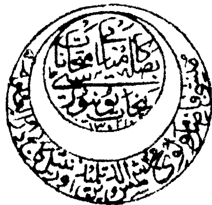
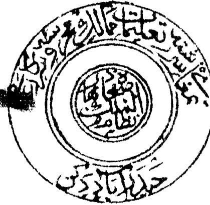
UNIVERSAL LIBRARY

تمغه طلائی عطیه سررشته تعلیمات ملک سرکار عالی





کتب خانه منشی فاضل مولوی محمد شمس الدین

نام کتاب

....

نمبر کتاب	
قیمت کتاب	
جلد بندی	
میزان	

مطبع نظام دکن

جلد ۵ نمبر ۲ — ادب اُردو کا باتصویر ماہوار رسالہ — فروری سنہ ۱۹۱۲ء

ادیب

ایڈیٹر: پیارے لال شاکر (میرٹھی)

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

قیمت سالانہ للعہ — پنچکوڑی متر ایر پرنٹر و پبلشر نے انڈین پریس الہ آباد میں چھاپ کر شائع کیا — فی پرچہ ۶ر




ہر سچّے محبّ وطن

کا فرض ہے کہ

اپنے وطن اور ماتر بھومی کی صنعت و حرفت کی مدد کرے

کیونکہ اس طرح

وہ اپنے اہلِ وطن کے لئے روزگار مہیّا کرنے اور اپنے ملک کو خوشحال بنانے مین مدد کرنے کے قابل ہوگا

ہر سچّا بھی خواہ ملک عقل اور کفایت شعاری دونوں کے لحاظ سے

لال املی کے خالِص اونی کپڑوں

کو پہننا ضروری خیال کرتا ہی - وہ اُن سستے کپڑوں کے استعمال سے استقلال کے ساتھ اجتناب کرتا ہی جو غیر ممالک سے اونی کے نام سے آتے ہیں مگر جن میں برابر کا سوت ملا ہوا ہوتا ہے اور ملک میں بنے ہوئے اونی کپڑوں کے نام سے فروخت ہوتے ہیں

کیا ہم آپ کو موسم کے حسب حال اپنے کارخانہ کے بنے ہوئے کپڑوں کی فہرست ارسال کریں؟

کانپور وولن ملز کمپنی لمیٹڈ کانپور

Cawnpore Woollen Mills Co., Ld.,



CAWNPORE.





Their Imperial Majesties King-Emperor George V. and Queen-Empress Mary.

جنوری ۱۹۱۲ء

ادیب

جلد ۵ — نمبر ۱

مبارک باد

من جانب اہل الرائے والقلم

وقتِ جلوسِ شہ بود در دستِ ہر یک ہدیہ — من نیز حاضر مے شوم تصویرِ جاناں در بغل

ہز مجسٹی ملک معظم جارج پنجم کے دربارِ دربار تاجپوشی کے ایّام میمنت فرجام مکرمت انضمام جسقدر قریب آتے گئے اُسیقدر طبقات وجماعاتِ رعایا کی طبائع میں فرحت کے ولولے، مسرّت کے جذبے، ارادت کے غلغلے، عقیدت کے زمزمے پیدا ہوتے گئے جس طرح برفستانی دریاؤں کی منجمد سطحات آفتابِ عالمتاب کے طلوع پر پگھل پگھل کر روانی کا منظر دکھاتی ہیں، اور جس طرح سمندر کا سکون جوشزن موجوں کے تحرّک سے مبدّل بہ سیلان ہوجاتا ہے، یہی گوناگوں ترنگیں اور بوقلموں اُمنگیں یکے بادیگرے اس ربع مسکوں کے باشندوں کے دلوں میں یوم بہ یوم ساعت بہ ساعت دمبدم نمو پاتی رہیں۔ یہ کچھ ظاہری نمود ونمایش نہیں، بلکہ ٹھیک کانشنس کا اظہار ہے سچّی ارادت اور خلوص کو اگر کوئی چھپائے بھی تو چھپ نہیں سکتا ع

که عشق و مشک را نتواں نہفتن

ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں کو علمِ غیب نہیں ہز مجسٹی کی رونق افروزی اور انعقادِ دربار تاجپوشی کا طنطنہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ چار دانگِ عالم میں اہل الرائے والقلم (پریس) ہی نے پہنچایا، اور پبلک کو ہز مجسٹی کی جلوہ فرمائی کے لئے گوش بر آواز بنایا۔ اس لئے اہلِ قلم کی قوت جو سلطنت کی حفاظت وحمایت میں کام دے رہی ہے، ویسی ہی مسلّم ہے جیسی اہل سیف وعَلَم کی قوّت۔ بلکہ ترقی کے موجودہ زمانہ میں پریس کی

قوت فوجی قوت سے بہت زیادہ زبردست ہے۔ سیسے (ٹائپ کے حروف) ان سیسوں کے گولوں سے، جو توپوں میں کام دیتے ہیں، اپنی دور دراز کی زد اور تاثیر اور نفوذ میں ایسے زبردست ہیں، کہ اُن کے مقابلہ میں توپوں کے گولوں کی رسائی، جو دشمن تک ہوتی ہے، بےحقیقت ہے۔ آلاتِ حرب کا اثر صرف اجسام پر ہوتا ہے، اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ دس پانچ میل تک، مگر پریس کے گرابوں کا اثر طبائع اور نفوس پر، اور وہ بھی ہزاروں میل تک۔ پھر پریس کی قوت ایک دوسری پبلک گورنمنٹ ہے، جس کے تسلط و حکمرانی کی دوست و دشمن پر ہر وقت یکساں ضرورت ہے، برخلاف فوجی قوت کے جسکی ضرورت کبھی کبھی صرف دشمن کے لئے ہوتی ہے نہ کہ دوستوں کے لئے۔ اس پبلک گورنمنٹ (پریس) کو یہ قوت برٹش گورنمنٹ نے ہی عطا کی ہے، اس میں خود یہ پیدا نہیں ہوگئی جس طرح موج کی روانی اور سیلاب بسا اوقات اپنے زور شور کے تموّج میں دریا کے کناروں سے ابل کر دور دراز شہروں اور آبادیوں تک پہنچ جاتا ہے، مگر اس کو یہ قوت دریا ہی عطا کرتا ہے۔ اسی طرح پریس کی طاقت، جس کا سکّہ طبائع و نفوسِ انسانی پر ہزاروں میل تک بیٹھا ہوا ہے، مہذب گورنمنٹیں ہی عطا کرتی ہیں، جو بالآخر ان کی قوتوں کے ساتھ متحد ہو کر کام کرتی ہیں۔ اور جسطرح دریا کا مدّ اس کے جزر میں سما جاتا ہے، اسی طرح پریس کی طاقت گورنمنٹ میں جذب ہوجاتی ہے۔ پس پریس کی طاقت جس قدر زبردست اور مکمل ہوگی، اسی قدر گورنمنٹ کو تقویت پہنچے گی۔

لارڈ میکالے کا مقولہ ہے کہ "کامل آزادی عطا کرنا ایک مہذب اور منصف گورنمنٹ کا کام ہے، اور اس آزادی کو برقرار رکھنا ایک وفادار رعایا کا شیوہ ہے" اس رمز کو ہندوستان کے پریس نے خوب سمجھا ہے، اور کچھ کم ایک سال قبل جب سے اس کے کانوں میں یہ نوید بشاشت جاوید پہنچی ہے کہ ہز مجسٹی شہنشاہ ہند و انگلینڈ علاوہ اپنے پایۂ تخت شہر فرنگی بہر (لندن) کے ہندوستان جنت نشان کے قدیم دار الخلافۂ سلاطینِ مغلیہ (دہلی) میں بھی تاجپوشی کا جشن منائیں گے اور دربارِ قیصری منعقد فرمائیں گے، تو اس نے اپنے فرائض اظہارِ وفاداری کا جو کچھ ثبوت دیا ہے وہ آفتاب کی طرح روشن ہے، اور چھپائے چھپ نہیں سکتا۔ اعلیٰ درجہ کے اخباروں سے لیکر ماہوار رسالے تک خیر مقدم کے رنگ میں رنگے ہوئے نکلے۔ اپنی اپنی بساط کے موافق ہر ایک پرچہ گویا کوسِ شاہی بنا، اور ہز مجسٹی کی اس رونق افروزی سے رعایائے ہند کو جو فوائد و برکات حاصل ہونگے ان کا اظہار کیا، اور پبلک کے قلوب پر ان کا غلغلہ بٹھایا۔

ادیب نے اس مبارک موقع پر جو خدمات نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اپنی پبلک کی طرف سے کی ہیں، اور آئندہ کرے گا، ان کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ وہ اس کے صفحات پر خود نمایاں ہیں۔ ادیب دعاگو ہے کہ ہندوستان کو یہ تاجپوشی کا دربار ہمیشہ کے لئے مبارک ہو، اور ہندوستان پر برٹش گورنمنٹ کا سایہ ہما پایہ ہمیشہ قائم رہے، اور دیسی پریس اس سایہ میں برابر پھولتا پھلتا اور اسکے ثمرات سے فوائد رعایا کے دلنشیں کرتا رہے۔ اور پریس کو خداوند خدا یہ توفیق عطا کرے کہ وہ باہمی خلوص و اتحاد سے یکجان و ہزار قالب بن جائے اور دوئی و تفرقہ درمیان سے اٹھ جائے۔ آمین

دربارِ شہنشاہی

رعایا کو بادشاہ یا بادشاہوں سے جو تعلقات اور جو وابستگیاں ہوتی ہیں وہ ایسی لازمی ہوتی ہیں کہ جب تک ایسا باہمی تعلق قائم رہے اُنکا ٹوٹنا یا ظاہر میں قطع تعلق ہوجانا آسان نہیں ہوتا اور اگر ضرورت یا بدنیتی یا بدطینتی سے کوئی توڑنا بھی چاہے تو ظاہر میں ایسا کرنے کے واسطے اُسے ایک بڑی ہمّت اور بڑے حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

صرف رعایا ہی کو بادشاہ یا بادشاہوں سے ایسے تعلقات نہیں ہوتے۔ بادشاہ یا بادشاہوں کو بھی رعایا سے ایسے تعلقات اور وابستگیاں ہوتی ہیں جیسے رعایا پر ایسے تعلقات کا نباہنا لازمی ہوتا ہے، ایسے ہی بادشاہوں پر بھی لازمی ہوتا ہے۔

چونکہ کوئی بادشاہ سوائے مرضی قدرت کے نہیں ہوتا اور کوئی رعایا بجز حکم الٰہی کسی بادشاہ یا کسی سلطان کے حیطۂ قبض و قدرت میں نہیں دی جاتی اس واسطے ایسے تعلقات کی بنیاد گویا قدرت ہی کی مشیت سے رکھی جاتی ہے اور قدرت ہی اُن کا باعث اور موجب ہوتی ہے ایسے تعلقات کے قائم رکھنے اور اُنکی نمائش عملی کے واسطے رعایا اور بادشاہوں میں مختلف قسم کے عملی تبادلات ہوتے رہتے ہیں اور اُنکے ذریعہ اور وساطت سے وہ رشتہ جو قدرت نے خود قائم کیا ہے مختلف صورتوں میں تازہ ہوتا رہتا ہے اور مختلف صورتوں میں ایسے گراں بہا تعلقات کی سالگرہ منائی جاتی ہے گو وہ صدیوں یا ایک صدی یا نصف صدی کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ رعایا اپنے رنگ میں اُن کا اعادہ کرتی ہے اور سلاطین اپنے رنگ میں خواہ کسی ہی درجہ اور رتبہ کا انسان ہو چاہے رعایا ہو اور چاہے بادشاہ تعلقات کی جدت اور نمائش کا خواہاں ہے اور قدرت اس کی تائید میں ہے کیونکہ قدرت بعض دفعہ خود بھی ایسی جدت اور نمائش کی خواہاں ہوتی ہے جو کچھ ہم اپنے اردگرد دیکھ رہے ہیں اور جو سماں اور جو ٹھاٹھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے یہ سب قدرتی جلوا اور قدرتی نمائش یا دربار ہے اس نمائش یا اس دربار سے ہم بہت سی عجیب و عجیب باتیں اور دلچسپ کیفیتیں اخذ کرتے ہیں اور ان سے اپنے مفاد کی صورتیں نکالتے ہیں اور ان صورتوں سے جو کچھ ہمارے تعلقات اور وابستگیاں قدرت یا منظرِ قدرت سے ہیں ان پر یقین کرتے اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

رعایا اور بادشاہ یا بادشاہوں میں ان تعلقات کے اظہار سے قرب اور بُعد کا ہونا لازمی ہے۔ قرب بذریعہ احکام اور عملیات شاہی کے ہوتا ہے اور بُعد اس کے درجہ اور جبروت کی وجہ سے ان دونوں کے یکجا ثابت اور اعلان کرنے کیواسطے بادشاہ اور رعایا دونوں کو ایک اسٹیج پر لانے کے لئے جبروت رعب داب اور تزک و احتشام کا عملی رنگ میں لانا لابدی ہوتا ہے جس کی تہ یا جس کے اندرونہ میں رحم۔ فیاضی۔ خلوص۔ الطاف و اکرام و وفاداری۔ عقیدت مندی نثار ایثار کا اپنی اپنی جانب سے اظہار ہوتا ہے۔

قدرتی اصطلاحات میں اگرچہ ایسی رسموں کا نام کچھ اور ہو انسانی الفاظ میں انھیں خوشی۔ فرحت۔ جشن۔ مجالس دربار کارونش وغیرہ وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں یہ رسم آج ہی نہیں منائی جاتی شروع سے ہی اس کا بول بالا رہا ہے ہر درجہ کے بادشاہ اور ہر درجہ کی رعایا

نے اپنی اپنی بساط اور اپنے اپنے رنگ میں اس کا خیر مقدم کیا ہے تاریخیں اس پر روشنی ڈالتی اور داستانیں اس کا ذکر کرتی ہیں کتابیں اس سے پُر ہیں اور صحائف مملو جشن جمشیدی ۔ جشن نوشیروانی ۔ جشن اشوک ۔ جشن ہرقل ۔ جشن بونا پارٹ ۔ جشن پیٹر اعظم ۔ جشن بابری ۔ جشن اکبری ۔ جشن جہاں گیری ۔ جشن شاہجہانی ۔ جشن بکرما جیتی ۔ جشن وکٹوریا ۔ جشن ایڈورڈ ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ صدہا جشن اور صدہا تاجپوشیاں اپنے اپنے روپ و رنگ میں یہ ثبوت دیتی رہی ہیں کہ کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہا اور اسکی ضرورت اُن تعلقات کی وجہ سے ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایسے دربار کثرتِ مصارف کی وجہ سے شاید اخیر پر چنداں مفید ثابت نہ ہوں یہ غلط ہے جیسا کام ہوگا ویسا خرچ اور تکلّف بھی ہوگا ۔ یہ جشن محض نمائشی ہی نہیں ہوتے بلکہ مقصود ان سے دو باتیں ہوتی ہیں ۔

(**الف**) ایک بادشاہ اس ظہور اس جلوس اس نمائش سے اپنی رعایا برایا سے دستاویز تاجپوشی حاصل کرے ۔ اور اپنے رنگ میں اس اعزاز اس احترام اس قبولیت کا باضابطہ اعلان کرے جو قدرت نے اسے بخشا ہے ۔

(**ب**) رعایا برایا خوشی سے یا ضبطِ ضابطہ سے اپنے حکمراں کی سند حکمرانی پر اثباتی شہادت ثبت کرے ۔

ہر بادشاہ اور ہر کنگ جو ایسا کرتا ہے اور ہر جدید حکومت میں جو یہ ساز و سامان کیا جاتا ہے اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ ہر بادشاہ اس قدرتی احترام اور اعزاز کی نسبت رعایا برایا سے بذریعہ ایسے ساز و سامان کے ایک دستاویز حاصل کرتا ہے اور رعایا سے اپنا جبروت اپنا حکمراں ہونا تسلیم کراتا ہے ۔

کیا ان حالات میں کہا جا سکتا ہے کہ ایسے دربار فضول یا محض نمائشی اور تکلیف دہ ہیں ہرگز نہیں دراصل جب کوئی بادشاہ ایک مدّت حکومت کے بعد دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو دوسرے بادشاہ کے واسطے لازمی ہے کہ اپنے حقوق اور دعاوی کی اپنے رنگ میں تصدیق عامہ کرائے ایک شادی عقد نکاح کے واسطے تو چند لوگوں اور حالی موالی کا جمع ہونا لوگ پسند کرتے ہیں ۔ بعض اس بڑی شادی کے واسطے جن میں رعایا برایا اور بادشاہ کے تعلقات کثیرہ کا انعقاد ہوتا ہے یہ کہتے ہیں کہ کوئی محفل نہ قائم کی جائے ایک جج یا ایک افسر کے جانے پر دوسرا جج یا دوسرا افسر باضابطہ چارج لیتا ہے اور اسکا گزٹ بھی ہوتا ہے ۔ کیا جدید حکومت کے شروع ہونے پر اس قاعدہ کی پابندی نہ کی جائے ۔

ہمارے اعلیٰ حضرت ملک معظم قیصر ہند شاہ جارج پنجم دملکہ علیہ معظمہ میری دام اقبالہم و اقبالہا ۔ ایڈورڈ ہفتم کی وفات کے بعد درباری رنگ میں ہند و انگلینڈ سے جدت معاہدہ حکمرانی دہلی میں کرتے ہیں اور رعایا اُن کے حضور حاضر ہو کر اپنی وفاداری ۔ جاں نثاری اور ایثار رعیتانہ کی تصدیق دستاویز معاہدہ حکمرانی پر کرتی ہے ۔ ایک بادشاہ ایک حکمراں رخصت ہوتا ہے اور قدرت کے انتظام کے مطابق دوسرا اسکی جگہ لیتا ہے ۔ رعایا اس کو شاہی حکومت والا جاہی کی خوشی و مسرّت سے باعظمت بکرامت دستار پہناتی ہے اور اس کے حضور میں ادب سے اپنی عاجزی اور اپنی مسکنت اپنی وفاداری اپنی جاں نثاری کا مستحکم اور صادق حلف لیتی ہے ۔

یہ حلف کیسے عظیم الشان کیسے رفیع الدرجہ کیسے جامع بادشاہ کے حضور میں لیا جاتا ہے جس کی حکومت میں آفتاب نے بھی غروب ہونے کی قسم کھائی ہے اور جس کے ملکوں میں انصاف عدالت نظم و نسق کے ایک وسعت کے ساتھ دریا بہ رہے ہیں ۔ دریا بھی کیسے نور کے امن و امان کے آزادی کے علوم و فنون کے تہذیب کے

دنیا میں اور بھی موجودہ زمانہ میں حکومتیں ہیں۔ان کا جبروت اور سکہ بھی قابل تعظیم ہے۔لیکن جو خوبی جو تمکنت جو رعب داب جو حسن جو وسعت اس جبروت و تمکنت اس سکے میں ہے وہ اور کسی کے حصہ بخرہ میں کم ہی آئی ہے۔ہندوستان کے واسطے جہاں یا جس سرزمین میں بھانت بھانت قومیں بھانت بھانت مذاہب بھانت بھانت رسم و رواج ہیں ایسی ہی حکومت اور ایسے ہی بادشاہ کی ضرورت تھی قدرت نے چُن کر یہ حکومت ہم پر مسلّط کی ہے اور عملی رنگ میں ہمیں دکھا دیا ہے کہ دنیا بھر میں نہ تو کوئی حکومت اس کی ثانی ہے اور نہ اس کے لگ بھگ یہ اُن لوگوں سے پوچھو جو مختلف ملکوں اور اقوام کی سیریں کرتے ہیں۔چیز کی قدر ہمیشہ مقابلہ سے ہوتی ہے ہندوستان کی موجودہ حالت موجودہ پستی کہہ رہی ہے کہ بلندی اور اعلیٰ زینہ پر ہندوستان کو فائز کرنے کے لئے ایسی ہی حکومت کی فی الواقع ضرورت تھی اور اگر خدا نخواستہ کبھی اس کا قدم کھسک جائے تو سارا ہندوستان اپنی قسمت کو آٹھ آٹھ آنسو روئے۔

کیا ایسے بادشاہ ایسے حکمراں کے دربار جشن تاج پوشی سے ہمیں خوشی نہیں ہونی چاہیئے بصد فخر اور ہزار مرتبہ۔ مان لو کہ چند لوگ یا صدہا ہی کروڑوں میں سے ایسے سہی جو بعض عُمالِ حکومت ہذا کے شاکی بھی ہوں لیکن اصول حکومت اور ذاتِ شاہ سے تو کسی کو بھی کلفت اور کدورت نہیں۔کیا یہ تھوڑی بات ہے اور تھوڑی سی کامیابی۔ذالک فضل اللہ یُوتیہ من یّشاءُ

اے ہندوستان کی رعایا برایا!! اور اے ہندوستان کی ہندو مسلمان۔عیسائی۔پارسی وغیرہ وغیرہ چھوٹے میل چھوٹی حیثیت کی رعایا! تیرے لئے یہ حکومت یہ دربار یہ شاہ ایک قدرتی فیضان اور رحمت ہے۔تجھے امیروں سے ڈر نہیں اور دولت مندوں کی پرخاش سے خوف نہیں۔اے زمینداران خوش ہو کہ تمہارے بادشاہ نے تمہاری سرزمین میں قدم رکھا اور اسے اپنے قدوم میمنت لزوم سے مالا مال کیا ہے۔

اے شہر دہلی تیرے واسطے سب سے زیادہ مقام مسرت و مقام فخر و احترام ہے کہ مدتوں کے بعد تیری سرزمین میں ایک جلیل القدر شاہ بحر و بر قدم زن ہوا اور تیری ہی گود میں تاج سلطانی زیب سر کیا۔اے دلّی تو نے مدتوں اور عرصہ کے بعد یہ شان و شوکت دیکھی اور یہ چہل پہل اپنے ارد گرد پائی ہے اور ایک عرصہ کے بعد تیرے کوچوں تیری راہوں تیرے منڈوں میں تیرے حسرت بھرے ٹیلوں پر یہ سماں یہ منظر رونق بھرا ہوا ہے بے شک تیری وفادار آنکھوں میں اکبری، شاہجہانی، جہانگیری، پرتھوی، اشوکی شان و شوکت کی تصویریں بھی ایک دم کے لئے گزر جائیں گی اور تیری آنکھیں انہیں دیکھکر ضرور پتھرا گئی ہونگی۔لیکن شکر کر کہ ایک عدیم المثل یورپین شہنشاہ کوسوں طے کر کے تیری مقدس اور پوتر دھرتی میں سند شاہی لینے اور تاج پوشی کے واسطے آیا۔گو تو کہے گی۔ع

چشمِ ما بسیار ایں خوابِ پریشاں دیدہ است

لیکن یہ جاہ و جلال بھی تو نے کبھی نہ دیکھا ہوگا اور پھر کس حالت میں جبکہ چاروں طرف امن و امان اور آزادی کی ہوائیں چلتی ہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں۔لندن سے لے کر پشاور کی دیواروں تک آزادی و امن کی ایک ہی ہوا چل رہی ہے۔کیا تو خوش نہیں ہوتی کہ اس جشن شاہی میں تیری دھرتی میں اُن نوابوں، اُن راجوں مہاراجوں کی نسلیں بھی رونق افروز ہوئیں جن کے باپ دادے تیری خاک چومتے تھے اور جن کے رگ و ریشہ میں تیری فیاضیوں کا اب تک خون دورہ کر رہا ہے۔

اے خاکِ دلّی! تجھ میں ایک مین اور ایک پوتر تا ہے۔ تجھ میں ایک جادو ہے تیری خاک میں غضب کی تاثیر اور جذب ہے۔ تونے آریا نسلوں کو کھینچا تونے ہندوؤں کو اپنی بستی میں عزت کے ساتھ جگہ دی۔ تونے مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ تیری تاثیریں تیرے جذبات ایشیا تک ہی محدود نہ رہے بلکہ سمندروں کے پار بھی اقصائے مغرب میں تیرا ستارہ چمکا اور جارج پنجم بالقابہ کو بایں خدم وحشم کھینچ لایا۔

اے دلّی اور اے ہندوستان! تم سب کے لئے یہاں یہ جشن شاہی یہ کرّ و فر مبارک ہو۔ قدوم شاہی کے آثار محمودہ سے ہندوستان کی کایا پلٹے۔ ہندوستان علوم و فنون اور اتفاق وصلح کے خزانوں سے بھر پور ہو کر انگریزی تاج انگریزی قوم کا شکر گزار رہو۔

قومیں قوموں سے آشتی ملیں اور جارج پنجم کی اُستت اور جے کرتے ہوئے ترقیات سے بغلگیر ہوں۔ قدرت اس نیک تقریب کی بدولت ہندوستان سے ارضی وسماوی بلیات کا ستیاناس کرے۔ خدا کی برکتیں ہندوستان اور سرزمین ہندوستان کے ساتھ ہوں۔ آمین۔

خدا جارج پنجم کی برکات اور الطافِ شاہی کے ساتھ عمر دراز کرے۔ اور مزید برکات کا اُسے وارث بنائے وہ چند در چند قوموں کا سچا گڈریہ ہے بھانت بھانت شکلوں کا ریوڑ اس کے ہاتھ میں دیا گیا ہے۔ ہندوستان کی رعایا ہندو مسلمان پارسی عیسائیوں کی طرف سے مبارک باد۔ آسمان یہ جاہ وجلال یہ شان و شوکت نکتہ چینی کی نظروں سے نہ دیکھے اور خدا کی برکات اور رحمتیں اس کے ساتھ ہوں خدا ہی تمام امن و امان اور برکات و رحمتوں کا متولی اور بخشندہ ہے۔

اور اُسی پر سب قسم کی امیدیں کی جا سکتی ہیں اور وہی سب جاہ و جلال اور شان و شوکت کا حامی اور جامع ہے۔ خدا رعایا اور بادشاہ دونوں کے ساتھ ہو ۔ آمین۔

تاج انگلینڈ و ہندوستان کا بول بالا۔

سلطان احمد

دُعائیہ نظم

سلامت رہیں شاہ قیصر ہمارے ۔۔۔ شہِ دادگر عدل گستر ہمارے
شہنشاہ بیگم رہیں شاد و خرم ۔۔۔ بڑی عمر والے ہوں قیصر ہمارے
رہے تاجِ ہندوستاں تیرے سر پر ۔۔۔ ترا سایۂ امن سر پر ہمارے
تمہیں ہم سبھوں کے ہو ملجا و ماوے ۔۔۔ تمہیں پاسباں اور دلبند ہمارے
سبق تیرے عدل و سخا و کرم کے ۔۔۔ زبانوں پہ ہیں خوب از بر ہمارے
دعائے ترقیِ اقبال شہ میں ۔۔۔ ہم آواز ہیں بحر اور بر ہمارے
تری تاج پوشی سے اس سرزمیں پر ۔۔۔ ہے جشن و خوشی آج گھر گھر ہمارے
وفادار ہیں ہم ترے جان و دل سے ۔۔۔ ترا اک اشارہ ہے اور سر ہمارے
شعارِ وفا دیکھ اور جاں نثاری ۔۔۔ عدو سب ہیں حیران و ششدر ہمارے

× × × × × × × × × × × ×

کوئن امپرس شاہ اور شاہزادے ۔۔۔ مہ و مہر ہیں اور اختر ہمارے

جلالِ وفا کیش کی پھر دُعا ہے
سلامت رہیں شاہ قیصر ہمارے

قاضی محمد جلال الدین

مہاراجہ جدھشٹر

اور دہلی کا سب سے پہلا شہنشاہی جشن

"جدھر دھرم ہو اُدھر ہی جے ہے"

مہارانی گاندھاری راجہ دریودھن سے

یہ پہلا ہی مرتبہ ہے کہ اعلیحضرت ملک معظم قیصر ہند حضور جارج پنجم دام ملکہ وسلطنتہ مع علیا حضرت ملکہ معظمہ کوئین میری دام اقبالہا بتقریب جشن تاجپوشی رونق افروز اقلیم ہند ہوئے اور یہ جشن ہندوستان کے قدیم دارالسلطنت شہر دہلی میں ہوا۔ دہلی زمانۂ قدیم سے ہندوستان کا دارالسلطنت رہا ہے۔ پٹھان، خلجی تغلق، اور مغلیہ سلاطین کا دارالخلافت تو یہ زمانہ تاریخ میں ہی رہا ہے اور جو رونق اس شہر کی ان سلاطین کے زمانہ میں رہی خصوص نئے شہر کی تعمیر کے بعد جو جشن بڑی دھوم دھام اور شان وشوکت کے ساتھ صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں ہوئے اُن کی نسبت تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ گویا یہ کل ہی کے واقعات ہیں۔ مگر یہاں ایک ایسے جشن کا ذکر کیا جاتا ہے جس کو بموجب ہندوؤں کے قول کے پانچہزار برس سے زیادہ ہوئے اور جو اسی شہر دہلی کا سب سے پہلا شہنشاہی جشن تھا۔ یہ جشن ایک بہت بڑے اور عظیم الشان بادشاہ کے خطاب شہنشاہی اختیار کرنے کے وقت ہوا تھا جس کے مفصل حالات ہندوستان کی مشہور ومعروف رزمیہ نظم مہابھارت میں بیان ہوئے ہیں۔

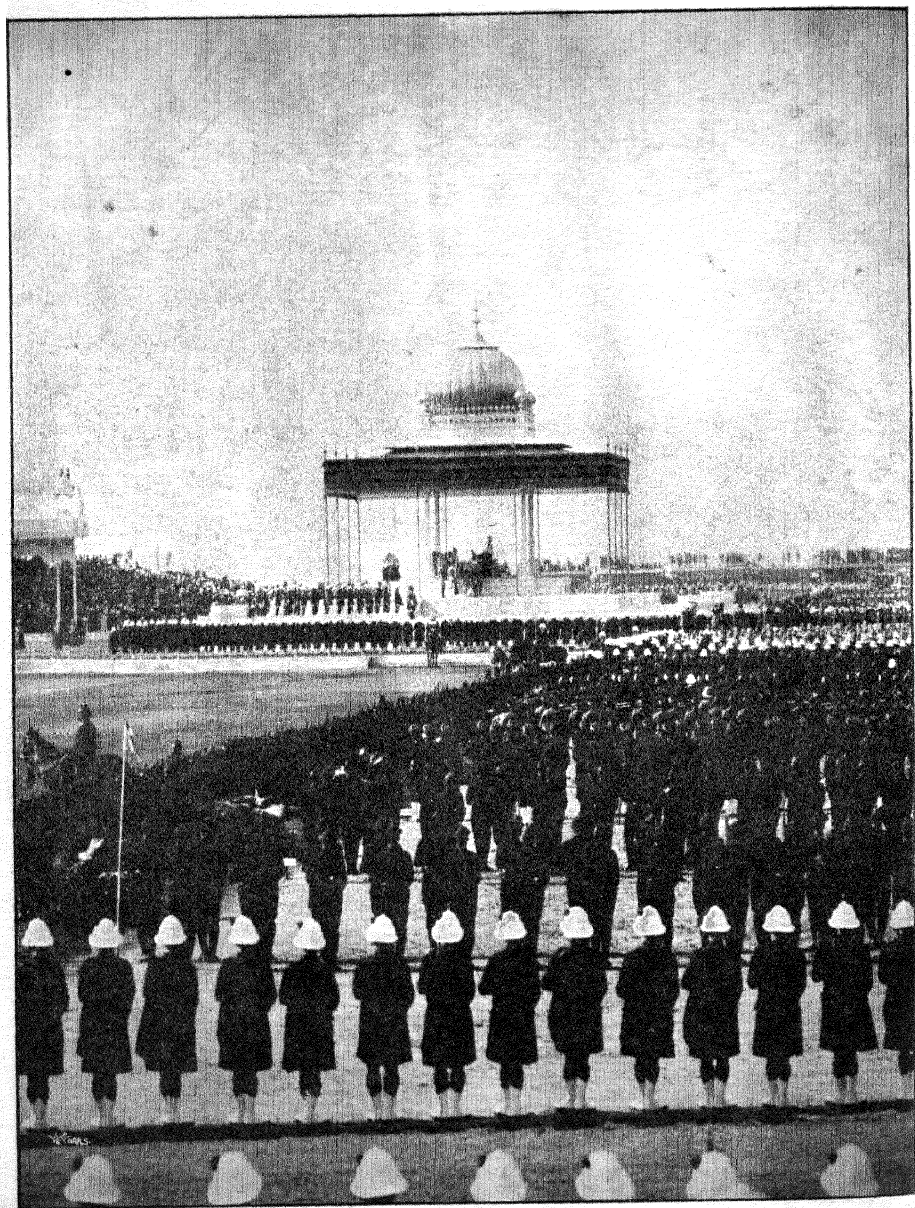
مخفی نہ رہے کہ ملک ہند میں ہمیشہ سے طوایف الملوکی رہی ہے اور زمانہ قدیم میں جو راجے یہاں صاحب حکومت تھے وہ سب سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں پر منقسم تھے۔ سورج بنسی راجاؤں کی راجدھانی اجودھیا تھی۔ اور چندر بنسی راجاؤں کا دارالسلطنت ہستناپور تھا۔ ان راجاؤں میں جو کوئی راجا باقی دوسرے راجاؤں کو مغلوب کر کے اپنی حکومت کا سکہ اُن پر بٹھاتا تھا وہ تاج شاہنشاہی کو سر پر رکھ کر ایک بہت بڑا جشن کیا کرتا تھا جسکو راجسوجگ کے نام سے ملقب کرتے تھے۔ دواپر جگ کے آخر میں جس کو پانچ ہزار برس سے کچھ زیادہ ہوئے چندر بنسی خاندان کے راجے ہستناپور میں حکومت کرتے تھے۔ اور اس خاندان میں بھرت نامی ایک بہت مشہور راجہ ہوا ہے جو دشینت اور شکنتلا کا بیٹا تھا اور جس کے نام سے یہ ملک اب بھی بھارت ورش کہلاتا ہے۔ اسی بھرت کی نسل میں دھرتراشٹ اور پانڈو دو بھائی پیدا ہوئے۔ بڑا بھائی دھرتراشٹ اندھا تھا اس لئے وہ سلطنت نہ پاسکا اور چھوٹا بھائی پانڈو راجہ ہوا۔ دھرتراشٹ کے سو بیٹے پیدا ہوئے جن میں سب سے بڑا دریودھن تھا۔ اور یہ تاریخ میں کوروؤں کے نام سے مشہور ہیں۔ پانڈو کے

پانچ بیٹے ہوئے جن کے نام *جدھشٹر۔ بھیم سین، ارجن، نکل، اور سہدیو ہیں اور یہ تاریخ میں پانڈوؤں کے نام سے مشہور ہیں۔ پانڈو کے مرنے کے بعد کوروؤں نے ہستناپور کے راج کو غصب کر لیا اگرچہ اپنے باپ کے حقوق کے لحاظ سے پانڈوؤں کو اس سلطنت کے پانے کا حق تھا۔ لیکن پانڈوؤں کے اندھے چچا دھرتراشٹ نے بہ نظر رفع فساد جدھشٹر کو جو پانڈوؤں میں سب سے بڑا بھائی تھا پانچ گاؤں عطا فرمائے جن کے نام اندرپرستھ، کھانڈو پرستھ، وغیرہ تھے۔ چنانچہ راجہ جدھشٹر جو ہمیشہ صلح جو اور امن پسند رہے ان ہی پانچ گانوں پر قناعت کر کے اپنے بھائیوں کے ساتھ داخل اندرپرستھ ہوئے اور اسی اندرپرستھ کو جو آگے چلکر دہلی کے نام سے مشہور ہوا اپنا پایۂ تخت بنایا۔

مے دانو نامی اس زمانہ میں کوئی مشہور کاریگر اور ہوشیار معمار تھا۔ اُس نے راجہ کے حکم سے ایک نہایت شاندار اور نفیس سبھا یعنی مجلس کا مکان تیار کر دیا۔ یہ عمارت اپنی آپ ہی نظیر تھی اور اس معمار کی کاریگری کی سب سے اعلیٰ نمونہ تھی۔

ایک دن راجہ جدھشٹر اپنی اس سبھا میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دیورشی نارد ان کے پاس آئے اور ان سے یہ کہا کہ جسطرح راجہ ہرشچندر نے اگلے زمانہ میں ایک بڑا جگ کیا تھا جس کا نام راجسو جگ ہے، اور جسطرح اس راجہ نے بہت بڑے مرتبہ کو پایا تھا اسی طرح تم کو بھی اسی طرح کا جگ کر کے شہنشاہی مرتبہ حاصل کرنا چاہئے جس سے اس دنیا میں تمہاری بہت بڑی تعریف ہوگی۔ اس جگ کو وہی راجہ کر سکتا تھا جس نے باقی سب راجاؤں کو اپنا مطیع کر کے سمراٹ پد یعنی شہنشاہی مرتبہ حاصل کیا ہو۔ ہمارے ملک معظم قیصرِ ہند شہنشاہ جارج پنجم نہ صرف ملکِ ہند کے شہنشاہ ہیں بلکہ ایک ایسی سلطنت کے بادشاہ ہیں جسپر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا ہے اور پھر فضلِ خدا سے اُنکی سلطنت میں امن و امان ہے۔ ان کا نہ کوئی رقیب ہے اور نہ کوئی مخالف یا بداندیش اور اس لئے یہ شہنشاہی مرتبہ انکو ہر طرح زیب دیتا ہے اور یہ انکا دربار کرنا ان کے لئے ہر طرح سے سزاوار ہے لیکن راجہ جدھشٹر کی حالت اس زمانہ میں کچھ اور ہی تھی اور وہ ایک چھوٹے سے راج کے مالک تھے نہ ان کے پاس کوئی بڑی دولت تھی نہ کوئی بڑی سپاہ اور اس لئے راجسو جگ یعنی شہنشاہی جشن کرنیکا انکا خیال گویا ایک طرح شیخ چلّی کے خیال کے برابر ہی تھا۔ اُنکے بھائی اُن کے دوست کوئی محبّت سے کوئی خوشامد سے انکو یہی صلاح دیتے تھے کہ وہ اس جگ کو ضرور کریں لیکن وہ ایک حیرت اور ششدر کی حالت میں تھے کہ جگ کریں تو کیونکر۔ انکا جو کچھ بھروسہ تھا وہ اپنے بھائیوں کی قوت بازو پر تھا اور سب سے بڑا بھروسا اُنکو سری کرشن جی کا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے پہلے سری کرشن جی سے مشورہ کیا۔ سری کرشن جی نے فرمایا کہ تم کو راجسو جگ کے کرنے میں کوئی تامل اور پس و پیش نہ کرنا چاہئے۔ تمہارے بھائی ایسے شجاع اور بہادر ہیں کہ دنیا میں کوئی راجہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا وہ سب راجاؤں کو جیت لیں گے اور پھر مگدھ دیش کے راجہ جراسندھ کے یہاں سیکڑوں راجے قید ہیں اگر جراسندھ کو مغلوب کر کے مار لیا تو پھر وہ سب قیدی راجے خود بخود تمہارے مطیع اور فرمانبردار ہو جائیں گے۔ اور مثل خادموں کے تمہارے دربار میں حاضر رہیں گے۔ اس سے سب سے پہلے جراسندھ کو جیتنے کی فکر کرنا چاہئے یہ کام بھیم سین سے ہو سکتا ہے۔ بھیم سین پہلوانی میں اس کو مار لے گا۔ غرض کہ راجہ جدھشٹر کو سری کرشن جی

* مخفی نہ رہے کہ سنسکرت میں یُدھشٹر ہی صحیح ہے مگر ہندی اور اردو میں جدھشٹر لکھا جاتا ہے اور یہی زبان زد عام بھی ہے۔



ارشاد قیصری

حضور شہنشاہ معظم کا استادہ ہوکر تقریر فرمانا (۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع)

Indian Press, Allahabad.



نوابان و شاہان اودھ

(۱) سعادت خاں برہان‌الملک (۲) نواب منصور علی خاں صفدر جنگ (۳) نواب شجاع‌الدولہ بہادر
(۴) نواب آصف‌الدولہ بہادر (۵) وزیر علی خاں (۶) نواب سعادت علی خاں بہادر
(۷) غازی الدین حیدر بادشاہ (۸) نصیر الدین حیدر بادشاہ (۹) منا جان
(۱۰) محمد علی شاہ (۱۱) امجد علی شاہ (۱۲) واجد علی شاہ

انڈین پریس الہ‌آباد

کی یہ صلاح پسند آئی اور کچھ دنوں کے بعد سری کرشن جی مع بھیم سین و ارجن کے مگدھ دیش کو گئے اور وہاں جراسندہ سے بھیم سین کی کشتی ہوئی۔ بھیم سین نے جراسندہ کو مار گرایا۔ پھر کیا تھا جراسندہ کے مرتے ہی وہ تمام راجے جو جراسندہ کی قید میں تھے آزاد ہو گئے اور ان سب کو ساتھ لے کر سری کرشن بھیم سین اور ارجن اندرپرستہ کو آئے۔ راجہ جدھشٹر نے اُنکی بہت بڑی تکریم کی۔ اور جگ میں حاضری کی دعوت دیکر سب راجاؤں کو رخصت کر دیا۔ اسکے بعد چاروں بھائیوں نے فوج لے کر چاروں جوانب میں چڑھائی کی۔ ارجن نے شمال میں جاکر کوہستانی راجاؤں کو فتح کیا۔ بھیم سین نے پورب کے ملکوں پر چڑھائی کی۔ اور وہاں کے راجاؤں کو جیتا۔ سہدیو نے دکن کے راجاؤں کو اپنا مطیع اور زیر دار بنایا۔ اور نکل نے پچھم کے سب راجاؤں کو لڑائی میں شکست دیکر مغلوب کیا۔ غرضکہ چاروں بھائی چاروں جوانب کے راجاؤں کو فتح کر کے اور بہت سا مال و دولت لیکر اندرپرستہ کو واپس آئے اور وہ سب دولت و مال راجہ جدھشٹر کے نذر کیا۔

اب راجسو جگ کے کرنے میں کیا کسر باقی رہی تھی۔ جگ کی تیاری ہونے لگی۔ سری کرشن جی کے دوارکا سے آجانے کے بعد راجہ جدھشٹر نے سہدیو کو جگ کا سامان اکٹھا کرنے کے لئے حکم دیا اور یہ فرمایا کہ سب راجاؤں کے پاس نیوتے بھیجدئے جائیں، اور نکل کو ہستناپور اس لئے روانہ کیا کہ وہ بھیشم پتامہ۔ دھرتراشٹ۔ دریودھن۔ دوشاشن۔ کرن وغیرہ سب بھائی بندوں کو اور گرو درونا چاریج و اشوتھاماں کو بلا لائے۔ راجہ جدھشٹر نے ان سب راجاؤں کی تکریم و خاطر ہر ایک کے حسب حیثیت کی اور ان سبھوں کو علیحدہ علیحدہ مکان رہنے کے لئے دئے جنمیں کنوے کھدے ہوئے تھے اور طرح طرح کے باغ لگے ہوئے تھے اور انواع و اقسام کی کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ گھر نہایت خوبصورت بنے ہوئے تھے اور ان کے فرش جڑاؤ تھے۔ اور چڑھنے کو اچھی اچھی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور طرح طرح کے قالین وغیرہ سے یہ آراستہ تھے۔ راجہ جدھشٹر نے اپنے قرابت داروں کو جگ کے الگ الگ کام پر متعین کیا تھا مثلاً کھانے پینے کے بندوبست کے لئے دوشاشن کو برہمنوں کی پیشوائی اور استقبال کے لئے اشوتھاماں کو راجاؤں کی پیشوائی کے لئے سنجے کو خام سامان کے دیکھنے کے لئے بھیشم پتامہ کو اور دکشنا بانٹنے کے لئے کرپاچاریج کو متعین کیا اور راجاؤں سے بھینٹ یعنی نذر لینے کے کام پر راجہ دریودھن متعین کئے گئے۔ اور سری کرشن جی نے برہمنوں کے پاؤں دھونے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ جب جگ کا دن قریب آیا اور برہمن اور راجے سب اکٹھے ہو گئے تو جدھشٹر کے حکم سے شلپیوں یعنی معماروں نے جگ بھوم میں یعنی جشن کے مقام پر الگ الگ ایسی عمارتیں بنا دیں جہاں سے سب لوگ کیا برہمن کیا چھتری جگ کو دیکھ سکتے تھے۔ جگ کے دن بیاس جی آپ برہما بنے۔ یاگ ولکیہ جی، ادھرلو، اور دھوم رشی، ہوتا، اور ان سب کے بیٹے اور چیلے رتوج، ہوئے۔ پھر عمدہ ساعت کے آنے پر برہمنوں کے حکم سے راجہ جدھشٹر ہزاروں برہمنوں اور راجاؤں کے ساتھ جگ شالا میں گئے اور ان کا وہاں ابھشیک ہوا یعنی اُنہوں نے تاج شہنشاہی کو اپنے سر پر رکھا۔ یہ جگ کس شان و شوکت کے ساتھ ہوا تھا اسکا ذکر جسطرح راجہ دریودھن نے حسد کی آگ میں جلتے ہوئے اپنے باپ دھرتراشٹ سے کیا تھا وہ یہاں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

"اے پتا جو لکشمی جدھشٹر کے یہاں میں نے دیکھی اس کا ذکر میں آپ سے کیا کروں۔ اٹھاسی ہزار اسناتک برہمن ان کے یہاں رہتے ہیں اور ہر ایک کی سیوا کے لئے داسی اور داس مقرر ہیں۔

یہ برہمن روزانہ سونے کے برتنوں میں بھوجن کرتے ہیں بڑے بڑے راجے ان کے یہاں مثل غلاموں کے ٹہل کرتے ہیں اور جو مال سونا چاندی و جواہرات وغیرہ نذر میں جدھشٹر کو اس جگ میں ملا اس کی گنتی میں کہاں تک کراؤں۔ راجہ کامبوج نے جدھشٹر کے پاس کدلی بن کے ہرنوں کے طرح طرح کے چمڑے اور قیمتی کمل اور پشمینے تین سو اونٹ اور خچروں پر لادکر بھیجے تھے، اور بہت سے راجاؤں نے انکی ڈیوڑھی پر حاضر ہوکر طرح طرح کے جواہرات نذر کئے۔ میں نے تو کبھی اتنی دولت اپنی آنکھ سے دیکھی اور نہ سنی تھی۔ میں نے یہ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گاؤں گاؤں سے لوگوں نے آکر تین کھرب سے زیادہ کا مال جدھشٹر کو نذر دیا۔ یہ لوگ مال سے بھرے ہوئے سونے کے کلس اپنے ہاتھوں میں لئے دروازے پر ہی کھڑے رہے اور اسقدر مال لانے پر بھی انکو اندر آنے کی اجازت نہ ملی۔ سمندر کے نزدیک اور سمندر کے پار رہنے والے ہزاروں آدمی بھیڑ۔ بکری۔ خچر۔ اونٹ کمل شہد اور طرح طرح کے جواہرات لئے ہوئے آئے مگر دروازے پر رکے ہی کھڑے رہے۔ پلچھوں کا راجہ بھگدت نہایت عمدہ نسل کے تیز رفتار گھوڑے اور دوسری عمدہ عمدہ چیزیں نذر کے لئے لایا تھا لیکن دروازے پر ہی روک دیا گیا اور جب اُسنے زری کے کام کے اور جواہرات سے جڑے ہوئے انواع واقسام کے کپڑے اور ہاتھی دانت کی موٹھ کی تلواریں بھینٹ میں پیش کیں تب وہ اندر گھسنے پایا۔ چین۔ بربر وغیرہ ملکوں کے لوگ وہاں آئے جن کے ساتھ دس ہزار بڑے بڑے خچر تھے ان جانوروں کو وہ نذر دینے کے لئے لائے تھے مگر وہ سبھا کے دروازے پر یوں ہی کھڑے رہے کسی نے انکو پوچھا بھی نہیں۔ شمالی ملکوں کے بنے دوشالے اور ریشمی بچھونے لگے ہوئے طرح طرح کے کپڑے جن میں سوت کی بناوٹ معلوم نہیں پڑتی تھی اور انواع واقسام کے بہت سے ہتھیار جدھشٹر کو نذر دینے کے لئے وہاں لائے گئے مگر ان کو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ مشرقی ملکوں کے لوگ ہاتھی دانت کے آسن یعنی کرسیاں وغیرہ جن میں جڑاؤ اور زریں کام تھا اور طرح طرح کے خود اور ہتھیار اور گھوڑے جن پر نہایت عمدہ جھولیں پڑی ہوئی تھیں، جدھشٹر کی نذر کے لئے لائے تھے، مگر ان کو بھی اندر آنے کی اجازت نہ ملی۔ البتہ کلنگ مگدھ وغیرہ کئی ملکوں کے راجے جو بذات خود قیمتی اور بھاری نذر کی چیزیں لیکر آئے تھے اندر آنے پائے تھے ان کے ساتھ ہزاروں ایسے ہاتھی تھے کہ جن کے بڑے بڑے دانت تھے اور جن پر سنہری جھولیں پڑی ہوئیں تھیں۔ غرض کہ میں کہاں تک ان راجاؤں کا نام گناؤں جنھوں نے بیشمار جواہرات اور دیگر اشیاء جدھشٹر کے نذر کیں۔

جدھشٹر نے مجھے بڑا سمجھکر بھینٹ یعنی نذر لینے کے کام پر مقرر کیا تھا اور میں اس بیشمار دولت کو لیتے لیتے تھک گیا لیکن میں نے اس کا پار نہیں پایا آخر تھک کر چپ کھڑا رہا۔ اس جاہ و حشم کو دیکھکر میرے دل میں حسد کی آگ ایسی بھڑکی ہے کہ میں آپ سے کیا کہوں میں اس آگ میں جل بھن کر کباب ہوا جا رہا ہوں"

جدھشٹر کی حشمت و دولت کو دیکھکر تو دریودھن کے دل میں حسد کی آگ مشتعل ہی ہوئی تھی لیکن جس واقعہ نے اس آگ کو اور زیادہ بھڑکانے میں سونے پر سہاگے کا کام کیا اسکو مختصراً شاعر کے الفاظ میں یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

بخوبی ہوا جگ کا اختتام — وہ مہمان رخصت ہوئے جب تمام
بڑے بھاری خلعت عنایت ہوئے — جو آئے تھے راجہ وہ رخصت ہوئے
سنو ایک دن کا یہ احوال اب — وہ ارجن وہ دریودھن و بھیم سب
عمارت کی ہر طرح کرتے تھے سیر — عزیز اقربا سب نہ تھا کوئی غیر

وہ کرتے تھے گلگشت گلزار کی   صفت تھی مکانِ طرحدار کی
ملا ایک شیشے[1] کا نایاب حوض   صفائی میں تھا رشکِ مہتاب حوض
سنو حال دریودھن بے شعور   کیا عقل نے اُسکی تا... فتور
وہ سمجھا کہ یہ حوض پُر آب ہے   صفائی میں آب اسکا نایاب ہے
تصور کیا پیرہن تر نہو   یہ پوشاک پانی کی جا در نہو
وہ دامن اٹھا کر ہوا جب رواں   نہ تھا حوض میں آب کا کچھ نشاں
خجالت سے دلمیں ہوا آب آب   بنا پیرہن اس کا رشکِ سحاب
وہ ڈوبا ہوا شرم کے چاہ میں   جو رکھا قدم بیشتر راہ میں
ہوا دوسرے حوض سے پھر دوچار   گہر سے کہیں آب تھا آبدار
صفا غیرتِ چشمۂ آفتاب   لطافت میں وہ آب موتی کی آب
خجالت زدہ تھا جو وہ بے شعور   چڑھی مغز میں اس کے بوے غرور
قدم بے تکلف جو رکھا وہاں   ہوئی برخلاف اُسکے حالت یہاں
کہ غوطے وہ پانی میں کھانے لگا   حیا کے عرق میں نہانے لگا
ہوا شرم سے جسمِ تر آب آب   وہ غصہ کہ کھاتا تھا دل پیچ و تاب
خجالت کے دریا میں تھا غوطہ زن   بنا چادرِ آب سب پیرہن
لباسِ مکلف ہوا تربتر   ہنسے بھیم و ارجن ات دیکھکر
ندامت زدہ سخت نادم ہوا   خجالت سے وہ جیتے ہی جی موا
وہ تیغِ حسد نے کیا اُس کا کام   ہوئی صبحِ عشرت کی اکبار شام
دکھایا خجالت نے یہ روزِ بد   ہوا سینہ مجروحِ تیغِ حسد ❊
تڑپنے لگا زخمیوں کی طرح   اڑا صاف چہرے سے رنگِ فرح

اس آتشِ حسد نے جسطرح خرمنِ زندگی کو جلاکر خاکستر کردیا اُس کی تاریخ شاہد ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ گلستانِ ہند ایک خارستان بن گیا۔

اب ہم راجہ جدھشٹر کے اُن اوصاف کا ذکر کرتے ہیں جنکے واسطے وہ ہند کے قدیم راجاؤں میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔

(۱) ایک بہت بڑا وصف اُنکا یہ تھا کہ جو عہد و پیمان اُنہوں نے ایک دفعہ کسی سے کر لیا اُس کے خلاف اُنہوں نے کبھی عمل نہیں کیا۔ چاہے اُن پر سخت سے سخت مصیبت کیوں نہ نازل ہوئی ہو اور چاہے فریق ثانی کی طرف سے کتنی ہی بے ایمانی کیوں نہ ہوئی ہو۔ مثلاً جب ایک دفعہ دریودھن کے ساتھ عہد کرکے جُوا کھیلنا شروع کیا تو باوجود اسکے کہ شکنی نے جعلی پاسے ڈالکر بے ایمانی سے انکا مال و دولت سب جیت لیا تھا۔ وہ اپنے اور سب طرح کے دُکھ سہتے رہے یہاں تک کہ دروپدی کی مصیبت کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کئے مگر اُس مصیبت سے اُسکو چھٹانے کے لئے انہوں نے کوئی ایسا فعل نہیں کیا جس میں عہد شکنی ہوتی۔

(۲) صبر و استقلال کی طاقت اُنکی اس حد درجہ کی تھی کہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی وہ ذرا بھی اُف نہ کرتے تھے اور بڑی بہادری کے ساتھ انہوں نے اپنی مصیبت کو جھیلا ہے۔ چنانچہ سلطنت کو جوے میں ہار جانے کے بعد جس وقت اُن کا اور اُن کے بھائیوں کا اخراج ہستناپور سے ہوا اس وقت کا ایک نہایت پُر درد سین شاعر نے حسب ذیل کھینچا ہے۔

شمالی جو دروازۂ شہر تھا   اُسی در سے اخراج اُنکا ہوا
اُسی در سے ہوتے تھے مجرم بدر   گنہگاروں کے واسطے تھا وہ در
نہ ڈالے خدا دشمنوں پر یہ دن   پریشاں نہ یوں ہوں دلِ مطمئن
پیادہ قدم زن ہر اک شہسوار   کفِ پائے گلرنگ میں زخمِ خار
کنارے جو گنگا کے پہونچے غریب   ہوا سایۂ نخل اُس جا نصیب
بچھونے کی جا فرشِ برگِ شجر   غذا کو بیاباں کے تازے ثمر
ہوئی صبح اختر شماری میں شب   جدھشٹر کے دل پر نہ تھا کچھ تعب
نہ آیا مصیبت کا ہرگز خیال   نہ تھا اُنکی پیشانی پر کچھ ملال

[1] یہ حوض فی الحقیقت اسپٹھک یعنی بلور کا تھا نہ کہ شیشے کا۔

(۳) برہمنوں کی تکلیف کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ جس وقت ہستناپور سے روانہ ہوئے، ہزاروں برہمن ان کے ساتھ تھے جنہوں نے اُن کے جود و سخاوت سے بہرہ اُٹھایا تھا۔ راجہ کو اپنی تکلیف سے بڑھکر اُن کی تکلیف کا بہت خیال تھا اور رنج تو اسی کا تھا کہ وہ اب اُن کی حاجت روائی نہیں کر سکتے تھے

(۴) معافی کی صفت اُنکی اس درجہ کی تھی کہ باوجود اس کے کہ کوروؤں کے ہاتھوں ہزاروں ظلم وستم سہہ چکے تھے اس زمانہ میں جب بٹائی سلطنت کے لئے کوروؤں سے نامہ وپیام کا سلسلہ جاری تھا سنجے کے پیام کے جواب میں اُنہوں نے حسب ذیل فرمایا تھا۔

"اے سنجے جیسا تم کہتے ہو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ادھرم سے دھرم ہی اچھا ہوتا ہے لیکن دھرم یا ادھرم جو ہم کریں دونوں کی اچھی طرح جانچ کر کے اگر ہم ادھرم ہی کرتے ہوئے پائے جائیں تو آپ ہماری مذمت کیجئے جس طریقہ پر ہمارے باپ دادا پردادا چلتے آئے ہیں ہم بھی اُسی پر چلتے ہیں اُس سے الگ اور کوئی دھرم ہم نہیں جانتے۔ اے سنجے جو کچھ مال و دولت اس دنیا میں ہے اور جو کچھ دیوتاؤں کے یہاں ہے ادھرم سے ہم اس کے پانے کی بھی خواہش نہیں رکھتے آپ جاکر کوروؤں سے ہماری طرف سے یہ کہئے کہ جو تم نے ہم لوگوں کو مرگ چھالا پہنا کر بن باس دیا اور جو دکھ ہم نے بن میں سہے اُنکو ہم نے بھلا دیا ہے اور ہم نے تم کو معاف کیا ہم تمہیں نہ ماریں گے اور دوشاسن نے درودپدی کے بالوں کو کھینچکر جو ایذا اسکو پہنچائی اور اس سے جو روحانی صدمہ ہمکو ہوا اس بہت بڑے دکھ کو بھی ہمنے بھلا دیا ہے اور اس بارے میں تمہاری خطا ہمنے معاف کی۔ اب بھی ہمارا راج ہمکو واپس کر دو اب ہم شانت ہی ہونا چاہتے ہیں"

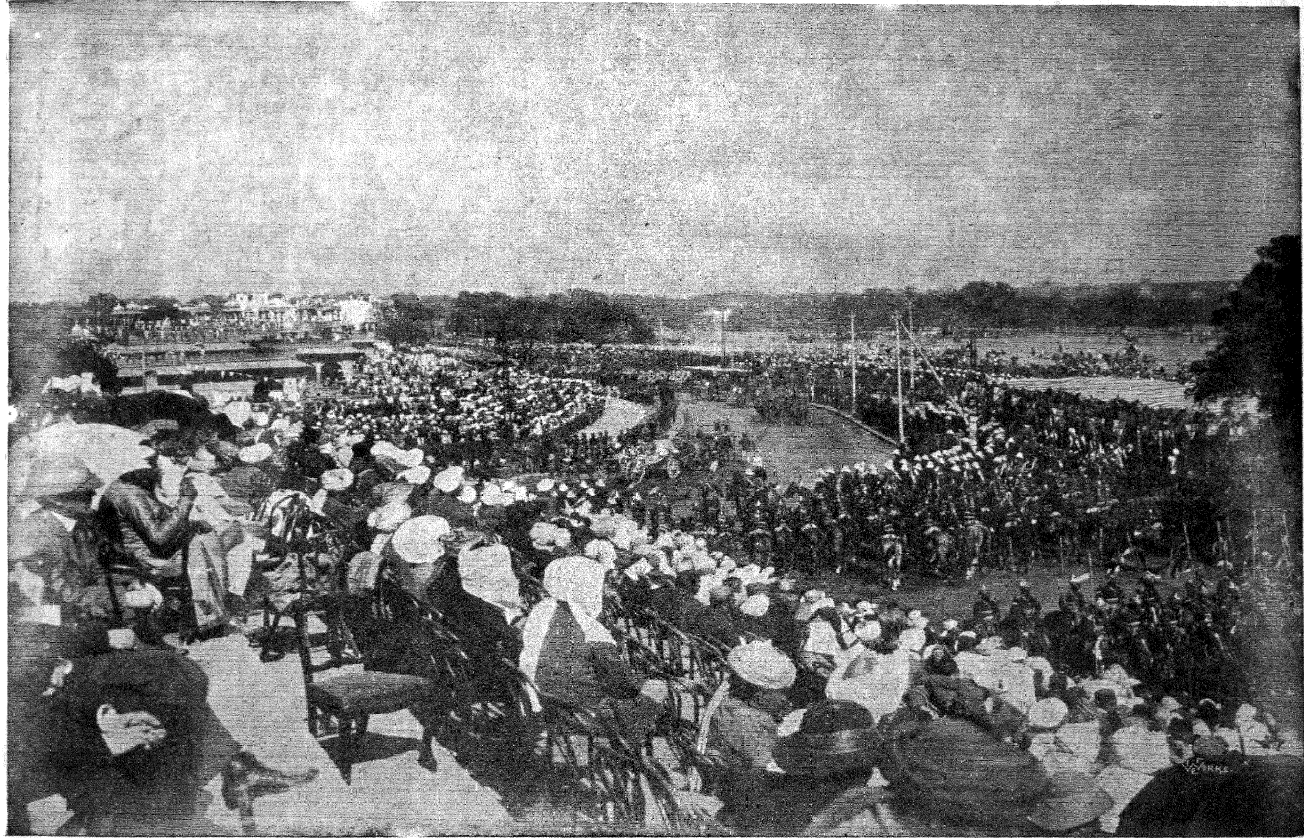
(۵) قناعت بھی جدھشٹر کی اس درجہ کی تھی کہ اندر پرستھ کی سی سلطنت کو کھو کر صرف پانچ گانوں کے مل جانے پر ہی صلح کر لینے کا پیام انہوں نے سنجے کے ذریعہ سے بھیجا تھا۔ چنانچہ سنجے انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ اگر وہ پانچ گانوں بھی ہم کو دے دیں تو ہم سب پھر شانت ہو جائیں گے اور ہماری انکی محبت بنی رہے گی۔

(۶) اپنے خاندان سے ان کو بہت محبت تھی۔ باوجود اسکے کہ دریودھن جو اُن کے حقیقی چچا کا بیٹا تھا ہمیشہ انکا جانی دشمن رہا۔ یہ ہمیشہ اُسکی بھلائی ہی چاہتے رہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دریودھن گندھربوں کی قید میں گرفتار ہو گیا اور اس کی خبر راجہ جدھشٹر کو پہونچی جو اُس زمانے میں جنگل میں بیٹھے دھونی رما رہے تھے۔ بھیم سین یہ خبر سنکر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ اچھا ہوا بدمعاش کو اپنے افعال کی خوب سزا ملی۔ یہ سُنکر جدھشٹر سے رہا نہ گیا فوراً بھیم سین سے یہ بولے۔

اگر ہم سے اور اُن سے ہو کچھ کلام — نہیں اُس کا ہو اس گھڑی انتقام
لڑیں جسقدر چاہیں آپس میں ہم — کسی کو نہیں رنج واندوہ وغم
اگر غیر اُن پر کرے بدنگاہ — سزا دیں اسے چل کے بے اشتباہ
اسے قید دیکھیں گوارا نہیں — طبیعت پہ اس جا اجارا نہیں

اس کے بعد ارجن نے اُن کے حکم سے دریودھن کو گندھربوں کی قید سے رہا کیا۔

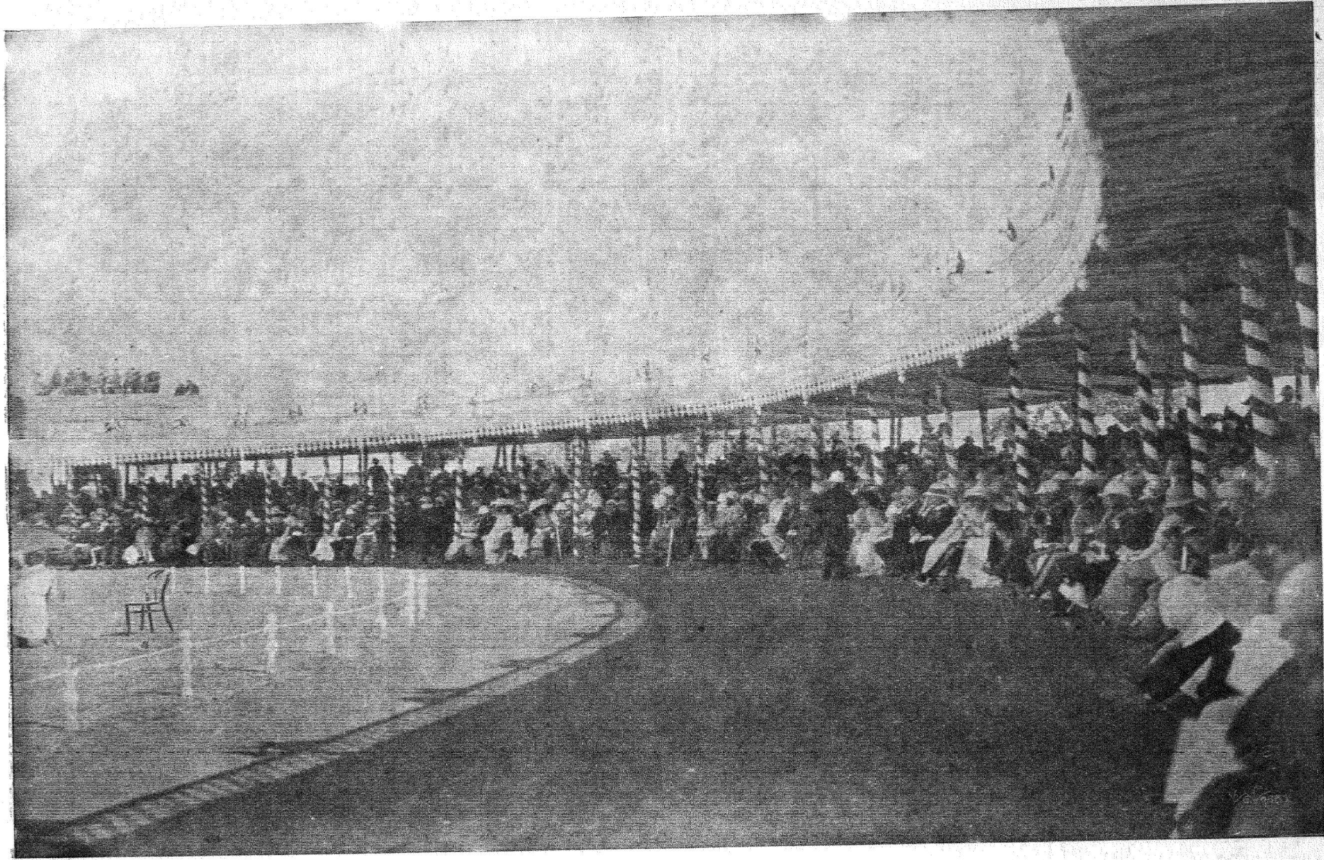
اسیطرح اپنے اندھے چچا دھرتراشٹر کی تعظیم و تکریم کرنے اور ان کے ساتھ سچی محبت کے اظہار کا کوئی دقیقہ چھوڑ نہیں رکھا گو ان کو یہ بخوبی معلوم تھا کہ اُن کا یہ چچا ہمیشہ انکا بُرا ہی چاہتا رہا ہے۔ چنانچہ جوئے میں درودپدی کے داؤں پر لگائے جانے کے وقت جب کہ بہت سے راجا جوئے کی مجلس میں موجود تھے اظہار رنج و تاسف کر رہے تھے یہ خوش ہو ہو کر بار بار یہی پوچھتا تھا کہ کیا دریودھن جیتا کیا دریودھن جیتا۔ ایسے سنگدل چچا سے بھی



شاهی جلوس

جامع مسجد کے سامنے کا نظارہ (۷ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع)

Indian Press, Allahabad.



پیویلین کا نظارہ

Indian Press, Allahabad.

راجہ جدھشٹر ہستنا پور کی موروثی سلطنت کے تخت پر جلوس کرنے کے بعد حسب ذیل مخاطب ہوتے ہیں۔

جدھشٹر کو بدنظر پاس تھا ۔ چچا سے یہ کی عرض اے بادشا
یہ بندہ فقط آپ کا ہے غلام ۔ اطاعت سے ہے مجکو ہر وقت کام
جو ہو حکم عالی وہ لاؤں بجا ۔ مری جان تک آپ پر ہے فدا
نہ رکھوں اطاعت سے باہر قدم ۔ بھروں دم غلامی کا میں دم بدم
اطاعت کروں کو رواں سے سوا ۔ کہ میں آپ کا راج ہے آپ کا

(۷) دشمن سے بھی انکو ویسے ہی محبت تھی جیسے کہ ایک دست سے سودشمن کی تکلیف کو بھی دیکھکر وہ بہت بیتاب ہوتے تھے چنانچہ ذکر ہے کہ جب لڑائی کے آخر میں دریودھن بھیم سین کے ہاتھ سے مارا گیا اور بھیم سین نے اُس کے سر کو اپنے پانوں سے ٹکرایا تو راجہ جدھشٹر نے نہایت خشمناک ہو کر بھیم کی اس حرکت پر اپنی ناراضگی ظاہر کی اور آپ میدان میں پڑے ہوئے زخمی دریودھن کے پاس گئے اور

لے اپنی آنکھوں سے زخمی کے ہاتھ ۔ کوئی دم کا باقی ہے اب اور ساتھ
سخن سنج یوں تھے وہ اندوہ گیں ۔ کہ یہ وقت اب سرزنش کا نہیں
مگر کیا کروں ہائے جلتا ہے دل ۔ یہ گرمی ہے دل کی پگھلتا ہے دل
مرا اس میں ہرگز نہیں کچھ قصور ۔ تری عقل ناقص نے ڈالا فتور
مجھے کشت و خوں یہ نہ منظور تھا ۔ لڑائی کے نزدیک سے دور تھا
فقط پانچ گانوں کا تھا خواستگار ۔ نہ تدنظر تھی مجھے کارزار
جدھشٹر جو روتے تھے بالین پر ۔ صدف چشم آنسو بنے تھے گہر
عدو کے بھی مرنے سے اک رنج تھا ۔ غموں سے وہ دل غیرت گنج تھا

(۸) جدھشٹر کی دانائی وزیرکی بھی بہت مشہور تھی اور اس کا امتحان متعدد بار کیا گیا ہے چنانچہ یکش کے سوالوں کے جواب انہوں نے حسب ذیل دئے تھے جو اس قابل ہیں کہ ہر شخص اُنکو اپنا دستور العمل بنائے۔

سوال۔ زمین سے بھاری آسمان سے اونچا ہوا سے تیز رفتار کیا ہے؟ اور گھاس سے زیادہ بڑھنے والی کیا چیز ہے۔؟

جواب۔ زمین سے بھاری ماں ہے؟ اور باپ کا درجہ آسمان سے بھی اونچا ہے۔ مَن یعنی خیالات کی رفتار ہوا کی رفتار سے بھی تیز ہے اور فکر گھاس سے بھی زیادہ بڑھتی ہے۔

سوال۔ دنیا میں سب سے افضل دھرم کونسا ہے اور کون سا دھرم ہمیشہ پھل دینے والا ہے اور وہ کیا چیز ہے جس کو بس میں کر لینے سے آدمی کو سوچ نہیں ہوتا اور ملاپ کس کے ساتھ کیا ہوا پُرانا نہیں پڑتا ہے؟

جواب۔ سب جانداروں کو بے خوف کر دینا یعنی کسی جاندار کو آزار نہ پہونچانا سب سے افضل دھرم ہے؟ اور اونکار کا جپ سدا پھل دینے والا ہے۔ من یعنی نفس کو قابو میں لانے سے آدمی کو سوچ نہیں ہوتا اور اچھے آدمیوں کا ملاپ کبھی پُرانا نہیں پڑتا۔

سوال۔ کس چیز کو چھوڑ دینے سے آدمی سب کا پیارا ہوتا ہے؟ اور وہ کیا چیزیں ہیں جن کو چھوڑ دینے سے آدمی مالدار ہو جاتا ہے سوچ نہیں کرتا ہے اور سکھ پاتا ہے؟

جواب۔ مان یعنی غرور کو چھوڑ دینے سے آدمی سب کا پیارا ہوتا ہے اور خواہشات کو ترک کر دینے سے مالدار ہو جاتا ہے اور غصہ سے مجتنب ہو کر سوچ نہیں کرتا اور طمع کو چھوڑ دینے سے سکھ پاتا ہے۔

سوال۔ آدمی کا وہ کون سا دشمن ہے جسپر بہت مشکل سے فتح ملتی ہے اور جسم میں وہ کون سا روگ ہے جسکی انتہا نہیں اور صالح اور غیر صالح کس کو کہتے ہیں؟

جواب۔ غصہ ہی بہت مشکل سے مغلوب ہو سکتا ہے۔ لالچ جسم

میں سب سے بڑا مرض ہے اور جو جانداروں سے محبت رکھتا ہے وہ صالح ہے اور جس کے دل میں رحم نہیں وہی غیر صالح۔

سوال۔ دنیا میں سب سے زیادہ حیرت کی بات کیا ہے اور ٹھیک طریقہ کونسا ہے اور خبر کس شے کا نام ہے۔؟

جواب۔ اس دنیا میں آدمی رات اور دن مرتے چلے جاتے ہیں پھر بھی جو بچ رہتے ہیں وہ اپنے کو غیر فانی سمجھتے ہیں کہ گویا کبھی مریں گے ہی نہیں۔ یہی سب سے بڑی حیرت کی بات ہے۔ ٹھیک طریقہ وہی ہے جس پر نیک لوگ چلتے آئے ہیں اور خبر اسی کو کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر شے فنا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

(۹) دھرم محض اس لئے کرنا چاہئے کہ دھرم کرنا اچھا ہے۔ اس مقولے کو راجہ جدھشٹر نے ہی عملاً کر دکھایا تھا۔ چنانچہ ایک روز کا ذکر ہے کہ راجہ جدھشٹر اپنے بھائیوں اور رانی دروپدی کے ساتھ جنگل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بجائے تاج شاہی کے سر پر جوگیوں کی سی جٹا تھی اور بجائے ریشمی کپڑوں کے درختوں کی چھال کے لباس تھے اور بجائے سنگھاسن کے مرگ چھالا تھا۔ اس حالت کو مشاہدہ کر کے دروپدی نہایت رنج کرتی ہوئی راجہ سے اسطرح ہمکلام ہوئی "اے راجہ آپ نے زمانۂ سلطنت میں اور سلطنت سے معزول ہونے کے بعد بھی کبھی دھرم سے زیادہ پیارا کسی کو نہیں سمجھا بلکہ دھرم کو اپنی جانِ عزیز سے بھی بڑھکر مانتے رہے مگر میں دیکھتی ہوں کہ وہ دھرم آپ کی رکشا نہیں کرتا ہے میں نے لوگوں سے سُنا ہے کہ دھرم کرنے والے آدمی کی رکشا خود دھرم ہی کرتا ہے۔ برخلاف اس کے میں یہاں یہ دیکھتی ہوں کہ آپ جیسے دھرماتما راجہ ایک بھاری مصیبت میں مبتلا ہیں اور آپ کے دشمن جنھوں نے ادھرم ہی کے کام کئے طرح طرح کے عیش بھوگ رہے ہیں۔ آپ کی یہ حالت اور آپکے دشمنوں کی وہ حالت دیکھکر مجھے سخت تعجب ہوتا ہے اور معاف فرمائے ایشور کے انصاف میں مجھے ایک طرح کا شک ہوتا ہے" اس کا جواب راجہ جدھشٹر نے یہ دیا کہ اے دروپدی یہ تیری باتیں دہریوں کی سی ہیں اور ویدوں کے خلاف ہیں۔ اے رانی میں جو کام کرتا ہوں اس کا کچھ پھل نہیں چاہتا ہوں اور میں جو دھرم کرتا ہوں وہ صرف یہ سمجھکر کرتا ہوں کہ دھرم کرنا اچھا ہے۔ میں کسی پھل کی تمنا سے کوئی کام نہیں کرتا ہوں۔ دھرماتما لوگ دھرم کی تجارت کرنا بہت بُرا سمجھتے ہیں۔

(۱۰) رفاقت کا بھی انکو بہت خیال تھا چنانچہ ذکر ہے کہ وہ ہمالیہ کے برفستان میں اپنے بھائیوں اور رانی دروپدی کے ساتھ خلد بریں کے سفر کی غرض سے چلے جا رہے تھے اور چاروں بھائی معہ رانی دروپدی کے راستہ میں یکے بعد دیگرے گر گئے۔ یہ تنہا ایک کتّے کے ساتھ جو سفر کے آغاز میں ہی ان کے ہمراہ ہو لیا تھا آگے کو بڑھے اس مضمون کو شاعر نے حسب ذیل باندھا ہے۔

جدھشٹر اکیلے جو مغموم تھے لیا ساتھ کتّے کو آگے چلے
سر راہ اندر نمایاں ہوئے کہیں مہر سے بڑھکے تاباں ہوئے
جدھشٹر سے فرمایا اے تاجور ارابے پہ اب ہو جئے جلوہ گر
محبت وداع اس جہاں کی کرو چلو سیر باغ جناں کی کرو
جدھشٹر نے اندر سے تب یہ کہا پذیرا ہو پہلے مری التجا
یہ کتّا ہے اسوقت میں جو رفیق سمجھتا ہوں دل سے میں اپنا شفیق
بٹھالو ارابے پہ اے مہرباں رفاقت کا تا ہو مرے امتحاں
سُنا جبکہ اندر نے طرفہ کلام کہا سگ کا ہو خلد میں کون کام
یہ کتّا نہ ہرگز وہاں جائے گا ارم میں نہ تِل بھر جگہ پائے گا

جدھشٹر نے جسدم سُنے یہ کلام — کہا کیا ہے پھر مجکو جنت سے کام
مجھے باغِ رضواں کی پروا نہیں — جدا مجھسے ہوتا ہے کتّا کہیں
ہوئی طول آپس میں جب گفتگو — وہ سگ دھرم بنکے ہوا روبرو
جدھشٹر سے بولا وہ عالی مقام — میں کتّا نہیں دھرم ہے میرا نام
جو اسدم بھی منظور تھا امتحاں — ہوئی جائیہ سگ میں صورت عیاں
ہزار آفریں ایسے اخلاق پر — یہاں بھی رہی راستی پر نظر

غرض کہ راجہ جدھشٹر کی زندگی کے حالات سے ہم کو ایک بہت بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ دھرم ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ جب لڑائی کے آغاز پر دریودھن اپنی ماں گاندھاری سے اپنی فتح کے لئے دعا کا طالب ہوا تو گاندھاری جی نے تمام شدنی واقعات کو جانتے ہوئے یہی فرمایا تھا کہ اسے بیٹا جدھر دھرم ہے اُدھر ہی جے ہے"۔ چونکہ راجہ جدھشٹر دریودھن سے کہیں بڑھکر دھرماتما تھے بلکہ دھرم سروپ ہی تھے اور آپ ہی سے انکا ایک نام دھرم راج تھا اس لئے آخر میں فتح اُنھیں کو حاصل ہوئی۔ مخفی نہ رہے کہ دھرم ہی پر سلطنت انگریزی کی بنیاد قائم ہے۔ دھرم ہی سے اس کو اس قدر سرسبزی اور کامیابی حاصل ہے لہذا ہماری تہ دل سے یہی دعا ہے کہ خداوند تعالے ہمارے شہنشاہ معظّم جارج پنجم کو اور زیادہ دھرم کے کاموں کے کرنے کی روز افزوں توفیق عطا فرمائے جس سے اس ملک کی رعایا کو اب سے بھی بڑھکر سرسبزی اور فلاح حاصل ہو۔

پربھولال

قدیم ہند فرمانرواؤں کے حقوق و فرایض

۱۔ زمانۂ قدیم کے ہندو فرماں رواؤں کی نسبت عام خیال

شاہی حقوق و فرایض پر بحث کرنے سے پہلے اس امر کی توضیح ضروری ہے کہ قدیم اہل ہنود میں راجاؤں کے متعلق لوگوں کے کیا خیالات تھے۔

سطحی نظر ڈالنے والے شخص کو عام طور پر یہی بات معلوم ہوتی ہوگی کہ زمانۂ قدیم کے ہندو راجہ خود راے۔ غیر ذمہ دار آٹوکریٹ یعنی مطلق العنان فرمانروا ہوتے تھے جنھیں اس بات کا اختیار ہوگا کہ اپنی سلطنت سے جس طرح جی چاہے سلوک کریں اور جو رعایا کے جان و مال کو اپنی ذاتی چیز سمجھتے ہوں گے وہ اس قسم کے جابر ہوں گے جنھیں غلامی پسند جاہل اور توہمات میں مبتلا۔ لوگ دیوتاؤں کے اوتار۔ جگنّاتھ یا بشنو یشور خیال کرتے ہوں گے۔ وہ اُنکی وحشیانہ کارروائیوں یا زیادتیوں میں دست انداز ہونا گناہ کبیرہ سمجھتے ہوں گے اور ان کو "مائی باپ" یا "دھرم اوتار" کے نام سے مخاطب کرتے ہوں گے۔ یا جیسا کہ بھاگوت میں آیا ہے

"انکی حالت اس دانا شخص کی مانند ہوگی جو کسی زردار بیوقوف کی غلامی میں پابند ہو"۔ اس خیال کی تردید میں رامائن مہابھارت اور سنگھتا سے بیسیوں حوالے دئے جاسکتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں لوگوں کی عام رائے کیا تھی۔ کیونکہ رامائن میں بھی جہاں کہیں راجہ کا ذکر آیا ہے اسے

راستی اور صداقت کا دیوتا شریفوں کا شریف - رعایا کا ماں باپ اور بنی نوع انسان کا ہوا خواہ بیان کیا گیا ہے۔
(جودھیا کانڈ)

مہابھارت میں بھی جب راجہ پرکشت سمیک رشی کی توہین کر چکتا ہے تو آخر الذکر اپنے بیٹے سے کہتا ہے " راجہ کے جی میں جو آئے اُسے کرنے دینا چاہئے" (آد- آستک)

منوجی مہاراج اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھکر لکھتے ہیں " راجہ پر گناہ کا کچھ اثر نہیں ہوتا" جس کا ہم معنی فقرہ مشرقی ممالک میں بھی ملتا ہے کہ " راجاؤں کو غلط طریق پر حکومت کرنے کا خدائی حق حاصل ہے" جس طرح قدیم انگلستان میں بادشاہ کو Son of Woden (ووڈن دیوتا کا بیٹا) اور اس کے بعد Lord's Anointed (جسے خدا نے تخت نشیں کیا ہو) کہلاتا تھا - ایسے ہی منوجی راجہ کو آٹھ دیوتاؤں کا اوتار قرار دیتے ہیں - چنانچہ اُنہوں نے لکھا ہے :-

راجہ اس دنیا کے آٹھ محافظ دیوتاؤں کا اوتار ہے - یعنی چندرما دیوتا - اگنی دیوتا - سورج دیوتا - وایو (ہوا کا) دیوتا - آکاش (آسمان) دیوتا - ویسروں (دولت کا) دیوتا - جل (پانی کا) دیوتا اور مرتیو (موت کا) دیوتا (۵-۹۶)

۲- راجہ کے اوتار ہونے کے متعلق منوجی کی توضیح

بظاہر یہ بات حد درجے کے وہم پر مبنی نظر آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اسکی بدولت جہلا کے دلوں میں راجہ کی ذات کی نسبت گونہ رعب اور پرستش کا خیال پیدا ہوجاتا ہوگا - لیکن جب ہم اس فقرے کو منوجی کی شرح کی روشنی میں دیکھیں تو صاف طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ اوتار ہونے کا خیال محض ایک ایمان یا تشبیہ ہے جس میں شاعرانہ طریق پر راجہ کے فرایض اور ذمہ داریوں کو ظاہر کیا گیا ہے - منوجی فرماتے ہیں :-

آکاش کے دیوتا اندر کی طرح جو سال بھر کے اندر برسات کے چار مہینوں میں زمین پر پانی برساتا ہے - راجہ کا فرض اوسکے ہونا چاہئے کہ وہ اپنی سلطنت پر برکتوں کی بارش کرے - آدیتہ یا سورج دیوتا کی مانند جو ۸ خشک مہینوں میں زمین کی نمی جذب کر لیتا ہے - راجہ کو اپنی رعایا سے ٹیکس وصول کرنے چاہئیں - وایو یا ہوا کے دیوتا کی مانند جو ہر طرف محیط ہے راجہ کو اپنے اہلکاروں کی معرفت ہر قسم کی واقفیت حاصل کرتے رہنا چاہئے - موت کے دیوتا یم کی طرح اس کا فرض ہو کہ جب وقت آئے تو دوست دشمن پر یکساں ہاتھ ڈالے اور رعایا کو زیر اختیار رکھے - ورن کی طرح (جو کسی زمانہ میں سب سے بڑا دیوتا تھا لیکن جسے بعد میں جال पाशः والے پانی کے دیوتا کے درجہ تک گھٹا دیا گیا تھا) راجہ کا فرض ہونا چاہئے کہ تمام چیزوں کو اپنے جال میں پکڑتا ہوا شریروں کو قابو میں رکھے جس طرح پورے چاند کو دیکھکر لوگوں کے دل خوش ہوجاتے ہیں ایسے ہی راجہ کو دیکھکر رعایا کا دل باغ باغ ہوجانا چاہئے - برے معاملات میں راجہ کو ہمیشہ اپنی طاقت اور غصہ سے کام لینا چاہئے حتی کہ اس کے اپنے اہلکار بھی کوئی شرارت کریں تو انہیں سزا دینے میں حذر نہ کرنا چاہئے اور اس طرح اسے اگنی دیوتا کی تقلید کرنا چاہئے (منوجی -۹-۳۰۴ تا ۳۱۰)

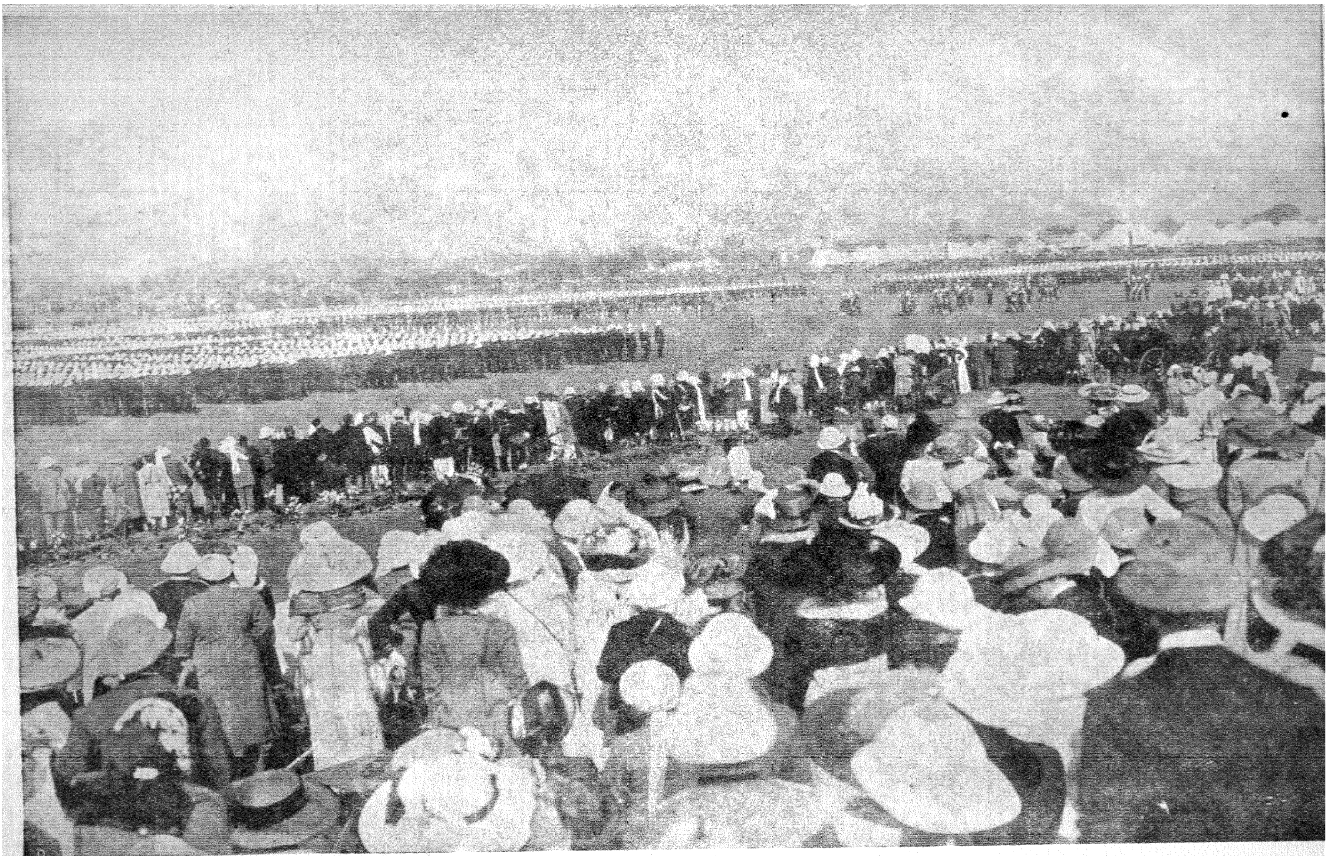
راجہ کے اوتار ہونے کا خیال جو ہندوؤں میں موجود ہے اس کے اندرونی معنوں کے متعلق اسی قسم کی توضیح رامائن میں بھی مذکور ہے جہاں لکھا ہے کہ :-

اُنکی سی اعلیٰ شانیں قائم کرکے راجہ خوبی میں یم - ویسروں (دولت کے دیوتا) اندر اور طاقتور ورن پر فوق حاصل کرسکتا ہے۔



شاهي كيمپ (دربار دهلي)

Indian Press, Allahabad.



عطیۂ کلرز

حضور شہنشاہ معظم پولو کے میدان میں افواج کو نئے جھنڈے عطا فرما رہے ہیں (۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع)

Indian Press, Allahabad.

اس طرح پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ راجہ کو ۸ دیوتاؤں کا اوتار قرار دیکر اس مشہور شاعر اور مقنن (منو) نے راجہ کے حقوق اور فرائض کے متعلق قدیم ہندو معیار کو ایک استعارہ کی صورت میں قایم کرنے کی کوشش کی ہے۔ رامائن کے متذکرۂ بالا اشلوک میں راجہ کے حقوق و فرائض قرار دیتے وقت اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ بچوں کی طرح اسے دم دلاسا دیکر رعایا کے ساتھ نیک سلوک کرنے پر آمادہ کیا جائے اور اس مطلب کے لئے قدرت کی ان فیاضانہ طاقتوں کی مثال اس کے روبرو پیش کی گئی ہے جن کے متعلق اس لحاظ سے اسے اوتار قرار دیا جاتا ہے کہ وہ ایسے آدرش (Ideals) ہیں جن کی اسے تقلید کرنا ہے۔

۳- راجہ کی شخصیت اور اُس کا عہدہ

راجہ کے حقیقی فرائض و حقوق کے متعلق اپنے معیار کو ایک استعارہ کی صورت میں قائم کرنے کے علاوہ ہمارے شاستروں میں اس کے ایک گہرے اور لطیف معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں راجہ کی شخصیت اور سلطنت کے سرکاری مرکز کی حیثیت سے اس کی حکومت میں ایک نہایت اہم فرق ظاہر کیا گیا ہے۔ ویدانت میں نام کے ایک خاص مغالطہ یا دھوکے کا ذکر کیا گیا ہے جس کا منشا ایک چیز کو غلطی سے کوئی دوسری چیز جس سے اس کا ہمیشہ تعلق رہتا ہے سمجھنا ہے۔ رعایا کے خدمت گاروں کے فرائض سمجھنے میں بھی اسی قسم کی غلطی ہوجاتی ہے یعنی یہ کہ کسی شخص کی شخصیت کو اس کا عہدہ سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کے پرائیویٹ حقوق و فرائض کو اس کے سرکاری حقوق و فرائض جانا جاتا ہے۔ رعایا میں اکثر اوقات بڑے سے لیکر چھوٹے تک تمام اہلکاروں کی نسبت اس قسم کا مغالطہ ہوجاتا ہے حتےٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ جو شخص پبلک کی خدمت گزار ہے اُسے پبلک کا آقا سمجھا جانے لگتا ہے۔ یہ ہماری فطرت کی ایک عام کمزوری ہے اور زمانۂ قدیم کے راجہ اکثر اس کا شکار ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر آپ راجہ دروپد کی نظیر ہی لیجئے جو تھوڑا ہی عرصہ پہلے پنچال کا تاج پہن چکا تھا۔ جب اس کے پاس اسکا جلاوطن دوست درونا سخت مصیبت کی حالت میں آکر کہنے لگا "اے راجہ میں تمہارا دوست یہاں آیا ہوں" تو راجہ دروپد کے غرور اور تمکنت پر سخت چوٹ لگی۔ درونا جیسے بیخانماں آوارہ گرد کے ساتھ اس قسم کی بے تکلفی برتنے پر وہ ہرگز آمادہ نہ تھا پس اس نے "غصہ سے بھویں چڑھا اور قہر آلود نگاہوں سے دیکھکر" یہ کہتے ہوے اسے نکلوا دیا کہ "ایک کنگلا دولتمند کا دوست نہیں ہوسکتا، نہ جاہل پنڈت کا دوست ہوسکتا ہے"

لیکن جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے متکبر اور مغرور حاکم یا راجہ کی آنکھ درحقیقت اس وقت کھلتی ہے جب کہ زمانہ کے انقلاب کے ہاتھوں اسے اپنی ننگی شخصیت لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا پڑتی ہے۔ جب کہ اس کے شاہی رتبے کا تمام اعزاز اور اسکے متعلق لوگوں کے دلوں میں جو مغالطہ ہوتا ہے دور ہوجاتا ہے اور ایک مغرور سے مغرور بادشاہ کو بھی کفِ افسوس مل مل کے کہنا پڑتا ہے :- "A horse! A horse! My Kingdom for a horse." (ایک گھوڑا! ایک گھوڑا! میں اپنی سلطنت ایک گھوڑے کے عوض دینے کو تیار ہوں[1]!) اس وقت انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حالت اس کوّے کے مانند تھی جس نے موروں کے

[1] یہ وہ فقرہ ہے جو انگلستان کے ایک بادشاہ نے میدان جنگ میں شکست یاب ہوکر فراری کی فکر کرتے ہوے کہا تھا۔

گرے ہوئے پر اپنی دُم میں لگائے تھے۔ راجہ وردوید جسکی آنکھیں حکومت کے عارضی جلال اور سطوت سے خیرہ ہو چکی تھیں ایک وقت بہت بُری طرح بیدار ہوا جب کہ گردشِ دوراں کے ہاتھوں وہ سخت پستی کی حالت میں لرزاں و ترساں ورونا کے روبرو لایا گیا لیکن آخر الذکر نے اس عظیم الشان فیاضی سے جس کا ثبوت جا بجا مہا بھارت میں ملتا ہے نہ صرف اسکی جاں بخشی کی بلکہ اسے مناسب نصیحت کر کے تاج و تخت پر بحال کر دیا۔ نیک راجہ سورتھ کو جس کی یاد میں بنگالی لوگ درگا پوجا کا تہوار مناتے ہیں جب سلطنت سے نکال دیا گیا تو اس وقت اسے اپنی شاہی سطوت کا فرضی مغالطہ نظر آیا اور اسے اس بات پر افسوس ہوا کہ کیوں میں اپنے آپ کو ایسی ادنیٰ باتوں سے بالاتر نہیں رکھ سکتا۔

اے رشیو! یہ کیا بات ہے کہ میں گو صداقت کو پہچانتا ہوں تاہم مجھے بھی سلطنت اور اس کے لوازم سے ویسی ہی محبت ہو جیسی ان لوگوں کو جو ان امور سے غافل ہیں۔ (چنڈی)

یہ نیک راجہ خدائی انصاف کا اوتار ہوتا ہے

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ حقیقی راجہ کے غیر شخصی اعزاز کی نسبت منوجی کا کیا خیال ہے۔ منورشی فرماتے ہیں:۔

جب دنیا میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی اور لوگ مارے خوف کے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے تو پرماتما نے انکی محافظت کے لئے راجہ کو پیدا کیا اور اس غرض کے لئے اس نے اندر۔ وایو۔ یم۔ سورج۔ اگنی۔ ورن۔ چندر۔ ما۔ ویسروں وغیرہ مختلف دیوتاؤں سے حصے لئے۔ اسکی رہنمائی کے لئے پرماتما نے پہلے دنڈ کو پیدا کیا جو شاہی عصا کا علامتی عدل۔ ضمیر سے پیدا شدہ صداقت کی روح جیسی خدائی آگ موجود ہو اور تمام چیزوں کا سہارا ہے اس دنڈ کے خوف سے تمام بے جان اور جاندار چیزیں باعث تفریح بن گئیں اور وہ کبھی اپنے خواص کو نہیں چھوڑتیں۔ راجہ کا فرض ہے کہ تمام بُرائی کرنے والوں کے خلاف ہر حالت میں موقعہ۔ مقام۔ طاقت اور علم کا خیال رکھتے ہوئے دنڈ کو کھڑا کرے۔ دنڈ ہی راجہ شخصیت رکھنے والا رہبر اور حاکم ہے اور وہی چاروں طبقات کے لوگوں (آشرموں) کے فرائض مقرر کرتا ہے۔ دنڈ تمام پیدا شدہ چیزوں پر حکومت کرتا اور انھیں محفوظ رکھتا ہے اور جب سب سو جاتے ہیں تو وہی جاگتا رہتا ہے۔ دانا لوگ دنڈ کو مجسم راست شعاری سمجھتے ہیں۔ جب دنڈ کو غور و احتیاط سے قائم رکھا جائے تو اس سے راجہ کی ساری رعایا نہال و خوش حال رہتی ہے لیکن اگر غور و پرداخت سے کام نہ لیا جائے تو یہ ہر طرف تباہی لاتا ہے۔ دنڈ ایک عظیم طاقت ہے جس سے کام لینا کم تربیت والے لوگوں کے واسطے مشکل ہے۔ اور اسے اگر فرض و استحقاق سے خارج کر دیا جائے تو وہ خود مقابلہ میں آ کر راجہ اور اسکے تمام دوستونکو تباہ کر ڈالتا ہے (منو۔ ۷۔ ۱۴ تا ۲۸)

یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دنڈ کو ایک عظیم طاقت قرار دیا گیا ہے جس سے کام لینا کم تربیت والی طبیعتوں کے لئے مشکل ہے۔ چنانچہ منورشی بڑے غور و خوض کے بعد راجہ کی تربیت کے لئے ایک طویل کورس مقرر کرتے ہیں جس میں زراعت کی تعلیم بھی داخل ہے۔ چنانچہ منوجی مہاراج فرماتے ہیں:۔

راجہ کو لازم ہے کہ وہ وید جاننے والوں سے تینوں ویدوں کا مطالعہ کرے۔ اور ان کے علاوہ قدیم مالی و اقتصادی علوم (دنڈ نیتی یا ارتھ شاستر) الہٰیات (Metaphysics) اور برہم ودیا (The Science of Self) پڑھے نیز ان کاموں میں مہارت

رکھنے والوں سے کھیتی باڑی۔ تجارت اور مویشی کی پرورش کے طریقے سیکھے۔

اس موقعہ پر شاہی لقب کا مبہم استعمال بھی قابل غور ہے جس کے لئے ایک جگہ راجہ اور دوسری جگہ نرپ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ الفاظ بلا امتیاز ایک جگہ خدائی ظہور یا دنڈ کے لئے جو راجاؤں کا راجہ ہے استعمال کئے گئے ہیں اور دوسری جگہ اس کے قائم مقام (locum-tenens) کے لئے جسے نرپ کہا جاتا ہے اور جس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ برائیوں پر اتر آئے تو دنڈ اسے تباہ کر دیتا ہے۔ اصطلاحات کی یہ گڑبڑ خیالات کی اس پریشانی کا باعث اور نتیجہ ہے جو کم سمجھ دار راجاؤں اور ان کی رعایا میں پائی جاتی ہے اور اسی سے وہ توہمات باطلہ پیدا ہوتے ہیں جنکی تائید منو کے اقوال سے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۵) قدیم ہندوؤں کا مسئلہ تھیوکریسی*

سطور بالا میں جسقدر حوالے دئے گئے ہیں انھیں پڑھنے کے بعد اس بارے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ منوجی خدائی اوتار کی حیثیت میں دنڈ یا انسانی کاروبار میں خدائی عدل اور بہبود کے اس غیر شخصی آدرش کی تعریف کرتے ہیں جس کی علامت شاہی عصا میں موجود ہوتی ہے اور جس کے اختیارات کا مرکز راجہ کا عہدہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ہمیشہ برقرار رہنے والا آدرش۔ خدا کا ظہور اور مدامی مقدار ہے جس کی نمائش عارضی طور پر قابل تبدیل اجزا کے نامتناہی سلسلہ یا کمزور فانی انسانوں کے تاجدار سروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو قدیم ہندو راجہ کو خدائی حکومت (Theocracy) کا نمونہ خیال کر سکتے ہیں۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ یہ قدیم یہودی طریقے کی نسبت زیادہ سمجھ دار ہے۔ گو کسیقدر زیادہ نظری (Metaphysical) ہے۔ وہ انسان جسے راجہ کہا جاتا ہے برقی تار کی مانند ہے جو انصاف اور طاقت (دنڈ) کی اس برقی رو کو جو خدا سے جسے تمام نیکی اور طاقت کا عظیم مورچہ سمجھنا چاہیئے خارج ہوتی ہے حقیقی صفت اس تار میں موجود نہیں بلکہ رو میں ہے۔ انسانی راجہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اسکا واسطہ تو براہ راست اس خدائی دنڈ سے ہے جس کا اوتار اس راجہ کی ذات میں موجود ہے۔ جوں ہی تار کا سلسلہ مورچہ کے ساتھ منقطع ہوجاتا ہے رَو بند ہوجاتی ہے اور تار کا نکما ٹکڑا باقی رہ جاتا ہے۔ جب راجہ برائیوں پر مائل ہوجاتا ہے تو خدائی روح (Spirit) یا دنڈ اسے چھوڑ دیتا ہے اور وہ ایک کمزور فانی انسان کی صورت میں رہ جاتا ہے حقیقی راجہ جس میں خدائی روح کا ظہور ہو کسی قسم کی برائی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ تو گویا دوسرے لفظوں میں یہی کہنا ہے کہ خدا کوئی برائی نہیں کر سکتا۔ قدرتی طور پر ادب اور تعظیم کرنے والے ہندو کا من اس خالی از تعظیم روکھی اور سیدھی سادی تشریح کو گوارا نہ کر سکتا تھا کہ بادشاہ اس لئے کوئی قصور نہیں کر سکتا کہ اس کے تمام افعال کے لئے اس کے مشیر و وزیر ذمہ دار ہیں۔ قدیم اہل ہنود کا خیال تھا کہ راجہ کبھی مرتا ہی نہیں چنانچہ رامائن کے اجودھیا کانڈ میں آیا ہے:-

> زندہ جسم میں جیسے بصارت موجود رہتی ہے ایسے ہی راجہ
> ہروقت اپنی رعایا میں صداقت اور راستی کے چشمے کی طرح
> موجود و مصروف رہتا ہے۔

* (Theocracy) (خدائی حکومت)

حقیقی بادشاہت ریاست سے ناقابل علیحدگی ہے اور اس کا کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہنا ضروری ہے کیونکہ جس طرح بغیر مرکز کے کوئی دائرہ نہیں ہو سکتا ایسے ہی اختیار یا بادشاہت کے مرکز کے بغیر ریاست کا وجود ناممکن ہے۔ اس جگہ یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بقول منو رشی قدیم ہندوؤں میں بادشاہت ایک مطلق العنان شخصی حکومت نہ ہوتی تھی بلکہ اس کے ساتھ مختلف اجزا ہوا کرتے تھے جو ہمیشہ ہم آہنگی سے کام کرتے تھے یعنی راجہ، اس کے منیر، شہری حاکم، دیہاتی حاکم (جیسے قدیم انگلستان میں Boroughs کی حکومت ہوا کرتی تھی) خزانہ، فوج اور راجہ کے دوست (جیسے قدیم انگلستان میں موجود تھے) اور ان میں سے ہر ایک رکن سلطنت اپنی خاص قابلیت کے اعتبار سے جس کام کا وہ اہل ہو دوسرے پر فوق رکھتا تھا (منو۔ ۹۔ ۲۹۴ تا ۲۹۷)

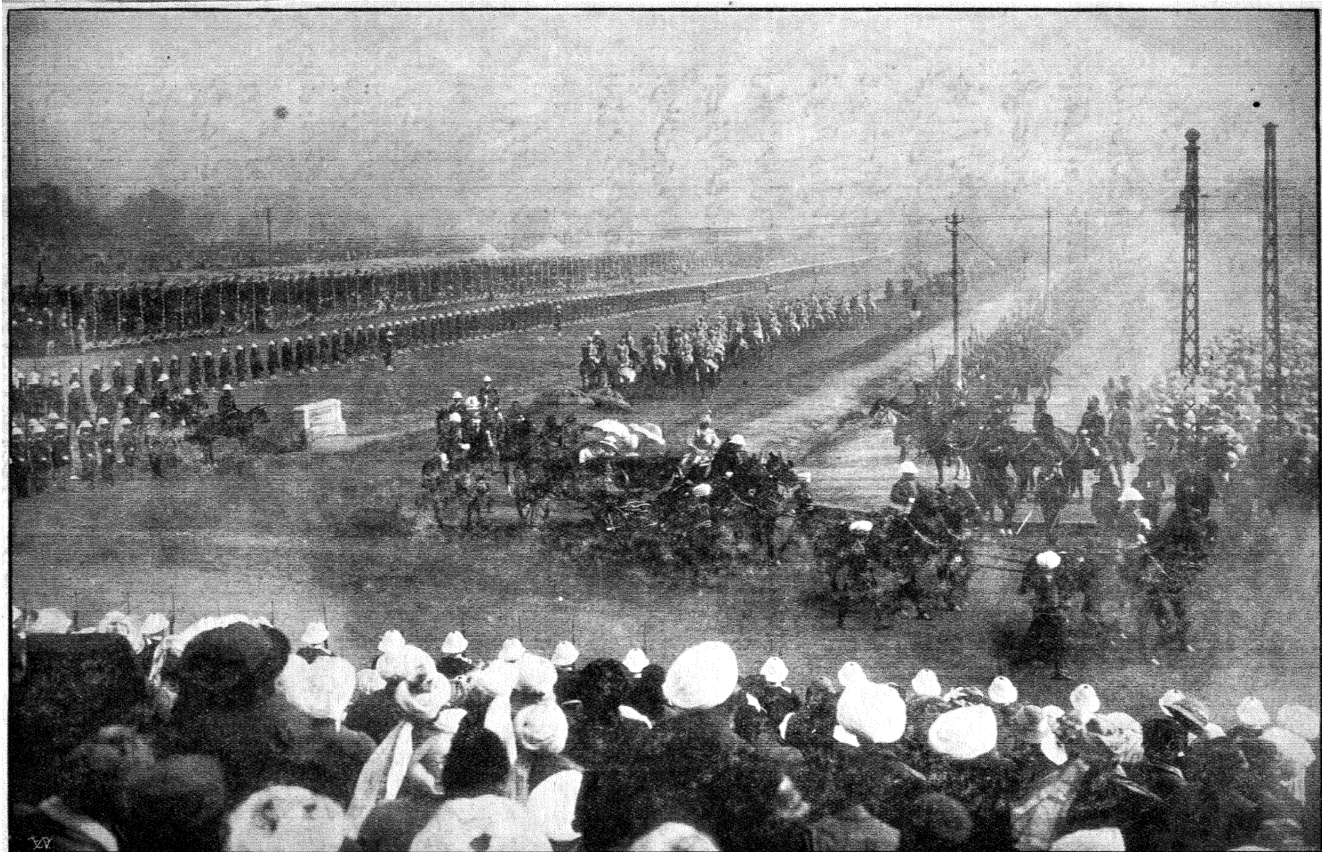
۶۔ ناانصاف یا جابر راجہ

چونکہ بھگوان منو کے خیال کے مطابق حقیقی راجہ انصاف اور صداقت کی خدائی روح کا منتخب کردہ ذریعہ ہوتا ہے اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح خدا اپنی اعلیٰ صفات کو زائل کئے بغیر برائی نہیں کر سکتا ایسے ہی راجہ اپنی شاہی کو ہاتھ سے دئے بغیر کسی برائی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہونا تو گویا لفظی تردید کے برابر ہوگا۔ جو راجہ کسی بدی کا مرتکب ہوتا ہے اسے محض بہ اعتبار شائستگی راجہ کہہ سکتے ہیں ورنہ حقیقت میں وہ راجہ نہیں جسطرح لکڑی کا گھوڑا حقیقی گھوڑا نہیں ہوتا لیکن اس مسئلہ کے معنی خواہ کچھ بھی ہوں راجہ بوجہ انسان ہونے کے اپنے اندر تمام انسانی کمزوریاں رکھتا ہے ہماری طرح بالکل ممکن ہے کہ راجہ بے خبری یا باخبری کے عالم میں کوئی غلطی کر بیٹھے۔ رعایا کے عام افراد کی طرح مہرشی منو تمام برائیوں کا ذمہ دار اس راجہ کو جس سے وہ سرزد ہوئی ہوں قرار دیتے ہیں اور اس خیال کو مد نظر رکھ کر انہوں نے راجہ کے لئے یہ سزا مقرر کی ہے کہ وہ ایک اسی جرم کے معمولی مجرم کی نسبت اپنے آپ پر ہزار گنا زیادہ جرمانہ کرے (منو۔ ۸۔ ۳۳۶) ایسے امور کو راجہ کی ذاتی کمزوری خیال کرنا چاہئے جو اگر زیادہ بڑھ جائے تو ممکن ہے باہمی تعلق کی وجہ سے ڈنڈ کے خدائی اعزاز یا راجہ کی حقیقی پدوی (رتبہ) کو ان برائیوں کی تاریکی میں چھپا دے۔ گو زمانۂ قدیم کے تیز فہم اور دور اندیش ہندوؤں میں سے ایک کو دوسرے سے نہ ملایا کرتے تھے۔

راجہ کے اپنی مرضی سے یا بلا مرضی اتفاقیہ طور پر کسی برائی کے مرتکب ہونے پر تو اس بات کو کافی خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھاری جرمانہ کی سزا دے لیکن سوال یہ ہے کہ جب کوئی راجہ فطرتاً یا عادتاً بیحد جابر یا ناانصاف ہو تو اس سے کیا سلوک کیا جائے؟

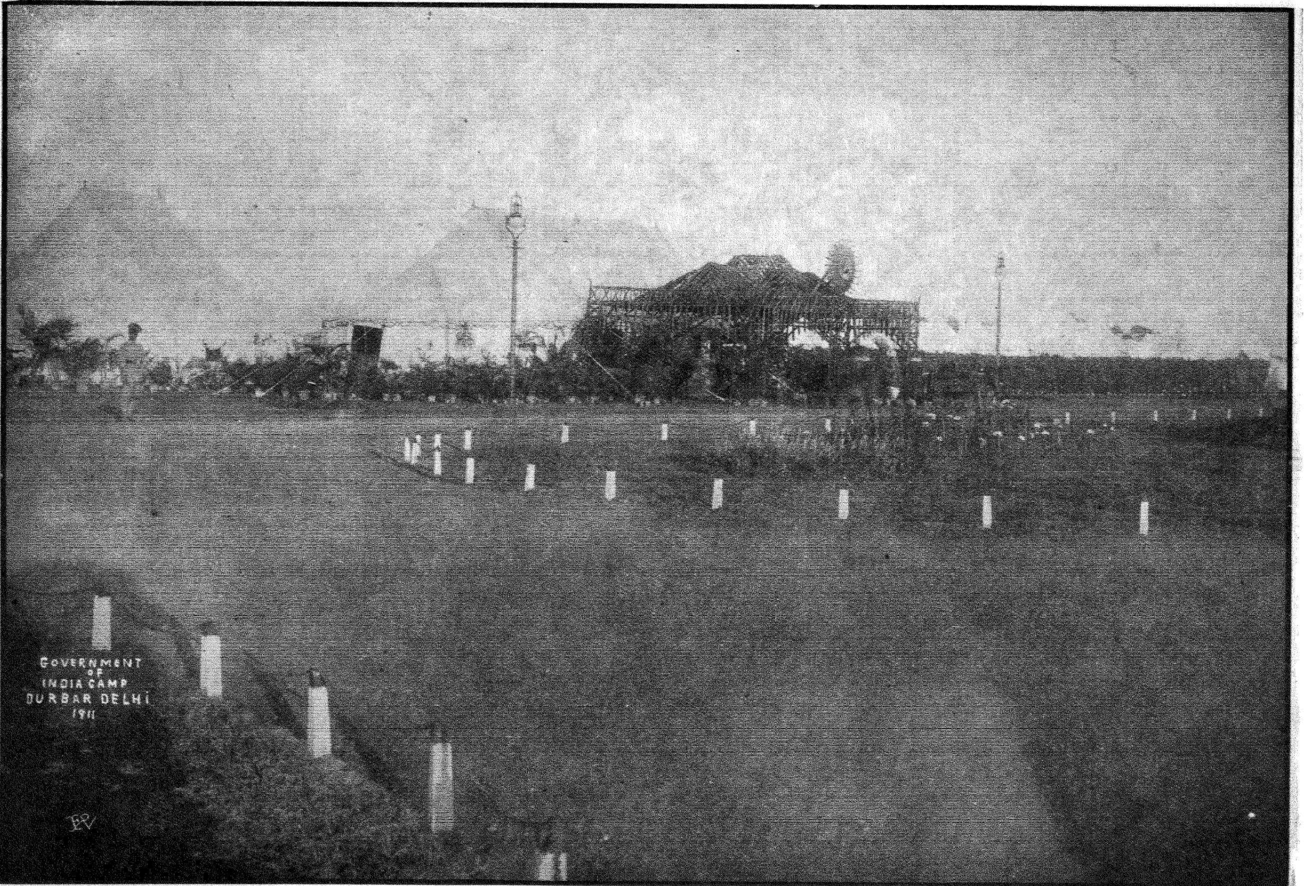
زیادہ مہذب یورپین ممالک میں ایسے بادشاہوں سے جو سلوک ہوتا تھا اسکی واضح مثالیں تاریخ میں چارلس اول یا لوئس شانزدہم کا حیرت ناک انجام دیکھنے سے مل سکتی ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان کے جابر اور مکار راجاؤں کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک خود منو نے روا رکھا ہے۔ ان کی نسبت لکھا ہے کہ ان کی بادشاہت چھن جانی چاہئے اور انہیں مع ان کے معاونوں کے جان سے مار دینا چاہئے چنانچہ بھگوان منو لکھتے ہیں:۔

جو ناعاقبت اندیش راجہ اپنی بیوقوفی یا لاپروائی سے رعایا پر جبر کرے اسکی بادشاہی چھین لینی چاہئے اور اسے مع اسکے



علیا حضرت ملکۂ معظمہ میری دام اقبالہا کی سواری کا نظارہ
(شاہی جلوس — ۷ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع)

Indian Press, Allahabad.



گورنمنٹ آف انڈیا کا کیمپ (دربار دہلی)

Indian Press, Allahabad.

دوستوں کے مار دینا چاہئے۔ (منو۔ ۷۔ ۱۱۱)

اپنے اس بیان کی تائید میں انہوں نے بعض قدیم ہندو راجاؤں مثلاً وِنیا۔ نہش۔ سوداس۔ سمکھ اور نمی کی مثالیں پیش کی ہیں اور لکھا ہے کہ ”انہیں ان کی گردن کشی کے باعث مار دیا گیا تھا“ (منو ۷۔ ۴۱)

لیکن یہ امر قابلِ تاسف ہے کہ جو قصور ان راجاؤں پر عاید کئے گئے وہ رعایا کے خلاف نہ تھے بلکہ زیادہ تر برہمنوں کے خلاف تھے یعنی اس فرقے کے خلاف جس سے خود منوجی تعلق رکھتے تھے۔ ہمارے نقطۂ خیال سے ان میں سے اکثر بالکل کسی قصور یا جرم کی حد تک نہیں پہنچے اور نہ انکا پبلک سے کسی قسم کا تعلق ہے۔ بشرطیکہ اُس زمانہ میں پبلک سے وہی مراد لی جاتی ہو جو آجکل لی جاتی ہے۔ بہر نوع تاریخ بتاتی ہے کہ جس طرح انگلستان نے اپنے چارلس اول یا جیمز ثانی کو ٹھکانے لگانے میں دریغ نہیں کیا ایسے ہی قدیم ہندو بھی وِنیا[1] یا نہش[2] ایسے راجاؤں سے سختی کا سلوک کرنے میں پس و پیش نہ کرتے تھے۔ لیکن انگلستان اور ہندوستان کی امثلہ میں اختلاف ضرور ہے انگلینڈ کی مثالیں تو تاریخی ہیں لیکن ہندوستان کی قدیم روایات پر مبنی ہیں۔

ہندوؤں نے اپنے جابر راجاؤں کی نسبت بیان کیا ہے کہ وِنڈ یا خدائی انصاف نے زمانۂ قدیم کے کسی رشی (جسکا وجود تک مشتبہ ہے) کی بد دعا کی صورت اختیار کر کے ان لِجاڑوں کو ان کے افعالِ بد کی سزا دی چنانچہ انگیر کی بد دعا سے راجہ وِنیا جل گیا۔ اگستیہ کی بد دعا سے نہش نے اژدہا کی صورت اختیار کر لی اور بششٹ کی بد دعا سے سوداس[3] آدم خور بن گیا اور نمی[4] کی بھی بہت بری حالت ہوئی۔

۲۔ قدیم ہندوستان میں عام رائے کی اہمیت

لیکن خیالی اور اصولی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم رامائن اور مہابھارت سے بعض مثالیں پیش کر کے اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قدیم بھارت ورش میں راجہ اور رعایا کے باہمی تعلقات کس قسم کے تھے۔ راجہ دسرتھ کی وفات پر ان کا جانشین منتخب کرنے کے لئے جو طریق برتا گیا اسکی کیفیت رامائن میں قلمبند ہے جس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ عملی طور پر زمانۂ قدیم کے ہندو راجہ کو ایک غیر ذمہ دار مطلق العنان فرمانروا نہ سمجھتے تھے جسکی مرضی بمنزلۂ قانون

---

[1] وِنیا کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے شادی کے مقدس رشتہ کو توڑ ڈالا تھا [2] نہش کا قصّہ یہ ہے کہ اس نے اگستیہ رشی سے اپنی پالکی اٹھوائی اور اُسے ٹھڈا (ٹھوکر) لگایا تھا اس پر اس رشی کی بد دعا سے وہ ایک بہت بڑا اژدہا بن گیا [3] راجہ سوداس مہاراجہ رام چندر جی کے آبا و اجداد میں سے تھا اس کے بیٹے سوداس کا ذکر کرتے ہوئے منوجی نے لکھا ہے کہ بچپن میں اسے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک روز دوران شکار میں اسے شیروں کے روپ میں دو راکشش نظر آئے جن میں سے ایک کو اس نے شکار کر لیا۔ دوسرے نے بہت سے روپ بدلکر آخر کار راجہ کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ رشی بششٹ کو جب وہ اسومیدہ جگ کی رسوم پوری کروا چکے تو انسانی گوشت کھانے کو پیش کیا جائے بششٹ جی کو یہ بات معلوم ہوگئی اور انہوں نے راجہ کو سراپ دیا جو کلماس پد یا کالے پاؤں والے کے نام سے آدم خور بن گیا۔ جب بششٹ جی کو معلوم ہوا کہ راجہ کو دھوکا دیا گیا تھا تو انہوں نے اسکو تسلّی دی اور بارہ سال کے بعد اسے تخت دوبارہ مل گیا [4] نمی راجہ اکشواکو کا بارھواں بیٹا تھا اس نے ایک یگیہ کے موقعہ پر بششٹ جی کو اپنا پروہت مقرر کیا بششٹ جی راجہ کو انتظار کرنے کے لئے کہکر چلے گئے مگر آخر الذکر نے بغیر انتظار کئے رسوم ادا کروا دیں اس پر بششٹ جی نے اسے سراپ دیا جس سے راجہ کا سوکھشم شریر اسکے جسم کو چھوڑ گیا۔ بہت مدت تک آوارہ پھرنے کے بعد آخر کار اسے تمام حیوانات کے پپوٹوں میں جگہ مل گئی۔

ہو۔ بلکہ اسے لوگوں کا منتخب کردہ حکمراں خیال کیا جاتا تھا وہ ایک مقررہ دستور کی چاردیواری میں محصور تھا تمام اہم معاملات میں رعایا کے لیڈروں کی ایک کونسل کے مشورہ پر چلتا تھا اور انہی کی موجودگی میں تمام ایسے کام سرانجام دیتا تھا اور اسکے فیصلے رعایا کے قوانین اور رواج کے مطابق ہوتے تھے۔ جب رامائن کا وہ اہم واقعہ جس پر اس تمام قصہ کا دارومدار ہے ظہور پذیر ہو رہا تھا یعنی رام چندرجی کو جلاوطنی کا حکم مل چکا تھا وہ خود چھال کا لباس پہن چکے تھے اور مہارانی سیتا کو اُسی قسم کی پوشاک پہنا رہے تھے تو مہرشی بششٹ پر اس رقت انگیز نظارے کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے کیکئی سے مخاطب ہو کر کہا

اے بدعورت۔ اے تو جو نسل کو تباہ کرنے والی ہو جس نے راجہ کو فریب دیا ہے اور اب سمجھ کی باتوں پر کان بند کئے بیٹھی ہے۔ اے بے شرم عورت۔ سیتابن کو نہیں جائے گی۔ وہ اس تخت پر بیٹھے گی جس پر رام چندرجی کا حق ہے۔ اور اپنے شوہر کی غیرحاضری میں راج کرے گی۔ بیوی اپنے شوہر کا بالکل عکس ہوتی ہے اور اس حیثیت سے سیتا چونکہ رام چندرجی کا عکس ہے وہ دنیا پر حکومت کرے گی۔ اگر سیتا یہ فیصلہ کرتی ہے کہ میں رام کے ساتھ بنوں کو جاؤں گی تو ہم سب ان کے ساتھ جاتے ہیں سارا شہر ان کے ہمراہ چلنے کو تیار ہے۔

اگر سیتا جی کے خیالات ایسے اعلیٰ وارفع نہ ہوتے یا یہ مثل کہ "کس عورت کا دل سونے سے نفرت کر سکتا ہے؟ اور کونسی بلّی مچھلیوں کو ناپسند کرتی ہے؟" قدیم ہندوستان کی عورتوں پر صادق آتی اور سیتا جی بششٹ کا کہنا مان لیتیں تو ہندوستان میں حکمراں عورت کی سب سے پہلی مثالوں میں سے ایک ضرور قائم ہو جاتی اور ابتدائے تاریخ سے بہت مدت پہلے ایک ہندو ملکہ راج کر چکتی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو غالباً والمیک بیچارے کو اپنے قصہ کے لئے کوئی اور پلاٹ تلاش کرنا پڑتا لیکن واقعات نے یہ صورت اختیار کی کہ سیتا جی چونکہ اپنے شوہر کے ساتھ جانیکا ارادہ کر چکی تھیں۔ انہوں نے اپنے ارادے سے پھر جانا پسند نہ کیا۔ دنیا کے تین شریف ترین انسان۔ رام لکشمن اور سیتا بن باس کو روانہ ہوئے اور لوگوں نے راجہ دسرتھ کے لئے نعرہائے شرم بلند کرنے شروع کئے۔ جب وہ دریائے گنگا کو عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچے تو کہن سال سومنتر ایک جگر دوز خبر لیکر پہنچا نصف شب کے قریب راجہ دسرتھ کا انتقال ہو چکا تھا۔

اتفاق سے بھرت جسے رام چندرجی کے بعد تخت نشیں ہونا تھا مع اپنے چھوٹے بھائی سترگھن کے کیس گیا ہوا تھا اس امر کا اندیشہ تھا کہ تختِ سلطنت خالی رہ جائے گا۔ اس پر جو کارروائی کی گئی اس سے نہ صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے موقعوں پر کیا طریق عمل برتا جاتا تھا بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں راجہ کے انتخاب کے متعلق لوگوں کو کیا اختیارات حاصل تھے۔ راجہ کے مرنے سے ایک دن بعد تک لوگ سوگ میں رہے لیکن وہ "کام کو کام" سمجھتے تھے اور خیالات فرض کے آگے کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ اگلے روز علی الصبح دوجاتی (برہمن کشتری اور ویش) بادشاہ گر مجلس کے ہال میں جمع ہوئے۔

دوجاتی لوگوں میں رشی مارکنڈے۔ مودگلی۔ بامدیو کشیپ۔ کاتیاین۔ گوتم اور جوالی کے علاوہ وزرائے سلطنت شریک تھے۔ ان سب نے مباحثہ میں حصہ لیا اور ہر ایک نے اپنی اپنی رائے پیش کی۔ اس موقعہ پر بششٹ جی جو خاندان شاہی کے بڑے پروہت تھے پریزیڈنٹ (پریسیڈنٹ) بنے اور ہر ایک نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:۔

مہاراج چونکہ اپنے بیٹے کے غم میں دل شکستہ ہوکر مرچکے ہیں ہمنے تمام رات سوگ میں بسر کی ہے اور یہ رات ہمیں ایک صدی کے برابر لمبی محسوس ہوئی ہے۔ اب جب کہ مہاراج سورگ لوک کو پدھارے۔ رام بنوں کو چلے گئے بہادر لکشمن اُن کے ہمراہ ہیں۔ بھرت اور سترگھن دونوں راجگرہ واقع کیکیا میں گئے ہوے ہیں۔ لازم ہے کہ نسل اکشوا کو کے کسی اور رکن کو آج ہی تخت نشین کردیا جاسے کیونکہ راجہ کی عدم موجودگی ہمارے لئے تباہی کا باعث ثابت ہوگی۔

انہوں نے یہاں تک کیا کہ بشسٹ جی کو جن پر انھیں پورا اعتبار تھا اس بات کا اختیار دیا کہ" اکشوا کو یا کسی اور کی نسل کے جس شخص کو آپ چاہیں راجہ مقرر کردیں۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جب راجہ نہو تو مچھلیوں کی طرح لوگ بھی ایک دوسرے کو نگل جاتے ہیں"۔ لیکن بشسٹ جی نے اس مشکل کو اسطرح رفع کیا کہ دوستوں وزیروں۔ عام پبلک اور بڑے بڑے برہمنوں کی اس جماعت سے درخواست کی کہ گھوڑوں پر سوار کرکے قاصدوں کو فوراً بھرت کے پاس بھیجا جائے جو اسے اور اس کے بھائی کو ساتھ لے آئیں۔ ساتھ ہی کسی اور تجویز کے متعلق اپنی ناقابلیت ظاہر کی کیونکہ سرگباش راجہ تخت کو بھرت کے سپرد کرگیا تھا۔ بشسٹ جی کی اس تجویز کو جملہ حاضرین نے پسند کیا اور کہا" بہت اچھا قاصدوں کو روانہ کردو"۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قومی سبھا یا قدیم ہندوستان کی فوک موٹ (Folk-Moot) کے بشسٹ جی کی تجویز منظور کرلینے سے وہ مشکل رفع ہوگئی جو بہت بڑی حد تک اس حالت سے مشابہ تھی جس کے باعث ولیم آف آرینج (William of Orange) ولیم سوم کا لقب اختیار کرکے انگلستان میں خاندان اسٹوارٹ (Stuarts) کے تخت پر قابض ہوا۔

سطور بالا میں یہ امر ثابت کیا گیا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ابتداے تاریخ سے پہلے لوگوں کی ایک سبھا (Assembly) ہوا کرتی تھی جسکا فرض اہم سرکاری معاملات کو طے کرنا ہوا کرتا تھا۔ اور اس سبھا میں معاونان سلطنت، وزرا، عوام کے نمائندے، اور ۸ یا ۹ بڑے بڑے برہمن شریک ہوتے تھے۔

بڑے بڑے برہمنوں کی کونسل جو مباحثات میں حصہ لیتی تھی Witenagemot سے مشابہ ہوتی تھی اور یہ ساری سبھا قدیم انگلستان کی Folk-Moot سے ملتی جلتی تھی۔ راجہ کے انتخاب کے معاملہ میں ہرچند کہ اکشوا کو کی نسل کو ترجیح دی گئی تھی تاہم لوگوں کا انتخاب صرف وہیں تک محدود نہ تھا۔

بشسٹ جی نے سبھا کے روبرو اپیل کی اور آخری کارروائی کرنے سے پہلے اسے اسکی منظوری لینی ضروری تھی۔

اس موقعہ پر ہم ایک اور اسی قسم کی اگر اس سے کم سنسنی خیز واقعہ کی مثال کشکندہ سے پیش کرتے ہیں جو راجہ بالی کی غیر متوقع اور طویل غیر حاضری میں پیش آیا تھا اور جب کہ لوگوں نے اس کے بھائی سگریو کو راجہ بنا لیا تھا۔ بالی کی واپسی پر سگریو اسے اپنی معذرت کے دوران میں کہتا ہے:۔

ہرچند کہ مجھے اس بات کی خواہش نہ تھی تاہم لوگوں اور وزیروں نے اپنے غم میں میری طرف دیکھا اور مجھے راجہ بنادیا پس آپ مجھے معاف کردیں۔ (کشکندہ ادھیاے ۱۰۔ شلوک ۲)

آگے چلکر وہ پھر کہتا ہے:۔

میری واپسی پر لوگوں اور وزیروں نے مجھے مجبور کیا کہ میں راجہ بننا منظور کروں کیونکہ خالی سلطنت جنبیوں کی فتوحات کا شکار ہوجاتی ہے

اب ہم مہابھارت کا مطالعہ کریں جو رامائن کی طرح قدیم

ہندوستان کی ایک مشہور و معروف رزمیہ نظم ہے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تمام اہم سرکاری معاملات میں اعلیٰ اختیارات رعایا کے ہاتھوں میں تھے جو اپنے فرماں رواؤں کو منتخب کر سکتے تھے۔ راجہ پانڈو کے انتقال پر ہستناپور کے تخت کے متعلق جو کشمکش پیدا ہوئی وہی اس سارے قصّہ کی بنیاد ہے۔ بد باطن دریودھن نے پانڈووں کو زندہ جلا دینے کی جو تجویز سوچی تھی اس پر اگر آپ پورے طور پر غور کریں تو یہی معلوم ہوگا کہ اسے اندیشہ محض اسی بات کا تھا کہ لوگ میرے بجائے یدھشٹر کو راجہ منتخب کرلیں گے چنانچہ مہابھارت میں مذکور ہے:۔

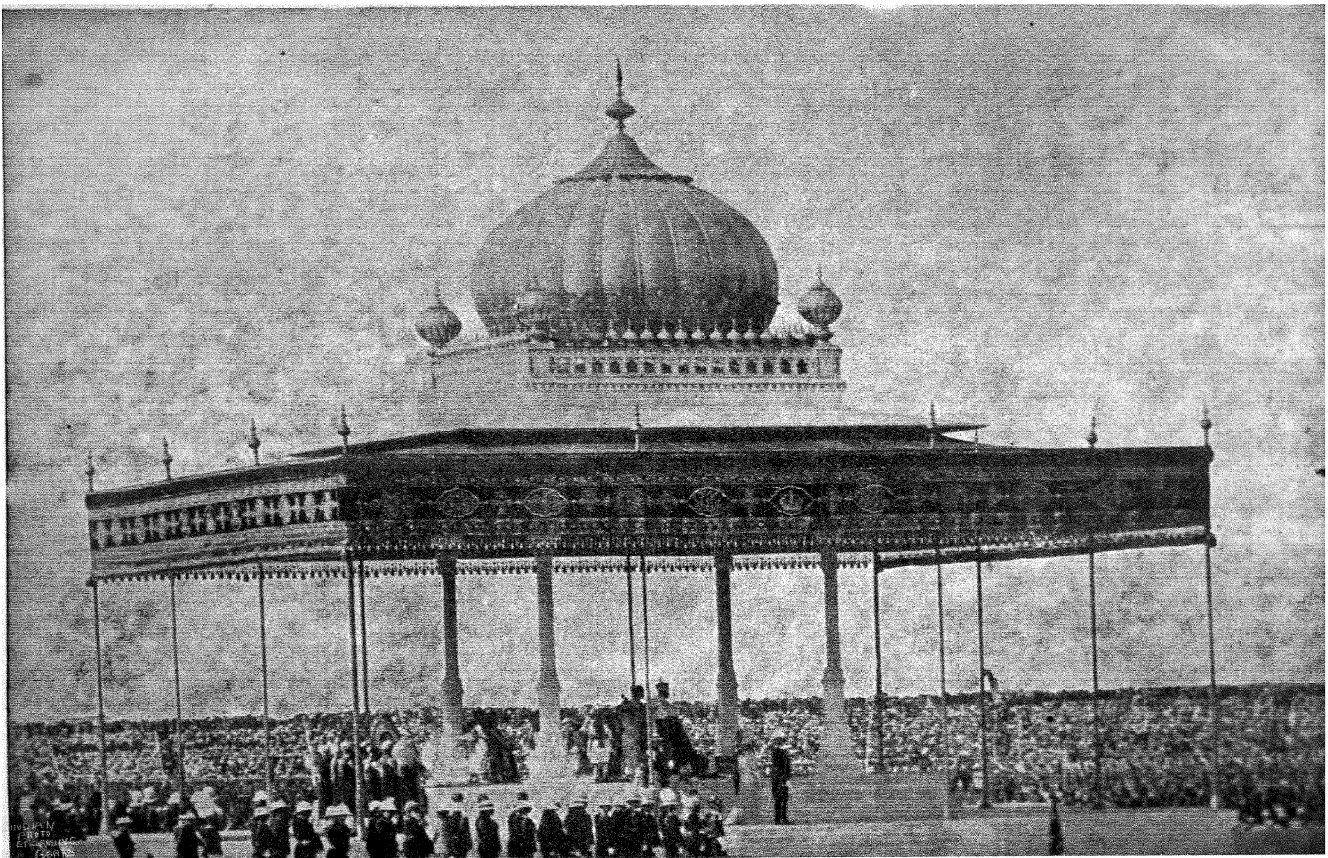
تب لوگ پانڈو پتروں کے اعلیٰ صفات سے باخبر ہو کر اپنی مجالس میں ان کا ذکر کرنے لگے۔ اپنے گھروں اور سبھاؤں میں وہ پانڈو کے سب سے بڑے بیٹے کے متعلق جو وہاں آچکا تھا تخت نشینی کا تذکرہ کرنے لگے۔ انہوں نے سوچا کہ جب اندھے اور ذہنی آنکھیں رکھنے والے دھرتراشٹر کو پہلے تخت نہیں ملسکا تو اب کیونکر مل سکتا ہے؟ شانتنو کے صداقت پسند اور ارفع خیال بیٹے بھیشم نے جب پہلے تخت نشینی سے انکار کردیا تھا، تو اب بھی کردیگا۔ اب ہم پانڈو کے سب سے بڑے بیٹے کو راجگدی پر بٹھائیں گے جو ہرچند کہ عمر میں چھوٹا ہے تاہم دانا اور رحمدل ہے۔ وہ اپنے فرض کو سمجھے گا۔ اور شانتنو کے بیٹے بھیشم اور دھرتراشٹر اور اسکے بیٹوں کے لئے ہر قسم کا آرام مہیا کرے گا اور ان کا اعزاز برقرار رکھے گا جب بدباطن دریودھن نے لوگوں کو اس طرح باتیں کرتے سنا اور معلوم کیا کہ وہ یدھشٹر کے حامی ہیں تو وہ غم میں گھلنے لگا“

(شلوک ۴ تا ۱۰ ادھیائے ۱۵۲ آدسمبھو)

دریودھن نے اپنے دشمن کے منصوبے خاک میں ملانے اور اسے راستے سے ہٹانے کے لئے کنک سے صلاح مشورہ کیا اور خفیہ طور پر پانڈووں کو مع ان کی ماں کے زندہ جلا دینے کی سازش کی اور اس مدعا کی تکمیل کے لئے شیطان سیرت پروچن کو تیار کیا۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جسطرح قدیم انگلستان میں فوک موٹ (Folk-Moot) ہوتی تھی، اسی طرح قدیم ہندوستان میں بھی سبھا مقرر تھی جو اہم سرکاری معاملات طے کیا کرتی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ دونوں ملکوں میں رعایا کے حسب دلخواہ طریق حکومت کی ابتدا ان کے مشترکہ آریہ اسلاف سے ہوئی ہوگی۔ انگلستان میں نارمن فتوحات نے ملکی انتظام کو ایسا درہم برہم کردیا کہ انگریزوں کو کئی صدیوں تک مسلسل جد وجہد کے بعد اپنی اصلی سیاسی ترقی حاصل ہوسکی اور وہ اپنے طریق حکومت کو درجۂ تکمیل پر پہنچا سکے۔ لیکن ہندوستان پر نارمن فتوحات سے بھی بدتر انقلابات آئے جن کی بدولت یہاں کا سارا انتظام درہم برہم ہوگیا۔ انگلستان کی مثال ہمارے لئے رہبری کی روشنی کا درجہ رکھتی ہے اور اس امر کی ضمانت ہے کہ اگر ہم اپنے فرض کو ایمانداری سے سرانجام دیتے جائیں تو ہندوستان پھر ملک معظم جارج پنجم کے سایہ ہما پایہ میں وہی ترقی حاصل کرسکے گا جو اس سے بدرجہا زیادہ ہوگی جو اسے کسی زمانہ میں حاصل تھی۔

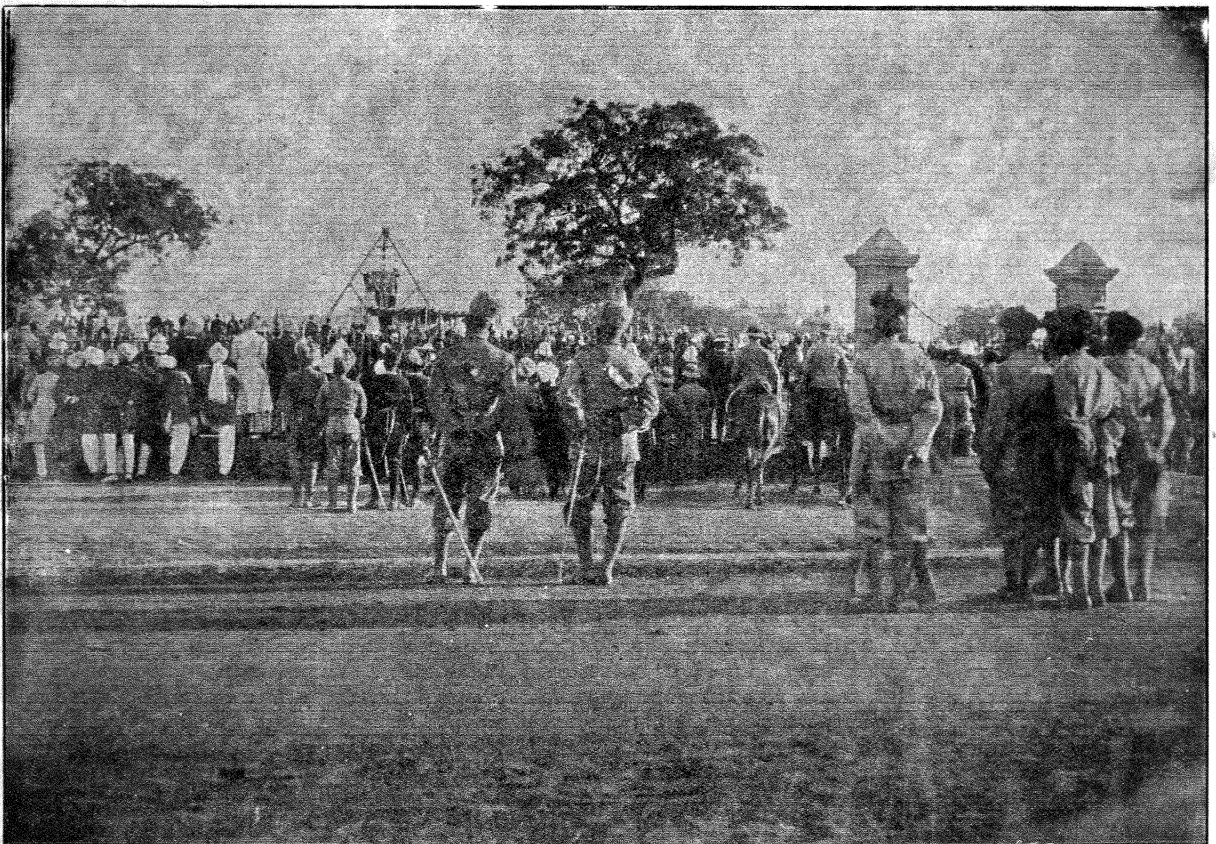
تیرتھ رام



اعلان شاہی کا پڑھا جانا

(۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع)

Indian Press, Allahabad.



مراسم سنگ بنیاد

جدید پایۂ تخت دہلی کے سنگ بنیاد رکھنے کی رسم جو بادشاہ سلامت نے ۱۵ دسمبر ۱۹۱۱ع کو ادا فرمائی

Indian Press, Allahabad.

دہلی

دہلی کا پُرانا نام ہستناپور ہے۔ مگر اس شہر کا صحیح صحیح پتہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس جگہ واقع تھا۔ پُرانے ہستناپور سے کچھ فاصلہ پر ایک شہر اندرپرست تھا جس کو شروع شروع میں مہاراجہ یدھشٹر نے اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ تیس پشت تک مہاراجہ یدھشٹر کے خاندان کی حکومت وہاں رہی۔ اُنکے بعد پانچسو برس تک دوسرے خاندان کے راجوں نے حکومت کی بعد ازاں خاندانِ گوتم کا عمل دخل ہوا، اور اس کے پندرہ راجہ وہاں حکمراں رہے۔ گوتم کے بعد میوروں نے اپنا تسلط جمایا۔ میور خاندان کا آخری راجہ پال تھا۔ راجہ پال کو اجین کے مہاراجہ بکرماجیت نے شکست دی۔ اُنہیں ایّام میں راجہ دلیپ نے ایک نیا شہر آباد کیا جسکا نام دہلی پڑا۔ قریباً آٹھ سو برس تک دہلی ویران پڑی رہی، اور اس کے بعد وہاں تومر خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ اُن سے چوہانوں نے سلطنت چھینی۔ چوہانوں میں بسالدیو وہ شخص تھا جس نے خاندانِ تومر کو وہاں سے نکال دیا۔ بسالدیو کا نام مینار فیروز شاہ میں کندہ ہے۔ "پُرانی دہلی" مہاراجہ پرتھی راج کے ویران قلعہ کے پاس ہی کہیں تھی۔ آہنی ستون جو وہاں باقی رہ گیا ہے، وہ اہلِ ہنود کے پُرانے شہر کی ایک یادگار ہے

دہلی کے اردگرد بہت ویران عمارتیں نظر آتی ہیں جنکا رقبہ کم و بیش ۴۵ میل مربع ہے۔ یہاں پر سات شہر آباد تھے جنکو مختلف فرمانرواؤں نے آباد کیا تھا۔ دہلی کی ویران عمارتیں اور اُن کی یادگاریں ان سات شہروں کی شہادت دے رہی ہیں۔ ان سات شہروں میں سے ایک شہر کا نام لال کوٹ تھا، جس کو راجہ اننگ پال نے آباد کیا تھا۔ دوسرا شہر وہی جہاں پرتھی راج کا ویران قلعہ اسوقت تک موجود ہے۔ اُسے پرتھی راج نے ۱۱۸۰ء میں آباد کیا تھا۔ باقی پانچ شہروں میں سے ایک شہر کہیں سیری کے پاس تھا جسکو ۱۳۰۴ء میں علاؤالدین نے آباد کیا تھا۔ دوسرا تغلق آباد ہے جس کو ۱۳۲۱ء میں تغلق شاہ نے آباد کیا تھا۔ تیسرا عادل آباد ہے جس کو ۱۳۲۵ء میں محمد تغلق نے آباد کیا۔ محمد تغلق نے اور بھی دو شہر آباد کئے تھے۔ غرض یہ کہ کئی بار شہر پر شہر آباد ہوئے اور برباد ہوگئے۔

یہ کثیرالاضلاع رقبہ اگرچہ مختلف زمانوں میں آباد ہوا ہے مگر اسکی آبادی مسلسل تھی۔ آٹھویں صدی ہجری کا مشہور سیّاح ابن بطوطہ جو سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی آیا تھا، اس شہر کی نسبت اپنے سفرنامہ میں یوں لکھتا ہے:۔

> یہ ایک عظیم الشان شہر ہے، اور اسکی عمارت میں خوبصورتی ومضبوطی دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اسکی فصیل ایسی مضبوط ہے کہ دُنیا بھر میں اسکی نظیر نہیں۔ مشرق کا کوئی اسلامی یا غیر اسلامی شہر اسکی عظمت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ بڑا فراخ اور تمام آباد ہے۔ یہ اصل میں چار شہر ہیں جو ایک دوسرے کے متصل واقع ہیں (۱) دہلی جو ہندوؤں کے وقت کا پُرانا شہر ہے اور ۵۸۴ھ میں فتح ہوا تھا۔ (۲) شہر سیری جسکو دارالخلافہ بھی کہتے ہیں (۳) تغلق آباد (۴) جہاں پناہ جسمیں سلطان محمد تغلق شاہ حال رہتے ہیں۔

سفر نامہ ابن بطوطہ کو خان صاحب مولوی محمد حسین ایم اے نے دو جلدوں میں ترجمہ کیا ہے۔ دہلی کے ذکر میں آپنے مسالک الابصار کے مصنّف کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ یہ شخص دمشق کا رہنے والا اور ابن بطوطہ کا ہمعصر تھا۔ اس روایت سے بھی دہلی کی مسلسل آبادی اور عظمت وشان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

دہلی کا شہر کئی شہروں کو ملاکر بنایا گیا ہے۔ ان شہروں کے نام علیحدہ علیحدہ بھی ہیں، لیکن سب کو ملاکر دہلی کہتے ہیں۔ شہر کا محیط چالیس بیتالیس میل ہے۔ اس کے تین طرف بارہ بارہ ہزار قدم تک باغات ہیں اور مغرب کی طرف پہاڑی ہے۔ ایک ہزار مدرسے اور دو ہزار چھوٹی چھوٹی مسجدیں اور ستّر دارالشفا ہیں۔

سنہ ۱۶۱۱ء میں فنچ صاحب آگرہ سے دہلی گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے اُس وقت "پُرانی دہلی" کے بقیہ حصّہ کو دیکھا تھا۔ اُن شکستہ مکانات اور قلعوں کو وہاں کے لوگ "سات قلعہ اور باون پھاٹک" کے نام سے نامزد کرتے ہیں"۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ مہاراجہ یدھشٹر کا اندرپرست کہیں اسی مقام پر واقع ہوگا جس کو پُرانا قلعہ کہتے ہیں۔

سنہ ۱۱۹۱ء میں، جب کہ وہاں مسلمانوں کا تسلّط ہوا، تو انہوں نے پُرانے شہر کو ویران کردیا۔ بہت کم اس کے نشانات اب پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی حکومت میں دہلی میں سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی وہ قطب مینار ہے جسکو قطب الدین ایبک نے بنوایا تھا۔ اس کے بعد علاء الدین نے قصرِ ہزار ستوں تعمیر کرایا جس کے کچھ نشانات شاہپور کے پُرانے قلعہ میں اب تک پائے جاتے ہیں۔ بعد ازاں غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد میں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اُسکے لڑکے محمد نے بھی عادل آباد نامی ایک مضبوط قلعہ بنایا۔ فیروز تغلق نے سنہ ۱۳۵۱ء سے سنہ ۱۳۸۸ء کے درمیان بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ایک نہر بھی اس نے جمنا سے نکالی اور اپنے جدید دارالامارت فیروز آباد تک لے گیا۔ یہ نہر اب تک جاری ہے۔ اسی فیروز تغلق نے فیروز آباد کو آباد کیا اور کشک فیروز آباد، کشک شکار نامی دو محل بھی تعمیر کرائے۔ سنہ ۱۵۳۳ء میں ہمایوں نے اندرپرست (پُرانے قلعہ) کی مرمت کرائی اور اسے دین پناہ کے نام سے نامزد کیا۔ سنہ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ نے اس کا نام شیر گڑھ رکھا۔ اسی شیر شاہ نے قلعہ کہنہ مسجد کے نام سے ایک مسجد اور شیر محل نامی ایک محل تعمیر کرایا۔ سنہ ۱۵۴۶ء میں شیر شاہ کے لڑکے سلیم شاہ نے قلعہ "سلیم گڑھ" بنوایا۔

جو دہلی آج ہماری نظروں کے سامنے ہے، اور جس کا دوسرا نام شاہجہاں آباد بھی ہے، اس کو سنہ ۱۶۳۸ء میں شاہجہاں نے آباد کیا تھا۔ وہاں کا مشہور قلعہ اور مشہور شاہی محل جو اسی قلعہ کے اندر واقع ہیں سنہ ۱۶۳۸ء اور سنہ ۱۶۴۸ء کے درمیان میں تیار ہوئے۔ شہر کی چہار دیواری اور جامع مسجد اس کے کچھ عرصہ بعد تعمیر ہوئیں۔ جب شاہجہاں کو اورنگ زیب نے قید کیا تھا، اس سے پیشتر چھ سال تک وہ اپنے تعمیر کردہ محل ہی میں رہا تھا۔ اس کے بعد قریباً بیس برس تک اورنگ زیب اسی میں رہا۔ بعدہٗ سنہ ۱۶۸۰ء میں جنوب کی طرف ایک مہم پر روانہ ہوا۔ شاہجہاں کے بعد کوئی عمارت دہلی میں تعمیر نہیں ہوئی۔

سنہ ۱۷۳۹ء میں شاہِ فارس (نادر شاہ) نے دہلی پر یورش کی اور ۱۲ مارچ کو دوپہر تک کشت وخون جاری رہا۔ گلی کوچہ میں خون کے دریا بہ گئے، اور شاہی فوج نے قتلِ عام شروع کردیا۔

یہ قتلِ عام محمد شاہ کی استدعا ے موقوفی پر بھی جاری رہا۔ اُسوقت تک شہر کا بہت سا حصہ ویران ہوچکا تھا۔ دہلی کی رونق بالکل جاتی رہی۔ نادرشاہ وہاں سے تختِ طاؤس کوہ نور ہیرا اور بے انتہا زر و مال لے کر اپنے ملک کو واپس گیا۔

۱۷۹۰ء میں مہاداجی سیندھیا نے دہلی کو فتح کیا۔ اور ستمبر ۱۸۰۳ء میں اسپر اپنا کامل تسلط جمایا۔ ۱۸۰۳ء میں جنرل لیک نے سیندھیا کی فوج کو شکست دے کر شاہ عالم بادشاہِ دہلی کو، مع اس کے عیال و اطفال کے، اپنے تابع کیا۔ اکتوبر ۱۸۰۴ء میں جسونت راؤ ہلکر ایک عرصہ تک دہلی کا محاصرہ کئے رہا۔ مگر انگریزی فوج کو وہاں سے نہ ہٹا سکا۔ اس وقت سے ۱۸۵۷ء تک دہلی انگریزوں کے قبضہ میں رہی اور اورنگ زیب کے خاندان کے شہزادے برائے نام وہاں کے بادشاہ کہلاتے رہے۔

۱۸۵۷ء میں جبکہ غدر ہوا اس وقت تک دہلی میں بہادر شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ بادشاہ معمّر آدمی تھا۔ پر چونکہ آپکی شرکت بلوائیوں کے ساتھ پائی گئی، لہذا مقید ہو کر رنگون بھیجدیئے گئے۔ اسوقت سے دہلی کا تختِ شاہی ہمیشہ کے لئے خالی ہوگیا۔ غدر کے بعد دہلی کا الحاق صوبۂ پنجاب کے ساتھ ہوگیا، اور اُسکی رونق معمولی شہروں کی ایسی رہ گئی۔

اگرچہ دہلی کی شاہی رونق بالکل جاتی رہی ہے، تاہم یہاں اب بھی بہت سے مقامات قابلِ دید ہیں جنمیں سے چند خاص مقامات کا تذکرہ اس جگہ کیا جاتا ہے:-

۱- قلعۂ دہلی | اس قلعہ کو ۱۶۳۹ء میں شاہ جہاں بادشاہ نے پچاس لاکھ روپیہ کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا۔ اِسکی تعمیر میں سنگِ سرخ سے کام لیا گیا ہے اور اسی لحاظ سے اسکو "لال قلعہ" کہتے ہیں۔ یہ قلعہ دریاے جمنا کے کنارے پر واقع ہے۔ اندر جانے کے لئے کئی پھاٹک ہیں جنمیں سے لاہوری دروازہ، جو چاندنی چوک کے مقابل ہے، بہت مشہور ہے۔ لاہوری دروازہ اور قلعہ کے درمیان انواع و اقسام کی عمارات تھیں جنمیں شاہی وقت میں بازار لگتے تھے، اور عملہ شاہی کی رہائش تھی۔ مگر غدر کے بعد یہ سب مسمار کردی گئیں۔ مگر جو کچھ بچ رہا ہے اُس سے پرانی دہلی کی رونق و عظمت ظاہر ہوسکتی ہے۔ لاہوری دروازہ سے نکلکر تھوڑے فاصلہ پر نقار خانہ ملتا ہے۔ اس مقام تک امرا اور منصب دار ہاتھیوں پر سوار آتے تھے اور یہاں سے دربار تک پاپیادہ جاتے تھے۔ قلعہ کے اندر داخل ہونے پر دیوانِ عام، دیوانِ خاص، اور موتی مسجد پر نظر پڑتی ہے۔ یہ تینوں مقامات قابلِ دید ہیں۔

۲- دیوانِ عام | یہ سنگِ سُرخ کے ستونوں پر کھڑا ہے اور تین طرف سے کھلا ہے۔ تختِ شاہی سطح زمین سے دس فٹ اونچا ہے۔ یہ سنگ مرمر سے بنا ہے اور سنگ مرمر کے چار میناروں پر قائم کیا گیا ہے۔ اس کا کام بہت نفیس ہے۔ یہاں شاہی دربار ہوتا تھا، اور ہر خاص و عام جا سکتا تھا۔ پیچھے کی دیوار میں ایک زینہ ہے جو تخت تک چلا گیا ہے۔ تخت کے عقب میں ایک دروازہ ہے، جسمیں ہو کر بادشاہ دربار کو آتے تھے۔ پچھلی دیوار میں قیمتی پتھروں کی پچی کاری ہے اور قسم قسم کی گلکاریاں بھی ہیں۔ یہ ایک فرانسیسی نقاش (آسٹن ڈی بورڈکس) کی صنّاعی ہے جس نے شاہجہاں کے وقت میں اسکو بنایا تھا۔

۳- دیوانِ خاص | دیوانِ عام سے .. اگز جانبِ مشرق دیوانِ خاص ہے۔ یہاں وزرا سے خاص خاص امورِ سلطنت کے بارے میں صلاح و مشورہ ہوتا تھا۔ عوام کو یہاں آنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے اور سنگ مرمر کے میناروں پر قائم ہے۔

چھت میں سنہری کام سے بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ پہلے یہ چھت نقرئی چادر سے مڑھی ہوئی تھی، مگر ۱۷۶۰ء میں مرہٹے اس کو نکال لے گئے۔ درمیان میں جانبِ مشرق سنگ مرمر کا ایک چبوترہ ہے جس پر تختِ طاؤس رکھا جاتا تھا۔ اس تخت کو ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ لے گیا۔ اب یہ تخت طہران میں موجود ہے۔

اس تخت کو تختِ طاؤس اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے پیچھے دو موروں کی شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ عجائبات دنیا کا نمونہ تھا۔ چھ کرور روپیہ اس کی لاگت تھی۔ پشت کا تختہ جس پر بادشاہ تکیہ لگا کر بیٹھتا تھا، دس لاکھ روپے کا تھا۔ اس کے پیچھے ایک طلائی درخت تھا جو سبزہ و الماس سے سرسبز اور لعل و یاقوت سے گلرنگ تھا۔ اس کے دونوں طرف ایک ایک مور زنگارنگ کے جواہرات سے مرصّع، چونچ میں موتیوں کی تسبیح لئے کھڑے تھے۔ تخت چھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا تھا، چھ پاؤں پر کھڑا تھا۔ یہ تخت اور اس کے پایہ خالص سونے کے تھے اور اس میں قسم قسم کے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اوپر کی طرف بارہ مرصّع ستونوں پر مغرّق محرابیں اور جڑاؤ میناکاری کی چھت دھری تھی۔ تخت کے دونوں طرف ایک ایک شامیانہ تھا، جو خالص مخمل کے بنے ہوئے تھے یہ شامیانے بھی موتیوں سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ اس کی چوبیں آٹھ آٹھ فٹ اونچی خالص سونے کی بنی ہوئی اور جواہرات سے جڑی ہوئی تھیں۔ دیوان خاص کے قریب ہی شمال میں غسل کے واسطے سنگِ مرمر اور سنگِ سرخ کے حوض بنے ہوئے ہیں۔ یہاں آکر بادشاہی بیگمات غسل کیا کرتی تھیں۔

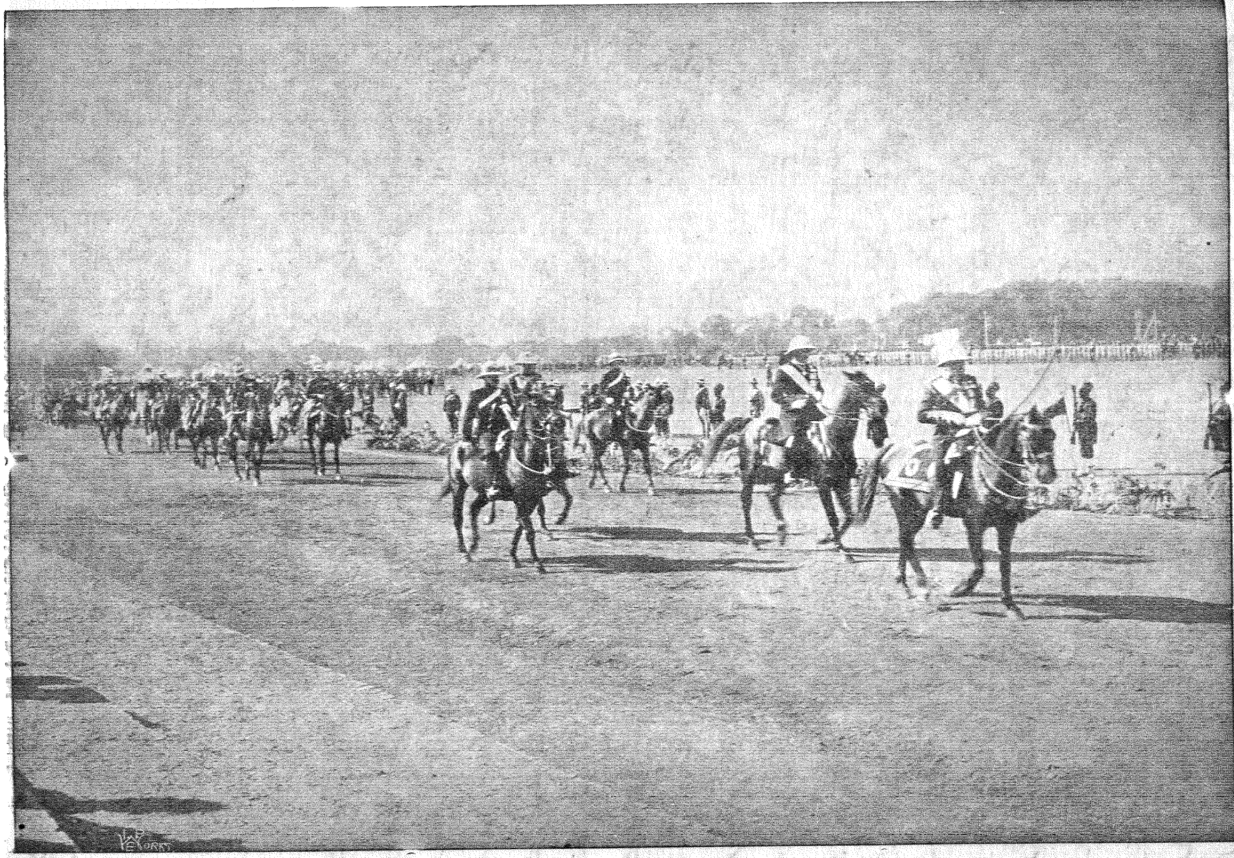
۴۔ موتی مسجد | غسل خانہ کے متصل موتی مسجد ہے۔ اسکو ۱۶۳۵ء میں اورنگ زیب نے تعمیر کرایا تھا۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ اس پر لاگت آئی تھی۔ یہ مسجد بھی سنگ مرمر کی ہے۔ اسکی نفاست و خوبصورتی قابلِ دید ہے۔ اس مسجد میں بادشاہی بیگمات نماز پڑھا کرتی تھیں۔

۵۔ جامع مسجد | یہ مسجد تمام عالم میں مشہور اور بے نظیر ہے۔ اسکا طول ۲۰۱ فٹ اور عرض ۱۲۰ فٹ ہے۔ شاہ جہاں بادشاہ کے عہد میں (۱۶۵۰ء) میں اس کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ چھ برس تک پانچ ہزار کاریگر اسکی تعمیر میں لگے رہے۔ دس لاکھ روپیہ اس پر لاگت آئی تھی۔ اس کے مینار بہت بلند اور نہایت دلکش ہیں جنمیں دو میناروں کی بلندی ۱۳۰ فٹ ہے۔ مسجد کے اندر داخل ہونے کے لئے ۳۴ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ اس کے تین دروازے ہیں۔ مشرقی دروازہ بمقابلہ جنوبی و شمالی دروازہ کے زیادہ بلند اور خوبصورت ہے۔ باہر کی طرف اس مسجد میں سر سے پانوں تک سنگِ سرخ لگا ہوا ہے اندر کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے اوپر تین بڑے گنبد سنگِ مرمر اور سنگِ موسیٰ کے ہیں۔ اس کے اندر کا فرش سنگِ مرمر کا ہے اور صورت مصلّی کی بطور محراب کے سنگِ موسیٰ کی ترشی ہوئی ہیں۔ صحن کا فرش سنگ سرخ کا ہے۔ درمیان میں ایک مربّع حوض ہے جس کے کنارے سنگِ مرمر اور سنگِ موسیٰ کے ہیں۔ حوض کے بیچ میں ایک فوارہ ہے۔ میناروں پر چڑھنے سے شہر کا منظر خوب نظر آتا ہے۔ قرب و جوار کی تمام عمارتیں یہاں سے صاف نظر آتی ہیں۔ اس مسجد کا قطعۂ تاریخ یہ ہے

مسجدِ شاہِ جہاں قبلۂ حاجات آمد

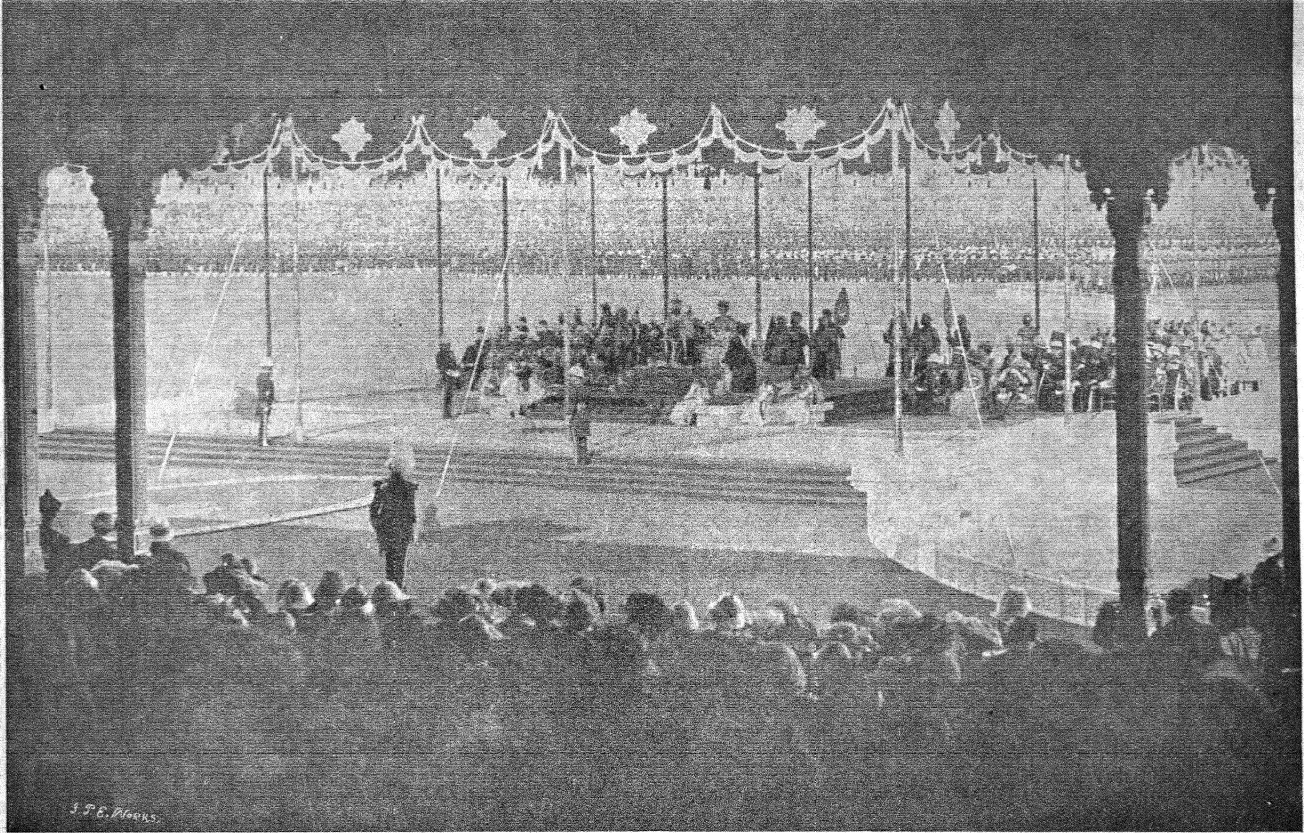
مختصر یہ کہ "جامع مسجد" دہلی کی ناک ہے۔ اس کے چاروں طرف بازار ہیں۔

مسجد میں قلمی قرآن شریف کی کئی جلدیں رکھی ہیں جعفر علیؓ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا بھی ایک قرآن شریف موجود ہے



حضور شہنشاہ معظم (پولو کے میدان میں)
۱۵ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع

Indian Press, Allahabad.



اداۓ کورنش

دیسی والیان ریاست کا حضور شہنشاہ معظم کے سامنے سر اطاعت خم کرنا (۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع)

Indian Press, Allahabad.

جو ساتویں صدی کا ہے، حضرت امام حسین کے ہاتھ کا لکھا ہوا بھی ایک قرآن شریف موجود ہے۔ کفش مبارک، قدم مبارک، اور موئے مبارک کی زیارت بھی یہاں ہوتی ہے۔ یہ چیزیں بھی نادرات روزگار ہیں۔

۶۔ مینار فیروز شاہ | یہ مینار پتھر کا ہے جو دلّی دروازہ سے باہر سڑک کے بائیں طرف واقع ہے۔ اس مینار کو ہندوؤں نے بنایا تھا، اور میرٹھ میں کھڑا کیا تھا۔ فیروز شاہ جو ۱۳۵۱ء لغایت ۱۳۸۸ء تخت دہلی پر حکمراں رہا، میرٹھ سے اس کو پانچ ٹکڑے کرکے لایا اور اس جگہ شہر فیروز آباد بناکر اس کو کھڑا کیا۔ اس پر کئی کتبے ہندوؤں کے درج ہیں۔ سب سے پرانا کتبہ پالی زبان میں ہے، جسمیں راجہ اسوک نے اس کے قائم کرنے کی وجہ بیان کی ہے۔ یہ راجہ ۲۲۰ برس قبل از مسیح گذرا ہے۔ یہ کتبہ آخر میں اس عبارت پر ختم ہوتا ہے کہ

ہندوستان کے مختلف حصوں میں تین مینار کھڑے کئے جائیں اور مذہبی فرمان پتھر کے میناروں پر کندہ کیا جائے، تاکہ ہمیشہ تک بحال رہے۔

ایک کتبہ میں جو بلدیو چوہان کی فتح کا حال لکھا ہے اور ایک میں رائے پتھورا کی طرف سے اس کے بزرگوں کا نام درج ہے۔ یہ مینار بالفعل ۴۸ فٹ ۲ انچہ بلند ہے اور قطر ۳ فٹ ہے۔ اس کے اوپر سنہری چوٹی تھی۔ اسی لحاظ سے اسکو مینار زرّیں کہتے تھے۔ لیکن اب یہ چوٹی ٹوٹ گئی ہے۔ یہ مینار ایک ٹیلہ کے اوپر واقع ہے۔ اس کے اردگرد شہر فیروز آباد کے کھنڈر ہیں۔ دو اور مینار، جن پر اسی قسم کے راجہ اسوک کے کتبے درج ہیں، ایک بنارس گورنمنٹ کالج کے احاطہ میں اور دوسرا قلعۂ الہ آباد میں ہے۔

۷۔ پرانا قلعہ اور مسجد شیر شاہ | یہ قلعہ شہر کے بائیں طرف ۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ بہت قدیمی قلعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ زمانۂ مہابھارت میں یہ موجود تھا۔ یدھشٹر نے جو پانچ قلعے دریودھن سے طلب کئے تھے، ان میں سے ایک یہ تھا۔ ابتک اس کا نام اندرپرست مشہور ہے۔ لیکن اب اس میں ہندوؤں کا کوئی نشان باقی نہیں۔ یہ قلعہ بہت جگہ سے شکستہ ہوگیا ہے۔ اس کے چاروں گوشوں پر چار برج ہیں۔ چار دروازوں میں سے تین دروازے بند رہتے ہیں، اور صرف ایک دروازہ (غربی) کھلا رہتا ہے۔ اسکے گرد عمیق خندق ہے، جسکا کچھ حصّہ مٹی سے بھر گیا ہے۔ قلعہ کی فصیل بھی بہت جگہ سے شکستہ ہوگئی ہے۔ اب اس کے اندر بہت لوگ کچّے مکانوں میں رہتے ہیں اور سرکار کو مکانات کا کرایہ دیتے ہیں۔ ۱۵۳۵ء میں ہمایوں بادشاہ نے اس کی مرمّت کرائی اور اس کا نام دین پناہ رکھا۔ جب شیر شاہ نے ہمایوں بادشاہ کو نکال دیا تو اس قلعہ کو اپنے نئے شہر کا قلعہ بناکر اس کا نام شیر گڈھ رکھا۔ یہ قلعہ ساڑھے پانچ سو گز لمبا اور پونے تین سو گز چوڑا ہے۔ اس قلعہ کے اندر مسجد شیر شاہ قابل دید ہے۔

اس مسجد کی بنیاد ہمایوں بادشاہ نے ڈالی تھی۔ لیکن جب ہمایوں کو شیر شاہ نے نکال دیا اور اس نے خود اس کو مکمّل کیا اور اسی وجہ سے اس کا نام مسجد شیر شاہ پڑا۔ اس کے پانچ محراب گھوڑے کی نعل کی شکل کے ہیں۔ یہ مسجد نیلے رنگ کی پختہ مٹی اور سنگ مرمر سے آراستہ ہے۔ ہم اس کو زمانۂ افاغنہ کی کاریگری کا ایک بہترین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کا اندرونی کام اور طاقچے بہت خوبصورت ہیں۔ اس کا درمیانی محراب اوپر سے سنگ سرخ و سنگ سیاہ اور نیچے سے سفید و سیاہ سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ نقش و نگار نہایت خوبصورت ہیں۔ درمیانی دروازہ بہت خوبصورت ہے جو سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ مسجد کا صحن ڈیڑھ ہزار گز لمبا اور ایکسو گز

چوڑا ہے۔ خاص مسجد کا طول وعرض ۴۲ اور ۱۷ گز ہے۔ مسجد کے صحن میں ایک مدّور حوض ہے جس کے وسط میں ایک فوارہ تھا جو اب منہدم ہوگیا ہے۔ اب یہ مسجد بلا مرمّت پڑی ہوئی ہے اس کے قریب وہ برج ہے جہاں سے گر کر ہمایوں بادشاہ مرا تھا۔ اس برُج کی تین منزلیں ہیں اس کا نام شیر منڈل ہے، کیونکہ شیر شاہ نے اسکو ۱۵۴۱ء میں بنایا تھا۔ بعدہٗ یہ ہمایوں بادشاہ کے کتب خانہ کا کام دیتا رہا۔

۸۔مقبرۂ ہمایوں بادشاہ | یہ عجیب ونفیس مقبرہ شہر سے ساڑھے تین میل کے فاصلہ پر جانبِ جنوب متصل عرب سرائے واقع ہے۔ اس مقبرہ کی تیاری ۹۷۳ھ میں ملکہ حاجی بیگم کی کوشش اور ہمت سے شروع ہوئی۔ پندرہ لاکھ روپیہ کی لاگت سے، سولہ برس کے عرصہ میں، یہ مقبرہ تیار ہوا۔ اس مقبرہ کا احاطہ ۳۰۰ گز مربع سے اُوپر ہے اور اندر جانے کے لئے دو بڑے بڑے دروازے ہیں۔ اس کے گرد ایک پرفضا باغ ہے۔ باہر سے یہ عمارت ہشت گوشہ نظر آتی ہے جس کے چار اطراف طویل اور چار چھوٹے ہیں۔ اس کا گنبد سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور باقی عمارت سنگِ سرُخ کی ہے۔ عمارت کے چاروں گوشوں پر چار مینار بنے ہوئے ہیں، اور چاروں طرف ایک ایک بارہ دری سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ مقبرہ دو چبوتروں پر کھڑا ہے نیچے والے چبوترے کی بلندی تین فٹ اور چوڑائی پچیس فٹ ہے۔ اس کے اوپر ایک اور چبوترہ محراب دار بیس فٹ سے زیادہ اونچا اور تیس فٹ سے زیادہ چوڑا ہے اس چبوترہ کے چاروں طرف سنگِ مرمر کا جالی دار جنگلہ تھا جو بہت جگہ سے ٹوٹ گیا تھا لیکن اب سرکار انگریزی نے اسکی مرمت کرا دی ہے۔ اب تین طرف کا جنگلہ موجود ہے اور چوتھی طرف کا مطلق نہیں۔ مقبرے کے باہر کی طرف کئی قبریں ان لوگوں کی بنی ہوئی ہیں جو شاہی خاندان میں ہوگزرے ہیں۔ منجملہ اُنکے ایک قبر دارا شکوہ کی ہے جو اورنگ زیب کا بڑا بھائی اور وارثِ تختِ تھا۔ مقبرے کے درمیان بڑے کمرہ میں ہمایوں بادشاہ کی قبر ہے۔ اردگرد کے حجروں میں بھی بہت سی قبریں ہیں۔

۹۔مقبرہ نظام الدین اولیا | حضرت نظام الدین اولیا کی قبر ایک احاطہ کے اندر واقع ہے، جس میں اور بھی کئی قبریں ہیں۔ حضرت نظام الدین تغلق شاہ کے عہد میں (۱۳۲۱ء) ایک ولی اللہ ہوگزرے ہیں، جن کی تعظیم وتکریم اب تک ہوتی ہے۔ اس مقبرہ پر مختلف اوقات میں روپیہ صرف ہوتا رہا ہے۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں محمد امام الدین حسن المعروف شمس الدین محمد خاں نے اسکی چھت کے ساتھ گنبد کو شامل کیا۔ شاہجہاں کے عہد میں کل عمارت کی مرمت کی گئی۔ اس میں داخل ہونے سے پیشتر ایک باؤلی نظر آتی ہے جسکو خود حضرت نظام الدین نے ۱۳۲۱ء میں بنوایا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے پانی میں بہت کرامات ہے۔ باؤلی کے آگے بہت خوشنما مقبرہ ہے۔ اس کے اردگرد کا برآمدہ سفید سنگِ مرمر کا ہے اور حجرۂ قبر کے اردگرد سنگِ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ اور خاص مزار کے گرد جالیدار کاٹھ کا گھیر ہے، اور چاروں گوشوں پر سنگی مینار ہیں جن کے اوپر چوبی چھپر کھٹ ہے۔ مزار اور مینار سفید کپڑے سے ڈھکے رہتے ہیں۔ حجرہ کے اندر عربی زبان میں اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ اور مزار کے سر کے اوپر قرآن شریف کی ایک جلد رکھی رہتی ہے۔ حجرہ کے باہر دروازے پر ایک مٹی کا برتن پڑا رہتا ہے جسمیں زائرین بطور خیرات نقدی ڈالتے ہیں۔

قریب ہی جہاں آرا بیگم (دختر شاہجہاں) کی قبر ہے۔

۱۰۔ چونسٹھ کھمبا | یہ عمارت چونسٹھ میناروں پر کھڑی ہے۔ اس کے درمیان میں کوکلتاش خاں کا مزار ہے۔ یہ عمارت بشکل مربع سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور اس کے میناروں پر ۲۵ گنبد ہیں۔ ایک زمانہ میں اس کے گرد سنگِ مرمر کے جالیدار پنجرے تھے، لیکن اب کئی جگہ سے پنجرے ٹوٹ گئے، اور ان کے بجائے لکڑی کے تختے لگا دیئے گئے ہیں۔ ۱۶۲۳ء میں یہ عمارت تکمیل کو پہنچی تھی۔ مقبرۂ حضرت نظام الدین اور مقبرۂ ہمایوں بادشاہ کے درمیان میں یہ واقع ہے۔ لیکن مقبرہ حضرت نظام الدین کے بہت قریب ہی۔

۱۱۔ مقبرۂ صفدر جنگ | یہ مقبرہ دہلی سے پانچ میل کے فاصلے پر قطب والی سڑک کے دائیں طرف واقع ہے۔ اس کا دروازہ سڑک کے دائیں طرف ہے۔ منصور علی خاں (المخاطب بہ صفدر جنگ) محمد شاہ بادشاہ دہلی (۱۷۱۹ء۔ ۱۷۴۸ء) کا وزیر تھا۔ اس مقبرے پر تین لاکھ روپیہ لاگت آئی ہے۔ یہ سنگِ سرخ کا ہے، اور اس کا طرز بہت کچھ روضۂ تاج محل (آگرہ) سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے ارد گرد تین سو گز مربع کا باغ ہے جس کے چاروں طرف بڑے بڑے لمبے تالاب بنے ہوئے ہیں۔ مقبرہ کے چار گوشوں پر چار مینار سنگِ سرخ کے اور چاروں طرف ایک ایک بارہ دری سنگِ مرمر اور سنگِ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ اوپر سنگِ مرمر کا بلند گنبد ہے۔ مقبرہ ایک چبوترہ پر کھڑا ہے۔ فرش کے مرکز میں سنگِ مرمر کا خوبصورت نقش و نگار شدہ مزار ہے۔ اور اس کے چبوترے کے نیچے ایک کھلی جگہ میں سادہ مٹی کی قبر ہے، جس کے اوپر روز جھاڑو ہوتا ہے اور پھول چڑھتے ہیں۔ اس مقبرے کو صفدر جنگ کے بیٹے نواب شجاع الدولہ نے بنوایا تھا۔ اب یہ عمارت بلا مرمت پڑی ہے۔ مقبرے کے دروازے کے اوپر یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے

چوں آں صفدرِ عرصۂ مردمی　　ز دارِ فنا گشت رحلت گزیں
چنیں سالِ تاریخ او شد رقم　　کہ بادا مقیمِ بہشتِ بریں
　　　　　　　　　　　　　　　　۱۱۶۷ھ

اس مقبرہ کے اوپر چڑھنے سے سامنے سڑک کے بائیں طرف چار قبروں اور مسجد کا ایک مجموعہ نظر آتا ہے منجملہ اُن کے بڑی قبر سکندر لودھی کی ہے اور جنوب کی طرف دو قبریں اور اور مسجد بادشاہانِ سادات کے وقت کی معلوم ہوتی ہیں۔

۱۲۔ قطب مینار | قطب مینار اجمیری دروازہ سے ۱۱ میل ہے۔ یہ اسی جگہ واقع ہے جہاں پرانی دہلی تھی۔ اسکے قریب پرتھی راج کے قلعہ کے نشانات بھی پائے جاتے ہیں۔ مینار ۲۳۹ فٹ بلند ہے۔ اس کے نیچے کا قطر ½ ۴۷ فٹ ہے۔ فی الحال اسکی پانچ منزلیں ہیں، مگر کسی زمانہ میں اس کی سات منزلیں تھیں جہاں اب آہنی جنگلہ لگا ہوا ہے، وہاں فصیلوں ایسے کنگورے بنے ہوئے تھے، اور پانچویں منزل میں ایک درجہ ایسا تھا جسکے چاروں طرف دروازے تھے۔ کہتے ہیں کہ اوپر والی دو منزلیں ۱۸۰۳ء میں کالی آندھی اور زلزلہ کے صدمے سے گر پڑیں۔ پہلی منزل ایک انچ کم پانچ فٹ بلند ہے اور اس سے اوپر کی منزل کی بلندی ۲۳ فٹ ۴ انچ ہے۔ ان دونوں کا مجموعہ مینار کی نصف بلندی کے برابر ہے۔ تیسری منزل کی بلندی ۵۰ فٹ ½ ۸ انچ، چوتھی منزل کی بلندی ۲۴ فٹ ½ ۹ انچ، اور پانچویں منزل کی بلندی ۲۵ فٹ ۴ انچ ہے۔ مینار کی بنیاد سطح زمین سے ۲ فٹ اونچی ہے۔ یہ مینار اندر سے خالی ہے، اور اس میں چکردار سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ پہلی منزل میں ۱۵۶، دوسری منزل میں ۸۷، تیسری منزل میں ۶۲، چوتھی منزل میں ۴۱، اور پانچویں منزل میں بھی ۴۱ سیڑھیاں ہیں۔ یعنی تمام سیڑھیاں مع اس ایک سیڑھی کے جو چھٹی منزل کی بنیاد ہے ۳۷۹ ہوئیں۔

قطب مینار کے قریب ایک پرانی مسجد ہے جسکو ۱۱۹۱ء میں قطب الدین ایبک نے بنوایا تھا۔ اس کے ایک دروازے پر عربی کتبہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۷ بت خانوں کو مسمار کرکے ان کے اینٹ پتھر سے یہ مسجد بنائی گئی ہے۔

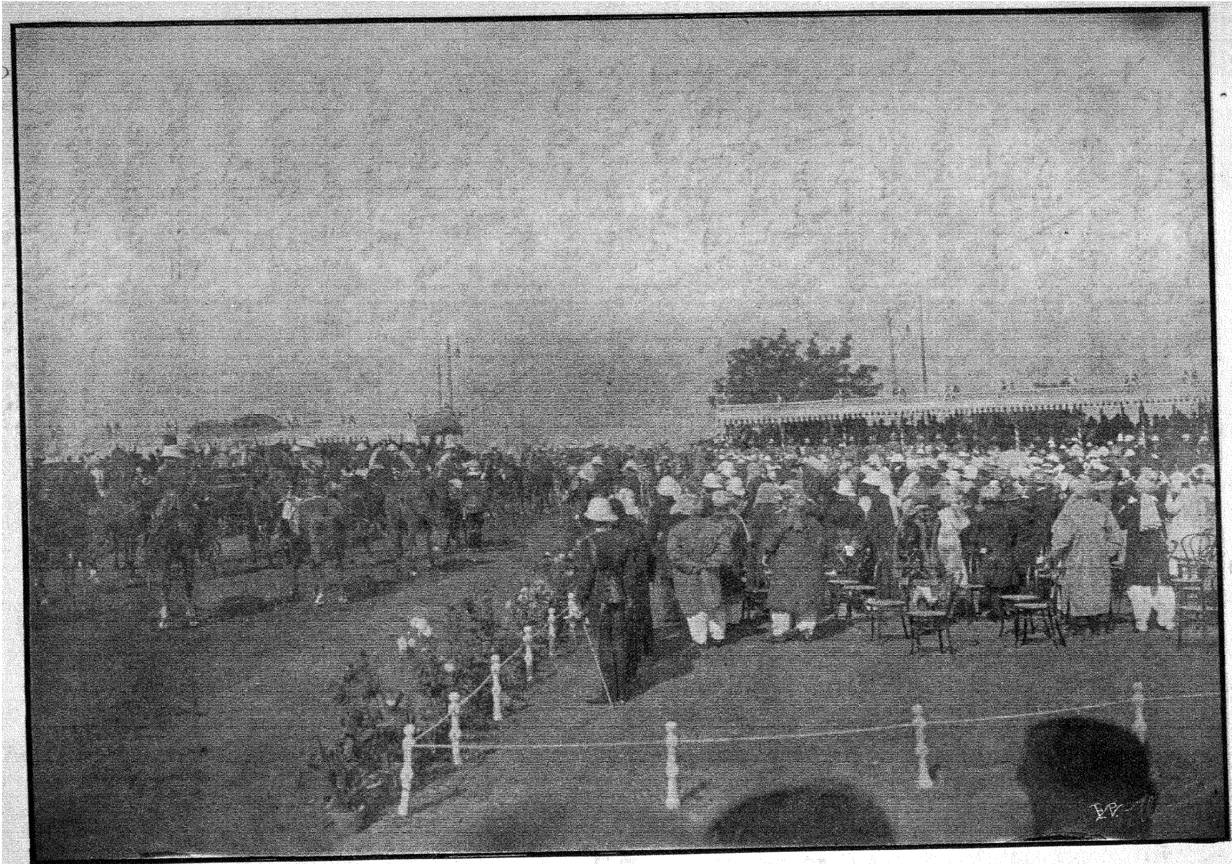
مسجد کے قریب ایک ٹھوس آہنی ستون ہے جسکا قطر ۱۶ انچہ اور ارتفاع ۲۳ فٹ ۸ انچہ ہے۔ اسپر ایک سنسکرت کتبہ کندہ ہے جسمیں لکھا ہے کہ یہ راجہ دھوؤ کا یادگار فتح ہے۔ اس راجہ نے دریائے سندھ کے قریب رہنے والی قوم "بالہیک" پر فتح پائی تھی، اور اس کی یادگار میں یہ ستون کھڑا کیا گیا تھا۔ خیال ہے کہ چوتھی صدی مسیحی میں یہ ستون کھڑا کیا گیا تھا۔ مگر بعض محققین کی راے ہے کہ اس ستون کو راجہ اننگ پال نے بنوایا تھا۔ اس ستون میں ایک مقام پر راجہ اننگ پال کا نام بھی کندہ ہے۔ اننگ پال والے مضمون کی تاریخ سمبت ۱۱۰۹ بکرمی (۱۰۵۲ء) ہے۔

۱۳۔مندر راے پتھورا | یہ نامی مندر قلعہ راے پتھورا کے پاس تھا۔ اس کے چاروں طرف دالان بنے ہوئے تھے اور درمیان میں صحن تھا جنوبی شمالی، اور مشرقی طرف دروازے تھے، اور مغربی طرف مورت تھی۔ مندر کے باہر بھی دالان تھے، جنکو "پرکھما کے دالان" کہتے تھے۔ ۱۱۴۳ء میں قلعہ کے ساتھ یہ مندر بھی بنایا گیا تھا اس میں بڑی صنعت کاری کی گئی ہے۔ ایسے استاد سنگتراشوں نے اس کا کام بنایا ہے کہ اس سے بہتر نہیں بن سکتا۔ ہر ایک پتھر پر منبت کاری میں ایسی ایسی خوبصورت گلکاری کی ہے اور ایسے اچھے اچھے بیل بوٹے کھودے ہیں کہ حدِ بیان سے باہر ہے۔ اس مندر کا مشرقی اور شمالی حصہ بدستور قائم ہے، باقی حصہ اسلامی حکومت کے دور میں مسمار کر ڈالا گیا۔ عام خیال ہے کہ یہ مندر وشنوؤں کا تھا، کیونکہ اس میں کرشن، مہادیو، گنیش اور ہنومان وغیرہ کی مورتیں پائی جاتی ہیں۔

۱۴۔مقبرہ سلطان التمش | یہ مقبرہ قطب کے شمال و مغرب میں واقع ہے۔ سلطان شمس الدین التمش پہلے سلطان قطب الدین بادشاہِ دہلی کا غلام تھا، اور بعدہٗ اس کا داماد ہوکر اس کے بیٹے آرام کو تخت سے اُتار کر جانشیں ہوا۔ یہ ۱۲۳۶ء میں فوت ہوا۔ اس کے بیٹے سلطان رکن الدین اور اس کی بیٹی رضیہ بیگم نے اس مقبرہ کو بنوایا تھا۔ اس کے اوپر چھت نہیں ہے۔ اندر کا احاطہ جسمیں بہت خوبصورت اور خوشنما نقش و نگار بنے ہیں، ۲۹½ فٹ مربّع ہے۔ دیواریں موٹائی میں ۷ فٹ سے زیادہ ہیں۔ گزرگاہ جانبِ شرق ہے۔ مقبرہ سنگ مرمر اور سنگ سُرخ کا بنا ہوا ہے، اور خاص قبر مرکز میں زرد سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔

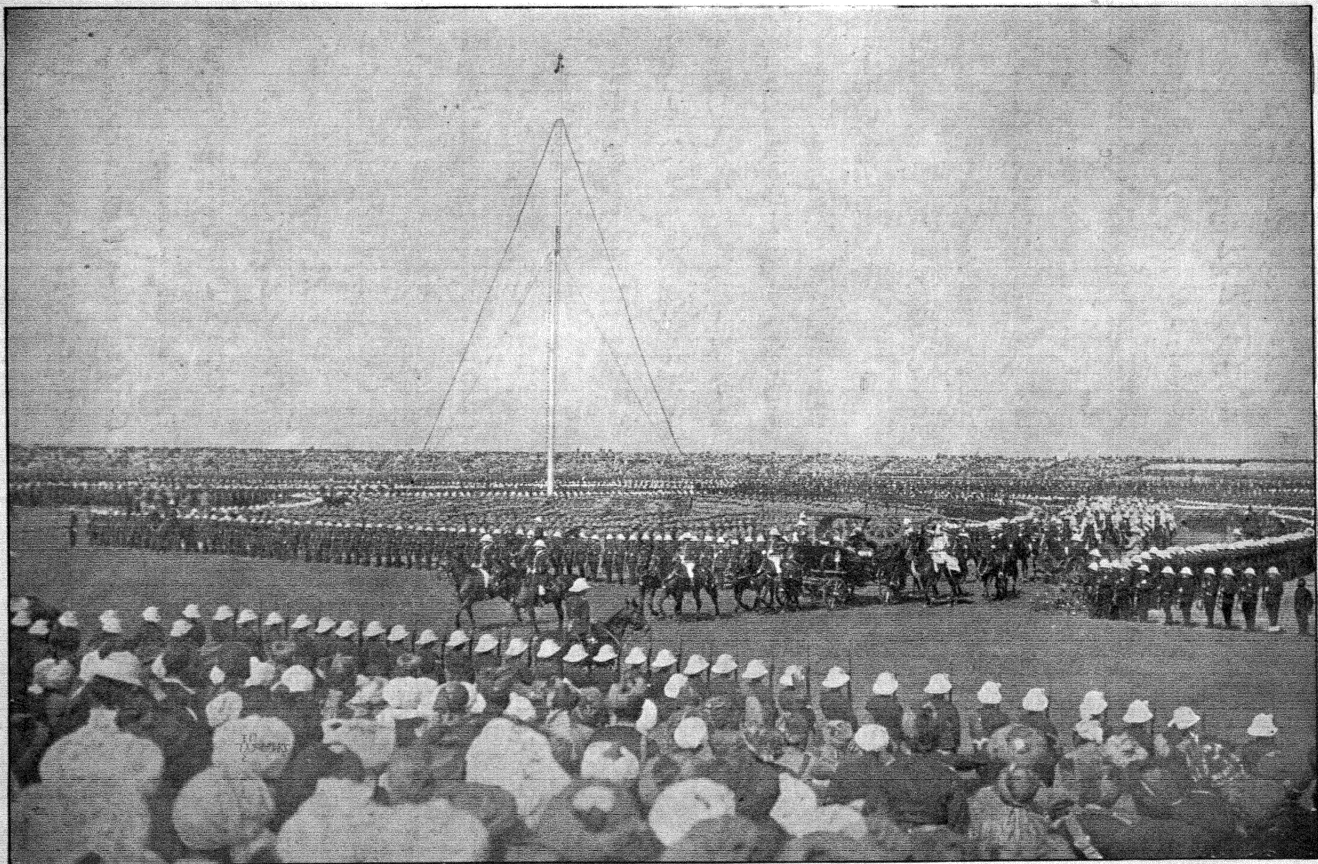
۱۵۔دروازہ علاؤالدین | یہ دروازہ علاؤالدین نے ۱۳۱۰ء میں بنایا تھا۔ جیسا کہ کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ عمارت اندر سے ۳۴½ فٹ مربع اور باہر سے ۵۶½ فٹ، اور دیوار کی موٹائی ۱۱ فٹ ہے۔ ہر ایک طرف اونچا دروازہ ہے، جن پر گھوڑے کے سُم ایسی محراب بنی ہیں۔ اوپر جابجا سنگِ سُرخ اور سنگِ مرمر کے نقش و نگار ہیں۔ پٹھانوں کی کاریگری کا یہ ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ مربّع چاروں طرف سے طاقچوں سے کٹا ہوا ہے۔ اگر ان طاقچوں کو شامل کیا جائے تو یہ ہشت گوشہ ہے۔

دروازہ سے گزر کر امام ضامن کی درگاہ آتی ہے۔ اس مقبرہ کے احاطہ کی چھوٹی چھوٹی دیواریں ہیں، اور بلند چبوترہ کے اوپر کھڑا ہے۔ قبر سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہے، اور اندرونی فرش بھی سنگِ مرمر کا ہے۔ اس مقبرے کو امام ضامن نے اپنی



حضور ملک معظم برٹش انڈیا کے قایم مقاموں کا ایڈرس قبول فرما رہے ہیں
(۷ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع)

Indian Press, Allahabad.



ایمفی تھیٹر کا نظارہ
(دی امپیریل میجسٹیز کے آمد کے وقت)

Indian Press, Allahabad.

زندگی میں یعنی ۱۵۳۳ء میں بعہد ہمایوں بادشاہ بنوایا تھا۔

۱۶۔ جنتر منتر | قطب سے واپس آتے ہوئے جنتر منتر کی عمارت ہے اس کو راجہ جے سنگھ والئی جے پور نے محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں بموجب حکم بادشاہ علم نجوم کی واقفیت کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ اب یہ مسمار شدہ حالت میں ہے۔ کسی کسی مقام پر دھوپ گھڑیوں کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں راجہ مذکور نے مندر رمان بنارس میں بنوایا تھا، جو کہ اب تک عمدہ حالت میں ہے۔ نیز تین عمارتیں اس قسم کی متھرا، اُدین اور جے پور میں بھی بنوائی تھیں۔

۱۷۔ چاندنی چوک | یہ بہت خوشنما اور قابل تعریف چوک ہے۔ یہ بہت دور تک چلا گیا ہے، اور دہلی کے دیگر بازاروں سے چوڑائی میں ۳ گنا ہے۔ اس کا طول ایک میل اور عرض ۱۲۰ فٹ ہے۔ بازار کے خاص مرکز میں جمنا کی نہر چل رہی ہے جو اوپر سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس کی چھت سطح زمین سے کسیقدر اونچی ہے۔ نہر کے اردگرد درخت لگے ہوئے ہیں، جس سے بازار کی رونق اور بھی دوبالا ہو گئی ہے۔ اس بازار کی وہ شان و شوکت نہیں رہی جو بادشاہی وقت میں تھی۔ دوکانیں تو ویسی ہی خوبصورت ہیں جیسی کہ پیشتر تھیں، لیکن جن لوگوں سے اس بازار کی رونق تھی، وہ مرکھپ گئے، تاہم شام کے وقت اس زمانہ میں بھی خوب چہل پہل رہتی ہے۔

اس بازار میں دہلی انسٹی ٹیوٹ ہے، جو انگریزی عمارات میں بہت خوبصورت شمار ہوتی ہے۔ اس کو میونسپل کمیٹی نے ایک لاکھ ۳۵ ہزار ۴ سو، ۵ روپے کی لاگت سے تعمیر کرایا ہے۔ کتب خانہ، عجائب خانہ، کمیٹی کا دفتر، دربار، اور آنریری مجسٹریٹوں کی عدالت کا بھی عمارت کام دیتی ہے۔ یہ عمارت باغ قیصرہ میں واقع ہے۔

بازار کے وسط میں ایک گھنٹہ گھر ہے جو سطح زمین سے ۱۲۸ فٹ بلند ہے۔ ۲۵½ ہزار روپے کی لاگت سے اس کو بھی میونسپل کمیٹی نے بنوایا ہے۔

چوک کے وسط میں نارتھ بروک نامی فوارہ بھی ہے۔ اسی فوارہ کے قریب سنہری مسجد ہے۔ جس کو روشن الدولہ ظفر خاں نے ۱۷۲۱ء میں بنوایا تھا۔ یہ مسجد اگرچہ چھوٹی ہے، مگر بہت خوبصورت ہے۔ اسی مسجد میں بیٹھکر نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دیا تھا۔

دہلی میں ایسے بھی بہت سے مقامات ہیں جو غدر ۱۸۵۷ء کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔ مثلاً اسلحہ خانہ، گرجا سینٹ جیمس، کشمیری دروازہ، قدسیاں باغ، قصر لڈلو، مکان ہندو راؤ وغیرہ۔ مگر ضرورت نہیں کہ اس خوشی کے موقع پر ایسے واقعات کا تذکرہ کیا جائے۔

پرانی عمارات بھی دہلی میں بہت ہیں، مگر اسقدر گنجائش نہیں کہ یہاں سب کا مفصل تذکرہ کیا جائے۔

یہ زمانہ ہمیشہ انقلاب پذیر رہا ہے۔ کوئی چیز یہاں قائم نہیں رہتی۔ جب خود حضرت انسان کی زندگی ہی نقش بر آب ہے، تو اور چیزوں کا کیا مذکور۔ قدیم روایات کے مطابق پانچ چھ ہزار برس گزر گئے جب کہ مہاراجہ یدھشٹر نے جنگلوں کو صاف کرکے ایک شہر آباد کیا اور پھر یگیہ کیا۔ یگیہ کیا تھا، یہ عداوت کی بنیا دتھی۔ دریودھن اپنے بھائی کی ترقی دیکھکر خاک ہو گیا، اور پانڈوؤں کو تباہ و برباد کرنے کا حیلہ دبہانہ ڈھونڈنے لگا۔ آخر اس خاندان پر تباہی آئی، اور جنگل وبیابان کی خاک چھاننی پڑی۔ سری کرشن جی نے بہت کوشش کی کہ کسیطرح آپس میں صلح ہو جائے، مگر یہ بات بالکل ناممکن تھی کہ ایک ہی

ملک میں دو بادشاہ حکومت کریں۔ ایک خانہ میں کسی طرح دو تلواریں نہیں سماسکتیں۔ آخرکار مہا بھارت کا عظیم ہنگامہ شروع ہوا۔ ہزاروں خاندان تباہ و برباد ہوگئے۔ خون کے دریا بہے۔ کتنے ہی بہادروں سے ہندوستان خالی ہوگیا۔ خاتمۂ جنگ پر مہاراجہ یدھشٹر کے ہاتھ سلطنت آئی، مہاراجہ موصوف نے اپنا اعزاز دکھانے کے لئے اشومیدھ یگیہ کیا۔ جس سرزمین پر یہ واقعہ ہوا تھا، اسی کے ایک حصّہ پر موجودہ دربار آراستہ ہوا ہے۔

مہا بھارت کے چار ہزار برس بعد اُسی زمین پر نجومیوں کی امداد سے، اس بات کی کوشش کی گئی، کہ یہاں ابدالآباد تک چھتریوں کی عملداری قائم کی جائے۔ مگر یہ کوشش بے سود تھی۔ آہنی ستون قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد یہیں پرتھی راج کا عروج ہوا، اور یہیں وہ سرنگوں ہوا، حتیٰ کہ ہندؤوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

اس کے بعد اسلامی بادشاہوں کے باہم لڑائیاں ہوئیں اور سلطنت مغلیہ کی بنیاد پڑی۔ پھر جنوبی ہندوستان میں مرہٹوں کا عروج ہوا، مگر ۱۷۶۱ء میں ایسی شکست کھائی کہ ہندوؤں کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ کچھ عرصہ بعد انگریزی عملداری تمام ملک میں پھیل گئی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں یہ عملداری بھی امید و بیم کی حالت میں تھی۔ مگر آخر انگریزوں کی فتح ہوئی۔ ہر طرف انگریزی جھنڈا لہرانے لگا۔

۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن نے دہلی میں دربار کیا اور ملکہ وکٹوریہ کے لئے "قیصرۂ ہند" کے خطاب کا اعلان کیا۔ اُسی جگہ جنوری ۱۹۰۳ء میں حضور ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کی یادگار میں لارڈ کرزن نے دربار کیا۔ اور اب وہ مبارک موقع ہے کہ خود اعلیٰ حضرت ملک معظم جارج پنجم دام ملکہ و علیا حضرت ملکہ میری دام اقبالہا نے بہ نفس نفیس خود اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس سرزمین کو شرف بخشا ہے

دہلی بھی کیسا عجیب و غریب مقام ہے کہ باوجودیکہ اس نے کتنے ہی شاہی خاندانوں کو نیست و نابود کیا تاہم اس کی عزّت ویسی ہی بنی ہوئی ہے۔

دہلی کا خطاب اپنے بادشاہ سلامت سے

میں، ہاں جس کو دہلی کہتے ہیں، جو زمانۂ غیر محدود سے انقلاب پر انقلاب دیکھ چکی ہے، اور جس نے اپنے ملکِ ہند کی خبرگیری خوشی اور غم کے حال میں برابر کی ہے، تیرا خیر مقدم کرتی ہوں اے میرے شہنشاہ، اور تیرا خیر مقدم کرتی ہوں اے میری ملکۂ عُلیا۔

راجپوت، پٹھان، اور شاہانِ مغل کی تاجپوشی میرے سامنے ہوئی۔

تیمور اور نادر کی تلوار میری پہاڑیوں پر چمکی۔ ہاں، وہیں جہاں اب وہ دور تک خیموں کا ملک نہایت شاداب اور دلفریب نظر آرہا ہے۔

کئی دن اور کئی رات دُور دراز سفر طے کرتے ہوئے، اور اپنے بحری تختِ رواں کی سواری سمندروں میں فلکِ نیلگوں کے زیر سایہ بڑھاتے ہوئے، اے میرے شہنشاہ! تو نے مجھے اپنے قدوم میمنت لزوم سے سربلند کیا۔

ایسا شاہانہ کرم ضرور فتح و نصرت اپنے ساتھ لاتا ہے، یعنی محبّت اور امن کی برکت عطا کرتا ہے۔ جو میرے انقلاب اور ہندوستان کے انقلاب پر غالب رہیگا۔

لے تاجدار! دیکھنا، ہم اس مبارک ہاتھ میں خود کو حوالہ کرتے ہیں، جتنے ہمیں محبّت اور امن بخشا ہے۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم اُنکو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

(انگریزی نظم)

برٹش ایمپائر

اکثر لوگوں کو برٹش ایمپائر کی عظمت و وسعت کا صحیح اندازہ نہیں۔ ادیب کے دربار نمبر کے لئے غالباً یہ موزوں مضمون ہو گا اگر ہم چند معلومات اس کے متعلق نذر ناظرین کریں۔

رقبہ و آبادی وغیرہ | برٹش ایمپائر کا رقبہ ایک کرور چودہ لاکھ مربع میل ہے گو یا اس کی نسبت باقی ماندہ رقبہ دریافت شدہ سے جو نئی اور پرانی دنیا کا معلوم ہے اکیس فیصدی ہے یعنی قدرے پنجم سے زیادہ ہے۔

آبادی | بروے نقشہ مردم شماری سنہ ۱۹۰۱ء اس کی آبادی اکتالیس کرور ہے یعنی کل دنیا کی آبادی سے بائیس فیصدی کی نسبت ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ جس شہنشاہ کی تاجپوشی کے متعلق یہ نمبر ہے اس کے زیرنگیں پانچویں حصہ دنیا کی آبادی سے قدرے زیادہ بنی نوع انسان اس کے رعایا ہیں۔

محاصل وغیرہ | محاصل چھ ارب ہے نیشنل ڈٹ یعنی قرضہ نیشنل پندرہ ارب ہے۔ سالانہ تجارت سولہ ارب سے قدرے زیادہ ہے۔ نوے ہزار میل میں ریل جاری ہے اور جہازوں کی تعداد بے شمار ہے۔ اصطلاحی الفاظ میں ایک کرور بارہ لاکھ جہازوں کا ٹینیج ہے۔ انگلینڈ اسکاٹ لینڈ آئرلینڈ ہر سہ ملکر یونائٹیڈ کنگڈم کے نام سے پکارے جاتے ہیں جن کا طریق سلطنت عموماً معروف ہے۔ یعنی تاج انگلینڈ بذریعہ پارلیمنٹ کے حکمراں ہے جو دو طبقوں پر منقسم ہے ایک ہوس اوف لارڈس دوسرا ہوس اوف کامنز۔

نوآبادیاں | انکے علاوہ ممالک محروسہ و نوآبادیاں بھی ہیں۔ جو سات قسم کی ہیں ان میں طرزِ حکومت یکساں نہیں۔

اوّل - ہندوستان جہاں ایک گورنر جنرل اور اسکی کونسل واضع قانون و کونسل انتظامی کے ذریعہ سے منتظم ملک ہے۔ یہ ہر سہ مجموعی طور پر سکرٹری آوف اسٹیٹ اِن کونسل کے ماتحت ہیں۔ کلونیل آفس سے ان میں سے کسی کا تعلق نہیں فی الواقعہ سکرٹری اوف اسٹیٹ ان کونسل ہندوستان کے عظیم الشان مملکت پر حکمراں ہے جو تاج انگلینڈ کے منجانب باختیار قرار پایا ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی موضوعہ سلطنت ہے۔

دوم - خود مختار نوآبادیاں جہاں کلونیل سکریٹری کا کوئی اختیار کسی افسر پر سوائے گورنر کے نہیں تاج انگلینڈ کو محض اسقدر اختیار ہے کہ قوانین مجوزہ کو مسترد کر دے ایسی خود مختار آبادیاں چھ ہیں۔ اسٹریلیا جس کے ماتحت پیوا ہے کنیڈا - نیوفونڈلینڈ - نیوزی لینڈ - کیپ کولونی - ناٹال - ٹرانسول اورنج کالونی۔

سوم - نوآبادیاں جن میں ہوس آف اسمبلی انتخاب سے مقرر ہوتا ہے اور ایک لیجسلیٹو کونسل بھی نامزد ہوتی ہے۔ یہ تین ہیں۔ بہاماز - باربی ڈوس - برمیوڈا۔

چہارم - وہ نوآبادیاں جن میں جزوی انتخاب اور جزوی تقرر سے لیجسلیٹو کونسل بنتی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔ برٹش گائنا۔ فجی - جمیکا - لی ورڈ آئی لینڈز - مالٹا - ماری شیئس - سائپرس کا انتظام بھی مانند برٹش گائنا کے ہے اور گوکہ انگریزی کلونیل سکرٹری فی الواقع اس کا انتظام کرتا ہے تاہم برائے نام یہ صوبہ

ٹرکی کا مقبوضہ سمجھا جاتا ہے۔

پنجم۔ وہ نوآبادیاں اور دیگر ممالک جہاں لیجسلیٹو کونسل تاج انگلینڈ مقرر کرتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔ برٹش ہونڈورس۔ فوک لینڈ۔ سینٹ لوسیا۔ سینٹ ون سنٹ۔ ٹرانڈاڈ۔ گراناڈا ایسٹ افریکن پروٹیکٹوریٹ۔ گیمبیا۔ گولڈ کوسٹ۔ سیرا لون نائجریا جنوبی۔ نیاسی لینڈ۔ سیلون۔ ہونگ کونگ۔ اسٹریٹ سٹلمنٹ۔

ششم۔ وہ نوآبادیاں اور زیر حفاظت صوبے جہاں کی حکومت ایک ایک ہائی کمشنر کے سپرد ہے اس کے مشورہ کے لئے کوئی کونسل نہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں۔ اشانٹی۔ بسوٹو لینڈ۔ بیکوانا لینڈ جبرالٹر۔ نائجیریا شمالی۔ گولڈ کوسٹ کا شمالی حصّہ۔ سینٹ ہلینا۔ سمالی لینڈ۔ اوگنڈا۔ دی ہائی وائی۔

مغربی جزائر بحر کاہل جسمیں کئی جزائر ہیں

ہفتم۔ وہ ممالک جہاں باختیار رائل چارٹر کمپنی انتظام کرتی ہے مثل ایسٹ انڈیا کمپنی کے افریقہ میں ایک کمپنی بنام برٹش ساوتھ افریقہ کمپنی صوبہ مشہور روڈیشیا کا انتظام کرتی ہے یہ کمپنی کلونیل سکریٹری کے ماتحت ہے۔ سوائے ہندوستان کے مندرجہ بالا ممالک کا کلونیل سکریٹری سے سابقہ پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر چوتھے سال ایک امپیریل کانفرنس بھی ہوتی ہے جس میں قوانین کے وضع کرنے کے متعلق تجاویز پیش ہوتی ہیں۔ اس میں جملہ نوآبادیوں کے سفیر جمع ہوتے ہیں کلونیل سکریٹری اس کا ممبر ہوتا ہے اور وزیر اعظم انگلینڈ باستحقاق عہدہ اس کا پریزیڈنٹ ہوتا ہے۔

رعایا | سوائے جاپان کے دنیا کے ہر قوم وملت کے لوگ تاج انگلینڈ کی رعایا برٹش ایمپائر میں موجود ہیں بقول حافظ ؎

نہ من براں گلِ عارض غزل سرایم وبس کہ عندلیبِ تو از ہر طرف ہزار انند

یعنی صرف ہندیوں کو ہی یہ فخر حاصل نہیں کہ وہ برٹش رعایا ہیں بلکہ کوئی ملک اور مذہب ایسا نہیں ہے جنمیں سے کوئی نہ کوئی رعایا برٹش نہو۔ روسی۔ جرمن۔ فرنچ۔ اطالیہ۔ برتوکیس۔ ہسپانی ایرانی۔ عربی۔ افغانی۔ مصری۔ افریقی۔ چینی۔ امریکن وغیرہ وغیرہ جملہ اقوام میں سے تاج انگلینڈ کی رعایا میں ملیں گے۔ گو اُن کی اپنے ملکوں میں بادشاہت اپنی اپنی قوم کی موجود ہے۔

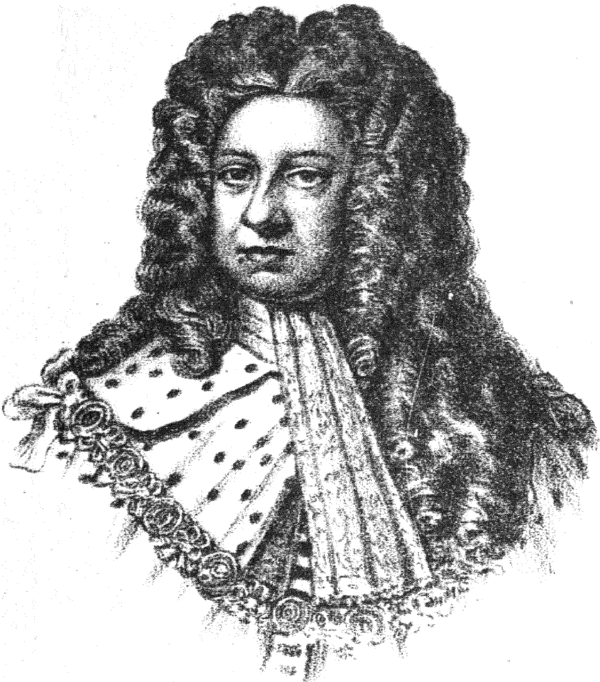
زبان | دریافت سے سائیکلوپیڈیا بنانے والے نے تحقیق کیا ہے کہ کوئی دنیا کی زبان (سوائے جاپان کے) ایسی نہیں کہ برٹش ایمپائر کے کسی نہ کسی حصّے میں نہ بولی جاتی ہو۔

گزشتہ مملکتیں | کلدانی۔ ایرانی۔ ہندی۔ چینی۔ روما۔ یونانی۔ اسلامی مصری۔ بدہست۔ سلطنتیں گذری ہیں لیکن آج تک اتنی عظیم الشان سلطنت کا تاریخ پتہ نہیں دیتی جو برٹش ایمپائر کے قریب وسیع ہوئی ہو۔ خواہ بلحاظ حسنِ انتظام رقبہ آبادی خواہ بلحاظ اقوام ومذاہب کے برٹش ایمپائر اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ یوں تو امریکن قوم اپنی بادشاہت خود کرتی ہے لیکن وہ بھی دراصل انگلینڈ کی ہی ایک شاخِ بریدہ ہے جو نئی دنیا میں سرسبز ہو کر ایک بڑا درخت بن گئی ہے۔

برٹش ایمپایر کی ہنوز ترقی مسدود نہیں۔ نہ کوئی خدانخواستہ آثار کمزوری کے معلوم ہوتے ہیں بچاس سال آیندہ تک نقشۂ دنیا میں چند اور ملک بھی تاج انگلینڈ کی حفاظت میں آنے کی امیّد کی جاتی ہے۔

معاملات تجارت اور ملکی ضرورتیں یوماً فیوماً ایسی وقوع میں آتی جاتی ہیں کہ ایک وقت آوے گا کہ مفتوحہ رعایا کا انتظامِ ملک میں کلحقہ دخل ہو گا اور کوئی نہ کہہ سکے گا کہ من دیگرم تو دیگری۔

شمیم



George I



George II



George III



George IV

جارج اوّل سے جارج چہارم تک

سلسلۂ فرماں روایان انگلستان میں خاندان ہانوور کو اُن مفید اثرات کے لحاظ سے جو اس عہد میں ظہور پذیر ہوئے اور جن سے ملک کی سیاسی۔ معاشرتی۔ اور تمدنی کیفیات میں دلپذیر اضافہ ہوا قابلِ وقعت امتیاز حاصل ہے۔ مادرِ مشفقہ ملکہ وکٹوریہ مرحومہ اور اُن کے صلح جو جانشین ایڈورڈ ہفتم کے بابرکت زمانے میں علوم وفنون کی اشاعت اور سلطنت کی وسعت وغیرہ کے لحاظ سے حکومت برطانیہ کی عظمت کا سکّہ ایک عالم میں بیٹھ گیا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ان ترقیوں کی ابتدا بہت پیشتر ہو چکی تھی اور ان کا کریڈیٹ ایک خاص حد تک پیشرو حکمرانوں کو بھی ملسکتا ہے جنمیں جارج اوّل سے جارج چہارم تک خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان ابتدائی حکمرانانِ خاندان ہانوور کے کارناموں پر ایک طرف امتدادِ زمانہ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اور دوسری طرف گلرے اور تھیکرے کی تصنیفات نے جنمیں نکتہ چینی کا پہلو زیادہ ترمدِّنظر رکھا گیا ہے۔ اُن کے عہد کی خصوصیات کو بہت مدّھم کر دیا ہے تاہم غائر نظر سے اصل حقیقت منکشف ہو سکتی ہے۔

جارج اول

(ولادت ۱۶۶۰ء۔ تاجپوشی ۱۷۱۴ء۔ وفات ۱۷۲۷ء)

الکٹر آف ہانوور کو انگلستان کی حکومت اپنی ماں صوفیہ کے جانشیں ہونے کی حیثیت سے ملی تھی۔ صوفیہ انگلستان کے جیمس اوّل کے سلسلۂ نسب میں منسلک ہونے اور اسطرح خاندان اسٹوارٹ کے قائم مقام ہونے سے کوین این کے بعد قانون وراثت کے رُو سے تخت انگلینڈ کی مالک سمجھی جاتی۔ اور خود اُسے ذاتی طور پر اس حق کے حاصل کرنے کی بیحد تمنا تھی۔ لیکن جب اسکی تکمیل کا وقت آیا تو اس سے کچھ پیشتر ہی (۱۷۱۴ء) صوفیہ اس دنیا سے گذر چکی تھی اور اس لئے اُسکے حقیقی وارث کی حیثیت سے ۱۷۱۴ء میں جارج اوّل کو انگلستان کی فرمانروائی اور جہانبانی کا خلعت زیب بر کرنا پڑا۔

جارج کی تربیت وتعلیم کا زمانہ ہانوور میں بسر ہوا تھا جو مملکت جرمنی میں واقع ہے اور اب تک اُسے انگلستان کی طرز معاشرت اور اہل انگلستان کے جذبات وخیالات سے واقفیت حاصل کرنے کا مطلق موقع نہ ملا تھا۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ وہ انگریزی زبان سے بھی نابلد تھا۔ جرمنی گویا اُسکی مادری زبان تھی لیکن وزرا، انگلستان کو اس سے مَس نہ تھا۔ اور اس لئے مہماتِ ملکی میں بادشاہ کو ارا کینِ سلطنت اور ان کو بادشاہ کی رائے اور اصلی منشا معلوم کرنے میں خاص طور سے دقّت ہوتی تھی۔ ذاتی طور پر بھی جارج کو اپنی نئی مملکت اور نئی رعایا کے کاموں میں چنداں دلچسپی نہ تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ جس سلطنت کی مالک ومختار بننے کا خواب صوفیہ ہمیشہ دیکھتی رہی اُس پر قابض ومتصرف ہونے کے بعد بھی جارج کو کسی قسم کی خوشی نہیں حاصل ہوئی۔ اُسکا خیال تھا کہ جب ایک "اجنبی ملک" کے باشندوں نے خود اپنی قسمت کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دی تو اُسے مجبوراً اس ذمّہ داری کو

قبول کرنا پڑا۔گو یا ذاتی طور پر اسے انگلستان آنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔اس قسم کے خیالات کے ہوتے ہوئے یہ امید کرنا کہ اُسے باشندگانِ انگلستان کے ساتھ پوری پوری ہمدردی رہی ہوگی خلافِ قیاس ہے۔ان باتوں نے انگلستان والوں کے دل بھی پھیکے کر دئے تھے تاہم بہ حیثیت مجموعی جارج اوّل کا عہد پُرامن رہا اور اس سے پبلک کو جو سکون و اطمینان حاصل ہوا گو یا اُس نے اوّل الذکر فرو گذاشتوں کی کافی تلافی کر دی۔

ملکہ این کے انتقال کے بعد تختِ انگلستان خالی تھا اور عام مورّخوں کا خیال ہے کہ جارج اوّل کے آجانے سے ان تفکرات و پریشانیوں کا ازالہ ہو گیا جنکا ایسے نازک موقع پر پیدا ہونا ایک قدرتی بات ہوتی ہے گو یا جارج اوّل نے سلطنت کو بچا لیا اور اپنے قول کے بموجب خود کو مبتلائے تکلیف کر کے ملک کے لئے امن و آسائش کا سامان بہم پہنچایا اور" اس لئے برطانیہ کو اس کی ذات پر فخر کرنے اور اس کے کارناموں کا ممنون منّت ہونے کا ہر طرح حق حاصل ہے"۔

۱۷۲۷ء میں جارج اوّل نے اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا اور

جارج ثانی

(ولادت ۱۶۸۳ء۔تاجپوشی ۱۷۲۷ء۔وفات ۱۷۶۰ء)

کے سر پر تاج شاہی رکھا گیا۔

جارج ثانی کا بھی ابتدائی زمانہ ہینوور میں گذرا تھا اور اس لئے اس کی عادات و خصائل میں وہاں کے خیالات کا عکس موجود تھا۔تاہم انگلستان سے اس کو اپنے پیشرو کی طرح زیادہ اجنبیت نہ تھی اور اسکے عہد میں انگلستان میں تجارتی و تمدنی حیثیت سے جو جو ترقیاں ہوئیں ان کے اعتبار سے اس کا نام ہمیشہ یادگار عالم رہے گا۔

اس وقت انگریزی قوم تہذیب و تمدن کے میدان میں نہایت تیزی سے سرگرم رفتار تھی اور اس کی افراد تمام اقطاعِ عالم میں پھیلی ہوئی تھیں۔تجارت کی وسعت کے ساتھ حدودِ سلطنت میں بھی ترقی ہو رہی تھی۔یہی زمانہ ہے کہ مشہور انگریزی جنرل لارڈ کلایو جس کی الوالعزمیوں نے ہندوستان کی زمین میں انگریزی حکومت کا بیج ڈالکر یہاں کی تاریخ میں ایک روشن باب اضافہ کرنے کا باعث ہوئیں، پہلے وہ مدراس پریسیڈنسی کی تسخیر میں مصروف تھا اور اس کے بعد جنگ پلاسی کے فیصلہ کُن انجام نے گو یا گورنمنٹ برطانیہ کے ہاتھوں میں ہندوستان کی عنان حکومت دے دی۔یعنی اہل ہندوستان آج گورنمنٹ عالیہ کے سایۂ عاطفت میں رہ کر جن برکات سے مستفیض ہو رہے ہیں ان کی ابتدا اسی زمانہ میں ہوئی تھی۔

جارج اول کے برخلاف اسکے جانشین جارج ثانی میں وہ جذبات موجود تھے جن کے بغیر کوئی حکمراں طبقہ رعایا میں ہر دلعزیزی کی سند نہیں پا سکتا۔شاہنشاہ بیگم کیرولائن بھی ملکی فلاح و بہبود کے وسائل سوچنے اور عملی طور سے انھیں قوت سے فعل میں لانے اور درجۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنے شوہر کی شریک تھی اور اس وجہ سے رعایا بھی بادشاہ و ملکہ دونوں کو عزّت و محبّت کی نظر سے دیکھتی تھی۔

جارج ثانی کے زمانۂ حکمرانی میں انگلستان کو جو فوائد حاصل ہوئے اور اُسکی وقعت و عظمت و امن و آزادی میں جو گونا گوں ترقیاں ہوئیں ان میں شاہزادہ فریڈرک کے وجود سے جو اوّل الذکر کا وارث اور تختِ سلطنت کا مالک بننے والا تھا چند در چند اضافے کی امید کی جاتی تھی لیکن اُس کے غیر متوقع انتقال نے

باپ کے سامنے ہی اس دل خوش کن امید کا خاتمہ کر دیا۔ ذاتی طور پر وہ بہت سوشل (معاشرت پسند) واقع ہوا تھا اور خیال ہے کہ اگر اسے تخت نشیں ہونے کا موقع ملتا تو اس کے دربار میں اسٹوارٹ کی سی دلاویزیاں پیدا ہو جاتیں۔ علوم و فنون سے اسے طبعی دلچسپی تھی اور عام رائے کے بموجب اس کی ناگہانی موت انگلستان کے حق میں ناقابلِ تلافی نقصان سے تعبیر کی جاتی ہے۔ اُسکی ۹ اولادیں ہوئیں جن میں سے خلفِ اکبر

جارج ثالث

(ولادت ۱۷۳۸ء۔ تاجپوشی ۱۷۶۱ء۔ وفات ۱۸۲۰ء)

کے نام پر قرعۂ حکومت ڈالا گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ نپولین اعظم کی جنگجوئیاں امنِ عالم کو خطرے میں ڈالے ہوئے تھیں اور کم از کم یورپ ان کے ہول سے غیر معمولی سیاسی مشکلات میں اُلجھا ہوا تھا لیکن ۱۸۱۵ء میں ڈیوک آف ولنگٹن کی ہمت آزمائیوں نے واٹرلو کے میدان میں فرانسیسی افواج کو شکست فاش دیکر جہاں ایک طرف ان مصائب کا خاتمہ کر کے یورپین ممالک کو آرام کی نیند سونے کا موقع دیا۔ وہاں انگریزی افواج کی جلادت و جوانمردی کا سکہ بٹھا کر تمام دنیا میں انگریزی رسوخ کی جڑ مستحکم کر دی۔ اہلِ امریکہ کے حصول آزادی کی کوششیں جو بالآخر سرسبز ہو کر رہیں اس عہد کے قابلِ ذکر واقعات میں سے ہیں اور وہ مساعی جمیلہ جو تجارتِ غلامان کے مسدود کرنے میں عمل میں لائی گئیں دولت انگلشیہ کے اوصافِ عدل ومساوات کو قیامت تک چمکاتی اور اس کے نام کو "حامیانِ بنی نوع انسان" کی فہرست میں نمبر اوّل پر لکھے جانے کا استحقاق جتاتی رہیں گی اور اس امر خیر میں تاریخ عالم کے زرّیں صفحات جارج ثالث کے عہد کی اس خصوصیت اور فصحِ انگلستان پٹ یم اور ولبرفورس کے ہمدردانہ جذبات و دردمندانہ خدمات کو روشن حرفوں میں آنے والی نسلوں کے سامنے پیش کر کے ان کی مستقل یاد دلاتے رہیں گے۔

اس کے علاوہ جارج ثالث کے شصت سالہ عہدِ حکومت سے اور بہت سی اصلاحات وابستہ ہیں جنکی وجہ سے آج بھی ایک عالم ہزاروں اور لاکھوں تمدنی واقتصادی فوائد حاصل کر رہا ہے فنِ زراعت کی ترقی کے ساتھ جانوروں کی اصولی پرورش ونگہداشت کے سامان مہیا کئے گئے۔ روئی کاتنے کی مشین ایجاد ہوئیں۔ اسٹیم انجن جسکا بر فاد وجود اپنے عالی دماغ موجد جیمس واٹ کی ذہنی قابلیت اور طباعی کا شرمندۂ احسان ہے اسی عہد کی یادگار ہے۔ ان نفع بخش اصلاحات و ترقیات کا سلسلہ جسکی ابتدا انقلاب فرانس کے خاتمہ کے بعد سے سمجھنی چاہیے

جارج رابع

(ولادت ۱۷۶۲ء۔ تاجپوشی ۱۸۲۱ء۔ وفات ۱۸۳۰ء)

کے عہد میں بھی جاری رہا۔ اور باوجودیکہ اور کئی قراین سے اسکا زمانہ عام مورخین کے خیال کے مطابق غیر اطمینان بخش رہا تاہم ملکی ترقی کی جو رَو چل نکلی تھی وہ موقوف نہیں ہوئی۔ انگریزی تجارت کا دائرۂ اثر بڑھتا گیا۔ ممالک محروسہ میں سڑکیں اور آرام دہ راستے تیار کئے گئے۔ سواری اور باربرداری کی گاڑیاں رائج ہوئیں۔ جارج اسٹیفنسن نے اسٹیم انجن کے بعض نقائص کی اصلاح کر کے ریل گاڑیوں کے چلنے کا خواب پورا کر دیا اور پہلی ریل وہ تھی جو سٹاکٹن سے ڈارلنگٹن تک چلائی گئی اور دوسرا ریلوے سلسلہ لورپول سے مینچسٹر تک قائم کیا گیا۔ ذاتی طور پر جارج چہارم اوّل اوّل بالکل انگریزی خیالات کا پابند تھا لیکن شادی کے بعد اس کی زندگی میں بہت بڑا

انقلاب آیا جس نے اس کی ہر دلعزیزی میں نمایاں فرق پیدا کر دیا۔ ملک کی عام حالت بھی آخر آخر قابلِ اطمینان نہ رہی تھی۔ اور آئے دن کی شورشوں اور سازشوں سے امن عامہ میں خلل پڑنے کا قوی اندیشہ تھا اور شاید یہ اندیشہ ایک دن پورا ہو کر رہتا اگر اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی ولیم چہارم عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیکر پارلیمنٹری اصلاحات کے ذریعہ ان کا انسداد نہ کر دیتا۔

سیّد محمد فاروق

حضور ملک معظم شہنشاہ جارج پنجم

"جن باتوں کی امید نہیں ہوتی وہی ہمیشہ وقوع میں آتی ہیں" اس بات کی ایک نہایت واضح اور نادر مثال شہنشاہ جارج پنجم کی حیات بابرکات اور طرز روش ہے۔ شاہنشاہ معظم کی مسعود ولادت بھی اس بات کی شہادت دیتی ہے۔

جون ۱۸۶۵ء کی دوسری تاریخ تھی۔ والد ماجد کے یہاں دعوت کا اہتمام تھا۔ کوئی چالیس دوست احباب مدعو تھے جن میں سے اب صرف Princess Hohenlohe اور Lady Alfred Paget موجود ہیں۔ کسے خیال تھا کہ دوسری صبح کو ٹھیک ایک بجکے ۱۵ منٹ پر آپ کتم عدم سے پردۂ وجود میں تشریف فرما کر راحت بخشِ عالم و عالمیاں ہوں گے۔ پھر آپ کا ولیعہد سلطنت کے معزز و ممتاز عہدہ پر سرفراز ہونا بھی ایک اتفاقیہ اور خلافِ امید واقعہ تھا۔ اور یہی حال شاہزادی صاحبہ سے ربط و محبت کا ہے جن سے آپ ایام طفولیت سے ہی یکجان دو قالب تھے۔

یہ واقعی ایک حیرت انگیز بات ہے کہ ایک بار شاہزادی صاحبہ کی والدہ ماجدہ (ڈچز آف ٹک) نے یہ فرمایا تھا کہ اگر مجھے اس وقت تمام یورپ میں اپنی کمسن لڑکی کے لئے خاوند انتخاب کرنے کو کہا جائے تو میں نہایت خوشی سے پرنس آف ویلز (شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم) کے فرزند دوم کو انتخاب کروں۔

حضور ملک معظم کے صادق سے صادق دوست کو کبھی خواب میں بھی خیال نہ گذرا ہوگا کہ اعلیٰ ترین مسند حکومت پر پہنچتے پہنچتے حضور کے اخلاق و عادات میں ایسی واضح و بیّن ترقی ظہور میں آئے گی اس وقت تک کسی کو بھی اُس نعمت غیر مترقبہ یعنی یکسوئی طبع و ارتکاز خیال کی کافی واقفیت نہ تھی جو حضور کو خزانۂ قدرت سے عطا ہوئی ہے اور جس کے باعث اب حضور کا یہ حال ہے کہ ہر چیز کو جو ملک برطانیہ سے منسوب کی جاتی ہے حضور اُسی قدر عزیز رکھتے ہیں جیسے اپنی خاص اور ضرورت کی چیزوں کو۔

حضور کی حیات بابرکات تعجب انگیز باتوں کی ایک طولانی فہرست پیش کرتی ہے بمقام گلڈ ہال میں حضور نے اپنے اہلِ ملک سے جو تقریر "انگلینڈ! جاگ اُٹھ" کے عنوان سے کی تھی اور جس نے صدائے نقارہ بنکر تمام باشندگان ملک کو اپنی خداداد لیاقتوں اور ذمہ داریوں کے مطابق کام کرنے پر آمادہ کیا تھا، حیرت انگیزی کی ایک دوسری مثال ہے

کیونکہ یہ تقریر اُن تمام اوصاف کا اظہار کرتی ہے جو کسی اعلےٰ سے اعلےٰ لسّان اور بامعنی مقرر میں ہونے چاہئے۔ کسی کو خیال بھی نہ تھا کہ یہ اعلےٰ اوصاف حضور کی ذات مبارک میں اس کثرت وخوبی سے موجود ہیں۔

حضور ملک معظم شاہنشاہ جارج پنجم کی ضرورت سلطنت کو ایسے وقت پڑی جب عام خیال یہ تھا کہ حضور کے والد محترم شاہنشاہ آنجہانی کے قوا فضل الہٰی سے ایسے مضبوط ہیں کہ ایک کیا چند سال تک وہ زمانہ کی صعوبات اور ہجوم افکار کے سخت مقابلہ میں کامیاب رہیں گے۔ واقعات کی ایسی معقول جانچ پرتال اور اس قدر سُلجھے ہوئے طریقہ کی سمجھ لینے کی قابلیت جیسی کہ حضور ممدوح کو حاصل ہے واقعی کمیاب ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ خزانۂ قدرت سے حضور کو جدّتِ تخیّل ورسائی فکر سے بھی کافی حصّہ ملا ہے۔ اسکی زندہ مثال وہ انتظامات ہیں جو حضور نے بذاتِ دہلی دربار کے مبارک اور قابل یادگار موقع کے لئے تجویز فرمائے ہیں۔ نہ صرف انتظامات و انتخابات بلکہ یہ خیال بذاتِ خود حضور ہی کی جدت طبع کا ادنیٰ نمونہ ہے۔

خلاف امید باتوں کے واقع ہونے کا ایک اور موقع خاص طور سے قابل ذکر ہے، جو حضور کی بچپن کی شوخی کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ ایک بار جب قصر ونڈسر میں خاندانی دعوت تھی شاہزادہ جارج نے کسی بات پر اپنی جدّہ محترمہ کو ناراض کر دیا۔ اُنھوں نے شاہزادہ کو میز کے نیچے چلے جانے کا حکم دیا اور کہا کہ جب تک تمہاری طبیعت درست نہ ہو جائے تم وہیں ٹھہرے رہو۔ کچھ دیر بعد آواز آئی "دادی صاحبہ اب میری طبیعت بالکل ٹھکانے سے ہے"۔ جواب ملا "بہت اچھا اگر تم درست ہو گئے ہو تو باہر نکل آؤ" فوراً آپ باہر نکل آئے۔ لیکن اس وقت آپ مادر زاد ننگے تھے۔ بات یہ تھی کہ آپ نے میز کے نیچے اپنا تمام وقت کپڑے اُتارنے میں صرف کیا تھا۔

بچپن کے زمانے کے بعد سے "جامعیت" (Thoroughness) حضور کی امتیازی صفت مانی جاتی تھی۔ آپ نے کسی ایسے فرض یا ایسے کام کرنے کا قصد کبھی نہیں کیا جس کا جامع اور کامل طور پر کیا جانا حدِّ امکان سے باہر ہو۔ ایسی تو شاید ہی کوئی مثال مل سکے کہ کسی کام کو حضور نے ہاتھ لگایا ہو اور اُسے بخوبی تمام انجام کو نہ پہنچایا ہو۔ ایّام طفولیت ہی سے حضور نہایت قوی اور صحیح الجثہ تھے۔ آپ کو چھوٹے چھوٹے قوتِ جسمانی کے تماشے دکھانے کا بھی کسی حد تک شوق تھا۔ مثلاً اپنے ساتھیوں کو زمین سے اُٹھا لینا۔ اپنی والدہ ماجدہ کو اپنے آغوش میں لے لینا وغیرہ۔

اوائل عمر ہی سے آپ گھوڑے کی سواری کے دلدادہ تھے اور یہ بات حیرت انگیز ہے کہ آپ اس فن میں اپنے برادر بزرگ سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے جو امپیریو کیولری کے افسر تھے اور بعد کو اعلےٰ درجے کے شہسواروں میں شمار کئے گئے۔ جب حضور والا کی عمر تیرہ اور اُنیس برس کے درمیان تھی آپ کا بہت سا وقت شکاری کتوں کے ساتھ شکار میں گذرتا تھا۔ ایسے اوقات میں حضور کے ساتھ محض مختصر سامان ہوا کرتا تھا۔ یہ اوقات حضور کے نہایت ہی خوشی کے لمحوں میں ہوتے تھے اور اس مختصر سامان کے ساتھ آپ نہایت اطمینان سے کھلے میدان میں جتنی دیر ممکن ہوتا تھا رہتے تھے۔ شہزادہ جارج اُس وقت بہت سے کھیلوں میں حصّہ نہ لیتے تھے لیکن جنھیں ہاتھ لگاتے تھے، خوب کھیلتے تھے۔ لان ٹینس خاص کھیل تھا اور اسوقت جبکہ آپ بحری لفٹننٹ تھے، اُن دو اعلیٰ درجہ کے کھیلنے والوں میں ایک تھے جنھوں نے دنیا کے قریب قریب بہت سے حصص میں جا کر مختلف مقامات کے

اعلیٰ سے اعلیٰ کھیلنے والوں کے مقابلے میں کھیلا تھا اور ہمیشہ شاندار اور نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔حضور شہنشاہ کی نشانہ بازی ایک ایسی مشہور بات ہے جسکے ذکر کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔لیکن شاید کم لوگ جانتے ہوں گے کہ حضور باوجود ایک چالاک اور بے مثل نشانہ باز ہونے کے عالی ہمتی اور بے غرضی کو مدّ نظر رکھتے ہیں۔ان موقعوں کا مذکور نہیں جبکہ نشانہ بازی کے وقت خاص ادب کی پابندی کی جاتی ہو جس کے مطابق سب سے اچھا مقام اور سب سے پہلی گولی لگانا گویا معزز ترین شخص کا حق ہوتا ہے ورنہ یوں بالعموم جب ادب کی ایسی سخت پابندی نہیں ہوتی اور جہاں تکلیف کا برتاؤ نہیں ہوتا آپکا یہ ہمیشہ مقصود ہوتا ہے کہ ہمراہیوں کو بھی کامیابی اور ناموری کا موقع دیا جاے۔

حضور ملک معظم کی اعلیٰ تربیت نے حضور کو اس مسئلہ پر عمل کرنے کی تعلیم دی ہے کہ "پیسے کا خیال رکھو، اشرفیاں خود اپنا خیال رکھیں گی"۔ باوجود سخاوت و دریادلی کے آپ کبھی فضول خرچی کو کام نہیں فرماتے اور نہ روپیہ ضائع کرنے کی عادت ہے۔ایک موقع کا ذکر ہے کہ حضور ٹینس کھیلنے کے لئے تبدیل لباس میں مصروف تھے اور کوئی ادنیٰ سکہ جیب سے نیچے گر پڑا۔ باوجود ایک دوست کی سخت ضد کے جسے کھیلنے کی دُھن تھی آپ نے خود جھک کے سکہ کو تلاش کرنا شروع کیا یہاں تک کہ سکہ مل گیا مگر کچھ ہی دیر بعد حضور نے ایک ہمراہی خادم کو ایک معقول رقم بطور انعام عطا فرمائی۔

بائیس سال کے سن میں جبکہ آغاز سبزہ سے آپ کے چہرے میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی تھی، آپ نے نیپلز میں جہاز چھوڑ کر کینیس کا سفر کیا جہاں والد ماجد کی زیارت منظور تھی راہ میں اٹلی کے چنگی خانہ کے لوگوں نے سخت پریشان کیا جب تک کل اسباب دیکھ بھال نہ لیا روانگی کی اجازت نہ دی۔ شاہزادے نے ہر چند اپنا حال بیان کیا اور اس امر کے ثبوت میں تمغے اور سندیں پیش کیں، لیکن کسی نے یقین نہ کیا۔لوگوں کو شاہزادہ کے پہلے کے فوٹو ہیں اور اب کی حالت میں ایسا نمایاں فرق نظر آیا کہ شاہزادے کو شاہزادہ تسلیم کرنے میں سخت تامل کیا۔

ایسے ہی ایک اور مرتبہ دقت پیش آئی تھی۔سفر شاہی کے دوران میں ایک موقع پر ایک لیڈی (جو بذاتہٖ نہایت معزز و مقتدر خاتون تھی لیکن آداب مجلس سے ناآشنا تھی) شہزادے کو بالکل نہ پہچان سکی۔ڈیوک آف کارنوال کے یہاں لنچ کی دعوت تھی۔اس لیڈی نے جسکا تعارف بھی باقاعدہ حضور سے نہ ہوا تھا ایسے پراگندہ و پریشان کن سوالات کئے کہ کئی بار ڈیوک کو خیال ہوا کہ وہ اصل واقعہ کو بتلا کر اُسے شرمندہ کر دے

شہنشاہ معظم کے ادائے فرض کے ایسے عمیق و قابل قدر خیالات کی بنیاد مذہب پر ہے۔متبرک چیزوں اور مقامات کی عزت کرنے کی تلقین پدر بزرگوار سے بھی ہوئی ہے اور والدہ محسنہ سے بھی۔شہنشاہ آنجہانی کے مذہبی عقائد ویسے ہی اعلیٰ اور مضبوط تھے جیسے سادہ اور خردمندانہ۔ والدہ ماجدہ کا یہ حال تھا کہ اُنھوں نے بچوں کے دلوں پر یہ نصیحت نقش کا نجر کر دی تھی کہ ایک دن بھی بغیر انجیل مقدس کے مطالعہ کے نہ گزرنے دیں

جیسے اور سنجیدہ لوگوں کا خاصہ ہے شہنشاہ جارج بھی بچوں کی توجہ خاص طور سے اپنی جانب مبذول کرا سکتے ہیں اور ایسے بچوں کی توجہ جن سے گفتگو کرنے کی حضور کو نوبت بھی نہ آتی ہو۔صبح کا ایک گھنٹہ حضور کے لئے خاص خوشی کا وقت

ہوتا ہی کیونکہ اُسوقت آپ اپنے عزیز بچّوں کے پیار کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس وقت بچّے اپنے طفلانہ تجربات و تکلیفات صاف طور پر والدین سے عرض کرتے ہیں اور اپنے نئے نئے کھیلوں کا حال مشرح بیان کرتے ہیں کھیل عموماً نہایت ہی سادہ اور کم قیمت ہوتے ہیں۔ قیمتی اور با تکلف کھلونے بادشاہی محل میں قطعی راہ نہیں پاتے۔

حال کے ایک واقعے سے صاف ثابت ہے کہ بادشاہ کو اپنے بچّوں سے کیسی محبت ہے۔ ایک افسر جو ہندوستان میں تھا ایک تمغہ کا مستحق ٹھہرا لیکن قبل اس کے کہ وہ تمغہ پاسکے اسکا انتقال ہوگیا کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کی بی بی کے پاس شاہی فرمان صادر ہوا کہ اگر اس کے کوئی لڑکا یا لڑکی ہو تو اس کو لے کر قصر بکنگھم میں حاضر ہو جنرل کی بی بی مع اپنے پنج سالہ لڑکے کے وہاں حاضر ہوئی۔ لوگ اسکو حضوری میں لے گئے اور وہ بادشاہ کے سامنے موجود ہوئی۔ بادشاہ نے بچّے کو اپنی جانب بلایا اور اس کے باپ کا تمغہ اُسکو دے کے کہا "تم نہیں جان سکتے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ مگر مجھے امید ہو کہ تم بہت جلد اس بات کو جان لوگے۔ مجھے بتاؤ کہ جب تم جوان ہوگے تب کیا کام کروگے؟

لڑکا۔ میں اپنے باپ کی طرح سپاہی ہونا پسند کروں گا۔

بادشاہ۔ مگر میری راے یہ تھی کہ تم اپنے بادشاہ کے مانند جہاز راں ہوتے اور یہی بہتر بھی تھا۔

لڑکا۔ (اس نے ضد کر کے کہا) جی نہیں میں اپنے والد کی طرح سپاہی ہوں گا اور یہی میری خواہش ہے۔

کچھ دیر بعد بات چیت ختم ہوئی اور لڑکے نے دروازہ کے پاس پہنچ کے کہا "گڈ بائی جناب مجسٹریٹ صاحب" اس غلطی کی وجہ یہ تھی کہ لڑکے کا باپ ہندوستان میں ایک عرصہ تک مجسٹریٹ بھی رہ چکا تھا۔ بادشاہ نے مہربانی سے مسکرا کر کہا "آہا تم نے اپنا سبق خوب یاد کیا ہے۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ بالکل درست یاد نہیں ہے۔

مشہور مقولہ ہے کہ "آدمی کی قدر اس کے دوستوں سے ہوتی ہے" دوستوں کی تعداد کے لحاظ سے تو شہنشاہ معظم اپنے والد بزرگوار سے بہت پیچھے ہیں جن کے دوستوں کا حلقہ یورپ کے ہر فرقہ اور ہر قوم اور ہر ملت کے لوگوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ بات مسلّم ہے کہ ہمارے شہنشاہ معظم کے ذاتی دوست صرف چند لوگ ہیں لیکن یہاں بھی وہی جامعیت مدِنظر ہے۔ جب حضور والا کسی کو اپنا دوست کہکر یاد فرماتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ محض اسکا تعارف کرا یا گیا ہے یا یہ کہ اُس سے دو چار بار ملاقات ہوچکی ہے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ اسکو حضور سے خلوص اور ہمدردی ہے اور دونوں دل صدق و صفا سے وابستہ ہیں۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ شہنشاہ جارج کسی کو اپنا دوست نہیں بناتے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات ہے کہ حضور کی دوستی دیرپا اور قابل اعتبار ہوتی ہے۔

ملکہ میری کے بھائیوں سے حضور کا برتاؤ ہمیشہ محبتانہ اور مخلصانہ رہا ہے۔ فرانسس آف ٹک (جو ایک نہایت باعلم وسیع اور تازی معلومات رکھنے والے نیک باطن شخص تھے) کی موت کا جانکاہ صدمہ حضور کے لئے کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ لڑکپن ہی سے باہم خلوص اور اتحاد کے مراسم تھے اور ایّام جنگ میں جو سال افریقہ میں گذرا تھا اس میں شاید کوئی ایسا ہفتہ نہ گذرا ہوگا کہ باہم رسل و رسائل کا سلسلہ جاری نہ رہا ہو۔

حال کے دوستوں میں لارڈ کچنر خاص طور سے قابل

ذکر ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ قریب چھ سال پہلے جب پرنس آف ویلز ہندوستان تشریف لائے تھے تو آپ کمانڈران چیف کے اعلیٰ مداحوں میں سے تھے لیکن آپ کا یہ خیال تھا کہ ایسے دلیر اور جوانمرد سپاہی سے شاید ہی دوستی قائم ہونا ایک مشکل امر ہوگا۔ لیکن بہت جلد یہ خیال دور ہوگیا۔ اور اب شہنشاہ معظم کے دل میں اس باکمال عالی حوصلہ سپاہی کی قدر اور بڑھ گئی ہے۔ بہت جلد یہ ثابت ہوگیا کہ اسکی دلکش طرز اخلاق سے بادشاہ بھی بہت آسانی سے ملتفت ہو سکتے ہیں اور اب انکی قدر نہ صرف بحیثیت ایک جری اور بہادر سپاہی کے ہوتی ہے بلکہ ان کا شمار حضور کے صادق اور دایمی دوستوں میں ہوتا ہے۔

شہنشاہ معظم کی خصوصیات میں سے یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ مثل اپنے والد بزرگ کے اپنے ہمچشموں میں سچی وفاداری کی روح پھونکدیتے ہیں۔ اور وفاداری بھی ایسی جو ایثار نفسی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ آپ کی خاطر کوئی کام کرنا گویا آپکے کاموں میں شرکت کرنا ہے۔ اپنے خاص نوکروں چاکروں کے لئے حضور کی خبرگیری اور فکرمندی ویسی ہی ہے جیسی رعایا کے لئے۔ حال کا ذکر ہے کہ ایک ملازم جسے رسوخ بارگاہ سلطانی کا فخر حاصل ہو چکا تھا کسی ایسے عہدہ پر مامور ہوا جس میں فی الواقع بہت بڑی امیدیں پائی جاتی تھیں لیکن چند تمہیدی اخراجات کی ضرورت تھی۔ تہیدستی کے باعث یہ مصارف اسکی سدّ راہ ہو رہے تھے۔ یہ خبر سنکر شہنشاہ معظم نے فوراً پیغام روانہ فرمایا کہ "تم اُس عہدہ کو بخوشی سے منظور کرلو۔ ہم نہایت خوشی سے اُن تمہیدی اخراجات کے کفیل ہوتے ہیں"۔

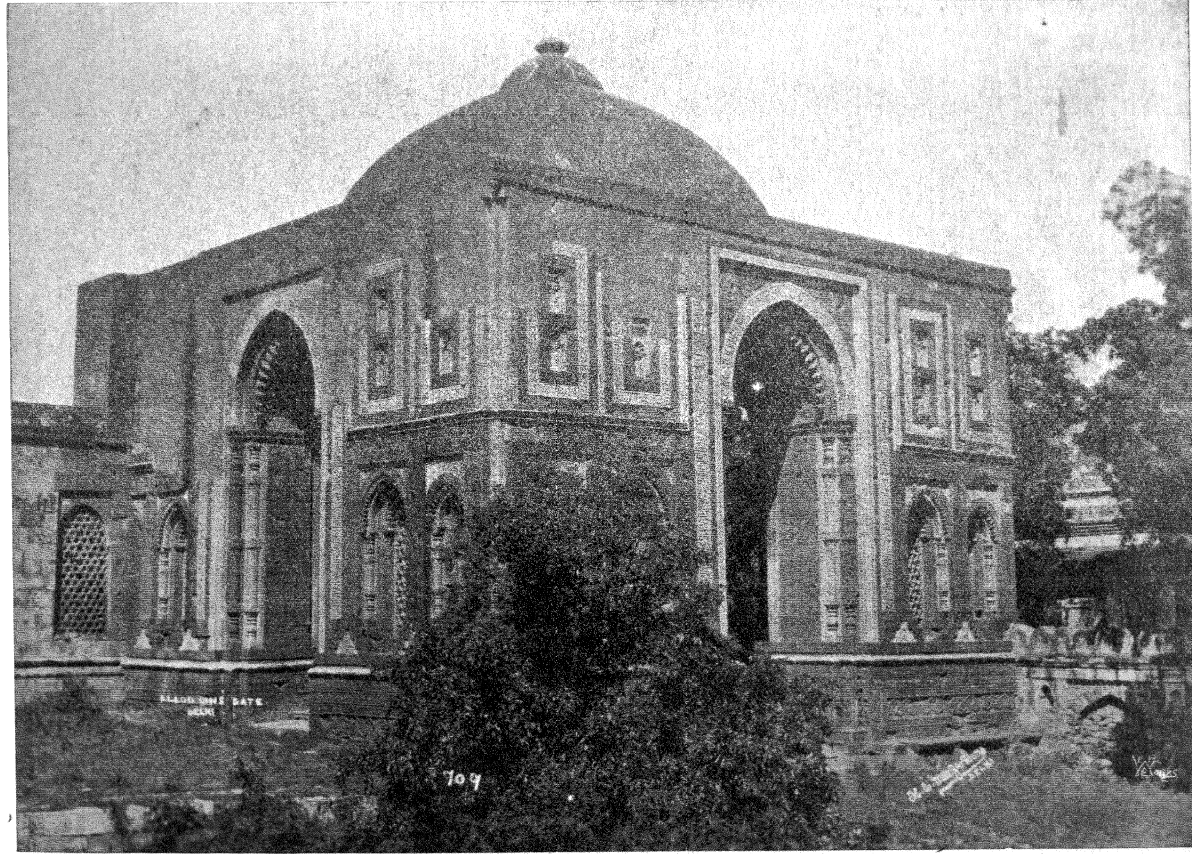
حضور کی زندگی میں ایسے واقعات کمیاب نہیں ہیں۔ شاذ ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو کہ حضور اس بات کا ثبوت نہ دیدیتے ہوں۔ حکومت محض جسمانی اور دماغی قوت سے ممکن نہیں ہے، بلکہ رعایا کی عزت قائم رکھنے اور اسکی حفاظت کرنے میں دلی ہمدردی کو بھی بڑا دخل ہے۔

جگت موہن لال

ملکہ میری

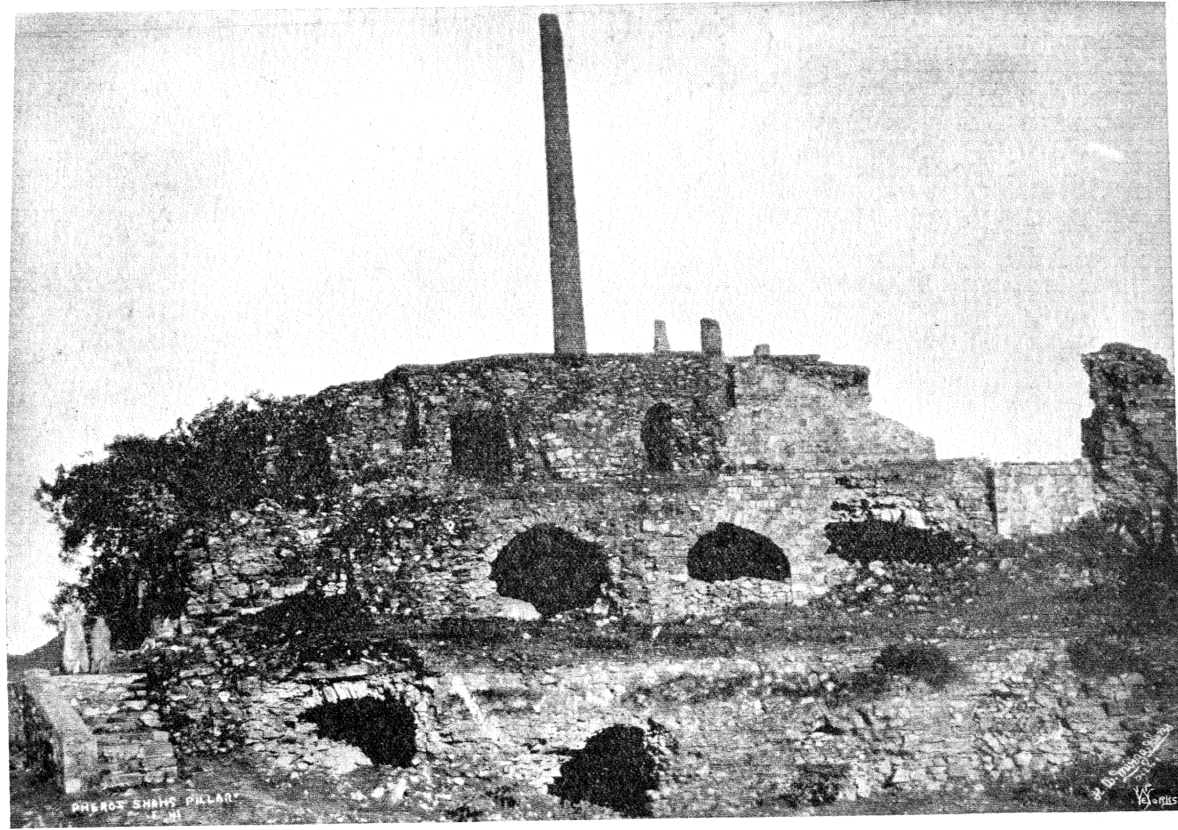
اور
ہندوستان کی گزشتہ مہارانیاں اور شہنشاہ بیگمات

حضور ملک معظم قیصر ہند شہنشاہ جارج پنجم اور اُن کی حرم محترم ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند شہنشاہ بیگم میری کی آمد آمد کی مسرت بار خوشخبری سے اس وقت ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے ہندوستان کی وفاشعار اور اطاعت نشان رعایا فرط مسرت سے پھولی نہیں سماتی ہے کہ اس کے مہربان حکمراں نے اپنی اس دور افتادہ مملکت کے تخت پر متمکن ہونے کے مراسم ادا کرنے کی غرض سے سات سمندر پار سے یہاں تک پہنچنے کی تکلیف گوارا فرمائی اور اپنی جاں نثار رعایا کو اپنے دیدار فرحت آثار کا افتخار بخشا۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے جب سے کہ ہندوستان کے باشندے اپنی قسمتوں کے مالک، اپنی اطاعت و فرماں برداری کے مرجع اور اپنی امیدوں اور تمناؤں کے مرکز کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے سے محروم ہیں۔



दरवाज़ा अलाउद्दीन। 'ALA-UD-DIN'S GATE دروازۂ علاوالدين

Indian Press, Allahabad.



फ़ीरोज़ शाह की लाट ।

FIROZ SHAH'S PILLAR

مينار فيروز شاه

Indian Press, Allahabad.

کارکنانِ قضا و قدر نے جب ہندوستان کی عنانِ حکومت ایک تھکی ہوئی قوم کے فرسودہ ہاتھوں سے لیکر ایک تازہ دم قوم کے ہاتھ میں دی، ہندوستان کے باشندے محض اپنے ولی نعم کے نائبوں ہی کو دیکھکر جیتے رہے۔ اس عرصہ میں انقلاب بھی ہوئے اور دو تین حکمرانوں نے کاروبارِ سلطنت سے سبکدوشی حاصل کر کے ہمیشہ کے لئے قصر ونڈسر کے شاہی گورستان میں آرام کی نیند سونا بھی اختیار کیا، لیکن کسی وقت یہ فخر اور یہ خوش گوار موقع اہلِ ہند کو نہ حاصل ہو سکا کہ وہ اپنے جدید شہنشاہ کی تاجپوشی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا لطف حاصل کرتے۔ اگرچہ ہمارے سابق شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم آنجہانی اور ہمارے موجودہ شہنشاہ جارج پنجم نے ایامِ شاہزادگی میں اس سرزمین کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے ضرور بابرکت کیا تھا مگر وہ صرف ایک ولی عہد شاہزادہ کی حیثیت سے تھا اور یہ ظاہر ہے کہ ولی عہد اور شہنشاہ وقت میں بہت بڑا فرق ہے۔ یوں تو ہم نے شہزادۂ وکٹر مرحوم کو بھی دیکھا تھا اور بحیثیت اپنے آیندہ حکمراں کے دیکھا تھا مگر اس دیکھنے نے ثابت کر دیا کہ شہزادہ و ولی عہد کی حیثیت سے کسی کو دیکھنے کے بعد اسی ذات ستودہ صفات کو بحیثیت شہنشاہ کے دیکھنا بالکل مختلف ہے اور اس لئے دوسرا اثر رکھتا ہے۔ اس کے سوا اہلِ ہند کو بہت بڑی خوشی اس لئے بھی ہے کہ وہ آج اپنی اس شہنشاہ بیگم کو اپنی آنکھوں سے اپنے ملک میں تشریف فرما دیکھتے ہیں جو ایک طرف ملکہ مارگریٹ، ملکہ میری، ملکہ الزبتھ ملکہ این، اور ملکہ وکٹوریہ کے تاج و تخت کی مالک اور دوسری طرف رانی دروپدی، رانی سنجوگتا، سلطانہ رضیہ، ملکہ نورجہاں اور ممتاز محل کی جانشیں ہیں۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ اس مبارک موقع پر ہر شخص کا خیال ان تمام پچھلے جلسوں کی جانب منتقل ہو جو اس سرزمین پر منعقد ہوئے ہیں۔ چنانچہ جب اسی سال ۲۲ جون کو بروز پنجشنبہ ویسٹ منسٹر ایبی کے سنٹ پیٹرز چرچ میں شہنشاہ معظم کی تاجپوشی کے مراسم ادا ہو رہے تھے تو تاریخی مذاق رکھنے والوں کا اشہب خیال کس شوق سے گزشتہ بارہ صدیوں کے واقعات کی سیر کر رہا تھا ۸۰۲ء سے لیکر جبکہ آقا نے اپنے فرزند اگبرٹ کو انگلستان کا بادشاہ بنانے کے مراسم ادا کئے تھے اس وقت تک جو جو انقلاب اور تغیرات ہوتے رہے ان سب کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ ویسٹ منسٹر ایبی ہمیشہ سے شاہانہ جلسوں اور دوسرے رسوم کا مرکز رہا ہے اور اس لئے ہر ایسے جلسہ کے وقت اس کے پچھلے تمام جلسوں کی یاد کا تازہ ہونا ضروری ہے۔ ان مواقع پر ایبی کے سنٹ پیٹرز چرچ کی چپہ چپہ زمین ان تمام بادشاہوں کی تاجپوشی کے شاندار جلسوں کے ساتھ جو یکے بعد دیگرے اس تاریخی مقام پر تخت نشیں ہوئے ہیں ان سب واقعات کو بھی یاد دلاتی ہے جو ان کے عہدِ حکومت میں وقوع پذیر ہوئے۔ یہی حال آج ہندوستان میں دہلی کا ہے۔ ملک معظم شہنشاہ جارج پنجم اور ملکہ معظمہ شہنشاہ بیگم میری کی تاجپوشی کا جشن اس وقت نہ صرف ان جلسوں کی یاد تازہ کر رہا ہے جو ۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے قیصری خطاب اختیار کرنے پر لارڈ لٹن نے اور اس کے چھبیس برس بعد شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کی خوشی میں لارڈ کرزن نے منعقد کئے تھے بلکہ اندرپرست کی بنا رسے لیکر جس کا تعلق پندرہ سو برس قبل مسیح سے ہے اس وقت تک جتنے جشن مختلف تاجداروں کی جانب سے

اس خاص خطہ میں ہوئے ہیں ان سب کی تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ ویسٹ منسٹر ایبی نے تو صرف گزشتہ بارہ سو برس ہی کی تاریخ یاد دلائی تھی لیکن آج دہلی پچھلے ساڑھے تین ہزار برس کے واقعات سنا رہی ہے۔

تاریخی خصوصیات کی حیثیت سے دہلی روے زمین پر اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ یوں تو دنیا میں اور بھی کئی ایسے تاریخی شہر ہیں جن کی اہمیت، اس میں شک نہیں، بہت زیادہ ہے مگر سرزمین دہلی کی داستان بالکل نرالی ہے۔ مختلف نسلوں، مختلف خاندانوں اور مختلف قوموں کے بادشاہوں کی تخت نشینی کے جتنے جشن اس خاص خطہ میں ہوئے ہیں اس کی نظیر شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ یہی وہ خطہ ہے جہاں کے شاہانہ جلسوں کا حال مہا بھارت جیسی زندۂ جاوید نظم میں محفوظ ہے، جو ان کی کیفیت قیامت تک بیان کرتی رہے گی اور یہی وہ مقام ہے جس نے راجسیو جگ، اسومیدھ جگ، اور جشن ماہتابی کے وہ قابل یادگار شاہانہ جاہ وحشم اور شہنشاہی عظمت و شان کے تماشے دیکھے ہیں جن کی یاد ابدالدہر صفحۂ روزگار پر قائم رہے گی۔ گو تاریخ کا ورق الٹ گیا اور ان جشنوں کے کرنے والے باقی نہیں رہے مگر ان کے نام اور ان کے کارنامے دنیا کو نہیں بھولے اور جب کبھی ایسے جلسے دہلی میں منعقد ہوتے ہیں ان کی یادگار کا کام دے جاتے ہیں۔ شہنشاہ جارج پنجم کے اس شہنشاہی دربار کا بھی اس وقت یہی اثر ہے اور اس میں ملکہ میری کی شرکت نے خصوصیت کے ساتھ ان تمام مہارانیوں اور شہنشاہ بیگموں کی یاد میں جو اپنے اپنے زمانہ میں فرمانروایان دہلی کی شریک تاج و تخت رہیں ہیں نئی جان ڈال دی ہے۔

ہندوستان کی ان تمام بے شمار ملکاؤں میں بعض جو بہت زیادہ سربرآوردہ ہیں ان میں سب سے اوّل رانی دروپدی کا نام قابل ذکر ہے۔ رانی دروپدی کی ایک بہت بڑی تاریخی خصوصیت یہ بھی ہے کہ سب سے پہلے سرزمین دہلی میں جو شاہانہ جشن حکمرانی کی تقریب میں قائم ہوا وہ اسی مہارانی کے نامور شوہر دھرم راج جدھشٹر کی فرمانروائی کا تھا۔ مہابھارت میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس شاہی دربار کا حال بیان کیا گیا ہے جو اس مقام پر اپنی نوعیت کا پہلا جشن تھا۔

مہارانی دروپدی

مہارانی دروپدی کپیلا کے راجہ کی لڑکی تھی اور اس زمانہ کے دستور کے مطابق سوئمبر کے ذریعہ قسمت آزمائی ہونے کے بعد مہاراجہ جدھشٹر سے اس کا عقد ہوا تھا۔ دروپدی کی زندگی کے تفصیلی حالات افسوس ہے کہ بہت کم معلوم ہیں مگر بعض ایسے سبق آموز واقعات اس رانی کے سوانح زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں جو قیامت تک عزت اور عظمت کے ساتھ یاد کئے جائیں گے۔ اس کی دماغی قابلیت بہت اعلےٰ تھی اور وہ بلا کی ذہین وطباع واقع ہوئی تھی۔ حقیقت و معرفت کے مشکل ترین مسائل تک پر اس کو عبور تھا اور وہ اعلیٰ اخلاق کا مکمل نمونہ تھی۔

مہارانی دروپدی کے شوہر مہاراجہ جدھشٹر کو جوا کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ راجہ کے اس شوق سے فائدہ حاصل کرکے دریودھن نے جو مہاراجہ دھرتراشٹر کا سب سے بڑا فرزند اور راجہ جدھشٹر کا چچیرا بھائی تھا اپنے دلی عناد کو پورا کرنے کی تدبیر نکالی۔ دریودھن کو اس تدبیر میں اس قدر کامیابی ہوئی کہ راجہ جدھشٹر نے ایک بازی میں سب راج پاٹ،

گھر بار، اپنے چاروں بھائی بھیم، ارجن، نکل، اور سہدیو، خود اپنی ذات اور اپنی رانی درو پدی تک ہار دی۔ جوے کی شرط پوری ہونے پر دریودھن کے ایک بھائی نے درو پدی کو سر دربار ذلیل کرنا چاہا۔ جب اس کی خبر مہا راجہ دھرتراشٹر کو پہنچی تو وہ اپنے لڑکے کی ناشائستہ حرکت پر بہت برافروختہ ہوا اور اپنی بھتیج بہو درو پدی کو بلا کر اس کی معذرت کی۔ معافی مانگنے کے بعد بوڑھے دھرتراشٹر نے قدیم ہندو فرمانرواؤں کے قاعدہ کے مطابق "بردان" دینے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ "جو تو مانگ وہ میں دینے کو تیار ہوں"۔ شوہر پرست اور وفادار درو پدی نے جواب دیا کہ "اگر آپ ایسے ہی مہربان ہیں تو راجہ جدھشٹر کو غلامی سے آزاد فرما دیجئے"۔ دھرتراشٹر نے اس درخواست کو فوراً قبول کیا اور پھر التجا کی کہ "ابھی کچھ اور مانگ۔ یہ بردان میرے حوصلہ سے بہت کم ہے"۔ نیک دل درو پدی نے نہایت ہمدردی سے کہا کہ "بھیم، ارجن، نکل اور سہدیو بھی آزاد کر دئے جائیں"۔ یہ استدعا بھی فوراً ہی قبول کی گئی اور ضعیف العمر دھرتراشٹر نے بڑی ہی محبت اور لجاجت سے پھر کہا کہ "ابھی کچھ اور مانگ"۔ عالی حوصلہ درو پدی نے بہت سادگی سے جواب دیا کہ "اب میں کچھ مانگنا نہیں چاہتی۔ دھرم کے مطابق ویشوؤں کو ایک، چھتریوں کو دو، اور برہمنوں کو سو بردان مانگنے کا حق ہے۔ میں چھتری ہوں اس لئے دو سے زیادہ بردان مانگ کر دھرم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔ لہٰذا میں اب کچھ نہ مانگوں گی"۔

آزاد ہونے کے بعد سابقہ قرارداد کے مطابق راجہ جدھشٹر کو اپنے چاروں بھائیوں سمیت بارہ برس کی صحرانوردی اور ایک برس کی گمنامی اختیار کرنی پڑی۔ اس زمانہ میں رانی درو پدی جس نے انتہا کے ناز و نعم اور شاہانہ آسائشوں میں پرورش پائی تھی بے خانمانی کے مصائب جھیلنے اور جنگل بیابان کی خاک چھاننے میں اپنے شوہر کی شریک رہی۔ اس جلاوطنی میں درو پدی اپنے شوہر کے ساتھ حقایق و معارف کے جن مسائل پر جس لیاقت اور کمال سے بحث کرتی اور اپنے شوہر کا جی بہلاتی تھی اس کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔

معینہ مدّت کے ختم ہونے پر جب پانچوں بھائی واپس ہوئے اور اپنے چچیرے بھائیوں سے اپنی سلطنت واپس مانگی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر کرک شیتر کی مشہور لڑائی وقوع میں آئی جس میں ہندوستان کے تمام راجہ مہاراجہ شریک تھے۔ اٹھارہ دن تک یہ لڑائی برابر ہوتی رہی اور جانبین میں بہت سی جانیں تلف ہوئیں۔ آخر راجہ جدھشٹر کو فتح حاصل ہوئی۔ راجہ جدھشٹر کی خدا ترس طبیعت پر اس کشت و خون کا یہ اثر ہوا کہ چند روز کے بعد اندرپرست کا راج پاٹ اپنے بھائی ارجن کے پوتے کو سونپ دیا اور آپ اپنے چاروں بھائیوں اور اپنی رانی درو پدی کے ساتھ ترک دنیا کر کے ہمالیہ کی گھاٹیوں میں بود و باش اختیار کی۔ وہیں ان سب کے ساتھ رانی درو پدی بھی واصل بحق ہوئی۔

مہارانی درو پدی کے بعد سلطنت دہلی کی تاریخ میں جو نام بہت نمایاں شان سے درخشاں ہوا وہ رانی سنجوگتا کا نام ہے۔

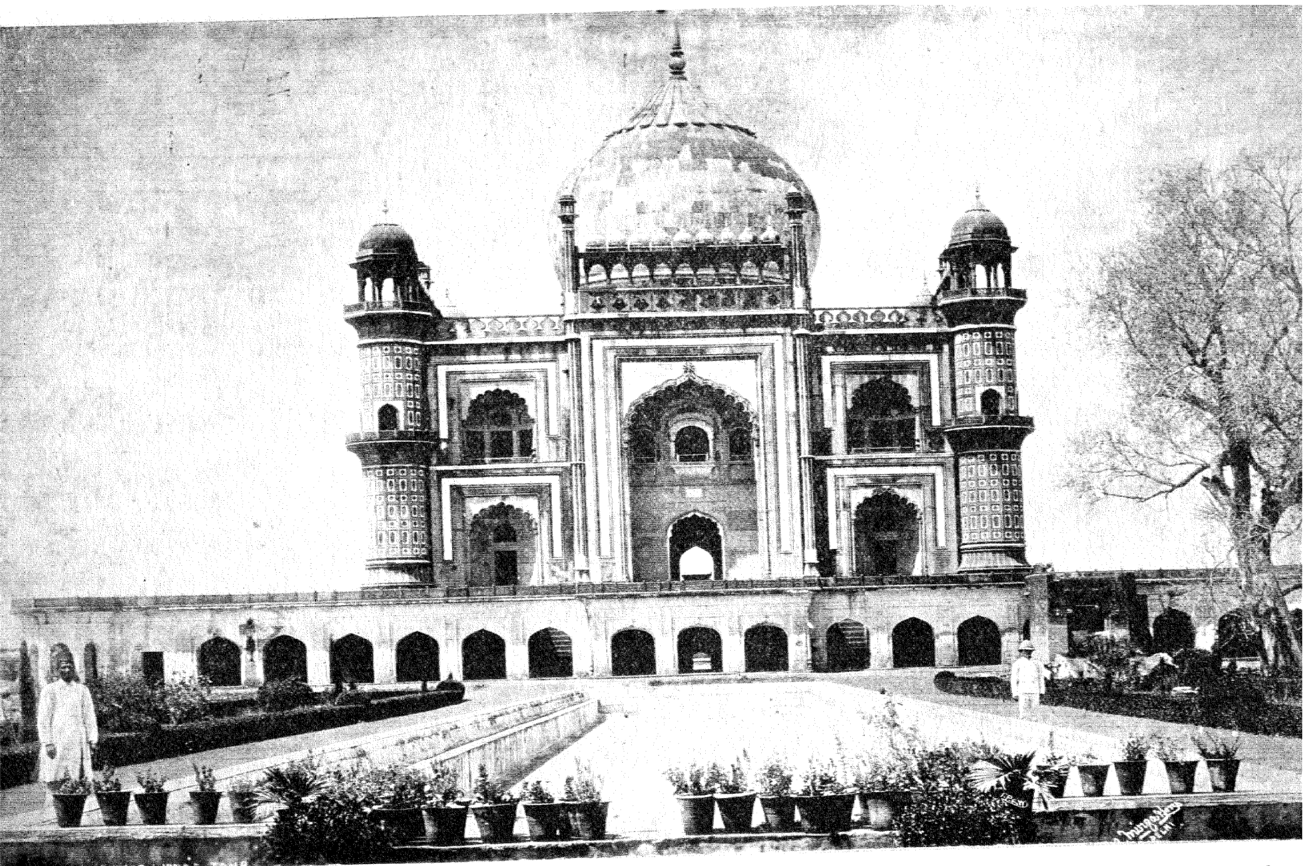
رانی سنجوگتا

رانی سنجوگتا قنوج کے فرماں روا جے چند کی بیٹی تھی۔ اس کے جمال صوری و معنوی کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوے تھے اور ہندوستان کے بڑے بڑے شاہزادے اس حسن و جمال کی دیبی کے شیدا و گرویدہ تھے۔ ہر ایک کی خواہش تھی

کہ ناز آفریں سنجوگتا کی قسمت اس کے ساتھ وابستہ ہو۔ جے چند نے اس امر کے تصفیہ کی بہترین شکل اختیار کی اور اس زمانہ کے قاعدہ کے مطابق سوئمبر کا جلسہ منعقد کیا۔ سوئمبر میں اطراف واکناف کے تمام تاجدار جمع ہوئے اور دہلی کی سلطنت کے مالک پرتھی راج کے سوا ہندوستان کا کوئی شاہزادہ ایسا باقی نہ رہا جو اس جلسہ میں شریک نہ ہوا ہو۔ جے چند کی قوت وعظمت بہت تھی اور تمام راجہ مہاراجہ اس کی عزت کرتے تھے۔ سارے ملک میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور بڑے بڑے حکمراں اس سے تھراتے تھے۔ اس لئے باوجود دعوت کے پرتھی راج کے نہ آنے کو اس نے بڑی بےعزتی سمجھی اور سخت برہم ہوا۔ ذلیل کرنے کے طور پر جے چند نے پرتھی راج کا ایک پتلا بنا کر نوکروں کے لباس میں حقارت کے ساتھ اس مقام پر کھڑا کر دیا جہاں سوئمبر کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ جب سب شاہزادے اس جگہ جمع ہو چکے تو جے چند نے اپنی پیاری بیٹی سنجوگتا سے استدعا کی کہ وہ جلسے میں آئے اور اپنی پسند کے مطابق شوہر انتخاب کرے۔ جلسہ میں پہنچکر سنجوگتا نے پہلے چاروں طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ ایک گشت کی۔ جب وہ تمام شہزادوں کو دیکھتی ہوئی پرتھی راج کے پتلے کے پاس پہنچی تو اس نے اپنے گلے کا ہار نکالا اور اس مٹی کی مورت کو پہنا دیا۔ بہادر سنجوگتا کی اس دلیری کو دیکھکر سب لوگ دم بخود ہو گئے۔ جے چند کے غیظ وغضب کی کوئی انتہا نہ رہی غصہ کے مارے وہ آپے سے باہر ہو گیا اور حکم دیا کہ فوراً اس ناہنجار لڑکی کو قید کر دیا جائے۔ اسی وقت حکم کی تعمیل کر دی گئی اور غریب سنجوگتا محض اپنے مغرور باپ کی شیخی کو صدمہ پہنچانے کے جرم پر زنداں کی شقت میں گرفتار ہو گئی۔ ناکام شہزادے اپنی مایوسی کا رنج کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔

جب پرتھی راج کو اس واقعہ کی خبر پہنچی کہ کس طرح قنوج کی شاہزادی نے اپنی جرات اور ضمیر کی آزادی سے بجا طور پر کام لیا اور اس کے اس قابل ستائش فعل پر اس کے ساتھ کس قدر ناجائز ظالمانہ سلوک کیا جا رہا ہے تو وہ فوراً مظلوم سنجوگتا کی حمایت کے لئے کھڑا ہو گیا۔ آناً فاناً اس نے جنگ کی تیاری کی اور بہت جلد جے چند کے مقابلہ کے لئے پہنچ گیا۔ ایک سخت جنگ کے بعد جے چند کو شکست فاش ہوئی اور پرتھی راج مظفر و منصور راج کماری سنجوگتا کو لے کر دہلی واپس ہوا۔ دہلی پہنچکر بڑے ہی تزک واحتشام سے اس نے سنجوگتا کے ساتھ شادی کر لی۔

اس زمانہ میں مسلمان فاتحین کا سیلاب بڑے بڑے دریاؤں اور پہاڑوں کو پھاندتا اور روندتا یکے بعد دیگرے ہندوستان میں آنا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب ۱۱۹۱ء میں پہلی مرتبہ شہاب الدین محمد غوری فتح ونصرت کے جھنڈے اڑاتا ہوا تھانیسر تک پہنچا ہی تو اس وقت پرتھی راج ہی سربرآرائے سلطنت تھا۔ پرتھی راج نے اس جوانمردی کے ساتھ محمد غوری کی مزاحمت کی کہ اسے ناکام لوٹنا پڑا۔ اسکے بعد ۱۱۹۳ء میں پھر سلطان شہاب الدین غوری ہندوستان پہنچا اور ایکی دفعہ کچھ اس انداز سے آیا کہ بڑے بڑے سورماؤں کے کلیجے دہل گئے۔ ابکی مرتبہ جب پرتھی راج سلطان غوری کے مقابلہ کو نکلا ہے تو اسے اپنی کامیابی سے مایوسی تھی لیکن وہ شیر دل، بلند ہمت، جوانمرد، اپنی اخیر سانس کو بھی اپنے ملک کی حمایت میں صرف کرنے کا متمنی تھا۔ رانی سنجوگتا جو اپنے شوہر کی شریک رنج وراحت تھی رزم وبزم ہر موقع پر ساتھ رہتی تھی۔ راجہ اس سے اس قدر محبت

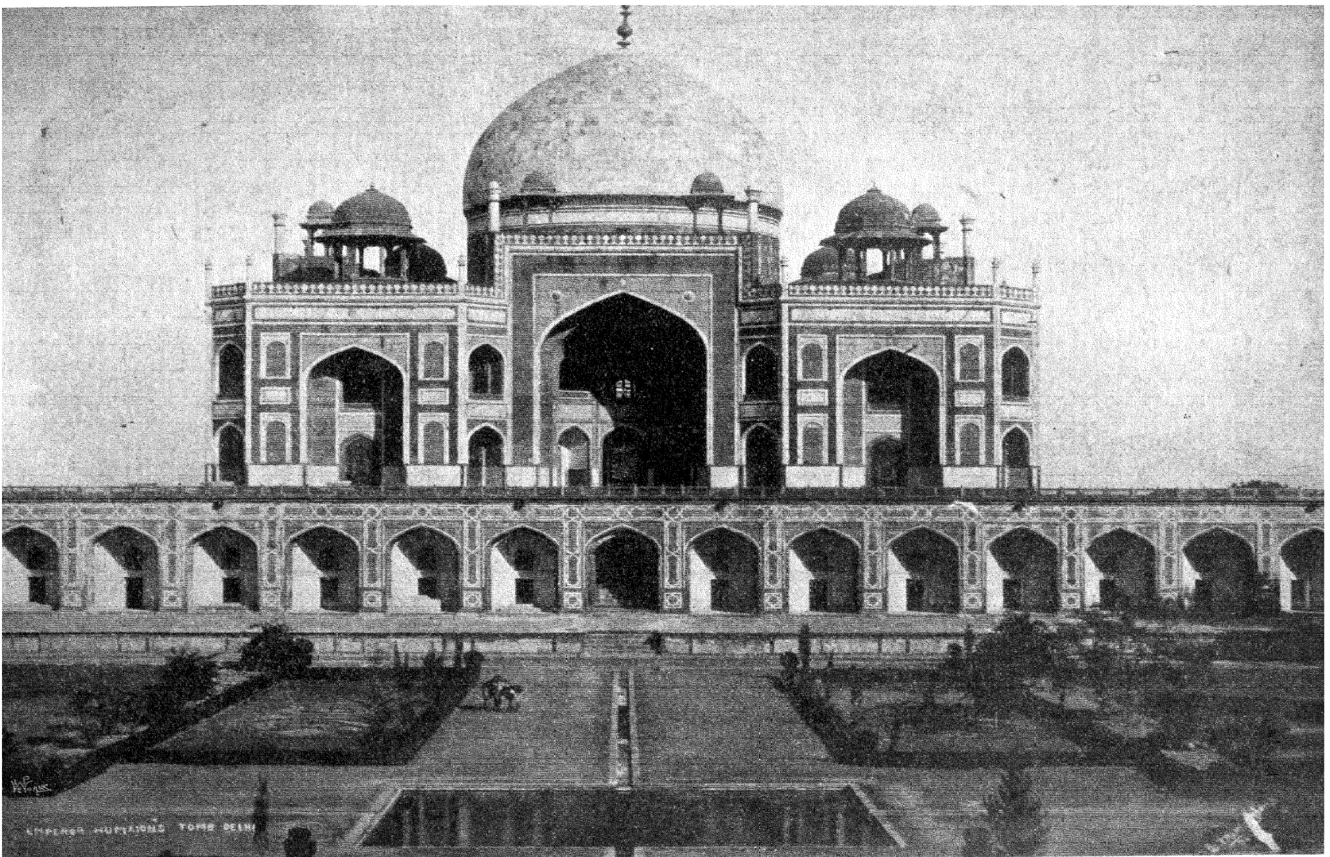


सफ़दरजंग का मक़बरा ।

SAFDAR JANG'S TOMB

مقبرۂ صفدر جنگ

Indian Press, Allahabad.



मक़बरा हुमायूँ ।

Indian Press, Allahabad.

EMPEROR HUMAYUN'S TOMB

مقبرۂ همایون شاه

کرتا تھا کہ اسے گھڑی بھر کے لئے بھی اپنے پاس سے جدا کرنا شاق گزرتا تھا۔ چنانچہ جب پرتھی راج مقابلہ کی غرض سے اپنے دارالسلطنت سے روانہ ہوا ہے تو رانی سنجوگتا اس کے ساتھ تھی۔ مگر اخیر وقت جب بالکل ناکامی کے آثار پیدا ہو گئے تو عورتوں کی حفاظت اور دلدہی کے لئے رانی کا دہلی چلا جانا ضروری سمجھا گیا جس وقت رانی سنجوگتا اپنے بہادر شوہر سے رخصت ہونے لگی تو پرتھی راج نے کہا:۔

پیاری بیوی! یقین کیجیو کہ میں کبھی جب تک میرے جسم میں جان باقی ہے میدان جنگ کو چھوڑنے اور لڑائی سے منہ موڑنے کی ذلت نہ گوارا کروں گا۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میرا ہر سپاہی اور ہر ساتھی بھی ضرور میرا ساتھ دے گا۔

رانی نے کہا:۔

پیارے شوہر! میں بھی اسی خیال سے رخصت ہو رہی ہوں۔ اگر میں دہلی نہ جاؤں تو وہ بیچاریاں اپنے کو بچا نہ سکیں گی۔ اب انکی دہشت و خوف زدگی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ مگر یاد رکھنا جب غنیم کی فوج دہلی میں داخل ہوگی تو انہیں ایک زندہ عورت کی صورت نہ دکھائی دے گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا جب پرتھی راج نے اپنے تمام رفیقوں اور ساتھیوں کے ہمراہ میدان جنگ میں لڑتے لڑتے جان دے دی تو فتحمند فوج آگے بڑھی اور شہر میں پہنچکر وہ حسرتناک چتا دیکھی جس میں نازک اندام رانی سنجوگتا اپنی ساتھیوں کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئی تھی۔

بہادر سنجوگتا کے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد کارکنانِ قضا و قدر نے دہلی کے تاج و تخت کے لئے پھر ایک ایسی ملکہ تیار کی جس نے تاریخِ عالم میں نام کر لیا۔

سلطانہ رضیہ بیگم

رضیہ بیگم دہلی کے مشہور تاجدار شمس الدین التمش کی بیٹی اور سلطان قطب الدین ایبک کی نواسی تھی۔ ہندوستان کی یہی وہ ملکہ ہے جو بلا شرکت غیرے اپنی سلطنت کی مالک اور فرماں روا تھی۔ اس کے بھائی رکن الدین فیروز کو جب چھ مہینہ اٹھائیس روز کی حکمرانی کے بعد اس کی عشرت طلبی کے باعث معزول کر دیا گیا تو ۱۸ ربیع الاوّل ۶۳۴ھ م ۱۹ نومبر ۱۲۳۶ء کو سلطانہ رضیہ نے تختِ سلطنت پر قدم رکھا۔ تمام مورخین رطب اللسان ہیں کہ وہ امورِ جہانداری میں طاق اور بہت قابل فرماں روا تھی۔ وہ اپنے باپ کے وقت میں بھی اکثر مہام سلطنت میں شریک رہتی تھی اور اس کا باپ ہمیشہ اپنی لڑکی کے صلاح و مشورہ کو پسند کرتا تھا۔ جس زمانہ میں التمش گوالیار کے محاصرہ کے لئے دارالسلطنت سے روانہ ہوا ہے تو اپنی نیابت سلطانہ رضیہ ہی کو سپرد کی تھی۔ اکثر اراکین سلطنت نے جب متعدد فرزندوں پر لڑکی کو ترجیح دینے کا سبب دریافت کیا تو اس نے کہا:۔

میں دیکھتا ہوں کہ میرے تمام لڑکے شراب کے عادی اور عیش و نشاط کے دلدادہ ہیں اس لئے سلطنت کا بار ان کے لئے بالکل ناقابلِ برداشت ہے۔ رضیہ بیگم اگرچہ ایک عورت ہے لیکن وہ مردانہ دل و دماغ رکھتی ہے اور اس لئے ایسے بیس فرزند اس ایک لڑکی پر قربان ہیں۔

سلطانہ رضیہ کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے چند روز بعد دربار کے بعض امرا نے باہم سازش کر کے علم بغاوت بلند کیا اور وزیر نظام الملک جنیدی، ملک علاء الدین، ملک سیف الدین، ملک اعزالدین سالار اور ملک کبیر خاں نے

لاہور پہنچکر بہت سی فوج جمع کی اور دہلی کی طرف بڑھے۔ اور وہ کے ضعیف العمر جاگیر دار ملک نصیر کو جب اس کی خبر پہنچی تو وہ ملکہ کی حمایت کے لئے چل کھڑا ہوا اور دریائے گنگا کے قریب پہنچکر باغیوں کی فوج سے معرکہ آرا ہوا۔ سخت جنگ کے بعد ملک نصیر کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو کر قید کی حالت میں انتقال کر گیا۔ اس اثنار میں باغیوں کے سرغنہ باہم اختلاف کرنے لگے اور سلطانہ رضیہ جو اس موقع کی تاک میں تھی فوراً اس اختلاف سے فائدہ حاصل کرکے ان پر حملہ کر بیٹھی۔ ان لوگوں کو بغاوت کی سخت سزا ملی۔ ملک سیف الدین اور ملک علار الدین گرفتار کر لئے گئے اور ان کو قتل کر دیا گیا۔ وزیر نظام الملک جنیدی کسی طرح جان بچا کر سرمور کی پہاڑیوں میں پہنچا اور وہیں اُس نے وفات پائی۔ سرکشوں کی سرکوبی کے بعد سلطانہ رضیہ نے خواجہ مہدی غزنوی کو جو پہلے نائب وزیر تھا وزارت کے منصب پر سرفراز کیا اور نظام الملک کے خطاب سے مفتخر فرمایا۔ فوج کی سپہ سالاری ملک سیف الدین ایبک کو ملی اور قتلغ خاں کا خطاب دیا گیا۔ کبیر خاں کو اس کی خطا معاف کرکے لاہور کی صوبہ داری عطا کی گئی۔ قتلغ خاں کا چند ہی روز میں انتقال ہو جانے کے باعث قطب الدین حسن کا تقرر سپہ سالاری کے عہدہ پر ہوا اور ملک اختیار الدین ایتگین کو امیر حاجب بنایا گیا۔ ان ہی تقررات اور انتظامات کے سلسلہ میں سلطانہ رضیہ نے جمال الدین یاقوت حبشی کو جو اصطبل شاہی کا داروغہ تھا امیر الامرا کے جلیل القدر عہدہ پر ممتاز کیا۔ ملکہ کی اس خاص عنایت نے دربار کے امرا میں ایک سخت ناراضی پیدا کر دی۔ یہانتک کہ اسی برہمی کے بہانہ ملک کبیر خاں صوبہ دار لاہور نے سب سے اوّل ۶۳۷ھ ہجری م ۱۲۳۹ء میں سرکشی شروع کر دی۔ سلطانہ رضیہ بذات خود اس کی سرکوبی کو نکلی اور ملک کبیر خاں کو سخت ہزیمت نصیب ہوئی۔ کبیر خاں نے اپنی ناشائستہ حرکت سے توبہ کی اور معافی مانگی۔ عالی حوصلہ رضیہ نے اس کی خطا معاف کر دی اور ملتان کی صوبہ داری بھی اسے عنایت کی۔ ملک التونیہ نے بھی اس کے چند روز بعد جمال الدین یاقوت کی سرفرازی کے غصہ میں بغاوت کر دی۔ سلطانہ رضیہ کو اس کے مقابلہ کے لئے بھی آمادہ ہونا پڑا اور جب وہ اس قصد سے روانہ ہوئی تو آدھے راستہ میں پہنچکر اُسکی فوج کے تمام اُن افسروں نے جو ملک التونیہ کے ہم وطن تھے بلوہ کر دیا۔ جمال الدین یاقوت کو تلوار کے گھاٹ اتارنے کے بعد بلوائیوں نے سلطانہ رضیہ کو مقید کرکے ملک التونیہ کے پاس پہنچا دیا۔ اس کے بعد معز الدین بہرام کو جو رضیہ کا بھائی تھا تخت نشیں کیا گیا۔ اس اثنار میں ملک التونیہ نے رضیہ بیگم کو جو اب بالکل اس کے قابو میں تھی راضی کرکے اس کے ساتھ عقد کر لیا۔ رضیہ بیگم کے اثر سے التونیہ کو ایک کثیر فوج جمع کر لینے میں بڑی کامیابی ہوئی اور دونوں اپنی فوج کو لیکر دہلی کیطرف بڑھے۔ نئے شہنشاہ کی طرف سے ملک اعز الدین بلبن جو شمس الدین التمش کا داماد تھا اور بعد میں الف خاں کے نام سے مشہور ہوا مقابلہ کے لئے بھیجا گیا۔ دونوں فوجوں میں سخت جنگ ہوئی اور رضیہ بیگم کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ اس نے دوبارہ اپنی منتشر فوج کو جمع کرکے دہلی کا قصد کیا اور پھر ملک اعز الدین نے اس کی مزاحمت کی۔ اس مرتبہ بھی اس کو بتاریخ ۲۴ ربیع الاول ۶۳۷ھ م ۲۴ اکتوبر ۱۲۳۹ء بہت سخت شکست نصیب ہوئی۔ جب دونوں میاں بی بی اپنی جانیں بچا کر اپنے چند جاں نثار رفیقوں کے ساتھ بھاگ رہے تھے تو راستہ میں ان کو گرفتار کر لیا گیا اور یہ سب اسی جگہ ۲۵ ربیع الاول ۶۳۷ھ م ۱۴ نومبر ۱۲۳۹ء کو قتل کر ڈالے گئے۔

بعضوں کا خیال ہے کہ رضیہ بیگم اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیرم کے پاس پہنچائی گئی اور وہیں قید میں اس کو مار ڈالا گیا۔ غرض سلطانہ رضیہ بیگم نے کل تین سال چھ مہینہ چھ دن سلطنت کی اور اس قلیل عرصہ میں اس نے جو انتظامات کئے وہ حد درجہ قابلِ تحسین ہیں۔ وہ اپنی رعایا کی عرض معروض بنفس نفیس سنتی تھی اور دادرسی کرتی تھی۔ تمام لوگ اس کی طرز حکومت سے بے انتہا راضی اور خوش تھے اور اگر جمال الدین یاقوت کے متعلق اس کی غیر معمولی شفقت نے اس کے امرا کو بد دل نہ کر دیا ہوتا تو وہ عمر بھر ہندوستان کی شہنشاہی کرتی۔ بہرکیف سلطانہ رضیہ بیگم کا نام ہندوستان کے نامی گرامی شاہنشاہوں کی فہرست میں خاص وقعت رکھتا ہے اور ہمیشہ عزت و حرمت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

اس ملکہ کے بعد زمانہ نے کئی پلٹے کھائے اور تین چار صدیوں کے گزرنے پر وہ نامی گرامی ستارہ طلوع ہوا جو ملکہ نورجہاں کے نہایت موزوں نام سے ملقب اور ہندوستان کے لئے فخر و ناز کا باعث ہے۔

ملکہ نورجہاں

شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے تاج و تخت کی شریک اور اس کے دل کی مالک نورجہاں بیگم کو جو خداداد عالمگیر شہرت اور ہردلعزیزی حاصل ہے اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ اس کی لیاقت و قابلیت اور اس کے ذہن و دماغ کے کرشمے انگلستان کی مشہور ملکہ الزبتھ اور روس کی نامور ملکہ کیتھرائن کے ساتھ اسکا مقابلہ کراتے ہیں۔ اس کے دلفریب حسن اور اس کی خداداد عقل نے نہ صرف شہنشاہ جہانگیر ہی کو اپنا والہ و شیفتہ کر لیا تھا بلکہ ایک عالم اس کے فہم و ذکا کا گرویدہ تھا۔ وہ میرزا غیاث بیگ حاکم خراسان کی بیٹی اور خواجہ محمد شریف شاہ ایران کے وزیر اعظم کی پوتی تھی جو حوادثات زمانہ سے تنگ آکر جب میرزا غیاث ترکِ وطن کر کے ہندوستان آ رہا تھا قندھار کے قریب نورجہاں پیدا ہوئی۔ مہرالنسا اس کا نام رکھا گیا جب میرزا غیاث شہنشاہ اکبر اعظم کے دربار میں پہنچا تو اکبر نے اُس کی امیدوں سے بڑھکر اس کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا اور اسکو اور اسکے فرزند ابوالحسن کو اعلیٰ خدمات عطا فرمائیں۔ مہرالنسا اپنی ماں کے ساتھ اکثر محل شاہی میں آتی تھی۔ ایک دفعہ مینا بازار میں جہانگیر سے جو اس وقت شہزادہ سلیم تھا اس کی چار آنکھیں ہوگئیں۔ نوجوان شہزادہ حسین و مہ جمال مہرالنسا کا ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ جب شہنشاہ اکبر کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ جہانگیر پر خفا ہوا اور میرزا غیاث کو لکھکر مہرالنسا کی شادی علی قلی شیر افگن خاں سے کرادی۔ اس وقت تو معاملہ یوں رفت وگذشت ہو گیا مگر جہانگیر کے تخت نشیں ہونے کے بعد جب قطب الدین کوکلتاش کو قتل کر کے شیر افگن خاں خود بھی مارا گیا اور اس کے پس ماندے مجرم کے رشتہ داروں کی حیثیت سے دربار شاہی میں پہنچے تو پھر اس میں جان پڑ گئی۔ جہانگیر نے اوّل تو مہرالنسا کو اپنی رضاعی ماں سلطانہ سلیمہ بیگم کے جو مقتول قطب الدین کوکلتاش کی والدہ تھی حوالہ کیا۔ چندروز کے بعد جب پھر عشق کی آگ جہانگیر کے سینہ میں بھڑک اٹھی تو اُس نے مہرالنسا سے نکاح کی خواہش ظاہر کی۔ مہرالنسا نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اپنی بقیہ زندگی اپنے مقتول شوہر کی یاد میں بسر کرنے کی آرزومند ہے۔ دو سال اسی حالت میں گزرے لیکن آخر مہرالنسا کو شہنشاہ جہانگیر کی استدعا قبول کرنی پڑی اور ۱۶۱۱ء میں شاہانہ تزک واحتشام کے ساتھ نکاح ہوگیا۔ پہلے نورالدین کی رعایت سے

نورمحل اور پھر نورجہاں بادشاہ بیگم خطاب ملا۔ محل کی ساری بیگمات پر فوقیت دی گئی۔ دن بدن جہانگیر کی گرویدگی بڑھتی گئی یہاں تک کہ عنانِ سلطنت اسی کے ہاتھ میں تھی۔ جہانگیر ایک لحظہ کے لئے اس کو اپنے پاس سے جدا نہ کرتا تھا۔ دربار اور سواری میں بھی وہ ساتھ ہوتی تھی۔ سکّہ میں بھی اسکا نام داخل تھا۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

نورجہاں بیگم کے اس تسلط کا جہانگیر پر جو اثر ہوا اس کو ایک انگریز مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

نورجہاں کی برکت سے جہانگیر کے اطوار میں اصلاح ہوگئی۔ اس کی بیدردی و تشدد کا خاتمہ ہوا۔ تفریح طبع کے سامان صرف شب کو اور وہ بھی خاص ایوان میں ہونے لگے۔ نورجہاں کی بدولت اس کا دربار زیادہ بارونق ہوگیا۔ لطف یہ کہ اخراجات میں کمی ہوئی۔ اس ملکہ نے اخلاق و آداب میں بڑی بڑی تبدیلیاں اور اصلاحیں کیں۔

نورجہاں کو نئی نئی ایجادوں کا بڑا شوق اور اس کا خاص ملکہ تھا۔ زیورات، زنانہ لباس، اور لطفِ زندگی کے سامان کی اکثر چیزیں اس کی اختراع سے اس وقت بکثرت مروّج ہیں۔ اس کی طباعی و ذہانت کی ہزارہا مثالیں موجود ہیں۔ نورجہاں کی شجاعت بھی بہت مشہور ہے۔ وقت واحد میں چار شیروں کو اپنے بیخطا نشانوں سے ڈھیر کر ڈالنے کا واقعہ کون نہیں جانتا۔ مہابت خاں کے مقابلہ میں نورجہاں نے جس تدبیر، فراست، دلیری، استقلال اور ثبات عقل سے کام لیا اور جس کمال کے ساتھ وہ شہنشاہ جہانگیر کو اس کے دام سے بچا لائی، حقیقت یہ ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ نورجہاں بہت نیکدل، مخیر، اور فیاض ملکہ تھی۔ اپنی جیب خاص سے وہ ہمیشہ غریب ناداروں کی مدد کرتی۔ مکہ معظمہ اور کربلائے معلیٰ وغیرہ جانے کا خرچ دیتی۔ یتیم لڑکیوں کی شادی کرا دیتی اور بیوہ کی پرورش کرتی تھی۔ انتہا درجہ کی حاضر جواب تھی۔ فی البدیہ اشعار کہنے میں بھی اس کو کمال تھا۔ نورجہاں کی شاعرانہ قابلیت کے متعلق ایک مصنف کا قول ہے:۔

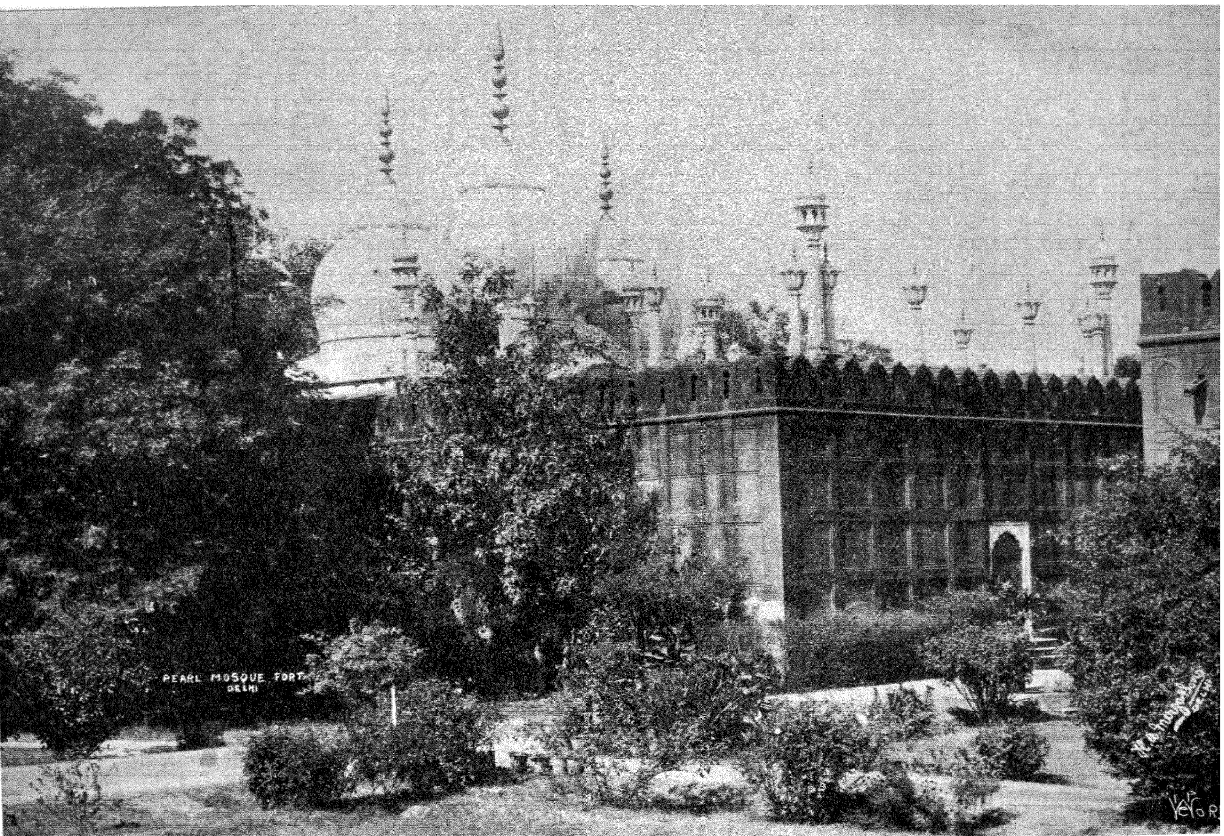
وصف سخنوری نورجہاں از غایت شہرت مستغنی از بیان است
و کلامش جستہ جستہ زبان زد سخنوراں و در حقیقت شیریں تراز قند است۔

اس غیر معمولی دل و دماغ کی یگانۂ آفاق شہنشاہ بیگم کے بعض متفرق اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

کشادِ غنچہ اگر از نسیم گلزار است کلید قفل دلِ ما تبسم یار است
نہ گل شناسد و نے رنگ و بو نہ عارض و زلف دلِ کسے کہ بہ حسنِ ادا گرفتار است
سلک مروارید بر فرقِ سرش دانی کہ چیست تشنگانِ شوق را جوئیست از آب حیات
عشقت چناں گداخت تنم را کہ آب شد گردے کہ ماند بر سرِ مژہ چشم حباب شد
نیست فوارہ کہ بینی بہ سرِ آب رواں آب از گرمیِ ایں فصل بر آورد زباں
دل بصورت نہ دہم تا شدہ سیرت معلوم بندۂ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم
زاہد اہولِ قیامت مفگن در دلِ من ہولِ ہجراں گزرانیدم و قیامت معلوم

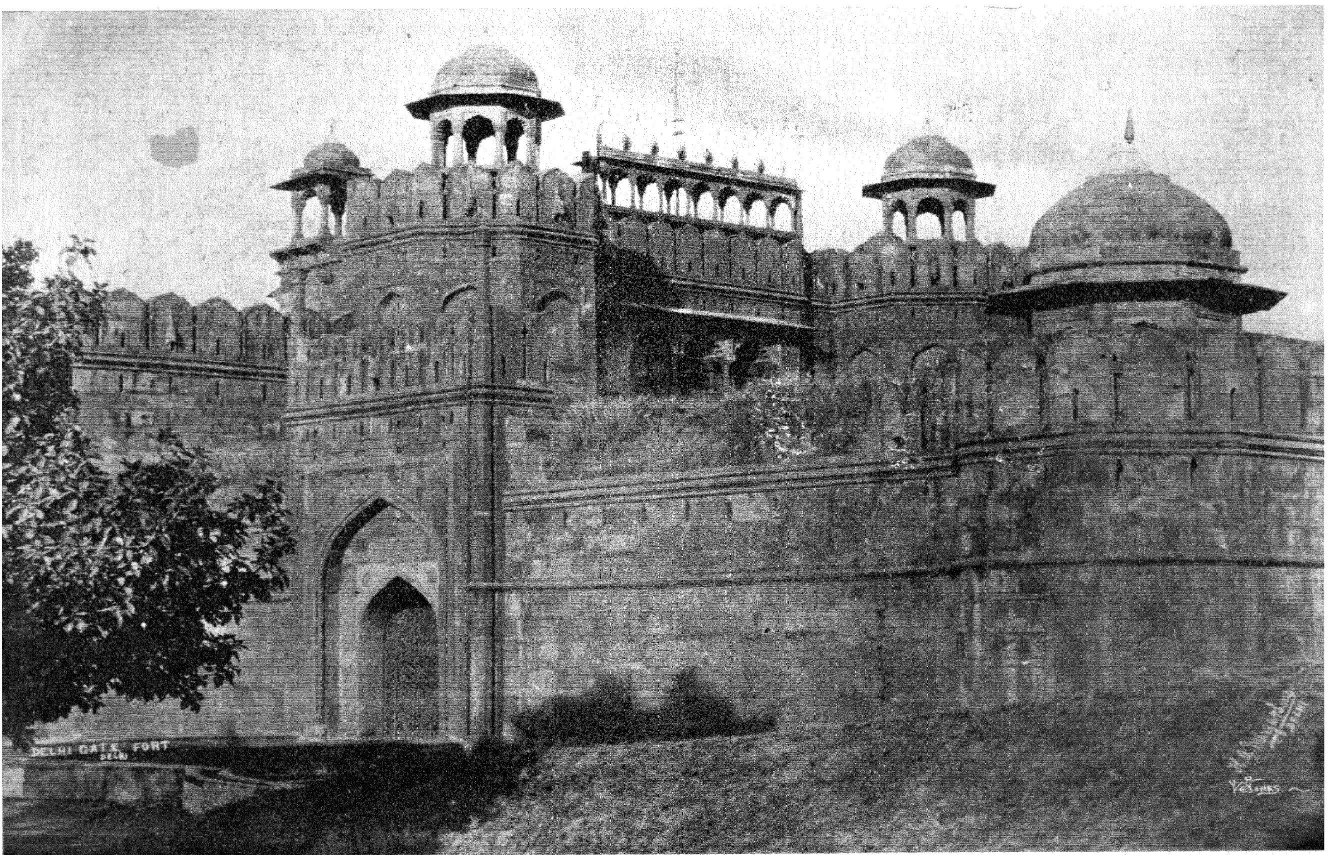
ایک دفعہ شہنشاہ جہانگیر نے عید کا چاند دیکھکر کہا: "ہلالِ عید براوج فلک ہویدا شد" نورجہاں بیگم نے فی البدیہ دوسرا مصرعہ لگا دیا: "کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد"۔ اسیطرح ایک مرتبہ جہانگیر کی زبان سے نکلا: "نمی آید بغیر از گریہ دیگر کار از چشم" نورجہاں نے برجستہ کہا: "بلے از مردمِ بے دست و پا دیگر چہ می آید"

ایک روز جہانگیر نے حریر کی قبا پہنی جس میں لعل کی گھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ نورجہاں بیگم نے بے ساختہ کہا:۔



मोती मसजिद (क़िले के भीतर)। PEARL-MOSQUE (FORT) موتی مسجد (اندرون قلعه)

Indian Press, Allahabad.



क़िले का दिल्ली-दरवाज़ा ।

DELHI GATE, FORT

دهلی دروازهٔ قلعه

Indian Press, Allahabad.

ترا نہ تکمۂ لعل ست در قبائے حریر شدست قطرۂ خونِ منت گریباں گیر

مگر افسوس سنہ ۱۶۲۷ء میں شہنشاہ نور الدین جہانگیر کی وفات نے نورجہاں بیگم کو زندہ درگور کردیا۔ اگرچہ شاہ جہاں نے اس کی بسر اوقات کے لئے پچیس لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ مقرر کردیا تھا لیکن اب اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہوچکی تھی۔ بیوہ ہونے کے ساتھ ہی اس نے اپنے قیمتی زیورات اور فاخرہ لباس کو جن کا اس کو بے انتہا شوق تھا ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا۔ مرنے تک اس نے پھر کوئی رنگین کپڑا زیب تن نہ کیا۔ ہمیشہ سفید لباس پہنتی تھی اور اپنے عاشق زار اور ناز بردار شوہر کی یاد اور خدا کی عبادت میں زندگی بسر کرتی تھی۔ یہانتک کہ سنہ ۱۶۴۵ء میں وہ بھی اپنے شوہر سے جاملی۔ آخر زمانہ میں جو حسرت و یاس اس کو نصیب ہوئی آج تک اس کے لوحِ مزار کا یہ شعر اُس کا اظہار کر رہا ہے۔

برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

نورجہاں بیگم کے بعد ہندوستان کے شاہنشاہی مرقع میں ارجمند بانو بیگم المعروف بہ ممتاز محل کی صورت جلوہ گر ہوئی۔

ممتاز محل

ارجمند بانو بیگم یمین الدولہ آصف خاں کی بیٹی، میرزا غیاث بیگ کی پوتی، اور مشہور نورجہاں بیگم کی بھتیجی تھی۔ سنہ ۱۰۰۲ھ م سنہ ۱۵۹۴ء میں پیدا ہوئی۔ حسن و جمال اور فہم و فراست میں وہ اپنی نامور پھوپھی کا نمونہ تھی۔ اعلےٰ تعلیم نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ شہنشاہ جہانگیر نے اس کی قابلیتیں دیکھکر اپنے بیٹے شاہجہاں سے اس کی شادی کردی۔ ۹ ربیع الاول سنہ ۱۰۲۱ھ م سنہ ۱۶۱۲ء شبِ جمعہ کو عقد ہوا۔ اس وقت ارجمند بانو بیگم کی عمر ۱۹ برس سات مہینہ تیرہ روز کی تھی۔ شادی بہت تکلف اور دھوم دھام سے رچائی گئی تھی اور خود جہانگیر نے میرزا غیاث کے گھر جاکر بزمِ شادی میں شرکت کی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے عروس کو شادی کی انگوٹھی پنھائی اور سر پر موتیوں کا سہرا باندھا۔ شادی کے بعد ممتاز محل کا خطاب ملا اور اسی نام سے وہ آج تک مشہور ہے۔

چندہی روز میں ممتاز محل نے اپنے شوہر کے دل میں جگہ کرلی۔ شاہ جہاں کو اس کے ساتھ بے انتہا انس تھا سفر میں اور لڑائیوں میں بھی وہ ساتھ رہتی تھی۔ شاہ جہاں اپنی پیاری بیگم کی خداداد قابلیت سے فائدہ حاصل کرتا اور اکثر اس کے صلاح و مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔ شاہی مُہر اُسی کے پاس رہتی تھی اور تمام فرامین جاری ہونے کے پہلے اس کی نظر سے ضرور گزرتے تھے۔ ممتاز محل بڑی ہی رحم دل اور غریب پرور تھی۔ بیکسوں کی فریاد رسی اور ناداروں کی پرورش اس کا خاص شیوہ تھا۔ ستی النسا خانم کو اس نے محض اسی انتظام کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ بیس برس تک اپنے شوہر کی رفاقت کرنے کے بعد آخر ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۰۴۰ھ م سنہ ۱۶۳۰ء کو بمقام برہان پور اڑتیس سال کی عمر میں اسنے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ شاہ جہاں پر اس حادثۂ جانکاہ کا جو اثر ہوا وہ اندازہ سے باہر ہے۔ فرطِ الم سے تمام بال سفید ہوگئے۔ لذیذ کھانوں کو بالکل چھوڑدیا۔ ہر سال جب ذیقعدہ کا مہینہ آتا تو بادشاہ کا غم تازہ ہوجاتا اور ماتم کا سامان کیا جاتا۔ عیدین وغیرہ کے موقعوں پر جب محل کی بیگمات حاضر ہوتیں تو اپنی عزیز ترین بیگم ممتاز محل کو موجود نہ پاکر شاہ جہاں کا یہ حال ہوتا کہ آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا۔ ممتاز محل کے بعد شاہ جہاں نے چھتیس برس عالمِ مفارقت میں بسر کئے۔ یہ تمام زمانہ اپنی

جو امرگ محبوبہ بی بی کی یاد میں گزرا۔ اس کے بعد شاہ جہاں نے کوئی دوسری بی بی نہیں کی۔ تاج محل یا روضۂ تاج گنج کی بے نظیر عظیم الشان عمارت آج تک شاہ جہاں کی سچی محبت، روحانی وابستگی اور انتہائی گرویدگی کا حال نہایت موثر پیرایہ میں سناتی ہے اور سارے جہان کے سیاحوں کو ارجمند بانو بیگم کی اخیر آرامگاہ کی زیارت کے لئے دور دور سے کھینچ بلاتی ہے۔ ہر مذہب، ہر قوم اور ہر ملک کے آدمی مختلف اقطاعِ عالم سے آتے ہیں اور ممتاز محل کے مقبرہ کو دیکھنے پر فخر و مباہات کرتے ہیں۔

ممتاز محل کے بعد یوں تو اور کئی ایسی ملکہ گزری ہیں جو شاہان دہلی کی رفیق زندگی کا فرض ادا کرتی رہیں لیکن ان میں کسی کو وہ عالمگیر شہرت اور مقبولیت نہیں حاصل ہوئی جو ان چند مندرجہ بالا رانیوں اور شہنشاہ بیگموں کا حصہ تھا۔ تقریباً ڈھائی سو برس کے بعد دہلی کی قسمت پھر ایک بہت بڑی اولوالعزم وحید عصر شہنشاہ بیگم ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ وابستہ ہوئی مگر افسوس اس عالی منزلت ملکہ کے قدموں کو دیکھنے کی عزت دہلی کی قسمت میں نہ تھی۔ ملکہ وکٹوریہ کے جانشین کی شریکِ تاج و تخت ملکہ الگزنڈرا نے بھی سرزمین ہند کو اس برکت سے محروم رکھا۔ لیکن آج اس انتظار کی تلافی ہو رہی ہے۔ مدت کے بعد دہلی کی قسمت جاگ اٹھی۔ ملکہ میری کی تشریف آوری نے اہل ہند کی ایک دیرینہ آرزو پوری کردی۔ وہ دل جو مہارانی درودپدی، رانی سنجوگتا، سلطانہ رضیہ، ملکہ نور جہاں اور شہنشاہ بیگم ممتاز محل کی عظمت و محبت سے معمور اور ان کی مشہور زمانہ خصوصیات اور خوبیوں کو اپنی آنکھوں دیکھنے کے متمنی تھے وہ آج ملکہ میری کو اپنے درمیان رونق افروز دیکھکر باغ باغ ہیں۔ سارا ملک اس وقت مبارک باد کے گیت گا رہا ہے۔ ہندوستان کی چوبیس کروڑ رعایا کا ایک ایک فرد اپنی شہنشاہ بیگم کا خیر مقدم کر رہا ہے اور ہمالیہ سے لنکا تک سرزمین ہند کا ایک ایک چپہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے:-

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما

سید خورشید علی

اودھ میں آخری تاجپوشی

ہفتے کا دن ماہ صفر کی چھبیس تاریخ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء سرِ شام سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بہادر کی تاجپوشی اور تخت نشینی کا غلغلہ تمام شہر میں ہے۔ آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا ہے۔ پلٹنیں سلامی کو پرا جمائے کھڑی ہیں۔ کارچوبی خوشنما وردیاں پہنے ہوئے سوار ٹہل رہے ہیں۔ رسالہ داروں کے نئے ٹھاٹھ ہیں۔ درِ دولت سے گلستان ارم کوٹھی فرح بخش تک روشنی کے ٹھاٹھ لگے ہیں ہر برج پر تمامی کی جھنڈیاں نصب ہیں۔ خاص بازار سے رمنے تک میلا لگا ہے۔ روند پھر رہی ہے۔ تماشائیوں کا سڑک پر ہجوم ہے۔ انتہائی روشنی سے دیوالی کی رات معلوم ہوتی ہے۔ دریا میں چراغوں کی روشنی کے عکس سے پانی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ دریا میں بجرے سجے ہوئے کھڑے ہیں۔ دوشالوں کے بادبان چھوٹے ہوئے ہیں، مچھلی والے بجرے پر ڈنکا ترم بج رہا ہے، مانجھی ڈانڈوں سے جلترنگ بجا رہے ہیں۔ باغ گلستان ارم رشکِ بہشت بنا ہوا ہے۔

کوٹھی فرح بخش دلہن کی طرح سجی ہے۔ لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ غربی اور شرقی دونوں پھاٹک رمنے کے بند ہیں (اتنے میں مہاراجہ بالکرشن کی سواری آئی پھاٹک کھلا) روش پر نواب امین الدولہ ٹہل رہے ہیں۔ فتح الدولہ اور میر عنایت علی رسالدار کو اپنے ہمراہ لے کر بارہ دری کی کھڑکی سے گلستان ارم میں چلے آئے۔ مہاراجہ بالکرشن نے فرمان جلوس سنایا۔ دوسری طرف مصلح السلطان اہتمام الدولہ حیدر حسین خاں، شرف الدولہ غلام رضا خاں، مرزا ہادی علی خاں، حفیظ الدولہ مولوی میر باقر علی سفیر شاہی کھڑے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد سواری کی آمد آمد کا غل ہوا چوبدار مردہے پکار رہے ہیں "سواری ہے بادشاہ عالم کی نگاہ روبرو" چاروں طرف سے ہٹو بچو کی آواز آرہی ہے۔ کرنل رچمنڈ رزیڈنٹ بہادر خفا ہو رہے ہیں کہ کیوں اتنا غل مچا یا ہے آہستہ بولو، آہستہ بولو۔ اس شور و غل میں سنتا کون ہے۔ آخر چپراسی سے ولایتی لیکر کمر میں لگائی، اور صاحب بہادر بھی قرینے سے کھڑے ہو گئے۔ جب سواری کا بوجہ زینے پر چڑھنے لگا، ہمراہیوں کی کثرت سے آہنی جنگلہ جو زینے کی کروٹ میں لگا تھا، ٹوٹ کر نیچے آرہا۔

بادشاہ کی سواری بارہ دری کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑے صاحب سے ہاتھ ملایا۔ بادشاہ کے مقرب خاص امیر الدولہ میر مہدی علی خاں سونے کا خاصدان ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں۔ نواب علی نقی خاں تسبیح ہاتھ میں لئے وظیفہ پڑھتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ سیف الدولہ علی حسین خاں داروغہ دیوان خانہ صحن میں کھڑے ہیں۔

بادشاہ تخت رواں پر سوار ہوئے۔ بارہ دری کے کمرۂ خاص میں جاکر دوگانہ شکرانہ ادا کیا۔ عبائے خاص دوش پر ہے سیف ایرانی ہاتھ میں ہے۔ گلے میں موتیوں کا مالا پڑا ہے کمر سے پٹکا بندھا ہے۔ شروع کا پاجامہ بڑے پائنچے کا پہنے ہوئے۔ سُرخ کشمیری شال کی قبا پُرمتن زیب جسم ہے۔ دوپلی نکے دار کامدانی کی کیواں ٹوپی زیب سر ہے۔ زلفیں چھٹی ہوئی۔ گھنگلا جوتا کامدار زیب پا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے زینے سے تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔

نواب مجد الدولہ نے چھوٹی کشتی جسمیں تاج شاہی رکھا تھا، پیش کی۔ ابھی بادشاہ تخت پر کھڑے تھے کہ جناب مجتہد العصر نے تاج شاہی بسم اللہ کہکر زیب سر کیا۔ ایک طرف بڑے صاحب بھی تاج میں ہاتھ لگائے ہوئے ہیں۔ بہ آواز بلند کہا واجد علی شاہ بہادر بادشاہ اودھ ہوئے۔ پھر بادشاہ تخت پر چار زانو ہو بیٹھے۔ تخت کے اوپر ایک کارچوبی منڈھا بھی کھنچا ہے جسکی ڈوریاں ریشمی ہیں اور کھمبے چاندی سونے کے ہیں۔ اس کے نیچے چتر مرصع خواص لئے کھڑا ہے۔ پشت پر دو چنو ربردار کھڑے ہیں (یہ وہی تخت و تاج و چتر ہے جو غازی الدین حیدر بادشاہ کے وقت میں دو کروڑ روپیے میں تیار ہوا تھا)۔

پہلے نواب نے نذر پیش کی۔ پھر شہزادوں نے نذریں دیں۔ بڑے صاحب زیر تخت کرسی پر بیٹھے اور سب صاحب لوگ کھڑے رہے۔ ملازموں نے باادب سلام کرکے نذریں پیش کیں۔ تمام رجواڑوں کی طرف سے نذریں گزریں۔ نذر کی اشرفیاں وزیر کی تحویل میں جمع ہوئیں۔

بادشاہ نے پہلے پانچ نام سادات حسینی کے دستخط فرمائے۔ مبارک سلامت کا غل ہوا۔ کئی ہزار طبلے پر تھاپ

پڑنے لگی۔ اونچے سُروں میں شہنائی بجائی گئی۔ نور کے طائفے جنکے سنہری رہپلی مو باف پڑے، دوپٹوں پر کا مدار چڑیاں بنی ہوئی، لچکے کی تیلی، اطلس کی گوٹ، گاتیاں لگائے ہوئے کمر لچکتی ہوئی۔ سردی کا زمانہ ہے۔ سرخ سبز کارچوبی دوشالے جہاں ذرا کھسک گئے کانوں کی بجلیاں تڑپنے لگیں۔ انکا بھاؤ بتا کے ناز سے پھرنا، راگنی کا ساز کے پردے سے نکلنا، تان کا ٹوٹنا، عجب لطف دکھا رہا ہے۔ سردئی پشوازیں بہار دکھا رہی ہیں۔ ڈھاڑی دلکش انداز سے ساز بجا رہے ہیں۔

کلانوت پر بین کندھوں پر اچھے اچھے بین رکھے کھڑے ہیں۔ اشارہ ہوا اور بیٹھ گئے۔ ٹپہ غزل ٹھمری ترانہ خیال اُڑا رہے ہیں۔ آوازوں میں سمندر کی پاٹ ہے چینی لوگ مزے سے جلترنگ بجا رہے ہیں فرنگی ارگن باجا بجا رہے ہیں کہیں بیلا بجتا ہے۔

اہل دربار کو خلعت ملے۔ نمکخواروں نے مزے لوٹے۔ فرمان معافی جاری ہوے۔ سلامی کی توپیں شہر کے چاروں ناکوں پر چھوڑی گئیں۔ ڈھنڈورا پٹا "حکم خدا کا، ملک بادشاہ کا، آج سے اودھ کے بادشاہ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بہادر ہوے، جو کوئی عدول حکمی کرے گا، سخت سزا پائے گا"

پھر تخت سے اتر کر تخت رواں پر سوار ہوے۔ ایک طرف بڑے صاحب ایک طرف چھوٹے صاحب ہمرکاب ہوے۔ روشن چوکی والے شادیانہ بجاتے ہوے ساتھ ساتھ ہوے۔ کمپنی بہادر کی طرف سے فوج واسطے حفاظت کے آئی۔ نواب امین الدولہ مع اہل عملہ رخصت ہوے۔ چھاونی سے پانچ کمپنیاں واسطے انتظام کے آئیں۔ حضور کی سواری محلسرا میں اتری۔ جرنیل مرزا اسکندر بخت بھائی کو نذر دے کر بہت آبدیدہ ہوے۔ بادشاہ بہو نواب ملکہ کشور فخر الزمانی نواب تاج آرا بیگم والدہ بادشاہ نے بلائیں لیں، سیلے صدقے اترنے لگے۔ محلسرا کے تمام عملے نے نذریں دیں۔ اتنے میں ابر رحمت گھر کر آیا اور کچھ ترشح ہونے لگا۔ صبح کو نواب امین الدولہ سعید الدولہ اہل دربار منتظر تھے کہ حضور تشریف لائے پھر ہی جشن وہی جلسے ہونے لگے۔ انعام اکرام تقسیم ہوئے۔

کچھ دنوں کے بعد نواب امین الدولہ معزول ہو گئے۔

۵ راگست ۱۸۴۷ء نواب علی نقی خاں بہادر کی سفارشیں پہنچیں۔ بادشاہ نے طلب فرمایا۔ حاضر ہوئے۔ سلام کیا نذر دی اتیس پارچے کا خلعت وزارت مرحمت ہوا۔ رکن رکین خلافت جہانداری اعتضاد سلطنت وشہریاری امیر الامرا مدار المہام وزیر الممالک معتمد الخاقان تلمیذ السلطان سیف مسلول رمح مصقول معرکہ دشمن گاہی ساعد مساعد یکرنگی وصفا ناہج مناہج صداقت و وفا مرید مرشد پرست اخلاص گزیں خانہ زاد عقیدت سرشت صفوت آئین مختار ذی اقتدار یار وفادار سپہ سالار رستم ہند مدار الدولہ منتظم الملک نواب علی نقی خاں بہادر سہراب جنگ فدوی خاص جاں نثار ابوالمنصور ناصر الدین سکندر جاہ سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ" خطاب ملا۔ پچیس ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔

انھوں نے دست بستہ عرض کی کہ فیض آباد کا داروغہ عدالت (جج) حفیظ اللہ فرنگی محل کا مولوی بے قصور محض وزیر سابق کے عتاب میں آگیا ہے۔ میری دوستی کے صلے میں خانہ نشیں ہے۔ مروت سے بعید ہے کہ میں خلعت وزارت پہن لوں اور وہ محروم رہ جاے۔ حکم ہوا اچھا ان کو بھی پیش کرنا۔ دوسرے روز مولوی صاحب طلب ہوے۔

ان کے گھر میں تیسرا فاقہ تھا کہ شاہی چوبدار نے آکر سلام کیا اور کہا آپ کو وزیر اعظم نے یاد فرمایا ہے۔ یہ اس کو امداد غیبی سمجھکر حاضر آستانۂ عالی ہوے۔ دربار لگا ہوا ہے۔ وزیر علی نقی خاں دست راست کرسی پر جلوہ فرما ہیں۔ شہزادے داہنی طرف کرسیوں پر فروکش ہیں۔ اکابرین سلطنت، رفقا، مصاحبین اپنے اپنے مراتب سے بیٹھے ہیں کہ ڈیوڑھی سے چوبدار نے آواز دی " بادشاہ عالمیاں مولوی حفیظ اللہ حاضر ہے نگہ دوبرو" اسیطرح ڈیوڑھی سے دربار تک دو طرفہ چوبدار کھڑے ہوئے آواز یکے بعد دیگرے لگا رہے ہیں کہ مردست کو خبر ہوگئی۔ اُسنے دست بستہ عرض کیا " مولوی حفیظ اللہ حاضر ہے" بادشاہ نے اشارۂ ابروسے اجازت حضوری دی۔ مولوی حفیظ اللہ لال پردے کے پاس کھڑے تھے۔ داروغہ ڈیوڑھی نے حکم دیا جانے دو۔ پردہ اٹھتے ہی راجہ اندر کا اکھاڑا نظر آیا۔ یہاں سے جھک جھک کر برابر سلام کرتے ہوے جا رہے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے داہنے ہاتھ پر پانچ اشرفیاں (جو کسی مہاجن سے سودی لائے تھے) رکھکر بایاں ہاتھ نیچے رکھکر نذر دکھائی۔ بادشاہ نے صرف ہاتھ رکھدیا نذر قبول ہوگئی۔ ہفت پارچہ کا خلعت ملا اور دوسو روپیہ ماہوار تنخواہ سابق بحال ہوئے۔ خلعت میں چیرہ، گوشوارہ، دوشالہ، رومال، تھان کمخواب، ٹیکا، تسبیح مونگے کی مرحمت ہوئی رخصت ہوکر گھر آئے۔ وزیر نے سرکاری ہاتھی پر سوار کرکے بھیجا۔ گھر پر آکے ایک ہزار روپیہ مہاجن سے اور سودی لیا۔

شام کو مردست چوبدار شاہی عملے کے لوگ انعام کے لئے حاضر ہوے۔ بمشکل تمام پانچسو روپیہ انعام دے کر جان بچائی۔ لوگوں نے کہا یہ مولوی صاحب ہیں جو کچھ دیں تبرک سمجھکر لے لو۔ دوسرے روز واجب العرض پیش کی کہ بخشی گری میں حکم بھیجدیا جائے جو منظور ہوگئی۔ مولوی صاحب اپنے سابقہ عہدے پر ممتاز ہوکر فیض آباد گئے۔

اسی طرح تاجپوشی کا جشن مہینوں رہا۔

رفیق خاص خواجہ اسد علی خاں قلق کو خلعت سرفرازی عطا ہوا مصاحبین خاص میں اسم ہوگیا۔ پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی " آفتاب الدولہ مہر الملک خواجہ اسد علی خاں بہادر شمس جنگ" خطاب ملا۔ علی حسین خاں کو سیف الدولہ خطاب ملا۔ خدمت دیوان خانہ تفویض ہوئی۔ مہاراجہ بالکرشن کو مشیر الدولہ خطاب ملا۔ خدمت دیوانی حاصل ہوئی۔ حیدر حسین کو اہتمام الدولہ خطاب ملا۔ دیوان عام کے مہتمم ہوے۔ بشیر الدولہ گلبن دولہ دیانت الدولہ احسن الدولہ۔ فیروز الدولہ خواجہ سرا نواب ناظر محلات شاہی مقرر ہوے۔ حاجی شریف ترکسواران خاص اور کئی بٹالن کے رسالدار ہوئے۔ ثابت الدولہ تاج الدولہ ملازمت سے موقوف ہو گئے لیکن شاہی وظیفہ جاری رہا۔

شاہان اودھ کے عہد میں بلکہ تمام ہندوستان کے راجہ مہاراجہ بادشاہ کے زمانے میں یہ بات تھی کہ جب کوئی شخص بادشاہ کے دربار میں پیش ہوا اور اسکی نذر بادشاہ نے قبول فرمائی سمجھ لینا چاہئے کہ اس کو ملازمت سرکاری ضرور ملے گی۔ یا کسی کو بادشاہ نے خطاب مرحمت فرمایا، تو خطاب کے ساتھ ہی ساتھ معقول تنخواہ ضرور مقرر کی جائے گی جسمیں عزت وآبرو کے ساتھ بسر کرسکے - اور یہ تنخواہ پشت در پشت چلی آتی تھی۔

تمام اودھ کی سلطنت میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جس کو خطاب ملا ہو اور شاہی وظیفہ نہ مقرر ہوا ہو۔ آخری شاہ اودھ کے دربار میں تو تمام ہندوستان کے چیدہ لوگ

مصاحبوں میں ملازم ہوے - ایک سے ایک بڑھ کے شاعر مولوی دانا حکیم - اسی زمانہ میں جناب عالی کا مزاج کچھ ناساز ہوگیا کچھ دنوں کے بعد الحمد اللہ صحت حاصل ہوئی - ہزاروں صدقے اُترے - تیل ماش بڑے تزک احتشام سے آے - منتیں مرادیں پوری ہوئیں - غسل صحت کی تیاری ہونے لگی - حکم ہوا جلد سامان کیا جائے - سلطان عالم حضرت عباس کی درگاہ تشریف لیجائیں گے - جلوخانہ میں سب موجود ہوں - مجرئی بھی سب حاضر ہوں چوک میں آئینہ بندی ہونے لگی -

تاریخ معینہ پر بادشاہ حمام میں تشریف لے گئے - نہا دھو جامہ خانے میں رونق افروز ہوئے - پوشاک کی کشتیاں آئیں - لباس فاخرہ زیب جسم فرمایا - ہوادار پر سوار ہوکر باہر تشریف لائے - عماری دار ہاتھی پر سوار ہوے - جھنڈیاں تمامی کی جھک گئیں - سلامی کی توپیں چھوٹیں - شہر میں سواری کی دھوم تھی - درِ دولت سے درگاہ تک تھالی پھینکو تو سر ہی سر جاے - سواری بہت قرینے سے نکلی - آگے آگے تمام فوج، اس کے بعد جلو میں برق دم پلٹنیں، سواروں کے پرے - دور سے غل ہوگیا لو اب ڈنکا آیا - دیکھنا وہ ماہی مراتب آپہنچا - اتنے میں بیرق اور پرچم دکھائی دیا - نشان و علم نظر آئے - آگے آگے ہزاروں سقے چھڑکاؤ کرتے ہوئے مشکوں میں گلاب کیوڑا بھرے ہوے تمامی کی لنگیاں باندھے ہوئے - دو تین سو شتر سوار زرتار شملے باندھے ہوے پُرزرور دیاں طاؤس کی طرح مست سانڈنیاں چھلاوا ایک ایک منزل کے دھاوے کی - باندار چوبدار روشن چوکی والے شہنائی نواز جلوہ دار غنچہ رُو گلفام دہنے بائیں چنور ہلاتے ہوے چہرہ پر سورج مکھی لگائے ہوے صید و شکار کا سامان قراول غضب کے شکاری شاہین عقاب تیز پر - خالی پوچے اور ہوادار مغرق نالکیاں نفیس پالکیاں انگریزی باجے بجتے ہوے جا رہے ہیں - اتنے میں جلوس خاص آیا - برچھے والے برق انداز بھالے والے خاص بردار کندھوں پر خاصیاں رکھے ہوے، سینگڑہی ساز مرصع کار نقیب آواز لگاتے ہوئے با ادب ملاحظہ دولت و اقبال کی ترقی ساتھ میں ہاتھیوں کے غول، مخملی کارچوبی جھولیں پڑی ہوئیں، ریشمی رسّے، طلائی مرصع کار مکٹ مستکوں پر چاند سورج لگے ہوے، دانتوں پر چوڑی چڑھی ہوئی - فیلبان بھی نکھرے ہوئے - سر پہ چیرے باندھے ہوئے کُرتے اور گوشوارے لٹکتے ہوئے گنگا جمنی کجبائیں لئے ہوے جن پر بادشاہ کے عزیز قریب جلوہ افگن بیچ میں بادشاہ سلامت - ادھر اُدھر تمام دو تنخواہ ارکان دولت ہمراہی میں اشرفیاں روپئے لٹاتے ہوئے اس شان و شوکت سے سواری درگاہ میں داخل ہوئی - پہلے انگلی اٹھا کے زیارت پڑھی پھر ضریح مبارک آنکھوں سے مس کی - دو ہزار روپیہ کی نذر چڑھائی - اسی شان و شوکت سے واپس آئے - ذرا سے درگاہ تک جانے میں لاکھوں روپیہ تقسیم ہوگیا - اسی طرح رات دن جلسے رہتے تھے - لوگ اس آرزو میں رہتے تھے کہ ایک مرتبہ بادشاہ ہمارا سلام لے لیں، پھر دولت کی کچھ پرواہ نہیں ہے - جسکا سلام قبول ہوگیا، مالامال کردیا - خلعت دیا تو زر بھی دیا، خطاب دیا تو تنخواہ بھی کردی -

اس داد و دہش کا یہ فیض تھا کہ لکھنؤ میں تین برس رہا تھا - الماس علیخاں خواجہ سرا نواب ناظر کے چیلے فتح علیخاں وحید بخش کی فقط شب برات میں لاکھ روپیہ کا تار بقیش کترا جاتا تھا عبیر کی طرح اڑایا جاتا تھا جسکی سیروں چاندی صبح کو مہترانی چن لیجاتی تھی -

عشرت لکھنوی

تاجِ انگلستان پر ایک مؤرخانہ نظر

(اہل نارمن* کے فتح کے زمانہ سے حضور ملک معظم جارج پنجم کی تاجپوشی کے زمانہ تک)

مسٹر ٹومس مور نے لکھا ہے کہ "گلدستوں اور پھولوں کے تاج کا استعمال بہت قدیم زمانہ سے ہے" واقعی اسوقت تک بہت سے تاج استعمال ہو چکے ہوں گے جب کہ اُن کے پہننے کی تاریخ ضبط تحریر میں آئی کیونکہ بہت سی قومیں دنیا میں ایسی ہو گزری ہیں جن کی کوئی تاریخ ہمارے پاس نہیں۔

حال کی تحقیقات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ چار ہزار برس قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام یعنی یونان یا قدیم روما میں جب کہ تاج کا استعمال علامت شاہی سمجھا جاتا تھا؛ اس سے بہت پہلے مینیس جس نے مصر کے اوّل شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی، اس قسم کی شاہی علامت استعمال کرتا تھا۔ اگر تاریخ حجاز پر نظر ڈالی جائے تو قصۂ گلگمیش میں یہ لکھا ہوا ملیگا کہ جب ایشتر جو بڑے دیوتا بعل کی لڑکی تھی، عالم ارواح میں پہنچی تو اس کا تاج دنیا کے ساتوں دروازوں میں سے پہلے دروازہ پر اتار لیا گیا تھا۔ توریت مقدس کی کتاب خروج کے ۲۹/۶ میں (یہ زمانہ غالباً انیسویں مصری خاندان کے زمانہ سے مطابقت رکھتا ہے از ۱۳۲۰ تا ۱۲۰۵ قبل عیسوی) کاہنوں کے تاجوں کا ذکر ہے "اور تو عمامے کو اس کے سر پر رکھ اور قدس کا تاج عمامے پر لگا"۔ علاوہ ازیں اسی کتاب کے ۳۹/۳۰ میں خالص سونے کے تاج کا بھی ذکر ہے جس کو حضرت موسیٰ نے کاہنوں کے لئے پسند فرمایا تھا۔

لہذا پوپ کے تاج نے بظاہر عبرانیوں کے بادشاہ یا منصف کی کلاہ کے نمونے پر اپنی صورت اختیار کی ہے۔ اگرچہ اپنی اصلی حالت میں یہ زیادہ تر اہل روما کی آزاد ٹوپی سے مشابہ ہے جس کو آزاد غلام جبکہ وہ غلامی سے آزاد ہو جاتے تھے پہنتے تھے۔ شہنشاہ قسطنطین (۲۷۴ء-۳۳۷ء) کے تاج سے مذہبی آزادی مراد تھی اور ۸۵۸ء تک اسی قسم کے تاج کا رواج رہا لیکن آخر کار اُس زمانہ کے پوپ نے اپنی ٹوپی میں ایک سنہری حلقہ اور زیادہ کیا جس سے یہ مراد تھی کہ پوپ کو دنیاوی اختیارات بھی حاصل ہیں۔ بونی فیس ہشتم نے ایک اور طلائی نشان بڑھایا جس سے دنیاوی بادشاہت مراد تھی اور اربن پنجم (۱۳۶۲ء-۱۳۷۰ء) نے ایک اور نشان زائد کیا جس سے اُسکی خوبصورتی دوبالا ہوگئی۔

انگریزی تاج کی بنیاد ایک سیدھی سادی پٹی سے پڑی اور نہایت تزک و احتشام کے درجہ پر پہنچی۔ اس کے دو حصّے ہیں جنمیں قبہ نما اور قوس نما شکلیں ہیں اور جو قیمتی جواہرات سے مزین ہیں۔ اسکو کلاہِ ریاست یا کلاہِ سیاست کہتے ہیں۔

الفریڈ اعظم (۸۷۱ء-۹۰۱ء) کے سکّوں پر ہمکو سنہری پٹی کا، جسمیں جواہرات کے نقوش پائے جاتے ہیں، پتہ چلتا ہے

* ڈیوک آف نارمنڈی ولیم اول جو فاتح کے لقب سے مشہور ہے ۱۰۶۶ء میں انگلستان پر حملہ آور ہوا اور اس کو اپنے تحت میں لایا یہ واقعہ فتح اہل نارمن کے نام سے مشہور ہے۔

جسمیں چند میخیں (جو اوپر سے گول ہیں) یا موتی لٹکے ہوئے ہیں۔ لڑائی کے وقت یہ حلقہ خود پر ڈالا جاتا تھا تاکہ بادشاہ آسانی سے پہچانا جاسکے۔ کینیوٹ (۱۰۱۷ء۔۱۰۳۵ء) کے وقت تک اس نمونہ میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی لیکن تاج اُس کے زمانہ تک زیادہ قیمتی اور مزین ہوچکا تھا۔ بجاے ایک گیند کے تین گیندیں میخ پر بنائی گئیں اور اس طرح سہ برگہ پھول کا رواج ہوگیا۔ ایڈورڈ کنفیسر (۱۰۴۲ء۔۱۰۶۶ء) نے تاج کی شکل کلاہِ بشپ کی مانند اختیار کی۔ لیکن ولیم اول نے روزمرہ کے استعمال کے لئے وہی نمونہ پھر اختیار کیا جسمیں چار میخیں معہ سہ برگہ پھول کے لگائیں۔ اگرچہ اسکی تاجپوشی کے وقت وزنی جواہرات کا تاج استعمال کیا گیا تھا۔

ولیم دویم (۱۰۸۷ء۔۱۱۰۰ء) نے اس پر اور زیورات کا اضافہ کیا اور اس نے کچھ میخیں بھی زائد لگائیں اور کانوں کے اوپر سنہری پٹی میں سے دونوں جانب چھوٹے دانوں کا ایک گچھا لٹکایا جو الفریڈ اعظم کے تاج کی نقل ہے اور جو جلوس شاہی کے وقت پہنا جاتا تھا۔ یہ وہی الفریڈ کا تاج ہوگا جسکی قیمت اس زمانہ کے حساب سے ۲۴۸ پونڈ ۱۰ شلنگ سمجھی گئی تھی۔

ہنری اول (۱۱۰۰ء۔۱۱۳۵ء) کے دو تاج تھے۔ ایک معمولی طرز کا تھا جسکو وہ خود پر پہنتا تھا۔ ایک اس سے زیادہ شاندار تھا جسکو وہ دربار کے مواقع پر استعمال کرتا تھا۔ اگرچہ یہ تاج ولیم اول کے سیدھے سادے تاج کے نمونے پر ہے لیکن اس میں ولیم دویم کے پیچ کو لٹکتے ہوے دانے موجود ہیں۔

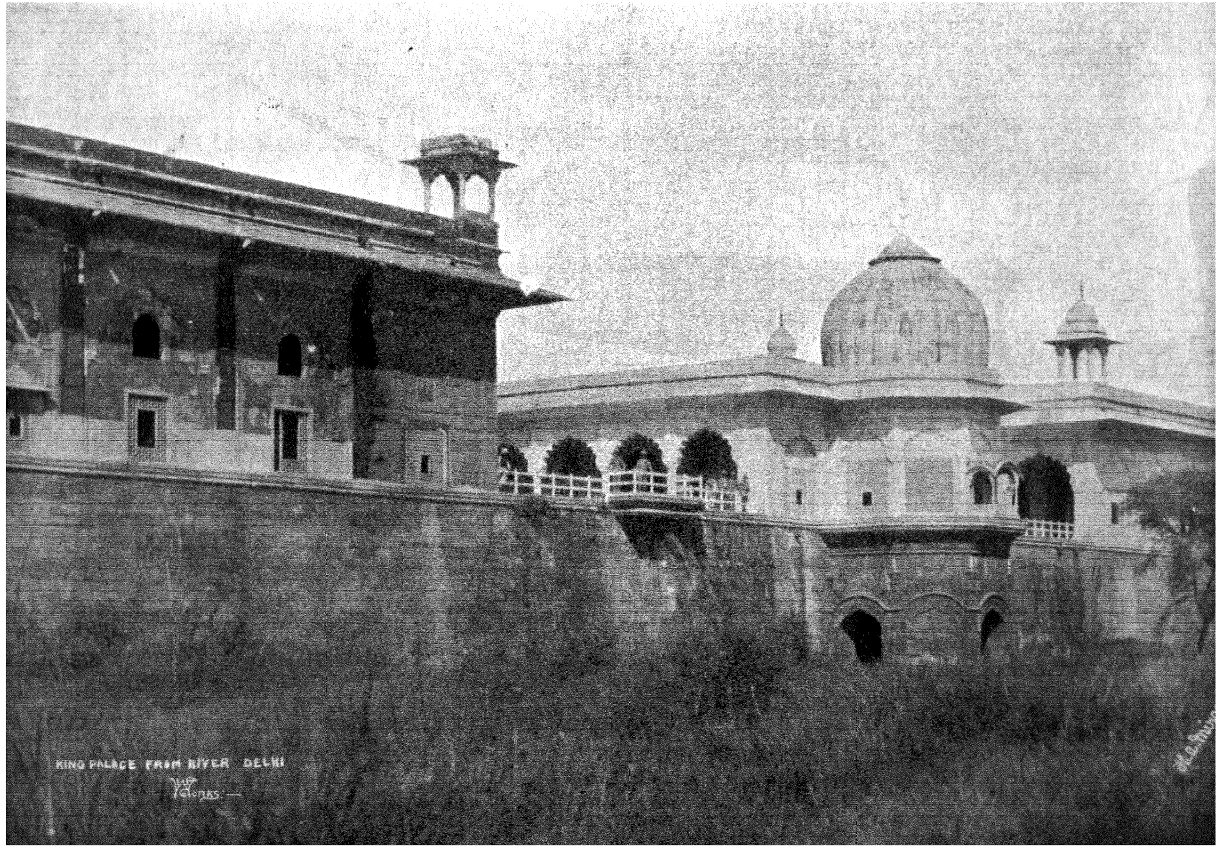
اسٹیفن (۱۱۳۵ء۔۱۱۵۴ء) نے علامت شاہی کی بہت زیب و زینت کی جو اس کے وقت سے شان و شوکت میں بڑھتا ہی گیا۔ میخیں معہ سہ برگہ پھول کے زیادہ وزنی ہوگئیں اور سنہری محراب سے ملا دی گئیں۔ یہ پہلا بادشاہ معلوم ہوتا ہے جس نے تاج میں پتیوں کے نمونے کی شکل اضافہ کی۔ ہنری دویم (۱۱۵۴ء۔۱۱۸۹ء) نے تاج کا بالکل وہی نمونہ قائم رکھا جس کو اسٹیفن استعمال کرتا تھا۔

رچرڈ اول (۱۱۸۹ء۔۱۱۹۹ء) نے بلحاظ قیمتی زیبائش کے ایک اور قدم آگے بڑھایا اور اس کا تاج اس قدر جواہرات سے مرصع اور مزین تھا کہ اس کی تاجپوشی کے وقت اس کے دو امیر دونوں طرف اُس کے تاج کو سنبھال رہے تھے کیونکہ وہ اس قدر وزنی تھا کہ وہ اُس کے بار کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

شاہ جان (۱۱۹۹ء۔۱۲۱۶ء) کی شبیہ سے جو وورسٹر کے بڑے گرجا میں ہے ہمکو اس کے تاج کی بدنما شکل یاد آجاتی ہے۔ اگر ہم لندن کے سناروں کی مذمت نہ کریں تو ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ یہ خاص تاج وہ ہے جو جرمنی سے بطور تحفہ کے بھیجا گیا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ اس کے تمام تاج (اُس کے پاس کئی تاج تھے دریائے واش کو پار کرتے ہوئے گم ہوگئے ہوں جو لنکن شائر اور نارفاک کے درمیان واقع ہے کیونکہ جب کمسن بادشاہ ہنری سویم (۱۲۱۶ء۔۱۲۷۲ء) کی تاجپوشی ہوئی تو ایک سیدھا سادہ سربند اس موقع کے لئے تیار کرایا گیا تھا۔ بعد ازاں اُس نے یقیناً ایک تاج بہت عمدہ بنوایا جیسا کہ اس کی شبیہ سے جو ویسٹ منسٹر ایبے میں ہے پایا جاتا ہے۔ اب تاج کی اہمیت اس درجہ پر پہنچی کہ ایک جواہرات کا محافظ بھی شاہی محل کے لئے مقرر کیا گیا۔

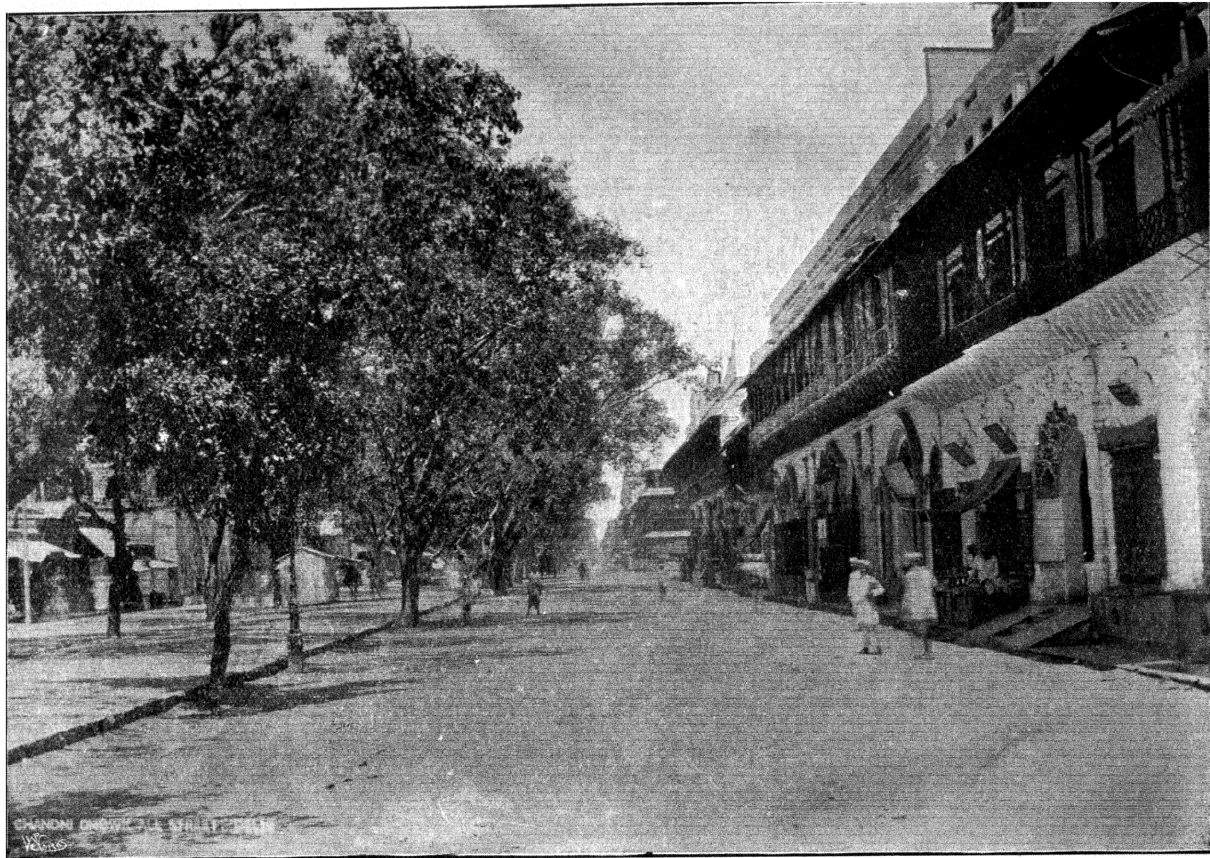
ایڈورڈ اول (۱۲۷۲ء۔۱۳۰۷ء) نے وہی طریقہ قائم رکھا جو اس سے پہلے متقدمین نے اختیار کیا تھا اور اس کے تاج کی خصوصیات وہی سنہری سہ برگہ پھول اور درمیانی جواہرات ہیں

ایڈورڈ ثانی (۱۳۰۷ء۔۱۳۲۷ء) نے شاہ بلوط کی پتیاں



यमुना की ओर से शाही-महल का दृश्य । KING'S PALACE (FROM RIVER) نظارۂ شاہی محل (دریا کی طرف سے)

Indian Press, Allahabad.



चाँदनी चौक के कूचे। STREETS OF CHANDNI CHOWK کوچہ ہاے چاندنی چوک

Indian Press, Allahabad.

بجائے سہ برگہ پھول کے اختیار کیں۔ ایڈورڈ سوئم (۱۳۲۷ء۔۱۳۷۷ء) پہلا بادشاہ تھا جس نے کلاہِ سیاست یا کلاہِ ریاست اختیار کی اور اس لحاظ سے بھی پہلا تھا کہ اس شاہی علامت کو ضمانت میں دیکر رعایا سے روپیہ وصول کیا۔ یہ نظیر اس کے چند جانشینوں نے بھی اختیار کی۔ اس تاج کی تصویر بھی ہم یہاں نقل کرتے ہیں جس کے بارہ میں رچرڈ ثانی (۱۳۷۷ء۔۱۳۹۹ء) نے جو شکسپیر کا شیریں کلام بادشاہ ہے یہ کہا تھا کہ "یہ بھاری بوجھ میرے سر سے ہٹاؤ"۔ مشہور "ہیری" تاج دوسرے عہد سے تعلق رکھتا ہے جو کنٹربری کیتھڈرل میں ہنری چہارم (۱۳۹۹ء۔۱۴۱۳ء) کی شبیہ میں مع اپنی اونچی اسٹابری کی پتیوں کے جن کے حد فاصل سہ برگہ پھول تھے اور جسکا بیندا جواہرات سے مرصع اور آراستہ تھا دیکھا جاسکتا ہے یہ غالباً بہت ہلکا تاج تھا جو شہزادہ ہال (بعد ازاں ہنری پنجم) کے تکیہ پر رکھا ہوا تھا اور جس کو وہ اپنے سر پر خود رکھ لیتا تھا۔ اجنکورٹ کے مقام پر اس کے پہننے سے بادشاہ کی جان بچ گئی کیونکہ جب وہ میدانِ جنگ سے فرار ہوا تو تاج بہت خراب ہوگیا تھا۔ اُس نے اینی آف بوہیمیا کی کلاہِ سیاست پر محرابیں اضافہ کرنے میں تقلید کی اور پہلی مرتبہ لاطینی صلیب استعمال کی۔

ہنری ششم (۱۴۲۲ء۔۱۴۶۱ء) کے زمانہ میں تاج نے بالکل نئی صورت اختیار کی۔ محرابیں اس نقطہ پر جہاں وہ ملتی ہیں زیادہ اونچی ہیں اور اس سے اُس جھکاؤ کی علامت پائی جاتی ہے جو آج انگلش تاج کی خصوصیات میں سے ہے۔ پتے غائب ہوجاتے ہیں اور لاطینی صلیب جس کو سب سے اوّل ہنری پنجم نے اپنے تاج میں بڑھایا تھا جیسا کہ اسکی بڑی مُہر سے ثابت ہوتا ہے مستقل طور پر اُنکی جگہ لے لیتی ہے۔ موتیوں کے چھوٹے گچھے کُھل جاتے ہیں اور اہم سہ برگہ پھول کی مستقل صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ شاہی تاج جسکو ہنری ششم نے پہنا خاندان یارک کے ہاتھوں پڑگیا اور اس سے ایڈورڈ چہارم (۱۴۶۱ء۔۱۴۸۳ء) کی یارک میں تاجپوشی ہوئی۔ لیکن اُس نے دوسرا تاج بھی بنوایا جس کی خصوصیات میں سے دس پھول تھے اور سب کے اوپر صلیب قائم تھی۔ وہ تاج جسکو رچرڈ سوئم (۱۴۸۳ء۔۱۴۸۵ء) نے باسوتھ فیلڈ میں کھودیا تھا سر ریجینالڈ برے نے ایک جھاڑی میں پڑا پایا اور اُس کو لارڈ اسٹینلے کے پاس لیگیا جسکو اُس نے ہنری ٹیوڈر کے سر پر رکھ دیا اور اس کو بادشاہ بنا دیا۔ ہنری ہفتم کے (۱۴۸۵ء۔۱۵۰۹ء) مقبرے پر ویسٹ منسٹر ایبے میں اس واقعہ کو اس طرح یادگار کے طور پر رکھا ہے کہ تاج کو جھاڑیوں میں پڑا دکھایا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں پھول، بشپ کے تاج کا مرکز، اور صلیب اختیار کی۔ ہنری ہشتم (۱۵۰۹ء۔۱۵۴۷ء) نے ایک زیادہ چپٹا اور کلاہ نما تاج چار نصف محرابوں کے اندر قائم کیا جنکے اوپر کرہ اور صلیب بنائی گئی ہے۔ اور ۸ صلیبیں اور اسی قدر پھول باہر کے حصے کو ظاہر کرتے ہیں جنہیں بہت سے جواہرات بھی لگے ہوئے ہیں۔

ایڈورڈ ششم (۱۵۴۷ء۔۱۵۵۳ء) کا تاج اُس کے باپ کے تاج سے زیادہ روشن اور چمکدار نہ تھا کیونکہ اسکی قیمت صرف ۳۷ پونڈ ۱۶ شلنگ ۸ پینس تھی۔ ملکہ میری (۱۵۵۳ء۔۱۵۵۸ء) کے تاجوں میں سے، اگرچہ اس نے تاج پوشی کے وقت تین تاج پہنے، کسیکا نمونہ باقی نہیں ہے۔ ملکہ ایلزبیتھ (۱۵۵۸ء۔۱۶۰۳ء) کے تاج کی ابتدائی تبدیلیوں میں کلاہ سیاست کا پتہ چلتا ہے۔ نصف محرابیں جو اس کے تاج میں بنی ہوئی تھیں ہر قسم کے قیمتی جواہرات سے مزیّن تھیں۔

جیمس اوّل (۱۶۰۳ء-۱۶۲۵ء) کا تاج شکل و صورت میں ہنری ہشتم کے تاج کی صلیبوں اور پھولوں کے مشابہ تھا۔ چارلس اوّل (۱۶۲۵ء-۱۶۴۹ء) کے تاج میں محرابوں کی اونچائی بہت زیادہ کردی گئی۔ اس کے جواہرات کی قیمت کا اندازہ ۹۸۳ پونڈ کیا گیا تھا اور اس کے سونے کا تخمینہ چالیس پونڈ۔ اس کی تاریخ کا پتہ لگانا ذرا مشکل ہے لیکن یہ بات کہ وہ ضمانت میں پیش کیا گیا یقینی ہے۔ آیا چارلس نے ۱۶۲۳ء میں اپنے باپ کے تاج پر روپیہ وصول کیا تاکہ وہ میڈرڈ میں جا کر اپنی شان و عظمت دکھلائے، یا اپنے جلوس کے سال میں یہ تاج ضمانت میں رکھا، یا یہ واقعہ ۱۶۴۲ء تک نہیں ہوا جس سال وہ اکسفورڈ کو واپس آیا، یہ ایسی باتیں ہیں جنکی بابت ٹھیک طور پر کچھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ درست ہے کہ اس کا تاج کچھ عرصہ کے بعد ٹاور میں پایا گیا کیونکہ کرامویل کے حکم سے وہ اور ملکۂ ایڈتھ کا تاج اور بادشاہ الفریڈ کا تاج تینوں سلطنت کے فائدے کی غرض سے فروخت کردئے گئے تھے۔

معلوم نہیں کہ تاریخی جواہرات پھر کس طرح واپس لئے گئے لیکن جب سر رابرٹ وائنر کو جو شاہی سنار تھا ہدایت ہوئی کہ وہ چارلس دوم (۱۶۶۰ء-۱۶۸۵ء) کے لئے دو تاج بنائے (سلطنت کا تاج اور سینٹ ایڈورڈ کا تاج) اُس نے وہ بڑا لعل جو اُس میں جڑا، کریسی کے مقام پر مال غنیمت میں ایڈورڈ موسوم بہ بلیک پرنس کے ہاتھ لگا تھا۔ مشہور زردی مائل نیلم جو دو انچ لمبا تھا اور وہ زمرّد جو کبھی ایڈورڈ کنفیسر کی انگوٹھی میں جڑا ہوا تھا اور جس کا محیط سات انچ تھا ان دونوں سے تاج کو مزیّن کیا گیا۔ سینٹ ایڈورڈ کا تاج معہ اپنی چار نصف محرابوں اور حلقہ کے جو جواہرات سے مرصّع تھا اور محرابوں کے سروں پر کچھ نیچا تھا جہاں کرہ اور صلیب قائم ہیں شکل و صورت میں ہمارے موجودہ بادشاہ کے تاج کے بہت ہی مشابہ ہے۔ سر رابرٹ وائنر کو ہدایت کی گئی تھی کہ یہ تاج شکل و صورت میں ٹیوڈر بادشاہوں کے اوّل بادشاہ کے تاج کے مطابق ہونا چاہئے۔ کیونکہ ہنری ہشتم نے پھولوں اور لاطینی صلیبوں کو دوچند کردیا تھا اور ہنری ہفتم وہ بادشاہ تھا جس نے چار پائدار اور مضبوط صلیبیں اسی قدر پھولوں کے درمیان قائم کی تھیں۔ جیمس دوئم (۱۶۸۵ء-۱۶۸۸ء) کی تاجپوشی کے وقت محرابیں زیادہ اونچی کردی گئیں، اور صلیب کے بازوؤں میں جو بہت سے تاجوں کی شکل و صورت سے مختلف ہیں نوکیلے چمکدار موتی لگے ہوئے ہیں۔

تاج میں کچھ تبدیلیاں اور اضافات ولیم سوئم و ملکہ میری (۱۶۸۹ء-۱۷۰۲ء) این (۱۷۰۲ء-۱۷۱۴ء) جارج اوّل (۱۷۱۴ء-۱۷۲۷ء) جارج ثانی (۱۷۲۷ء-۱۷۶۰ء) جارج سوم (۱۷۶۰ء-۱۸۲۰ء) کے عہدہائے سلطنت میں ہوئیں لیکن جارج چہارم (۱۸۲۰ء-۱۸۳۰ء) کے زمانہ تاجپوشی تک کوئی نئی قسم کا تاج سلطنت نہیں بنایا گیا تھا۔ جارج چہارم کا تاج شاہانِ اسبق کے تاجوں سے زیادہ خوشنما اور مزیّن تھا۔ اسکی قیمت ایک لاکھ پچاس ہزار پونڈ بتائی جاتی ہے۔ ولیم چہارم (۱۸۳۰ء-۱۸۳۷ء) نے غالباً اُسی کو استعمال کیا کیونکہ اسکی تاجپوشی کے وقت اور کسی قسم کی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا لیکن وہ تاج جو ملکۂ وکٹوریہ آنجہانی (۱۸۳۷ء-۱۹۰۱ء) کے لئے بنایا گیا شکل و صورت میں زیادہ شاندار تھا۔ وہ سونا جس سے سہ برگہ پھول، کرہ، صلیب، حلقہ اور محرابیں بنائی گئیں تھیں بالکل جواہرات سے مزیّن کردیا گیا تھا۔ ایڈورڈ کنفیسر کے بڑے نیلم اور بیرحم پیڈرو آف کیسٹیل کے مشہور لعل کے علاوہ اُس میں ۲۷۸۳ ہیرے، ۲۷۷ موتی، ۱۶ نیلم، ۱۱ زمرّد اور ۴ لعل تھے۔

ایڈورڈ ہفتم کے تاج میں جڑاؤ کی خوبی جو ملکہ وکٹوریہ کے تاج کی خصوصیات سے ہے کسی قدر جاتی رہی ہے لیکن جیسا کہ مسٹر سرل ڈیوینپورٹ

ایف۔ ایس۔ اے جو اِن معاملات کا مستند عالم سمجھا جاتا ہے لکھتا ہے کہ "ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاہی تاج ایک قدیم اور عمدہ نمونہ کو خوبی کے ساتھ پیش کرتا ہے"

گریول میموائرس میں ایک دلچسپ نوٹ اُس تاج کے متعلق درج ہے جسکو کوئن ایڈیلیڈ نے جو ولیم چہارم کی ملکہ تھی پہنا تھا۔ ۱۰ اگست ۱۸۳۱ء کی تاریخ کے نیچے وہ لکھتا ہے :۔

وِنڈسر کو سوار ہوگیا تاکہ اِس بات کا فیصلہ ملکہ سے کرے کہ وہ کس قسم کا تاج پہنے گی۔ اُس نے نقشوں کا ملاحظہ کیا جو نہایت اُسکے نا ملائم برتاؤ میں کسی قدر میرے نزدیک مہذب طریقہ تھا اور کہا کہ وہ ہمارے تاجوں میں سے کسی کو نہیں پہنے گی کیونکہ وہ مستعار تاج پہننا پسند نہیں کرتی اور مجھسے دریافت کیا آیا اُس کا نیل بدلنا تو نہیں ہے۔ میں نے کہا، جناب! میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ گزشتہ بادشاہ نے اپنی تاجپوشی کے وقت ایک تاج پہنا تھا، لیکن اس نے کہا "میں تاج پسند نہیں کرتی اور جواہرات میرے پاس کافی ہیں بس میں انکو اپنے طرز پر استعمال کرونگی" بادشاہ نے مجھسے کہا بہت بہتر۔ اور ملکہ سے کہا کہ "تم کو جڑاؤ کی قیمت ادا کرنی ہوگی"، اُس نے جواب دیا "نہ صرف جڑاؤ کی قیمت بلکہ میں کل صرفہ اپنے پاس سے دونگی"

جو حادثات تاج برطانیہ پر گذرے ان میں سے ایک وہ ہے جو شاہی ساز و سامان کو اُسی وقت برداشت کرنا پڑا جس وقت کہ وہ کرامویل کے رفقا، کے ہاتھوں میں پڑے۔ کیونکہ اُس وقت نہ صرف شاہی تاج معہ ایک چھوٹی ٹھوس سنہری "آئی"، کے جس کا وزن سات پونڈ ۲ اونس تھا اور جسکی قیمت ایک ہزار ایک سو دس پونڈ تھی برباد ہوا اور ملکہ کا تاج جس کا وزن ۳ پونڈ ۱۰ اونس تھا اور جسکی قیمت ۳۳۸ پونڈ تین شلنگ ۴ پینس تھی، جو بالکل شکستہ اور بد نما ہوگیا تھا، بلکہ اُس کے ساتھ وہ قدیم زمانہ کی یادگار بھی جاتی رہی جسکو شاہ الفریڈ کے تاج سے موسوم کیا جاتا تھا اور جو خالص سونے کا تھا اور جسمیں ہلکے جواہرات بھی لگے ہوئے تھے۔ اور دو چھوٹے کرہ بھی نصب تھے۔

یہ اور اسی قسم کی عجیب اور دلچسپ باتیں نہایت خوبی کے ساتھ مسٹر ولیم جونس کی عمدہ کتاب موسوم بہ "تاج اور تاجپوشی" میں مشرح درج ہیں۔ علاماتِ شاہی کی تاریخ میں دوسری باتوں کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر جونس نے بتایا ہے کہ کس طرح ۱۶۷۱ء میں وہ پھر خطرہ کی حالت میں تھے کیونکہ کرنل بلڈ انکے سرقہ کرنے کی فکر میں تھا۔ وہ اور اس کے رفیق تاج اور کرہ لے گئے۔ لیکن نادر کے پشتہ پر گرفتار ہوگئے اور علامات شاہی حفاظت کے ساتھ واپس لے لئے گئے۔ سوا اس کے اور کچھ نقصان نہیں ہوا کہ کچھ نشانات ان پر پڑ گئے جب کہ چوروں نے ان کو چپٹا کرنے کی کوشش کی تاکہ آسانی سے لے جاسکیں اور اس وجہ سے چند قیمتی پتھر خراب ہوگئے۔ چند دنوں کے بعد ایک بڑا ہیرا ایک بھنگی کو رستہ میں ملا اور اپنی اصلی جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ بڑا لعل جو عصائے شاہی کے سرے پر تھا چوروں میں سے ایک کی جیب میں پایا گیا۔ خوش قسمت بلڈ کی اِس بہادرانہ اور بےخوف حرکت سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور اُس نے نہ اس کو صرف معاف کیا بلکہ شاہی عطیات کا مورد بنا دیا۔

لیکن ۳۰ اکتوبر ۱۸۴۱ء کو شاہی علامات پھر خطرہ کی حالت میں تھے مگر اس مرتبہ آگ کی وجہ سے۔ مسٹر جونس تحریر کرتے ہیں کہ ایک انگیٹھی کے زیادہ گرم کرنے کی وجہ سے گول برج میں آتش زدگی شروع ہوئی اور جواہرات کا کمرہ خاکستر ہونیکے قریب تھا لیکن آخر کار دونوں عمارتیں محفوظ رہیں۔

اُس وقت یہ مناسب خیال کیا گیا کہ علاماتِ شاہی اور تاج کے جواہرات کسی محفوظ مقام پر رکھ دئے جائیں۔ لیکن اس بارہ میں بڑی مشکل کا سامنا ہوا کیونکہ اُس صندوق کی چابی جسمیں علاماتِ شاہی رکھے ہوئے تھے خواجہ سرا کے قبضہ میں تھی یا کچھ دور تھی اور وقت تھوڑا تھا آخرکار سلاخوں کو کاٹ کر ایک جگہ نکالی گئی جس میں سے بہت سی چیزیں بڑی دقّت کے ساتھ باہر لائی گئیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں ہم اپنے موجودہ شہنشاہ کے تاج کا بھی کچھ ذکر کریں تاکہ ناظرین کو حضور کے تاج کی بھی کیفیت معلوم ہوجاسے۔

ہمارے بادشاہ کے حکم سے کلینن ہیرے کے سب سے دو بڑے حصے جو "ستارگانِ افریقہ" کہلاتے ہیں اب سلطنت کے تاج اور عصائے شاہی کے جز ہیں۔ پہلی مرتبہ یہ دونوں ہزمجسٹی کی تاجپوشی کی رسم میں جو ویسٹ منسٹر ایبے میں (جون ۱۹۱۱ء) واقع ہوئی استعمال کئے گئے تھے۔ کسی بادشاہ نے آج تک ایسے دو قیمتی جواہرات نہیں پہنے۔ بادشاہ ایڈورڈ نے حکم دیا تھا کہ بڑا نوکیلا ہیرا عصائے شاہی میں نصب کیا جائے اور اُس سے چھوٹا تاج میں اور وہ جگہ بھی بتلا دی تھی جہاں کہ اُنہیں نصب کرنا چاہئے۔ عصائے شاہی اور تاج وہی ہے جو چارلس دوئم کا تھا۔ مرحوم بادشاہ کی خواہش تھی کہ عصائے شاہی کا کوئی حصّہ علیحدہ نہ کیا جائے اور جوہریوں کو یہ سخت مشکل کام سپرد کیا کہ وہ بڑے ہیرے کے لئے عصائے شاہی میں جگہ نکالیں جو ۵۱۶½ رتّی وزنی ہے اور عصائے شاہی کے نقش و نگار بھی خراب نہوں جو مدت سے شاہی طاقت کا مقدس نمونہ ہے۔

جواہرات نہ صرف تاج اور عصائے شاہی کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں۔ بلکہ سلطنت کے دیگر رسوم کے مواقع پر وہ ملکہ کے جواہرات کے جز و لاینفک ہیں۔

محمد یحییٰ تنہا

کوہ نور

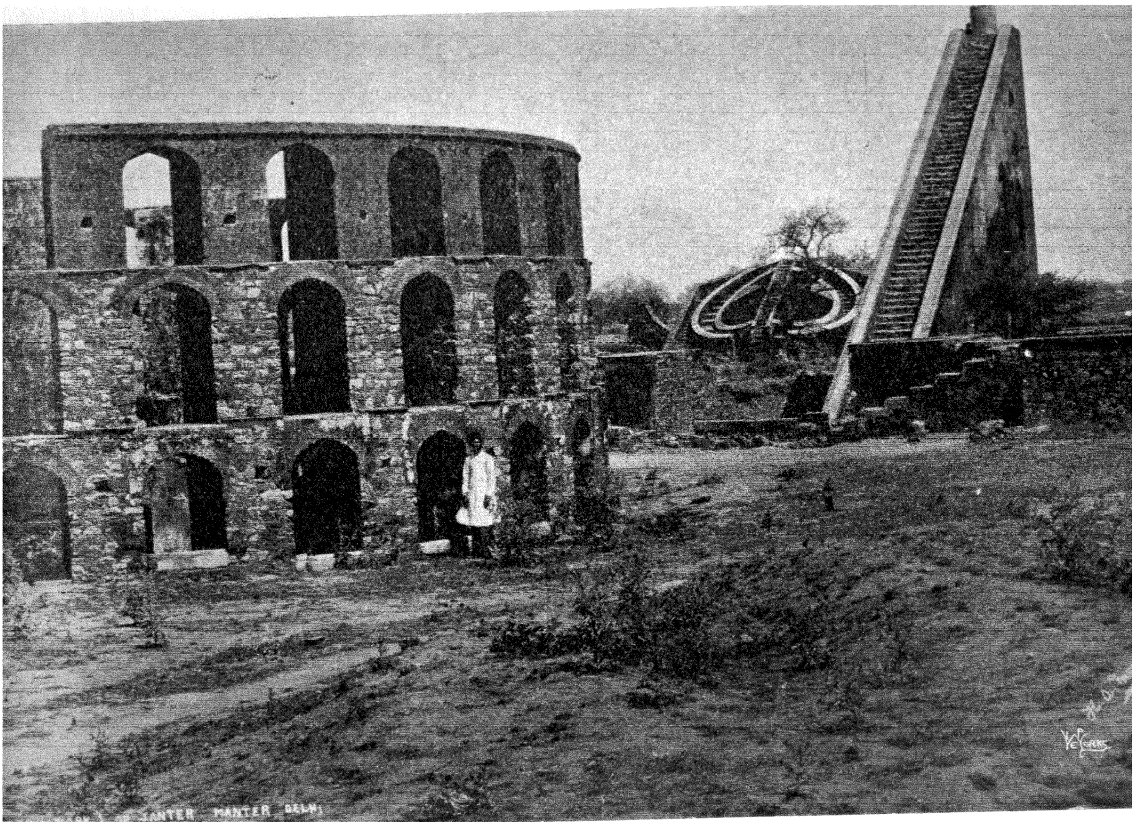
تاج برطانیہ کا رخشندہ جواہر

دہلی دربار میں جو شاہی رسوم ادا ہوئیں، انہیں ہندوستان کے لئے ایک خاص دلچسپی یہ بھی ہے کہ علیاحضرت جنابہ ملکہ معظمہ میری دام اقبالہا کے تاج میں ایک مشہور تاریخی ہیرا یعنی "کوہِ نور" جلوہ گر تھا اس ہیرے کی تاریخی کیفیت، جو بہت کچھ ہندوستان سے تعلّق رکھتی ہے، ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

موسیو ٹیورنیر[1] کے قول کے مطابق کو نور کی کان سے دستیاب ہوا تھا۔ کو نور دریائے کشنا پر واقع ہے۔ اس کے ملنے کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں مگر تحقیقات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو ۱۶۵۶ء یا ۱۶۵۵ء میں بحالت ناتراشیدگی میر جملہ[2] نے شاہجہاں کی نذر کیا تھا اس وقت اس کا وزن ۹۰۰ رتی یا ۷۸۰½ قیراط تھا۔ یہ قیراط اگر فرانسیسی ہوں تو وہ ۷۵۶ انگریزی قیراط کے برابر ہوسے۔

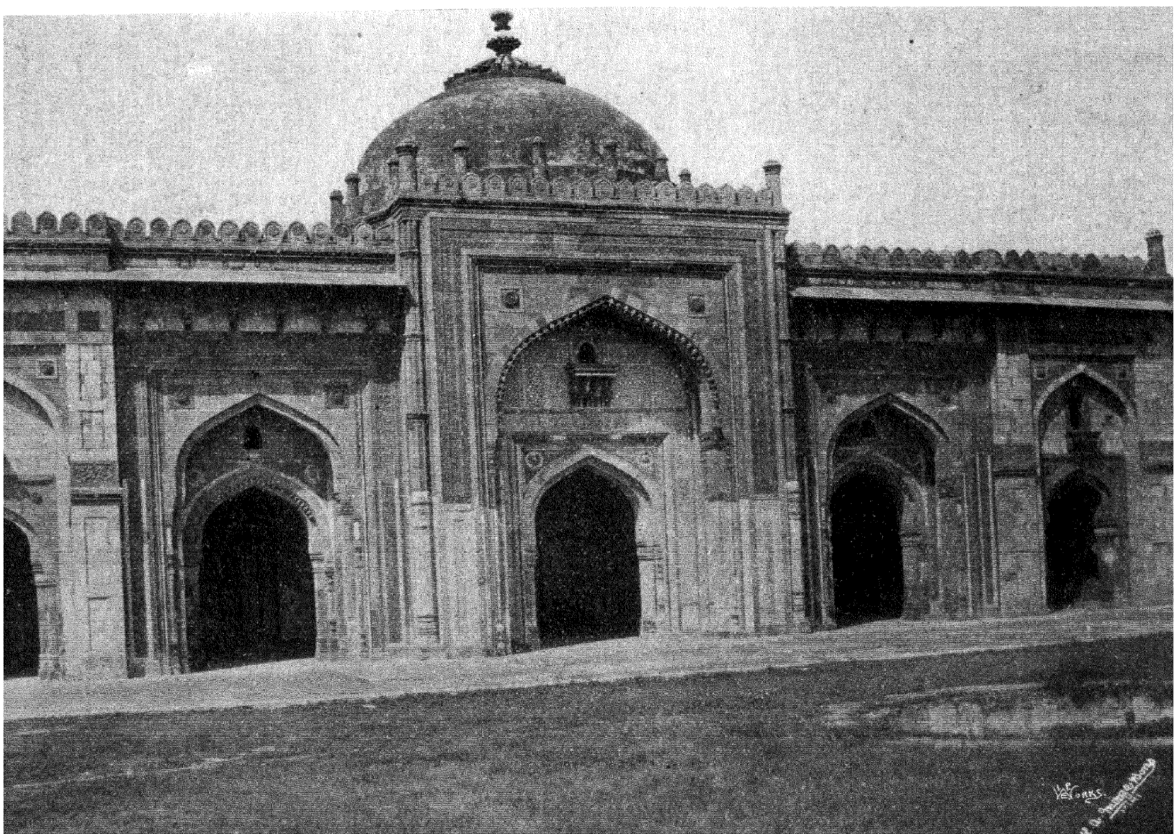
---

[1] موسیو ٹیورنیر نے دکن کی سیاحت ۱۶۴۵ء میں کی تھی یہ فرانس کا تاجر الماس تھا۔ [2] میر جملہ ایک دکنی سردار تھا جو سلطنت دکن سے بھاگ کر شاہجہاں کے پاس پناہ گزیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر برنیر نے اپنے سفرنامہ میں اس کا مفصل حال لکھا ہے۔



यन्त्रमन्त्र । JANTAR-MANTAR جنتر منتر

Indian Press, Allahabad.



पुराने क़िले के भीतर की मसजिद ।

MOSQUE (OLD FORT)

مسجد اندرون پرانا قلعہ

Indian Press, Allahabad.

بھیجدیا جاے - اسوقت اسکی قیمت کا اندازہ دس لاکھ پونڈ یعنی ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ کیا گیا تھا - مگر اس وصیت کی تعمیل نہوئی اور جب تک مہاراجہ دلیپ سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جانشین نہ تسلیم کئے گئے اس وقت تک جواہرخانہ میں رکھا رہا - ۱۸۴۹ء میں پنجاب گورنمنٹ برطانیہ کے قبضۂ اقتدار میں آیا تو یہ ہیرا ابھی نئی گورنمنٹ کو پہلے ہی اجلاس میں باضابطہ حوالہ کردیا گیا - اور لارڈ لارنس کے احباب نے اپنے ہاتھ سے لارڈ کو دیا - اتفاق دیکھئے کہ وہ ٹین کی صندوقچی جس میں ہیرا رکھا ہوا تھا لارڈ نے اپنی جیب میں رکھ لی تھی اور یہاں تک اس کو بھولا رہا کہ کامل چھ ہفتے تک یاد نہ آئی - جب پورے طور پر اُسے یاد دلایا گیا تو خیال آیا اور اُسوقت اس کے ہوش و حواس جاتے رہے - آخر خانساماں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُسنے اُس بیکار شیشے کے ٹکڑے کو احتیاط سے رکھ چھوڑا ہے - (خیر سے کوہ نور کو خانساماں نے شیشہ کا ٹکڑا خیال کیا) آخرکار وہ صحیح وسلامت ملکہ معظمہ وکٹوریہ مرحومہ کی خدمت میں پہنچگیا -

۱۸۵۱ء کی نمائش لندن میں پہلے مرتبہ کوہ نور عام منظر میں رکھا گیا - ۱۸۵۲ء میں ملکہ معظمہ نے اسے تراشنے کے واسطے مسٹر گارارڈس کو دیا اور اُس نے دو رسا نگر الماس تراش سے درست کردیا - تراشش کا کام ایک ماہ ۸ دن تک جاری رہا جس سے اس کا وزن ۱۰۶ ۱/۱۶ قیراط رہگیا اور تراشنے کا خرچ آٹھ ہزار پونڈ (ایک لاکھ بیس ہزار روپئے) پڑا - اب یہ عظیم الشان تاریخی ہیرا ملکہ معظمہ میری کے تاج کی زینت ہے - اور جو اصحاب دربار دہلی میں شامل ہوں گے ان کو تاج میں پہلے یہی ہیرا کنول کی شکل میں نظر آے گا -

محمد شفیع الدین خاں

قصیدہ بہاریہ*

تہنیت دربار دہلی وخیر مقدم شہنشاہ قیصر ہند حضور جارج پنجم دام اقبالہم

آمدِ شاہِ بہاری کا ہوا شور جو کل
باغِ عالم میں پڑی ایک سرے سے ہلچل

کڑکے وہ رعد کے چاؤش کہ گونج اٹھا چرخ
فوجِ حسّادِ چمن کا بھی گیا قلب دہل

ہو سکے کیا صفتِ موکبِ سلطان بہار
دیکھکر جس کو ملایک نے کہا صلّ وجل

آئے فراش سپہر اڈے ہوئے ہر سو سے
خیمہ اک نصب کیا زیر فلک دل بادل

سب کے آگے تھا بصد شان نشاں کا ہاتھی
پیلِ گردوں پہ علم کھولے ہوئے تھے بادل

شرق اور غرب سے جاروب کش آئے چالاک
خس وخاشاک گیا ساحتِ گیہاں سے نکل

تھے پرے ابر کے گھوڑوں پہ ہوا کے جو سوار
شوخی طرّاری میں بجلی سے سوا تھے چنچل

مخبرِ آمدِ شاہی تھا نقیبِ طاؤس
اُسکی آواز ہوئی آمدِ شہ کا سگنل

کڑکا اپنا جو کمار عد کے کڑکیتوں نے
اشہبِ چرخ کا چمکا نہیں کیا کیا کوتل

آیا سقائے فلک ساتھ لئے ابرِ مطیر
ایسا چھڑکاؤ کیا، کردیا دم میں جل تھل

صاعقے نے وہ تڑاقے کی اڑائی شلک
کہ گیا خرمنِ آرام خزاں کا سب جل

اسطرح شاہِ بہاری کی سواری آئی
بھر گئی آنکھوں میں شانِ کرم عزّ وجل

پرہیب ایسی تھی گردوں کے دمامے کی صدا
کہ زمیں گاؤ زمیں کے گئی پاؤوں کی نکل

داخلہ باغ میں اس شان و تزک سے جو ہوا
خیر مقدم کا وہاں بھی ہوا سامان سجل

---

* بادشاہی میلہ (دربار) کی سب کمیٹی نے اس قصیدہ کو نمبر اول قرار دیا ہے اس کے لئے ہم اپنے مکرم دوست حضرت یکتا کو مبارکباد دیتے ہیں - ایڈیٹر

سبزہ بیدار ہوا غنچوں نے کھولی آنکھیں   لیس بلبل کے بگل سے تھے سوار اور پیدل

سرو و شمشاد سنبھالے تھے یمیں اور یسار   تھا جو طاؤس جلو میں تو ہر اول ہر پل

اُٹھے سُکّان چمن شہ کی تواضع کے لئے   سرو قد اُٹھ کے صنوبر ہوا سب سے اوّل

نکلا سنبل بھی خیابان سے سنبھال اپنا چنور   چترِ شاہی لئے تالاب سے آپہنچا کنول

مورچھل لے کے چلا فخر سے رقصاں طاؤس   جسکی رفتار پہ پریوں کا بھی دل جائے پھسل

لیکے سورج مکھی درتاج[1] بصد فخر چلا   بادکش لے کے صبا آئی بہت مستعجل

چوبداروں کی روش لے کے چلا سرو عصا   ٹھاٹھ گلشن میں رہا گرچہ سدا اسکا اٹل

مور آئے جو سروں پر لئے کلغیٔ شہی   ناز ابو طرّہ لئے شوق سے پہنچی پیدل

زرِ گل نذر کی خاطر لئے گلبن اُٹھے   لالہ اسپند بنا اور بنا گل منقل

فرشِ رہ، راہِ عقیدت سے ہوئی جو نرگس   اُس کے اس فخر پہ حاسد ہوا آہوئے جبل

زر بچھا ور کیا گل نے تو سمن نے موتی   سبزہ نے آکے بچھایا وہیں فرشِ مخمل

غنچوں نے آمدِ شاہی کی سلامی سر کی   کرنا پھونکی پپیہے نے، جو کوکی کویل

آبشاروں نے کیا آئینہ بندی کا انتظام   آتشِ گل نے درختاں کئے سب دشت و جبل

رعب و تمکینِ شہی کا نرہا اُس کو خیال   سُنکے یہ مژدہ بڑا جوش سے فوّارہ اُچھل

چادرِ آبِ رواں نہر نے دی اپنی بچھا   چاندنی، ہاتھوں کو بس رہگئی اپنے مل مل

اسقدر شوق تھا دیدارِ شہی کا سب کو   دختِ رز توڑ کے نکلی تھی درِ شیش محل

بلبل و طوطی و طاؤس نے گایا دکلم   مل کے سُر شیر و شکر ہوگئے تیبر-کومل[2]

شان میں آج کے دن کی وہ سُناؤں مطلع   جو ہری جسکو سخن کے کہیں سب سے اوّل

آج ہے فصلِ بہاری کا گلستاں میں عمل
کھل گیا بلبلِ تصویر کے دل کا بھی کنول

خطِّ گلزار میں لکھوں جو ثنائے شہِ گل   روشِ باغ کی مانند ہو دلکش جدول

گلز میں آج ہراک شان میں جنّت کی نظیر   ہر چمن فیضِ بہاراں سے بنا ہے اچھبل[3]

زاہدِ خشک کا دل ہوگیا پانی پانی   اس طرح جھومتے آئے ہیں فلک پہ بادل

طبعِ مشّاطہ کی جدّت ہے وہ یا جوشِ نمو   آہوئے چشم کی شاخوں میں بھی پھوٹی کونپل

کھل گئیں آج عروسانِ چمن کی آنکھیں   آتشِ گل کے دھوئیں سے ہے لگایا کاجل

آج مستی کی ہوا میں ہے کچھ ایسی تاثیر   کہتی ہے سرو سے قمری کہ ذرا دیکھ! سنبھل!

اودی اودی ہیں وہ گھنگھور گھٹائیں چھائیں   زہد میں زاہدِ صد سالہ کے آیا ہے خلل

کچھ صبا سے کہا اور ہنس پڑیں ساری کلیاں   بلبلِ زار کا چکمہ گیا اک بات میں چل

اب نہ سنبل کو ہے الجھن نہ ہے لالہ کو جلن   کیا گئے جملہ خواص آج عناصر کے بدل

تُلتی ہے موتیوں میں آج کلی موتیے کی   آب و تاب اسکی زمانہ میں ہوئی ضرب مثل

خوشۂ تاک سے پروین کو ملا ہے جھومر   عرش پہ رکھے دماغ اب یہ کیوں نہ ہیا محل

جوئے باغ آنکھ نہ کیوں کاہکشاں پر مارے   نجمِ رخشاں بھی حبابوں سے ہوئے ہیں دجل

ہیں مہادیو شہادت میں اُٹھاتے گنگا   آبِ نہر ایسا لطیف اور ہے اتنا نرمل

قمری و طوطی و بلبل ہیں نوا سنجِ طرب   گنگناتا ہے ترانہ - کویلی گاتا ہے غزل

مترادف ہیں گلستاں میں بہار اور برسات   جیٹھی[4] اور کجری[5] کا ٹھہرا ہے تفاوت مہمل

میگھ گاتا ہے کوئی - کوئی ملار اور بہار   کیا نواسنجوں کا گلشن میں بندھا ہے دنگل

تان سین[6] اسکو کوئی سمجھے، کوئی مصری رام   ہو شکر ریزِ ترنّم جو یہ طوطی بمثل

بارے سرخاب[7] جگر نفتہ کی پیاس آج بجھی   کیوں نہ ہر قطرۂ باراں ہو اسے گنگا جل

اندھے ساون کے ہیں یکرنگی کے شیدا گویا   نظر آتی ہے اُنھیں چار طرف ہریاول

آج کثرت میں وہ وحدت کا اثر ہے ساری   دو کی جا دیکھتی ہے ایک ہی چشمِ احول

ہر درخت آج دکھاتا ہے سماں جھرنے کا   اسکی ہر شاخ سے جھرتا ہے وہ پانی نرمل

سیر کے پنکھے کا ہر برگِ شجر پہ ہے گماں   اسکی آب اور جھلا جھل پہ نظر جائے پھسل

پھول والوں کی نہ کیوں سیر ہو سیرِ گلشن   جائز از روئے بیاں گر ہے مجازِ مرسل

آب پر موتیے کی اب صفتِ طفلِ سرشک   گود میں سیپ کی جا تا درِ غلطاں ہے مچل

---

[1] درتاج فارسی میں سورج مکھی کے درخت کو کہتے ہیں [2] چڑھے اور اُترے سُر (زیر و بم) [3] وادیٔ کشمیر کے نہایت پُربہار مقاموں میں سے ایک [4] جیٹھی موسم بہار یا بسنت رُت کے گانے [5] کجری - برکھا رت کے گانے [6] موسیقی کے اُستاد کامل - اکبر کے عہد میں تان سین کے ہمعصر تھے [7] سرخاب یا چکور ایک چھوٹا سا پرند ہے جو تلازمات ہندی شاعری کے بموجب زمین کا پانی نہیں پیتا بلکہ مینہ کا پانی اوپر ہی اوپر پیتا ہے۔

شانِ خلّاق وہ پیدا ہے ہر اک عنصر سے گر مرے پارہ تو اکسیر بنے اُس کا بدل

آجکل پینگ بڑھی ہے وہ گل و بلبل کی شاخِ گلبن کے ہیں جھولے پہ بہم دست و بغل

دیکھکر آج عروسانِ چمن کا جوبن غرقِ دریائے خجالت میں ہوا ہی سنگل

سنکے توصیفِ نوا سنجیٔ مرغانِ چمن راجہ اندر کے اکھاڑے نے بھی چھوڑا دنگل

حوض کی آب یہ کوثر نہیں پانی پانی کھاتا ہے اسکی لطافت کی قسم گنگا جل

تن بدن سے تو پھٹا پڑتا ہے جوبن اُسکا کیا سنبھالے جوئے باغ آبِ رواں کا آنچل

صدقہ بھونرا ہے تو بلبل بھی ہے قرباں اسپر شاہدِ گل ہی گلستاں میں اک اٹھتی کونپل

آج گلشن میں ہے وہ نشۂ عشرت کا اثر غنچے کہتے ہیں صبا سے کہ ذرا دیکھ کے چل!

مسکراتی ہر کلی، مارتی ہے نرگس آنکھ مست چالوں پہ ہوا کی یہ چمن میں ہے چہل

اسقدر ولولہ انگیز ہے اب بادِ بہار کیف مے میں، تو صراحی میں مے اٹھتی ہے ابل

سر چڑھا جام سے، گر جام میں مینا سے گرا اٹھتے جوبن کی طرح بادہ بھی جاتا ہے اچھل

صرف نرگس ہی کی گلشن میں نہیں جاگی آنکھیں سبزۂ خفتہ بھی اُٹھ بیٹھا ہے اب پل کی پل

لگ چلی تاک سے اور جھومتی پھرتی ہے نسیم ایک ایک دانۂ انگور ہے اک اک بوتل

وہ پلک دریا ہے سلطانِ بہاری کی نظر باغِ عالم کا گیا رنگ سب اک دم میں بدل

کر دیا ایک ہی گردش میں زمانے کو نہال ہاتھ خالی جو تھے اب بنگئے وہ اہلِ دوَل

مقدمِ شاہ بہاراں کی صفت ہو کس سے آج جنگل میں ہوا فیض سے اسکے منگل

تھا میں اس عالمِ محویتِ کامل میں غریق کہ صدا کانوں میں اک آئی کہ اے مستِ ازل

ہوش میں آ تو اے محوِ گلِ نسرین و سمن اُٹھ کے سُن تو سہی کہتی ہے یہ کیا بانگِ دہل

دیکھ تو آئی ہے کیا ہند کے گلشن میں بہار دہمی باگلشن سے نکل چھوڑ تخیّل اک پل

آ تجھے نور کا مطلع میں سناؤں ایسا ہو سکے مطلعِ خورشید بھی جس کا نہ بدل

آج ہے ہند میں کیا عیش و مسرت کا عمل
مقدمِ شاہ سے نقشہ گیا عالم کا بدل

ہند میں آج شہنشاہ کے آئے ہیں قدم شاہِ خاور سے منوّر ہوا یا برجِ حمل

اور ہیں قیصرہ ذیجاہ بھی ہمراہ۔جن کی نیکیاں اور شفقت ہند میں ہیں ضرب مثل

زبدۂ تاجوراں زیبدہ تخت و نگیں دفترِ ماضی و حالیہ کا فردِ اکمل

ذات ہے مجمعِ اوصافِ حمیدہ جسکی خلقِ حسنہ کا نہیں جسکے۔زمانہ میں بدل

رات دن جس کے قلمرو کے ہیں صدقے خورشید پھر بھی وسعت کا معمّا نہوا اس کی حل

فرِ سلطانیٔ قیصر کا بیاں ہو کس سے شہر یاران جہاں اس کے ہیں اک عبدِ اقل

مدحِ حاضر میں وہ لکھوں میں اب اشعارِ نفیس سامنے ٹھہریں جو نقادِ سخن کے افضل

حشر تک پا نہ سکیں تیری نظیر اے قیصر مہر اور ماہ کی بھی ڈھونڈیں جو لیکر مشعل

منظرِ خسروِ عالم سے برستا ہے وہ نور جس سے آئینۂ دل صوفی کا پائے صیقل

رازِ عالم ہے عیاں کارِ خلافت ہے رواں بخشا قسامِ ازل نے وہ تجھے علم و عمل

ادنیٰ منشی ترا ہم پلہ ابوالفضل کا ہے تیرا عامل ہے ہر اک رشکِ دہ ٹوڈرمل

آج گر رستم و سہراب سے ہوتے شہزور باندھ لاتا اُنھیں پل بھر میں ترا اک کرنل

رعبِ شاہی وہ ٹپکتا ہے ترے چہرے سے کوہ بھی آگے ترے سہم کے ہوئے خردل

ہے کیڈٹ کور کا وہ بانکا جواں ایک سے ایک اکبری آن کا بھی سینہ میں دل جائے دہل

ایسا ہے کرّ و فر اور شوکت و جبروتِ شہی جس سے اوسان ہوں شاہانِ جہاں کے مختل

منبعِ جود و سخا مرجعِ اہلِ حاجات قبلۂ بذل و عطا کعبۂ امید و امل

دیدِ سلطاں ہمیں قسمت سے ہوا آج نصیب ہند کے دل کا کھلا فرطِ مسرّت سے کنول

صرف انساں ہی نہیں دیدِ شہی سے شاداں بحر و بر آج خوشی میں ہیں برج کا منڈل[1]

کون ہے جو نہیں سلطان کے قدموں پہ نثار سیرِ گلشن کو توجہ ہو جو تیری بمثل

رگِ گل رشتہ بنے جگنو بھی دے جوت جگا داخلِ طشتِ چمن آ کے ہوں بکھر صندل

آتشِ گل کو دمِ بادِ صبا بھڑکا دے لالہ بھی کھول کے دل اپنا لگالے گو گل

غنچۂ یاسمن اکشت[2] بنیں اور پھول کھلیں جب سنیں ہونگے وہ نذرِ رشۂ مسعودِ ازل

موگرا سوزِ دلِ صاف سے کافور بنے آرتی کا تری ساماں یہ کرے باغ بیکل

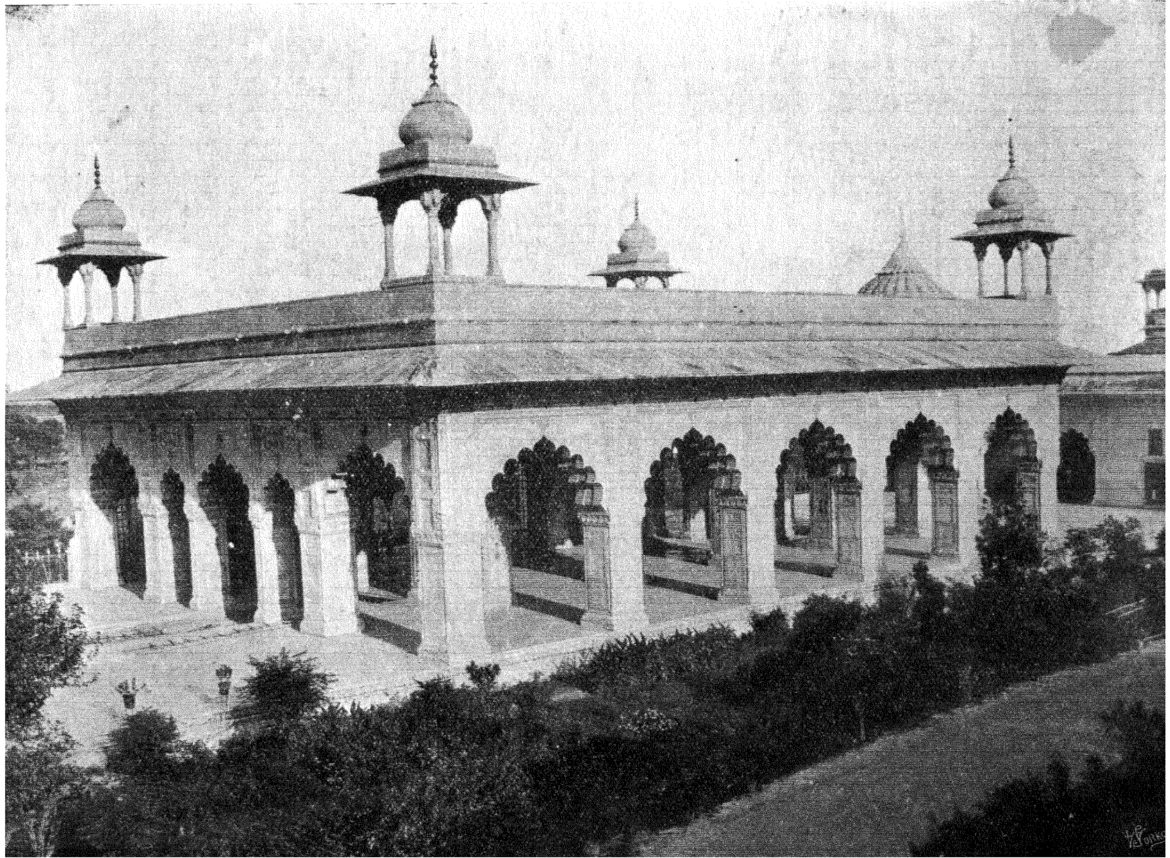
ٹیکا گیندا کرے اور مونیا پہنائے ہار پھول برسائے چمیلی وہیں بھر بھر آنچل

برگِ اشجار بجانے لگیں خوش ہو کر جھانجھ باغ گونج اُٹھے پدم[3] ایسے بجائے مندل

پھونکے طاؤسِ مسیحا نفس ایسا ناقوس "قم باذنی" کا کرے جو دلِ مُردہ پہ عمل

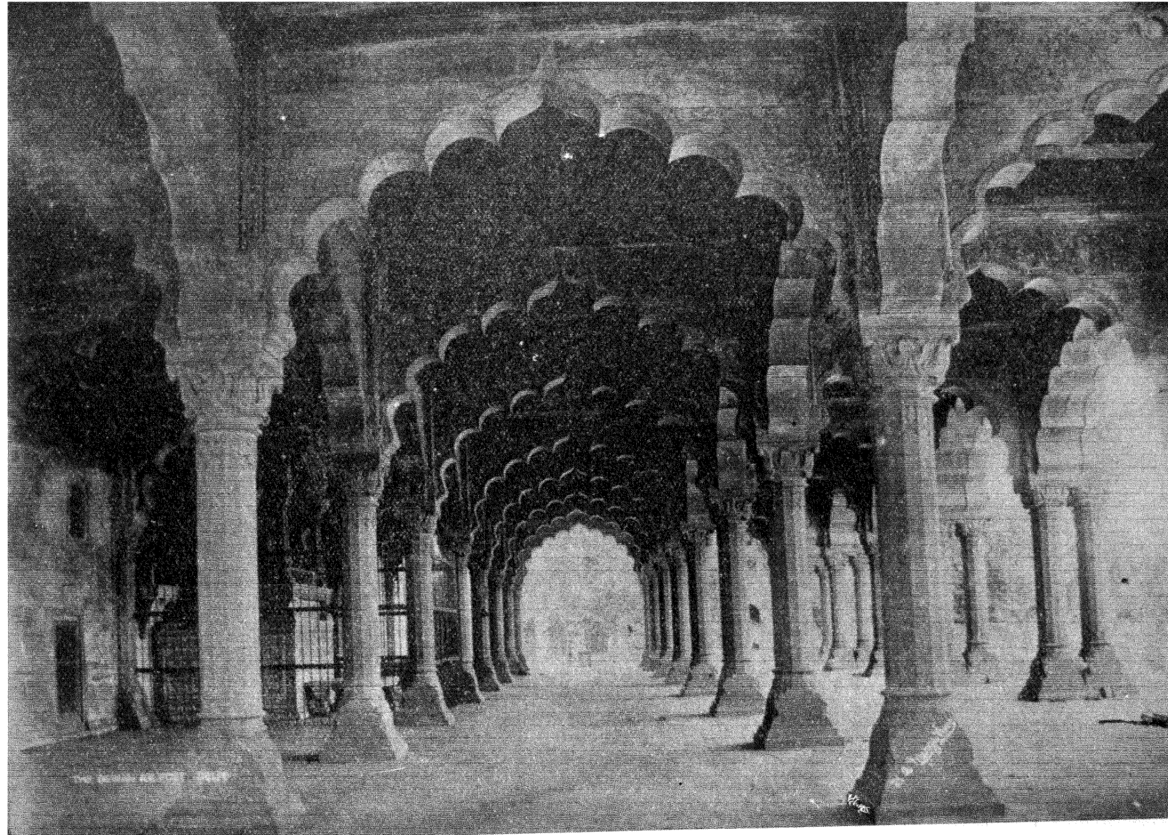
---

[1] برج کا خطہ [2] کچے چاول جو پوجا میں کام آتے ہیں۔ ارگ + [3] پدم کنول کا دوسرا نام ہے۔



दीवान-ए-ख़ास (क़िले के भीतर)। DIWAN-I-KHAS (FORT) دیوان خاص (قلعہ)

Indian Press, Allahabad.



दीवान-ए-आम (क़िले के भीतर)।

DIWAN-I-'AM (FORT)

دیوان عام (قلعه)

Indian Press, Allahabad.

اسطرح آرتی ہو تری چمن میں اے شاہ!
ہے پھر انساں کی عقیدت کا تو بس ذکر اجمل

تختِ دہلی کہ تھا مدت سے یہاں چشم براہ
زیب دہ جسکے جد حضرت رہے ہوئے ہیں اکمل

تھا پتھورا جہاں زینت دہِ بزمِ شاہی
جسکے سایہ میں کئے چند[1] نے وہ نکتے حل

تغلق اور خلجی کا ہے یاد جسے جاہ و جلال
داد دہی کرگئے جو صدیوں شاہانِ مغل

تخت وہ جسکو کہ دی شاہ جہاں نے رونق
خوش مذاقی کا ہے اک جسکی نشاں تاج محل

ایک مدت سے وہی تخت پڑا تھا خالی
خوبیٔ بخت سے حالت گئی اب اسکی بدل

آج دن اسکے پھرے، پھر وہ ہوا ہے آباد
اسپہ نازل ہوا اب پھر کرمِ عزّ و جل

تاجپوشی ہو مبارک تجھے شاہِ قیصر
شجرِ عہد ترا سبز رہے ۔ لائے پھل

دیکھکر تجھکو ملی ہمکو جہاں کی دولت
بن گئے ہم ترے دیدار سے اربابِ دل

نخرِ دہ آج ہمیں بخشا ہے تونے اے شاہ
نقدِ جاں اسپہ ہو قرباں ۔ تو ہی زیبا بدل

کیا ہی یہ تخت ہے اُس تخت پہ قیصر کا جلوس
کہتے ہیں حسّ و خیالات کا جسکو کہ محل

دل میں ہی ہند کے اے شاہ ترا تخت بچھا
کوئی طاقت جسے کرسکتی نہیں متزلزل

ہوسکے کس سے بیاں شوکتِ دربارِ شہی
کانپتے جسکے تصوّر سے ہیں مرّیخ و زحل

کیفیؔ بس شہ کی دعا پر تو کراب ختم کلام
کیونکہ بے اُسکے سخن سنجی ہے لغو اور مہمل

یا خدا زیبِ خلا دہر میں جب تک ہی ہوا
بنتے ہیں بحر کی تبخیر سے جب تک بادل

ابر کے مس سے بنے چرخ پہ جب تک بجلی
خیرہ نظروں کو کرے بجلی کی جب تک چھلبل

ہند پر سایہ کئے ہے یہ ہمالہ جب تک
جب تلک برف کا سر پر رہے اسکے آنچل

آریہ ورت میں گنگا رہے جب تک کہ رواں
اور ممتاز رہے پانیوں میں گنگا جل

جب تلک عدل و عطا شانِ جہانبانی ہیں
جب تلک خسرو عادل رہے مسعودِ ازل

ہے وفا و اطاعت سے رعیت کا فروغ
جب تک امن اور اماں سے ہے ترقیِ دول

قیصر و قیصرہ باکام رہیں دنیا میں!
قاف سے قاف تک انکا رہے حکم اور عمل

جارج پنجم رہیں تا حشر سلامت یا رب!
خرّم و شاد رہیں! راج رہے انکا اٹل!

برجموہن دتاتریہ کیفیؔ دہلوی

---

[1] پتھورا کے دربار کا شاعر

سرودِ تخت نشینی

لے ۔ ترے دن پھرے آج دہلی
آگیا پھر ترا راج دہلی

مانگ گردوں سے اب باج دہلی
ہند کی تو ہے سرتاج دہلی

حسن میں شان میں تو پری ہے
تجھکو اندر سے اب ہمسری ہے

شیر منڈل کے اب جو کھنڈر ہیں
اندر اپرست کے جو بام و در ہیں

جو پتھورا کے باقی اثر ہیں
جو اسوکا کے نقشِ حجر ہیں

سب پہ چھایا ہے نورِ مسرّت
ہر طرف ہے وفورِ مسرّت

قطب کا ہے جو اونچا منارہ
کر رہا ہے فلک سے اشارہ

قابلِ رشک ہے یہ نظارہ
ہند کا ہوں میں دارالامارہ

پرتوِ مہر ہے ضو میں میری
تختِ برما قلمرو میں میری

تغلق آباد و فیروز آباد
اور سلاطین ماضی کی اولاد

کرچکا ہے فلک جن کو برباد
اپنے قیصر کو ہیں دیکھکر شاد

مینہ برسنے کے آثار سے ہیں
منتظر ہم بھی بوچھار کے ہیں

تجھکو دہلی یہ رفعت کہاں تھی
پہلے یہ شان و شوکت کہاں تھی

پہلے حاصل یہ عزّت کہاں تھی
پہلے ممکن یہ دولت کہاں تھی

اب جو تیرا یہ جاہ و حشم ہے
قیصرِ ہند کا یہ کرم ہے

عہد اکبر سے شاہِ جہاں تک
ہند کا تھا جو عہدِ مبارک

تختگہ آگرہ ہی تھا بے شک
تاج اُسی کے رہا زیب تارک

تو بھی آئینہ داروں میں اُسکے
بلکہ طاعت گزاروں میں اُس کے

کب ابوالفضل کو تونے دیکھا
تجھکو فیضی سے کیا واسطہ تھا

بیربل تھا زمانہ میں یکتا
لیکن اُس سے تعلق تجھے کیا

تجھ میں کب یہ شگفتہ چمن تھا
تیرے بازو پہ کب نورتن تھا

تختِ اکبر کہاں تونے پایا
اور جہانگیر بیگم کا سایا

شاہجہاں نے تجھے گو بسایا
راس لیکن اُسے یہ نہ آیا

آگرہ میں ہوا قید جاکر اور وہ بیٹھے گنگا نہاکر
جب ہوا عہد اورنگ زیبی بڑھ چلی تھی تری دل فریبی
آگئی ساتھ ہی بدنصیبی طبع میں شہ کی تھی ناشکیبی
ایسا نکلا کہ پھر کر نہ آیا شہر میں پھر وہ لشکر نہ آیا

پھر نہ اُردو کا بازار تھا وہ سیم و زر کا نہ انبار تھا وہ
وہ جلوس اور نہ دربار تھا وہ وہ نسیم اور نہ گلزار تھا وہ
پھر وہ شاہانہ رونق کہاں تھی اس چمن میں جبھی سے خزاں تھی
تیس سال اُس کے بعد اور گزرے کوئی نکلا شہنشہ نہ تجھسے

وہ سلاطیں تھے کمزور ایسے ٹکڑے ٹکڑے ہوے سلطنت کے
تجھکو کب دعویِ فرّہی تھا تجھکو کب فخر فرماں دہی تھا
تخت کا نام تھا کچھ لفظاً ہر لے گیا آکے اُس کو بھی نادر
سلطنت کے تھے جتنے عناصر منتشر ہو گئے تھے سب آخر

چند دن اوج تجھکو رہا کچھ اب تو دو سو برس سے نہ تھا کچھ
اس خبر کا ہوا ہے تواتر تجھ میں ٹھہرے نہ اکبر نہ بابر
وہ تھے سادنت یا تھے بہادر تجھ کو بے جا ہے اُن پر تفاخر
تجھ سے مغلوں کی بڑھی تھی نگہتی لودیوں کی الگ تختگہ تھی

نظم میں اپنی ملٹن ساخوش گو لکھے لاہور اور آگرہ کو
تخت گاہِ سلاطین خوش خو اور ترے نام سے بے خبر ہو
پہلے شہرت نہ تھی تجھ کو حاصل ایسی عزّت نہ تھی تجھ کو حاصل
ہیں جو آثار عہدِ سلف کے فخر اکثر کیا ان پہ تو نے

پوچھتا ہوں مگر میں یہ تجھ سے کیا ایلورہ سے بھی ہیں یہ بڑھکے
کیا انھیں تاج سے ہمسری ہی یا اُسی کے لئے برتری ہی
گزرے راجہ جو اُتّم پر اُتّم ملک جن کا تھا سرسبز و خرّم
ان کی تاریخ ہے ایسی مبہم جانتے ہیں تو بس اس قدر ہم

تھے وہ ایام قنّوج و دہلی سنتے ہیں نام قنوج و دہلی

اب تفوق ہے تجھ کو جہاں پر لے گئی فوق تو آسماں پر
جھکتے ہیں سب ترے آستاں پر نام تیرا ہے سب کی زباں پر
دل میں عالم کے تیری جگہ ہی قیصرِ ہند کی تختگہ ہے

علی حیدر طباطبائی

مثمن تاریخی

مبارک ہو تجھے اے ہند عشرت کی فراوانی رکھا کنگ امپرر نے سر پہ دیہیم جہانبانی
مرادیں آج تو اے ہند پائی ہیں بآسانی ادا فرما رہے ہیں شہ رسومِ معدلت رانی
کرم کا منتظر رہ ہے یہ وقتِ گوہر افشانی سنائیں گے گورنر جنرل اب فرمانِ سلطانی
لبوں پر دیکھنا ہے شوخیاں موجِ تبسّم کی
سنی تقریر ہز رائل میجسٹی جارج پنجم کی

مُسلماں کیوں نہ دیکھیں چشم دل سے اپنے منظر کو مدینہ لیکے آیا شمل دل شاہِ فلک فر کو
حفاظت سے صدف رکھتا ہی جیسے اپنے گوہر کو بھلا یہ مرتبہ حاصل ہوا ہی کب سکندر کو
حبابوں نے بچھا دیں اپنی آنکھیں پا کے قیصر کو مسخر کر لیا دریا دلی سے کل سمندر کو
حبابِ بحر تھے یا سر بکف تھیں ساتھ سب موجیں
جہازِ ہز میجسٹی لائیں ہاتھوں ہاتھ سب موجیں

سرِ آب رواں بادِ بہاری دیکھنے والے شکوہ و شانِ سامانِ سواری دیکھنے والے
چلے ہیں ولولہ میں باری باری دیکھنے والے ہنسے دیتے ہیں دلکی بیقراری دیکھنے والے
عدالت اپنی، میری جاں نثاری دیکھنے والے ادھر آ جذبۂ بے اختیاری دیکھنے والے
قدم تو چوم لوں آدابِ شاہی سے نہ غافل ہوں
مجسّم شوقِ بیتابی ہوں اک حسرت بھرا دل ہوں

رہیگا یاد جشنِ تاجپوشی تیرا افسانہ وہ تیرا جامِ عشرت وہ مسرّت خیز پیمانہ
پھریگا رات دن آنکھوں میں وہ تاجِ ملوکانہ وہ شاہی گرّ و فر اور وہ مرصّع تیرا کاشانہ
وہ جوشِ والیانِ ملک وہ دربارِ شاہانہ فروزاں شمع ہی گرتا ہے پروانے پہ پروانہ

تماشا دیکھنے والی یہاں ساری خدائی ہے

نقاب رخ وفاداروں کے مجمع میں اٹھائی ہے

شکوہ و شانِ سلطان المظفر دیکھنے والے | شہنشہ کی نگاہِ روح پرور دیکھنے والے

ذرا دہلی تک آ یورپ کا منظر دیکھنے والے | فروغِ طالعِ بیدار ہمسر دیکھنے والے

سرِ دربار شاہی دورِ ساغر دیکھنے والے | ادھر بھی دیکھ لے اے آنکھ بھر کر دیکھنے والے

سریرِ حکمرانی پر ہیں اب رونق فزا باہم

"کوئین میری" وہ میری قیصرہ اور خسروِ عالم

مقدس تاج رکھا سر پہ اسلافِ معظم کا | نظر کے سامنے ہے جلوہ اک عدلِ مجسم کا

اثر ادنیٰ سا ہے یہ بذل شاہنشاہِ عالم کا | ہوا منسوخ وہ پارینہ دفتر جودِ حاتم کا

نمونہ بنگیا دربار دہلی مجلسِ جم کا | چلا سکہ زمانہ میں اب اُنکے حکم محکم کا

مبارک میرے قیصر کو الٰہی کار روشن ہو

معطر طرۂ دستارِ شاہی سے یہ گلشن ہو

نظر افروز اعلانِ شہنشاہی ہوا جسدم | ہوا خونِ وفاداری میں پیدا جوش کا عالم

فلاحیت ہماری شاہ کو مدِ نظر پیہم | دلی الفت کریں ہندوستاں سے فخر ہے کیا کم

زہے قسمت زہے طالع تمہارا ہو خوش و خرم | سلامِ قیصری فرمائیں خود شاہنشہِ اعظم

محبت میں دکھائیں کیوں نہ ہم جذباتِ روحانی

جب ایسا خسروِ عادل کرے دنیا میں سلطانی

کیا دہلی کو پھر کنگ امپرر نے پائے تخت اگر | گذشتہ عظمتوں کا پھر اٹھایا پردۂ منظر

ہوئیں روحیں سلاطینِ مغلیہ کی تمنا گستر | ہوا آباد پھر سے سلطنت کا یہ پرانا گھر

نہیں موقوف اسی پر آج ہے آباد ہر کشور | عروسِ دہر نے پہنا ہے سر سے پاؤں تک زیور

پڑھی تاریخ میں نے دیکھکر یہ شوکتِ عالم

مبارک ہو مرے قیصر کو جشنِ زینتِ عالم
۱۹۱۱ء

طلسمِ عشق ہیں یہ جذبہائے دل کی زنجیریں | قوی شوکت شہنشہ پر دکھائیں اپنی تاثیریں

کہ پھیلیں خسروِ مغرب کی اب مشرق میں تنویریں | رسا ہیں ساکنانِ ہند کی کیا آج تقدیریں

دکھائیں گے شہنشہ کو وفاداری کی تحریریں | بنائی ہیں یہ جذباتِ وفا کی چند تصویریں

بآسانی پہنچ جائیں گی یہ دربارِ قیصر تک

رسائی ہوگئی ہے دادرس ڈپٹی کمشنر تک

مبارک دن یہ ہاتھ آیا ہے خوبیِ مقدر سے | کہ لیں دادِ سخن ہم نائبِ شاہِ مظفر سے

فلک حشمت گرامی منزلت ڈپٹی کمشنر سے | خطاب اب عام ہے ہر ایک شہ کے مدح گستر سے

یہ دو موتی ہیں لیں بحر معانی کے شناور سے | سنیں یہ بیت تاریخی عزیز نکتہ پرور سے

سراجِ عدل سے چمکا ہے خورشیدِ جہانداری
۱۹۱۱ء

مبارک ہو شہِ برطانیہ حسنِ عملداری
۱۳۲۹ھ

عزیز لکھنوی

دربارِ نشاط

بارک اللہ عجب گرم ہے بازارِ نشاط | کہ دل و جاں سے ہے ہر شخص خریدارِ نشاط

حبذا کیسی بہاروں پہ ہے گلزارِ نشاط | رشک سے ہے دلِ ہر خار میں بھی خارِ نشاط

عرصہ فرخیِ بخت میں ہے جولانی | ہے ہر اک سمت رواں مرکبِ رہوارِ نشاط

پھول چنتے ہیں تمناؤں کے ہر سو گلچیں | آج کے روز پھلا پھولا ہے گلزارِ نشاط

جلوہ افروز ہے بن ٹھن کے جلوسِ شہ پر | دیکھئے جسکو وہ ہے عاشقِ دلدارِ نشاط

بار دربار میں پائیں یہی دھن ہے سب کو | اب ہر اک کا رہے بیکار بجز کارِ نشاط

ناتواں ہیں دل و جاں۔ کیا ہو داحق پایاں | دوش پر کیسے اٹھائے کوئی انبارِ نشاط

رشک تھا یہ کہ سرو کار ہے لندن سے فقط | پس ہوئی جلوہ نما ہند میں سرکارِ نشاط

بار بار آتی ہے یوں روحِ سکندر سے ندا | بار دے مجھکو بھی دربارِ دُربارِ نشاط

دیکھے نقدِ دل و جاں اس کے خریدار ہیں کس | و ناکس یہ کھلا ہے درِ بازارِ نشاط

جارج پنجم کا ہے دربارِ جلوس اے شاکر

توسنِ خامہ میں ہے گرمیِ رفتارِ نشاط



قصیدہ فریدہ

ہے نوید موسم گل بلبلیں ہیں نغمہ خواں　　بنگیا ابر کرم سے بوستاں ہندوستاں
ٹوپیاں غنچوں کی اوچھلیں فصل گل کو دیکھکر　　چیرزدی گلشن میں پتوں نے بجا کر تالیاں
تختہ تختہ بن گیا گلدستۂ نقش و نگار　　پتہ پتہ پر ید قدرت نے کیں گلکاریاں
ہر روش پر ہلکے ہلکے چل رہی ہو یوں نسیم　　ہو خراماں جیسے کوئی نازنیں دامن کشاں
موتیا - رابیل - بیلا - گرا دھر ہے عطر بیز　　جعفری - چنپا - چنبلی ہے اُدھر عنبر فشاں
کسطرح بولے - لئے بیٹھا ہی غنچہ اشرفی　　کسلئے پھولا سماے زر ہی مٹھی میں نہاں
باغ میں آنکھیں لڑا کر نرگس مخمور سے　　جھومتا ہے بادہ خواروں کیطرح سرو رواں
مطربانِ باغ نے مل مل کے جب گائے ملار　　رقص کرنے مشتری آئی فلک سے شادماں
نوجوانانِ چمن پہنے ہوے رنگیں قبا　　محفلِ جشن و طرب میں ہیں بہم نغمہ کناں
مٹگئے شکوے گلے آپس کے ملتے ہی گلے　　بلبل و صلصل بھی سوز گل کی ہیں اب مدح خواں
طائرانِ خوشنوا کی کیا سُریلی ہے الاپ　　جسکو سنکر جھومتی ہیں ہر شجر کی ڈالیاں
گوشے گوشے میں جمالِ قدرتِ حق دیکھکر　　پھرتی ہے کرتی ہوئی سجدے بہارِ بوستاں
دامنِ امید جو مقصد کے پھولوں سے ہے پُر　　خوب گل چھرے اڑاتا پھر رہا ہے باغباں
دامنِ گلچیں کا کھٹکا اور نہ غم صیاد کا　　نغمہ سنجانِ چمن پر لالہ رو ہیں مہرباں
لالہ زارِ خلد پر رضواں کو گر کچھ ناز ہے　　دیکھ لے آکر یہاں رنگِ بہارِ بوستاں
سرو ہے سیدھا برنگِ عاشقانِ راستباز　　شاخِ سنبل ہے خمیدہ صورتِ زلفِ بتاں
خوش ہی کا بخت جاگا چشمِ نرگس کی طرح　　شکل سبزہ غم ہوا آلودۂ خوابِ گراں
ہو نہیں سکتا ہوا سے کوئی پتہ منتشر　　دید کے قابل ہے حسنِ انتظامِ گلستاں
ابرِ رحمت کا کھنچا ہے شامیانہ چار سو　　گشت میں پھرتا ہے موجیں مارتا آبِ رواں
ڈر ہے کیا بلبل کو دزدِ دیدۂ صیاد کا　　جبکہ خود ہے برقِ تابندہ چراغِ آشیاں
میں سراپا محو تھا نظارۂ گلزار میں　　میرے دل میں تھا نہ باقی کچھ خیالِ این و آں
طرقوا کی دفعتاً پہنچیں صدائیں کان میں　　فوج کے دستے بڑھے پہنے مرصع وردیاں
ترکی و تازی - عراقی - کاٹھیاواری سمند　　شکلِ پیلان زبردست آئے بڑھکر ناگہاں
بینڈ باجے کو بجاتی پلٹنیں آنے لگیں　　باشکوہ و شان ہاتھوں میں لئے فوجی نشاں
کانپ جائیں رستم و سہراب جنکے رعب سے　　وہ بہادر تیغزن - گبرو نکیلے نوجواں
نیزے اتنے صاف فرما جاے جنسے آفتاب　　تیغیں اتنی تیز جن سے منفعل ہوں بجلیاں
کوہ لرزے اسقدر توپیں سلامی کی چلیں　　جان مردوں میں پڑی ایسی بجیں شہنائیاں
اتنے میں چشمِ تمنا میری روشن ہو گئی　　کھُل گیا بندِ نقابِ روئے اسرارِ نہاں
دیکھتا کیا ہوں کہ ایک رخشِ صبا رفتار پر　　جلوہ گر ہیں جارج پنجم قیصرِ ہندوستاں
سطوت و اقبال و اعزاز و حشم ہیں ہمرکاب　　دولت و اکرام و جود و معدلت ہیں ہم عناں
راجگانِ ذی شرف ہیں دونوں جانب ساتھ ساتھ　　رحمتِ حق ہی جلو میں اور کرم ہی سائباں
عدل کہتا ہی یہ ہیں نوشیروانِ ذی وقار　　شان کہتی ہے یہ ہیں اسکندرِ گردوں نشاں
ہر طرف سے ہی بلند آوازۂ خوش آمدید　　ویلکم کہتے ہیں جنٹلمین ہو کر یک زباں
اور بھی ایک مطلعِ پر آب لکھنا چاہیئے　　اے حمید اب موجزن ہے قلزمِ طبعِ رواں
اے مری طبعِ رسا بیٹھی ہی چھپکر تو کہاں　　صفحۂ قرطاس پر آکر دکھا جولانیاں
ہو مشامِ جاں معطر جس سے ایسے گل کھلا　　تا کروں باغِ سخن میں شوق سے گلچینیاں
وہ مضامیں ہوں پھڑکتے ڈال کے ٹوٹے ہوئے　　دم بخود ہو جائیں جنکو دیکھکر اہلِ زباں
ہو مضامیں میں فصاحت اور بلاغت کا مزا　　خاک پیدا لطف ہو جب روکھا پھیکا ہو بیاں
خرم و عزت ہے خدا کے ہاتھ راہِ مدح میں　　باندھ لے چلنے پہ ہمت اشہبِ کلکِ رواں
دورِ غم رخصت ہوا اب شادمانی کا ہے عہد　　مست ہیں سب بادۂ عشرت سے زیرِ آسماں
سیر کی خواہش جسے ہو آئے اِس گلزار میں　　خلد کی حاجت جسے ہو دیکھ لے ہندوستاں
لالہ رویانِ ارم سے ہی زیادہ رنگ و بو　　دعویٰ کچھ بیجا نہیں کرتیں گلونکی پتیاں
غیر ممکن ہی کہ ہو فردوس میں ایسی بہار　　جسطرح دہلی میں ہیں دربار کی تیاریاں
اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی رعایا خوش نصیب　　ہند میں خود سیر کو آتا ہے سلطانِ جہاں
دیکھئے کس شان سے نکلا سواری کا جلوس　　ساتھ مہ کے جسطرح ہو مجمعِ سیارگاں
کونسی اقلیم کے فرمانروا کو ہے نصیب　　یہ تزک یہ ساز و ساماں یہ شکوہ یہ عز و شاں
اتفاقِ وقت سے جو آج ہی پیشِ نظر　　ہندوالوں نے بھلا دیکھا تھا کب ایسا سماں
حکم قدرت کا ہی یہ خورشیدِ تاباں کے لئے　　گرمجوشی سے کرے دورہ بزیرِ آسماں

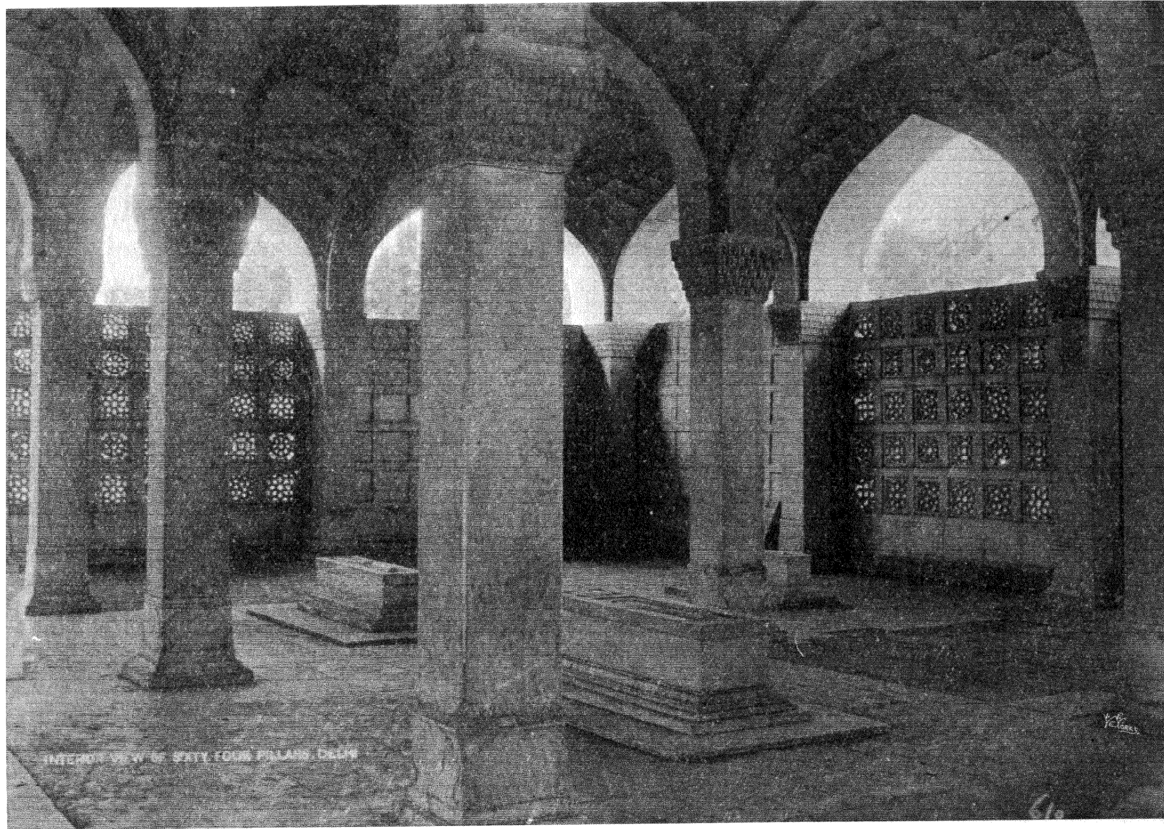


राय पिथौरा का मन्दिर ।

Indian Press, Allahabad.

RAI PITHORA'S TEMPLE

مندر راے پتھورا



"चौंसठ खंभा" का भीतरी दृश्य। INTERIOR VIEW OF SIXTY-FOUR PILLARS اندرونی نظارۂ چونسٹھ کھمبہ

Indian Press, Allahabad.

پھیلنے میں روشنی کے سست رفتاری نہو — نور عالم کا دکھائے صورتِ برقِ تپاں
سب پہ یکساں مہر ہو۔ یہ ماہ کو تاکید ہو — کیا عرب کیا ایشیا انگلینڈ کیا ہندوستاں
تاکہ اہلِ دید کو ہر ایک طرف آئے نظر — شاہِ عالی جارج پنجم کی رعایا شادماں
دھوم ہے عالم میں جس کے خُلق کی اور جود کی — وہ یہی ہے خسرو بالانشیں گردوں مکاں
دیوتا ہندو کہیں مسلم ولی نعمت کہیں — ہو یہ شاہِ ذی شرف دونو پہ یکساں مہرباں
ہمکو جو اُسکی حکومت میں ملی ہیں راحتیں — کونسے منہ سے کریں تعریف ہم اسکی بیاں
زیرِ دامانِ پدر بھی یہ نہ پایا ہم نے چین — اور کبھی آغوشِ مادر میں نہ دیکھی یہ اماں
سیکڑوں کالج ہیں قائم تربیت کے واسطے — پاس ہو ہو کر نکلتے ہیں ہزاروں نوجواں
عیش اور راحت کے ساماں کردئے لاکھوں بہم — ہوگئے آرام کے پیدا وسیلے بیکراں
آج یہ برٹش حکومت سے ہوا حاصل عروج — بنگیا اہلِ ہنر ہر ساکنِ ہندوستاں
وہ کیا انصاف وہ ڈالی بنائے اتفاق — گرگ ہو بکری کا مونس۔ شیر ہر دم پاسباں
پہلے جو تھے چور وہ اب پاسبانِ خلق ہیں — پہلے جو تھے راہزن وہ اب ہیں خضرِ کارواں
کوئی رکھ سکتا نہیں قانون سے باہر قدم — پانوں میں انصاف نے ڈالی ہیں ایسی بیڑیاں
گرچہ اپنی ذات سے ہے حامیٔ دینِ مسیح — وہ نہیں کرتا رعایا کی مگر حق تلفیاں
کیا مسلماں کیا مسیحی کیا یہودی کیا ہنود — اپنے عالی جاہ پر کرتے ہیں سب قرباں جاں
ہمنے کی تاریخ کی اوراق گردانی ہزار — دور میں دیکھا کسی کے بھی نہ یہ امن و اماں
پھر ثنائے شاہ میں ہے یہ مطلع اے حمید — ہو قلم وقفِ رقم ہو۔ پھر زباں محوِ بیاں
نخلِ باغِ آرزو کی نذر ہیں کچھ ڈالیاں — تحفۂ درویش ہو مقبول اے شاہِ زماں
تیرے کوچہ کی زمیں ہو میرے حق میں سجدہ گاہ — کعبۂ مقصد ہو مجھکو تیرا سنگ آستاں
سیکھتے ہیں یوں طریقِ انتظامِ مملکت — چلتے ہیں نقشِ قدم پر تیرے شاہانِ جہاں
شان تیری دیکھتا ہوتا اگر خاقانِ چیں — عدل تیرا تو لیا ہوتا اگر نوشیرواں
کھوج تیرے رتبۂ عالی کا پا سکتا نہیں — تا قیامت بھی اُڑے گر طائرِ وہم و گماں
جنسِ غم کی سرد بازاری جہاں میں ہوگئی — جب سے کھولی اپنے مہر و لطف کی تو نے دکاں
بندۂ فرماں ہو ہر فرد و بشر تیرے حضور — تیری طاعت کے لئے حاضر ہو ہر پیر و جواں
جس جگہ تیرا قدم پہنچے تو اس کو فخر ہو — تیرے قدموں کی زمیں سے اسکے کھائے آسماں

صورتِ ماہِ مبیں ہے نعل تیرے رخش کا — غیرتِ نجمِ فلک ہیں تیرے قدموں کے نشاں
کیا کسی پر مار سکتا ہے فلک تیرِ جفا — دیکھکر چلّے چڑھے تیری حمایت کی کماں
تو فخر ہے سخاوت ہو ترا طرزِ عمل — چاہے تو دم بھر میں بھر دے مفلسوں کی جھولیاں
سایۂ دستِ خدا ہے ہاتھ تیرا اے کریم — تیری بخشش سنکے حاتم چھپ گیا جانے کہاں
ہیں درِ دولت پہ تیرے جمع یوں اہلِ غرض — مسجدوں میں ہوں نمازی جسطرح وقتِ اذاں
حاسدوں کا دم فنا ہوتا ہو تیرے رعب سے — ہو پیامِ موت دشمن کو تری تیغِ رواں
آرزو میں تیرے نظارہ کی لاکھوں مر گئے — شکر ہے اللہ کا تو ہے ہمارا میہماں
گھومکر سیّاحوں نے دنیا کو دیکھا بارہا — جود میں خلق و کرم میں تیرا ثانی ہو کہاں
آئینہ ہے عکس کا یہ دل ترا روشن ضمیر — آشکارا تجھ پہ ہو جاتے ہیں اسرارِ نہاں
ہو خطِ تقدیر آئینہ بشر کے روبرو — مثل سرمہ گر لگا لے تیری خاکِ آستاں
آنکھ میں آیا ہمارے دلمیں ہو تو جلوہ گر — وہ بھی تیری رہ گزر ہے یہ بھی تیرا ہو مکاں
کیوں نہ ہو طالع سکندر اُس زمیں کے دن پھر — جسطرف گھوڑے کی اپنے موڑدی تونے عناں
کیوں فدا تجھپر نہوں اے خسروِ والا حشم — شاد ہے تجھسے رعایا تو ہے اسکا قدرداں
غنچہ لب غنچہ دہن گل پیرہن نرگس چمن — اے نہالِ آرزو اللہ تیرا باغباں
کیا کوئی طاقت ہو تجھسے درپئے جنگ و قتال — بل چوہوں کا ڈھونڈتے پھرتے ہیں دانِ جہاں
سر اُڑا اے منکروں کا تیری تیغِ آبدار — خون چوسے دشمنوں کا تیری برچھی کی سناں
ختم کرتا ہے دعا پر اب قصیدہ کو حمید — طول بیجا پر نہ ہو جائے خوشامد کا گماں
جب تلک ہیں چاند سورج جب تلک ہیں روز و شب — جب تلک قائم زمیں ہو اور سالم آسماں
جب تلک برگ و ثمر ہیں جب تلک کاہ و شجر — جب تلک ہیں کوہ و صحرا جب تلک ہیں گلستاں
جب تلک ہیں غنچہ و گل جب تلک ہیں بلبلیں — جب تلک قائم ہو دورِ فصلِ گل۔ دورِ خزاں
گلشنِ اقبال تیرا تازگی پیدا کرے — چومتی ہر دم رہے نصرت قدم کو بے گماں
جاری ہوں احکام شاہی تیرے ہفت اقلیم میں — ہو نصب ہر ملک میں شاہا ترا فوجی نشاں
خوش رہے ملکہ تری بچے ترے شاداں رہیں — پائیں عیشِ دائمی حاصل ہو عمرِ جاوداں
تو رہے محفوظ بادِ حادثاتِ دہر سے — باغ کو تیرے نہ پہنچے صدمۂ دورِ خزاں
تیرے بدخواہوں کا مُنہ کالا۔ خدا جلدی کرے — دوست تیرے شاد ہوں ہر دم کریں قرباں جاں

بول بالا اے شہنشاہِ معظم ہو ترا   کرتے ہیں دلسے دعائیں ہند کے پیر و جواں
سیرِ سے ہندستان کی ہو کے فارغ جب چلے   عافیت سے پہنچے انگلستاں میں تیرا کارواں

اور کیا چاہوں بس اب دلمیں کوئی حسرت نہیں
تجھکو دیکھا شکر ہے اللہ کا شاہِ شہاں

حمید میرٹھی

شہنشاہِ ہند جارج پنجم دام اقبالہم

سنتے ہیں فخرِ دہر تھا ہندوستاں کبھی   کہتے ہیں لوگ ہُن بھی برستی تھی یاں کبھی
بے مثل خوبیوں سے تھا جنت نشاں کبھی   یونہیں شنیدہ باتیں تھیں یہ ۔ ہوگا ہاں کبھی
لیکن کچھ آج اور ہی ہے اسکی آب تاب   اللہ رے یہ شان! کہ جسکا نہیں جواب
گلزار نو بہار کا عالم ہے چار سو   جنت بھی کوئی چیز ہے آج اسکے روبرو
دیکھو جسے وہ ہے ہمہ تن شوق و آرزو   لب پر ہنسی ۔ زبان پہ خوشی کی ہے گفتگو
رونق اسی میں آگئی سارے جہان کی   کایا پلٹ سی ہوگئی ہندوستان کی
چھائیں مسرتیں در و دیوار و بام پر   پھولی شفق خوشی سے رُخِ صبح و شام پر
ہندوستاں کو ناز ہے آج اپنے نام پر   دلّی کو افتخار ہے اپنے مقام پر
پایا ہے بخم و بخت نے اسکے شرف عجیب   برسوں میں جاکے جاگا ہے سویا ہوا نصیب
یہ لطف تھا ازل سے ودیعت برائے ہند   مالک ہمارے یعنی شہنشاہ آئے ہند
فرمانروائے ہند ہے رونق فزائے ہند   منہ مانگی پھر مراد نہ کیوں اپنی پائے ہند
بگڑی ہوئی تھی ملک کی تقدیر بن گئی   فیض قدم سے خاک یہ اکسیر بن گئی
خورشید یہ چمکتا ہے جو آسمان پر   ہے صرف دوپہر کے لئے جسکی کرّ و فر
مشرق کا آفتاب نہیں ہے یہ ذرّہ بھر   البتہ جارج پنجم سلطانِ دادگر
اس سرزمینِ پاک کا وہ آفتاب ہے   جسکی ضیا سے روے زمیں فیضیاب ہے
یہ آفتاب جس سے ہے ہر روز صبحِ عید   یہ آفتاب جس سے عیاں جلوۂ امید
آنکھوں کا سُکھ کلیجہ کی ٹھنڈک ہو جسکی دید   ہندوستانیوں پہ ہے وہ سایۂ سعید
ہراک کا آج عرش بریں پر دماغ ہے   ہر ذرہ آفتاب کا چشم و چراغ ہے
صد شکر فی زمانہ ہے وہ عہدِ سلطنت   نازاں ہیں اپنے معتقیوں پر عدل و معدلت
رحمت خدا کی شاہ کا ہے ظلّ عاطفت   آزادی میں نہیں کوئی بے جا مزاحمت
نے مذہبی عناد و تعصّب کا نام ہے   فکرِ رعایا پروری واں صبح و شام ہے
ناقوس کی صدا سے نہیں انتشار کچھ   بانگِ اذاں بھی ہے نہ سماعت پہ بار کچھ
ہندو سے دشمنی نہ مسلماں سے پیار کچھ   یکساں ہیں دونوں کوئی کہے یوں ہزار کچھ
چوٹی تلک کو دیکھلے کچھ برہمی نہیں   اسلام پر بھی لطف و کرم کی کمی نہیں
اے اہلِ ہند سوچئے تو جائے غور ہے   پہلے یہی تھا ڈھنگ جواب طرز و طور ہے
آگے کچھ اور بات تھی یہ بات اور ہے   مجھسے جو پوچھئے یہی ست جگ کا دور ہے
شاہِ جہاں ہے اپنا شہنشاہِ نامدار   آباد ملک اور رعیت وفا شعار
ہندوستاں میں آج وہ جادہ فگن ہوا   زینت فزائے تخت سرِ انجمن ہوا
دربار رشکِ شوکت و شانِ کہن ہوا   سرسبز اپنی آرزوں کا چمن ہوا

جب تک جہاں میں دورۂ خورشید و ماہ ہو
دنیا کا حکمراں یہ مرا بادشاہ ہو

شرر سہارنپوری

قصیدۂ دربار و تشبیب بہار

کس کی آمد سے گلستاں میں مچی ہے ہلچل   اور ہی کچھ ہیں جوانانِ چمن کے کس بل
ڈالیاں ملتی ہیں جھک جھک کے گلے آپس میں   پتے پھولوں سے ہم آغوش ہیں اور پھولوں سے پھل
لب سوسن مسی آلودہ ہے ماشاء اللہ!   چشم بد دور! ہے نرگس بھی لگائے کاجل
ابر نیساں نے لُٹائے ہیں زمیں پر موتی   سبزۂ تر ہے بچھائے ہوئے فرشِ مخمل
شامیانہ فلکِ نیلوفری کا ہے کھچا   خیمے ہیں اودی گھٹاؤں کے کھڑے دل بادل
خوشنما جھاڑ زمرّد کے ہیں سرو و شمشاد   پھول لالے کے ہیں یاقوت کے نایاب کنول
اکطرف چھوٹتی ہے روئے شفق پر مہتاب   اکطرف چرخ پہ سورج ہے جلائے مشعل
خاک ہمپایۂ افلاک ہے اللہ رے عروج   ذرّے بھی پڑھتے ہیں تسخیرِ کواکب کا عمل
صبح اقبال کا چمکا ہے ستارہ ایسا   طالع ہند سے کافور ہے تاثیرِ زحل

بعد اک قرن کے راس آیا قران السعدین   ہر گھڑی آج کی ہے نیک مبارک ہر پل
قیصر و قیصرہ کی ایک جھلک میں آہند   چار چاند آج لگے تجھکو زہے عزّ وجل
بعد مدت ترا چمکا ہے نصیبا اے دہلی   اُجڑے ایوانوں کو بھی آج ہے نازِ محل
فوجیں امڈی چلی آتی ہیں سلامی کے لئے   سب پرے باندھے مسلح ہیں سوار اور پیدل
بینڈ باجوں کی سریلی کبھی آتی ہے صدا   گونجتے ہیں کبھی توپوں کے گرجتے بادل
موٹریں کرتی ہیں تیزی میں ہوا سے باتیں   اب کہاں اگلے زمانے کے وہ رتھ اور بہل
ہاتھیوں پر کہیں ہودج کہیں زربفت کے جھول   ساز میں غرق جواہر کہیں گلگوں کوتل
ملک کے سارے نمودار جلو میں حاضر   راجگان و امرا اور رؤسا اہل دول
اک سے اک بڑھکے اراکین صنادید ہم   لارڈ لفٹنٹ ڈیوک اور گورنر جنرل
ہے یہ حیرت کہ لکھوں کیا میں شکوہِ دربار   رعب کہتا ہے قلم سے کہ خبردار سنبھل
سرنگوں ہوکے جو رکتا ہے کہیں یہ خامہ   شوق کہتا ہے کہ باہر حدِ مسطر سے نکل
کھینچنے کے لئے دربار کا زریں نقشہ   چاہئے تار شعاعی کو سنہری جدول
آسماں سے کہیں بھاری ہے زمیں کا پلہ   ذرّے کہتے ہیں ستاروں سے کہ ہم ہیں افضل
جارج پنجم کے ہے دربار گہربار میں آج   ہم تہیدستوں کی تقدیر کا قصہّ فیصل
جھولیاں بھرلیں جواہر سے گدا ابھی آکر   کیوں پڑے سوتے ہیں تانے ہوئے سر کمل
قابلِ دید ہے اس شاہ کا ٹکٹ دربار   سلطنت جسکی شہنشاہوں میں ہے ضرب مثل
مدح میں ہوکے مخاطب کوئی مطلع لکھوں   نقش ثانی کا ہے محتاج یہ نقشِ اوّل

مطلع

ہر چمن میں یہ ترے عدل کا بیٹھا ہے عمل   گل کو گلچیں سے نہ صیاد سے بلبل کو خلل
تاب شعلے کی نہیں خس کو جو پہنچائے ضرر   شمع پروانہ سے ہمدم سے نہ گل ہو مشعل
جثۂ فیل سے بھی مور کو پہنچے نہ دھمک   بچۂ میش کو دے گرگ جگہ زیرِ بغل
امن و راحت کے ترے عہد میں وہ دور چلے   شہر ویراں ہوئے آباد۔ بسے دشت و جبل
سیکڑوں اجڑے جزیرہ دل کے مقدر چمکے   ایک دنیا ہی نئی آئی سمندر سے نکل
سکہ بیٹھا ہے ترا ماہ سے لے تا ماہی   خشک و تر زیرِ نگیں قبضے میں سارا جل تھل
ریلیں خشکی میں سمندر میں جہازیں جاری   بحر و بر دونوں میں حکمت کی تری چلتی ہے کل
وہ جہانگیر ہے تو عہدِ ہمایوں کا مرے   صلح کل بڑھکے ہے اکبر سے ترا طرزِ عمل
ایسے سُلجھے ہوئے پاکیزہ تمدن کے اصول   بال بھر بھی نہیں آئین و قوانین میں بل
موشگافی سے ہوئے نکتۂ باریک عیاں   نکتہ سنجی سے کھلے عقدۂ ما لاینحل
علم و حکمت سے کبھی جہل کا چلتا نہیں زور   لفظ بے معنی ہے موضوع کے آگے مہمل
تجربے پر تری تحقیق کا ہے دار و مدار   اب ہے ظنی و قیاسی کی بنا مستاصل
سب میں ممتاز ہے تو سب میں سرافراز ہے تو   نامور جتنے گنے جاتے ہیں یورپ کے دول
حد نہ لشکر کی ترے اور نہ خزائن کا شمار   زور و زر دونوں میں سطوت ہے تری ضرب مثل
بج گئے فوج ظفر موج کے ڈنکے جسدم   کون ہے تجھسے جو سر بر ہو دمِ جنگ و جدل
پھونک کر خرمن اعدا کو کرے خاکستر   برق بنکر جو تری تیغ دکھائے جھل بل
طاق کسریٰ سے بھی اونچا ترا ایوان بلند   قصرِ قیصر سے بھی عالی تری رفعت کا محل
مختصر یہ ہے کہ آئین جہانبانی میں   تو ہی اپنا ہے نظیر اور تو ہی اپنا بدل
مدح تو ہو نہ سکی محو دعا اب ہے شفق   تیرا حامی ہو خدا وند شہ عزّ وجل
دوستوں کے لئے ہو رحم ترا مژدۂ امن   حق میں دشمن کے ترا قہر ہو پیغام اجل
یوں ترے دم سے پھلے پھولے رعایا کا چمن   تخم سے جیسے شجر شاخ سے گل اور پھول سے پھل
جلکے یوں خاک ہوں اعدا سیہ رو تیرے   جسطرح دانۂ اسپند درونِ منقل

شفق عمادپوری

دھنیہ باد

سَن سَن پَوَن چلت چو بائی   کو شومت راج نویدن لائی
گھورت گرجت نبھ گھن برست   رُدیا برست کنچن برست
کال گیو اب برست اولے   سگری پرجا موتی رولے
بادل جھومت بجری کرکت   دُشٹ اسنت کی چھتین دھرکت
مول کند بھوم اُپجت ایسے   ودیا بڑھت ہیں سجن جیسے
برست بادل کارے کارے   ندی تلاؤ اُٹھت ہیں دھارے
رہس رہس نبھ دامنی دمکت   آس پاس جل جگنوں چمکت
ڈالی ڈالی ممولا گاوت   وید منتر جس بپر سناوت
دیکھت جھپکت ہیں نین ڈورے   جل بچ جلچ ہیں مد کے کٹورے

پھیلت چمپا اُپجت بیلی   گجرے پہنت سگری سہیلی
دادُر جھینگر گھن گُن گاوت   مدھوکرین مدھ من للچاوت
کرت پپیہا پی تو پی تو   کویل کوکت کُوکُو کُوکُو
مور وا نرت کرت بن ماہیں   کوسوں ڈھونڈھت کا گاناہیں
جنگل جنگل پھول کھلت ہیں   کندا سینہ سے مول ملت ہیں
رین رشی مکھی دیکھت بھورا   چندر سے جس آنند چکورا
گھن جل اتھاہ سمندر میں کیسے   گربھت گیانی ہری میں جیسے
رین دنا ں نبھ جگمٹ بادل   چندر اور سورج کے گھونگٹ بادل
لندن دشا مہاتما دھارن   سندر شو بھا راج کے کارن
دھن مہاراجا راج پنچم   راج کرد مہا پر سے تک تم
دہلی تکھت پہ دم دم دھارد   نت نت دھار د جم جم دھارد
جیوسے تن میں براجے تم ہو   راجوں کے مہاراجے تم ہو
ہمرے نین اور چرن تمہارے   بجے بجے، دھن دھن بھاگ ہمارے
سکھ سیں راج استھان براجت   شو بھا راج تمھن کو ساجت
ایشور شکتی کاج میں تمرے   سورج چھپت نہیں راج میں تمرے
دھن دیوی میری مہارانی   تمرے بیری کی جگ میں ہانی
بھارت ماتا کی ماتا تم ہو   دیش بدیش کی داتا تم ہو
دیش کی گوتھوں کے سگرے بچے   تمری سیوا کے ہیں سچے
تمری برہ میں سگرے مگن ہیں   راج سے تمرے لگائے لگن ہیں
تمرے بچے ودیا پاوت   راج استھان سے چت ہیں لگاوت
ودیا کا دیا بالا تم نے   کردیا دیش اجالا تم نے
اُتر دکھن پورب پچھم   برٹش راج استھان گڑے تھم
سیس پہ تمرے مکٹ ہے ایسے   مکٹ آکاش کا سورج ہے جیسے
بھاری بھرکم تمرا کھانڈا   دُشٹ کا جس سے پھوٹت بھانڈا
دیش ہے تمری کرپا سیتی   جل کی ثمرن پھلت جس کھیتی
تمرے کو نیوت شامی رومی   تمرے دیا میں جگت کی بھومی
مول تمہارا بیاج تمہارا   چکرورت ہو راج تمہارا
پرلے تک تم دیش میں دھارد   دیش کی نیّا پار اوتارو
دیش کا سدھ ہو کاج تمھن سے   اسکو ملے سوراج تمھن سے

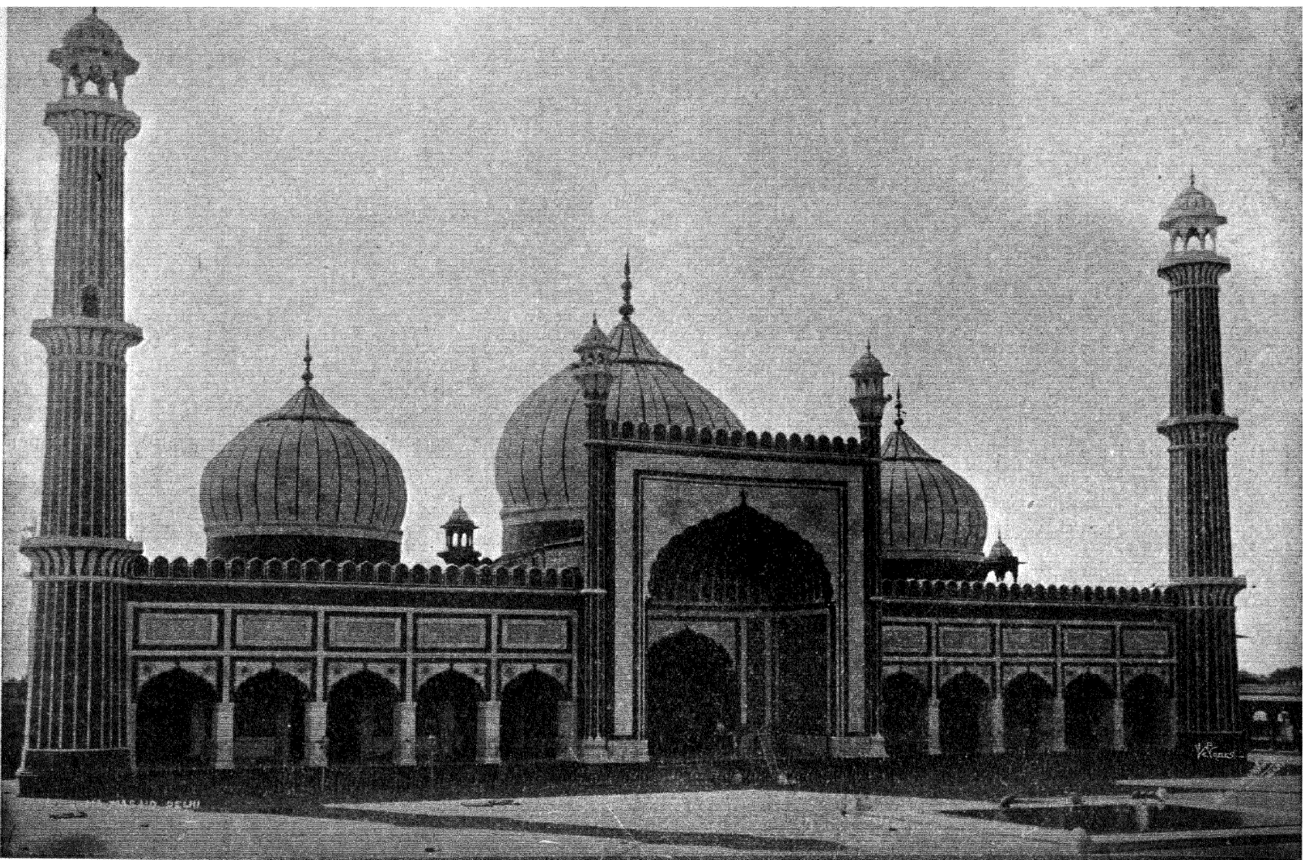
شوکت میرٹھی

جامع مسجد

مسجدِ جامع تری اللہ اکبر عزّ و شاں   ہے تنا میں سر بسجدہ کلک او رقام زباں
نور دیں ہے تیرے باعث قوت اسلام ہے   مر گیا زندہ ہے پر نام شہنشاہ جہاں
تیری شہرت قاف سے تا قاف عالمگیر ہے   صاحبِ ایمان معظم جانتے ہیں بیگماں
ہے تو ہی فخر المساجد ایسا حاصل ہے شرف   ہاں کوئی مثلِ بلال آئے تو ہے اپسر اذاں
تیری نسبت کس سے دوں حیران ہوں تو ہی بتا   مسجدِ اقصیٰ کہوں یا تختۂ باغِ جناں
تیرے آگے کچھ نہیں باقی ہے رفعت طور کی   گنبدِ گردوں کا ہمسر تیرا گنبد بیگماں
چھوٹ پڑتی ہے کلس پر جب شعاعِ مہر کی   صاف ہو جاتا ہے خورشید درخشاں کا گماں
سنگ مرمر مثل آئینہ دل زاہد سے صاف   سنگ موسیٰ کی غضب دلکش ہیں جس پر دھاریاں
کیوں نہ ذکرِ حوض میں دریا بنے طبعِ رواں   قربِ حق جسکے وضو سے پاتے ہیں پیر و جواں
پاک و پاکیزہ مطہر چشمۂ آبِ حیات   خضر کو پیکر ملی جس سے کہ عمرِ جاوداں
ہے بشکل دال خم محراب لیکن ہے یہ رمز   دعوتِ اسلام کا گویا اشارہ ہے عیاں
اب تری پہلی سی حالت وہ نہیں باقی رہی   گو ضعیفی ہے تری لیکن ہے پھر بھی تو جواں
حُسن سے تیرے مجھے اسکی نظر کا خوف ہے   نیلی پیلی آنکھوں سے کیا گھورتا ہے آسماں
مصلحت سے کچھ دنوں سرکار کی ضبطی میں تھی   مل گیا جب حکم تو ہونے لگی تجھ میں اذاں
دولتِ انگلیشیہ کو فتح پوری جب ہوئی   تو دوگانہ شکر کا پڑھنے لگے خورد و کلاں
حق بجانب ہے اگر دہلی کو ہووے تجھ پہ ناز   دیکھنے آئے دوبارہ قیصرِ ہندوستاں

عظمت جبروت یزداں رونقِ اسلام ہے
وصف تیرا کیا کروں، آگے خدا کا نام ہے

ماہ عظیم آبادی

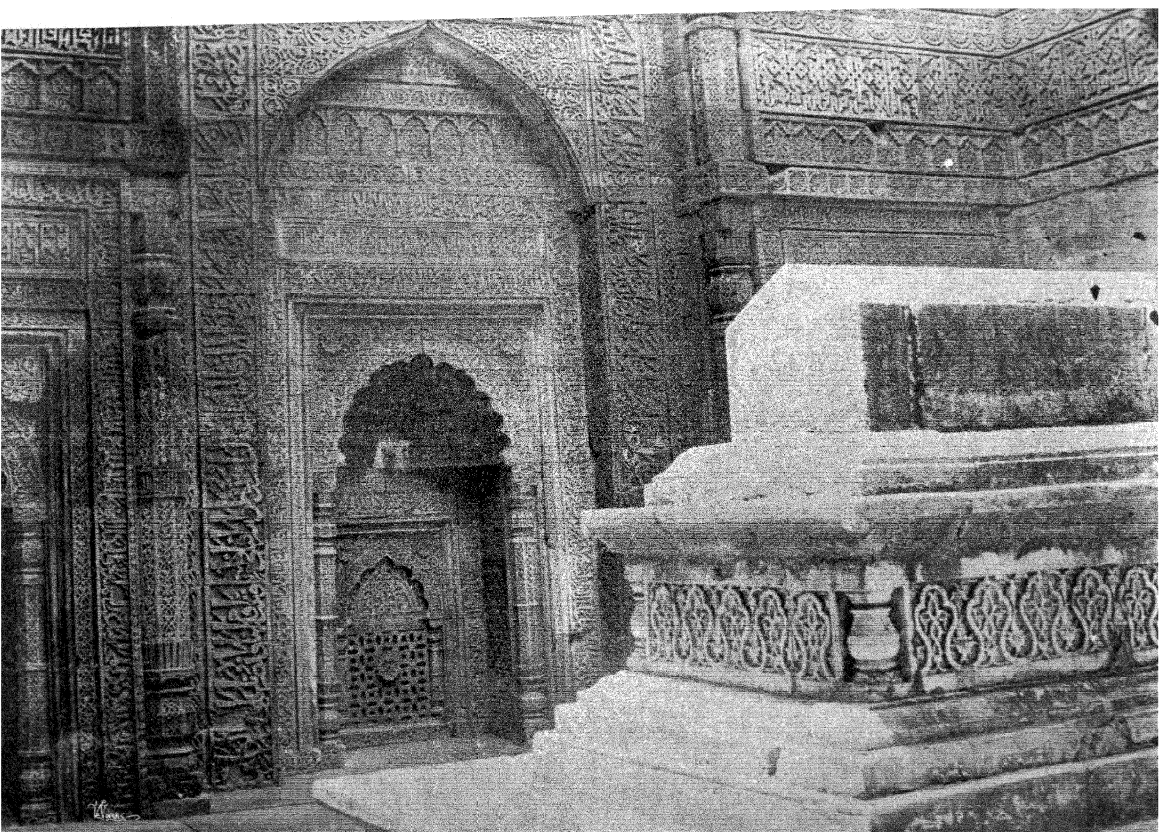


जामे मसजिद (भीतरी दृश्य) ।

INTERIOR VIEW OF JAMA MASJID

اندرونی نظارۂ جامع مسجد

Indian Press, Allahabad.



शम्सउद्दीन अल-तमश का मक़बरा ।

TOMB OF SHAMS-UD-DIN ALTAMSH

مقبرۂ شمس‌الدین التمش

Indian Press, Allahabad.

مرقع دربار

کیونکر نہو نگے سرنگوں سات آسماں دربار میں ۔ ہے جلوہ فرما قیصرِ ہندوستاں دربار میں
یعنی تھیٹر کا گماں کرتا ہے اس پر سب جہاں ۔ لایا ہے رضواں نذر کو قصرِ جناں دربار میں
ہیں فرش کچھ کمخواب کے کچھ قاقم و سنجاب کے ۔ زربفت کا کھینچا گیا ہے سائباں دربار میں
دربار میں ہیں جتنے گہر یا جتنے انجم چرخ پر ۔ اتنی مرصع بچھ رہی ہیں کرسیاں دربار میں
فردوس کا صحنِ چمن گویا دکھاتا ہے پھبن ۔ بچھا ہوا ہے ہر طرف جو پرنیاں دربار میں
قلعہ کے اندر تخت پر تاجِ مکلّل سر پہ دھر ۔ لو دیکھلو بیٹھا ہے وہ شاہِ جہاں دربار میں
یوسف جو شاہنشاہ ہیں بیگم بھی مہر و ماہ ہیں ۔ "صلِّ علیٰ" کیونکر نہو وردِ زباں دربار میں
لیڈیز گل اندام کے رخسار لالہ فام سے ۔ نام خدا کیا کھل رہا ہے بوستاں دربار میں
نواب یا راجہ ہیں یہ سردار یا خواجہ ہیں یہ ۔ اب دیکھتے ہو جسقدر تم میہماں دربار میں
خیمہ ہیں تا حدِ نظر اُسمیں بھٹا ٹھس ہیں بشر ۔ سچ پچ اُمنڈ کر آگیا سارا جہاں دربار میں
ریلیں ٹریمیں موٹریں اور ڈاکخانہ تار گھر ۔ ساماں بہم سب کر دئے راحت رساں دربار میں
بجلی کی ہے وہ روشنی ہے ماند جس سے چاندنی ۔ پانی کے نل بھی ہوگئے ہر سو رواں دربار میں
نظم و نسق میں خوبیاں کیونکر نہوں ہر دم عیاں ۔ سب منتظم اور مہتمم ہیں کارداں دربار میں
حیراں ہیں جنکو دیکھکر عقل و ذکاوت سربسر ۔ یورپ کی ہیں وہ طرفہ تر صناعیاں دربار میں
پیر فلک جن و ملک کہتے ہیں سب با رشک ۔ ہمنے کبھی دیکھا نہیں ایسا سماں دربار میں
طبقے زمیں کے پھٹ گئے تارے فلک سے ہٹ گئے ۔ توپوں کی غُرّش اسقدر ہے الاماں دربار میں
اُنکی جھلک اُنکی چمک جاتی ہے تا عرشِ فلک ۔ زرّیں ہیں ساری فوج کی جو وردیاں دربار میں
کرتے ہیں جنبش ہر طرف پہلو بہ پہلو صف بہ صف ۔ لاکھوں علم دربار میں لاکھوں نشاں دربار میں
رستم کا سینہ شق ہوا مریخ کا مُنہ فق ہوا ۔ ہونے لگا افواج کا جب امتحاں دربار میں
توپیں سلامی کو مگر حاضر ہوئی ہیں سر بہ سر ۔ یا آگئے ہیں اژدہے آتش فشاں دربار میں
خم ہو گئے ہیں تیر سب مثلِ کماں تسلیم کو ۔ سیدھی ہوئی تعظیم کو پشتِ کماں دربار میں
تم مطلعِ ثانی پڑھو سعدی و قاآنی بنو ۔ کھولو فراقؔ اپنا لبِ معجز بیاں دربار میں

شامل ہے شاہنشاہ کا سب خانداں دربار میں
انگلینڈ سے آئی بہارِ بے خزاں دربار میں

جمشید لیکر جام کو حاضر ہوا انعام کو ۔ آیا اُدھر آداب کو نوشیرواں دربار میں
شمشیر ہے تیری شہا یا تیرا اسپِ بادپا ۔ سیماب وش آتش منش برقِ تپاں دربار میں
سمجھا میں کوہِ طور ہے زرّیں عماری نور ہے ۔ آیا جو سج کر شاہ کا فیلِ دماں دربار میں
چکرائیگی عقل و خرد گھبرائے گی فہم و ذکا ۔ جادو کی چھوٹینگی جو آتشبازیاں دربار میں
جوشِ مسرت دیکھنا تاثیرِ فرحت دیکھنا ۔ چنپا کی کلیاں بنگئیں نوکِ سناں دربار میں
مل جائینگے انعام میں جا ئینگے سب کام میں ۔ دلّی کے سارے آگئے گنجِ نہاں دربار میں
وہ امپرس اور امپرر بیٹھے ہوئے ہیں تخت پر ۔ شمس و قمر کا دیکھ لو آکر قراں دربار میں
یاقوتِ احمر تاج کے دیتے ہیں جلوہ بے بہا ۔ ہم جانتے ہیں چھا گیا ہے ارغواں دربار میں
ہر ایک تن ہر اک بدن ہے عیش و عشرت میں مگن ۔ ہر ایک دل ہر ایک جاں ہے شادماں دربار میں
مجھسے فقیرِ ناتواں بھر لینگے اپنی جھولیاں ۔ لب ہونگے شاہنشاہ کے گوہر فشاں دربار میں
لاکھوں ہوئے قیدی رہا لاکھوں ہے ہوگی انکو عطا ۔ لطف و کرم کا ہو گیا دریا رواں دربار میں
ہاتھی ہوئے ہیں شادماں جو جھومتے ہیں ہر زماں ۔ مستی کا پانی آئے ہیں رطلِ گراں دربار میں
ہیبت سے پھٹ جائے جگر دم بھر میں ہو زیر و زبر ۔ بھولے سے گھس آئے اگر شیرِ ژیاں دربار میں
کیا دلربا ہے زیر و بم کیا جانفزا ہے تال و سم ۔ کیسا بندھا ہے بینڈ کا دلکش سماں دربار میں
حد ہو گئی ہے شوق کی یہ انتہا ہے ذوق کی ۔ ہوکر مجسم آگئے وہم و گماں دربار میں
ہے ذات کا تیری اثر اے خسروِ والا گہر ۔ ہر چیز سرتاپا بنی جو دلستاں دربار میں
دیدار شاہنشاہ کا عیسیٰ کا ہے اک معجزہ ۔ آآکے بوڑھے ہو رہے ہیں نوجواں دربار میں
دیکھیں جو بزم آرائیاں انکی بنالیں داستاں ۔ آئے ہیں روم و روس کے یوں قصہ خواں دربار میں
بس کر فراقِ بینوا اب صدق دل سے تو دعا ۔ آمیں کہیں گُفتار سب شیریں زباں دربار میں

یہ امپرر اور امپرس جیتے رہیں لاکھوں برس
پائے یہی دائم شرف ہندوستاں دربار میں

سید ناصر نذیر فراقؔ دہلوی

تہنیت آمد شاہی

اے ذہنِ رسا حسنِ عروسانہ دکھادے ۔ بیتاب ہے دل صورتِ جانانہ دکھادے
ہو ساغرِ جمشید وہ پیمانہ دکھادے ۔ ہے جشن کا دن شوکتِ شاہانہ دکھادے
خامہ کی صریریں قمِ عیسیٰ کی صدا ہوں ۔ الفاظ چمک میں یدِ بیضا سے سوا ہوں
جو سطر ہو وہ رشکِ رہِ کاہکشاں ہو ۔ لفظوں پہ چمکتے ہوئے تاروں کا گماں ہو
کاغذ مہ انور کی طرح نور فشاں ہو ۔ سورج کی کرن کاف کے مرکز سے عیاں ہو
ہر صاد بھی عین آنکھ ہو آہوئے حرم کی ۔ اتنی تو ہو ہاں شان مرے طرزِ رقم کی
اے بلبلِ گلزارِ جناں! تو بھی چہک آج ۔ ہاں اے گلِ فردوس بریں! تو بھی مہک آج
اے سبزۂ خوابیدہ! ذرا تو بھی لہک آج ۔ اے زاہدِ دیندار! ذرا تو بھی بہک آج
ہاں دیکھ چھلکتے ہیں یہاں عیش کے ساغر ۔ ہاں لائی ہے وہ حورِ جناں عیش کے ساغر
اے ساقیِ مہوش! مجھے اک جام پلادے ۔ کچھ سیر ذرا عالمِ بالا کی دکھادے
حیرت سے سراپا مجھے تصویر بنادے ۔ جو بیچ میں حائل ہے وہ پردہ تو اٹھادے
بے چین ہوں بے تاب ہوں میرے جگر سے ۔ بجھ جائے لگی دل کی کچھ اس آتشِ تر سے

اے فرشِ زمیں اوج میں بالا ہو فلک سے ذرے ترے بڑھکر ہوں ستاروں کی چمک سے
جنت ہو معطر ترے پھولوں کی مہک سے اک روشنیٔ نور سما تک ہو سمک سے
ذرّوں پہ ہو خورشیدِ جہانتاب کا دھوکا سایہ پہ بھی ہو چادرِ مہتاب کا دھوکا

ہاں اے فلکِ پیر نئے سر سے جواں ہو اک لوح ہی نیلم کی یہی سب کو گماں ہو
ہیرے سے جڑے ہیں، یہ ستاروں سے عیاں ہو مہتاب بھی اک چاندی کی صورت کا نشاں ہو
سر پیشِ شہنشاہ جھکانا ہے تجھے بھی آنکھوں کو سرِ راہ بچھانا ہے تجھے بھی

وہ کون شہنشاہ جو ہے منصف و عادل دانا و خردمند و فرزانہ و عاقل
ہر علم میں ہے طاق تو ہر فن میں ہے کامل فیاض و ہنرمند و سخی عالم و فاضل
اے شاہ! لیا نام جو بھولے سے بھی تیرا مُنہ چوم لیا قوتِ گویائی نے میرا

تھے پہلے شہنشاہ بڑے صلح کے جویا تصویر سراپا یہ انہیں کی ہوئے گویا
پایا انہیں صد شکر جو صد حیف اُنھیں کھویا پھل لائیگا اب تخمِ محبت جو ہے بویا
ہونٹوں پہ اب آآکے یہ کہتا ہے تبسم ایڈورڈ وہ ہفتم تھے تو یہ جارج ہیں پنجم

وہ عدل ہے، کسریٰ کی عدالت کو مٹایا وہ فیض ہے حاتم کی سخاوت کو مٹایا
وہ زور ہے رستم کی شجاعت کو مٹایا وہ شکل ہے یوسف کی بھی صورت کو مٹایا
جو بات ہے انکی دمِ عیسیٰ سے سوا ہے فتنوں کو سلاتی ہے وہ دامن کی ہوا ہے

اللہ کرے روز یہی جلوہ نظر آئے اک بار تو دیکھا ہے دوبارا نظر آئے
آنکھوں کو وہی صورتِ زیبا نظر آئے بنجائیں تماشا وہ تماشا نظر آئے
پھر ہند ہو روشن اسی جلوے کی چمک سے رتبہ میں یہ پھر بڑھ کے دوبالا ہو فلک سے

تو وہ ہے کہ بلبل کو گلِ تر سے ملا دے تو وہ ہے کہ قمری کو صنوبر سے ملا دے
تو وہ ہے کہ قطرے کو سمندر سے ملا دے تو وہ ہے عرض کو ابھی جوہر سے ملا دے
ہو مجھکو میسر رخِ زیبا کا نظارا شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

صد شکر ہوئیں آج قبول اپنی دعائیں چھائی ہوئی سر پہ ہیں وہ رحمت کی گھٹائیں
اتراتی ہوئی آئیں وہ جنت کی ہوائیں حوروں نے بھی لیں شوق سے زلفوں کی بلائیں
قربان اس انداز کے کیا ناز و ادا ہے اس چال پہ اٹھ اٹھ کے قیامت بھی فدا ہے

ہاں دیکھ لے یہ شوکتِ شاہانہ جدا ہے دربار کا انداز ملکانہ جدا ہے
اے دورِ فلک اب سے یہ پیمانہ جدا ہے ساقی ہے جدا اور یہ مے خانہ جدا ہے
ہر دل کہ ز دیدارِ تو شد رُو کشِ سودا از مردمکِ چشم نشاں باد سویدا

دلی کو تو دیکھو کہ دلہن آج بنی ہے گلزارِ ارم رشکِ چمن آج بنی ہے
سورج کی کرن شمعِ لگن آج بنی ہے کو، روشنیٔ صبحِ وطن آج بنی ہے
شبنم کے یہ قطرے ہیں کہ ہیں گوہرِ نایاب ہر وقت تنی رہتی ہے اک چادرِ مہتاب

ہر رنگ کے ہیں پھول یہ گلزار ہے ایسا ہر وضع کے ہیں لوگ یہ دربار ہے ایسا
ہو مصر بھی قربان یہ بازار ہے ایسا یوسف کو بھی لے مول خریدار ہے ایسا
ایسی تو چمک مہرِ درخشاں میں نہیں ہے جو نور یہاں ہے مہِ کنعاں میں نہیں ہے

ہے روشنی بجلی کی کہ یہ برق سرِ طور ہو جائے اسے دیکھ کے کیوں شمع نہ کافور
حیرت ہے کہ پہنچی ہے چمک اسکی بہت دور دیکھو نظر آتا ہے وہ جنت میں رخِ حور
موسیٰ ہیں کہاں دیکھ لیں جلوا یہ نیا ہے اللہ کی قدرت کا تماشا یہ نیا ہے

جو رنگ یہاں گوہرِ نایاب میں دیکھے جوہر نہ یہ آئینۂ مہتاب میں دیکھے
بوٹے جو یہاں مخمل و کمخواب میں دیکھے یہ پھول نہ آنکھوں نے کبھی خواب میں دیکھے
نیلم ہیں کہیں اور کہیں لعل پڑے ہیں بازار غرض کانِ جواہر کی بنے ہیں

ہے صبح سے اک دھوم کہ نکلے گی سواری سب کہتے ہیں اس چمکے کی تقدیر ہماری
خورشید کو ہے مدِّ نظر آئینہ داری چھڑکاؤ کو موجود ہوا ابرِ بہاری
کھلنے کے لئے غنچۂ سربستہ ہے حاضر اقبالِ سکندر بھی کمربستہ ہے حاضر

آتا ہے نظر چلے نشاں فتح و ظفر کا ہر سمت ہے اک نور دلِ اہلِ نظر کا
چھایا ہے عجب رنگ دعاؤں کے اثر کا ہے ایسی صفا صاف، ہے فق رنگ سحر کا
کچھ کسب ضیا اس سے ہو صبح کی ہے خواہش ہوں آکے قدمبوس یہ [illegible] کی ہے خواہش

لو آنکھ کو وہ مہرِ منور نظر آیا آئینہ میں یا روئے سکندر نظر آیا
تقدیر کو چمکاے وہ اختر نظر آیا جو کانِ جواہر ہے وہ گوہر نظر آیا
روشن ہے نظر جس سے وہ تنویر یہی ہے آنکھوں میں جو پھرتی تھی وہ تصویر یہی ہے

کیا شان ہے کہتا ہے ہر اک دیکھنے والا یا رب رہے تا حشر اسی مہ کا اُجالا
افزوں ہو اگر عمر تو اقبال دوبالا دشمن ہی نہو کوئی کہ منہ جس کا ہو کالا
خورشید جہانتاب بھی دیتا ہے دعائیں پھیلی رہیں یا رب رخِ تاباں کی شعاعیں

جب تک کہ ہو پہلو میں دل اور دل میں تمنا جب تک کہ ہو سر، سر میں ہو اس زلف کا سودا
جب تک کہ نہو وصل کا وعدہ کبھی پورا جب تک رہے تا حشر یہ فردا پسِ فردا
ہر صبح تجھے عیش ہو آرام ہو ہر شام آنکھوں کے اشارے سے یہ پھرے گردشِ ایام

اس فرقِ معلیٰ سے ہوئی تاج کی عزت ہے مرجعِ شاہانِ جہاں یہ درِ دولت
بجتی ہے اسی نام کی افلاک پہ نوبت ملتی ہے اسی سایہ میں آرام کو راحت
اے تختِ سلیماں! ترے سرتاج یہی ہیں جو کچھ ہیں زمانہ میں وہ بس آج یہی ہیں

برگشتہ نصیبوں سے تجھے رحم دلی ہے میراث میں یہ دولتِ نایاب ملی ہے
مرجھائی ہوئی دلکی کلی تجھسے کھلی ہے سودائیوں کی جیبِ دریدہ بھی سلی ہے
مجنوں بھی ترے دور میں ہشیار ہوا ہے غفلت میں جو سوتا تھا وہ بیدار ہوا ہے

ہیں چار طرف عیش کے انبار ذرا دیکھ پھولا ہوا ہر سمت ہے گلزار ذرا دیکھ
اس شہر کی اب گرمیٔ بازار ذرا دیکھ ہے فیض رساں ابرِ گہربار ذرا دیکھ
اے واصفِ دلخستہ بس اب شاد ہو تو بھی اس قیدِ غم و رنج سے آزاد ہو تو بھی

واصف اکبرآبادی

سرگذشت دہلی

اجڑا ہوا نہیں ہے ہرگز دیارِ دہلی
پوچھے ہمارے دل سے کوئی بہارِ دہلی

ہیں زندہ یادگاریں نقش و نگارِ دہلی
کچھ نام کر گیا ہے ہر تاجدارِ دہلی

تاریخ دفن اسمیں ہندوستان کی ہے
یونان و مصر و فارس سارے جہان کی ہے

بھارت میں جبکہ ڈنکا پانڈوں کا بج رہا تھا
وہ بھیم وہ یدھشٹر وہ کرشن سج رہا تھا

کوروں کے دل میں ہاکر ارجن گرج رہا تھا
بانکوں کا بانکپن بھی جن سے نرج رہا تھا

اُن کے محل تھے کیا کیا جمنا ترے کنارے
اندر پرست دہلی کہتے تھے تجھکو سارے

بھیشم کے دور دورے کوروں کی حکمرانی
ایسے ہوئے پریچھت کلجگ نے ہار مانی

پھر جنمے جے نے اپنی کی تیس مار خانی
اب نام ان کا سُنلو کھنڈرات کی زبانی

حسرت سے کہہ رہے ہیں ایوان ٹوٹے پھوٹے
ہم پر بھی نقش کاری ہم پر تھے بیل بوٹے

تجھکو پرانے قلعہ آباد رکھنے والا
دنیا کے حادثوں سے آزاد رکھنے والا

تعمیر میں نرالی ایجاد رکھنے والا
وہ کون نامور تھا بنیاد رکھنے والا

کیا تجھ میں خوبیاں تھیں کیا شانداریاں تھیں
کس شاہِ ذی حشم کی مہمانداریاں تھیں

دہلی میں راجپوتی لہرا رہا نشان تھا
اقبال اوج پر تھا ہمدرد آسمان تھا

کروٹ جو ایک بدلی غوری کا آستان تھا
ڈھنتا تھا سر تھیورا امندر مہیاں تھا

جو بت تھے اس میں کھپے کہ بن گئی ترے تقدیر
ان مورتوں میں کیا کیا عالم کی صورتیں تھیں

مینارِ قطب صاحب کب سے کھڑا ہوا ہے
کچھ بول چال منہ سے کیا تو لڑا ہوا ہے

کیوں سربلندیوں سے اتنا بڑا ہوا ہے
تیری بنا میں کسکا پتھر گڑا ہوا ہے

اے التمش کی مسجد تو ہی نشاں بتا دے
کرتی تھی حکمرانی رضیہ کہاں بتا دے

چتوڑ کی لڑائی دولت پہ جان دینا
وہ قوم کی حمیت عزت پہ جان دینا

خلجی کا شوخ چنچل صورت پہ جان دینا
جانباز پدمنی کا عصمت پہ جان دینا

ہیں زندہ داستانیں ہستی رہیگی جب تک
جمنا کنارے دہلی بستی رہے گی جب تک

تغلق نے تخت چھینا قلعہ نیا بنایا
فیروز شہ نے اپنا پھر کوٹلہ بسایا

سنگین لاٹ گاڑی سکھ سے رہی رعایا
یک لخت قہر کیسا نازل ہوا خدایا

تاتاریوں کو لیکر تیمور لنگ آئے
دلی کے رہنے والے جانوں سے تنگ آئے

لاکھوں کے خوں بہانے کی لوٹ مار کیسی
تیغ دو دم ہوئی تھی سینے کے پار کیسی

آہیں نکل رہی تھیں بے اختیار کیسی
بچوں کے واسطے تھی ماں بیقرار کیسی

ایسا نہ دن دکھائے دشمن کو بھی الٰہی
دہلی کو مدتوں تک جیسی رہی تباہی

وہ خاندانِ لودھی، بابر کا چڑھ کے آنا
میدانِ پانی پت میں توپوں کا دندنانا

دیتا تھا جان کیا کیا آزادیوں پہ رانا
آتا ہے یاد مجھکو اسوقت کا زمانا

تھی باپ کو محبت بیٹے پہ جان دیدی
مفتوحہ سلطنت کی اسکو زبان دیدی

کی ہے شہِ ہمایوں نے سلطنت ادھوری
زوروں پہ چڑھ رہا تھا جب شیر شاہ سوری

گردش میں تھا نصیبا ہندوستاں سے دوری
ایرانیوں نے کردی آخر مراد پوری

بیرم کی جاں نثاری ابتک زبان زد ہے
وہ نیک نام زندہ دنیا میں تا ابد ہے

کیا تربتِ ہمایوں پہ مقبرہ بنا ہے
صفدر کا مدرسہ ہے درگاہِ اولیا ہے

طوطیِ ہند نامی خسرو یہیں دبا ہے
تیرا جہان آرا سبزہ ہرا بھرا ہے

غالب کی ہے یہیں پر اُجڑی ہوئی نشانی
اردو لحد کے اوپر کرتی ہے نوحہ خوانی

درگاہ قطب صاحب سنگِ مزار دیکھے
سہروں میں پھول دیکھے پھولوں میں خار دیکھے

شاہوں کے جشن کیا کیا پروردگار دیکھے
آخر کو زیرِ تربت سب تاجدار دیکھے

سکھ نیند سو رہے ہیں قبروں میں شاہزادے
بادِ سحر جگا دے بادِ سحر جگا دے

انساں کو جان پیاری جاں کو بدن پیارا
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن پیارا

عاشق کو کوئے جاناں شیریں کو بن پیارا
شاہِ جہاں کو دہلی ہمکو وطن پیارا

رکھیں گے یاد اسکو جیتے رہینگے جب تک
جامِ شرابِ عشرت پیتے رہیں گے جب تک

دہلی کے لال قلعہ فردوس کے نمونے
اقبال دوڑتا تھا قدموں کو تیرے چھونے

دربار شہ جہانی دیکھا ہے خوب تو نے
پائی تھی کامیابی کس کس کی آرزو نے

کس تخت پر مرصع طاؤس جلوہ گر تھے
فرمانروائے دولت بیٹھے ہوئے کدھر تھے

دیوان خاص تیرا دیوان عام تیرا
آئین کے موافق ہر انتظام تیرا

شوکت کنیز تیری، رتبہ غلام تیرا
مشہور ہو رہا تھا دنیا میں نام تیرا

انصاف پروری سے دلی ہری ہوئی تھی
اس شہر میں اٹاٹ دولت بھری ہوئی تھی

ہاں تجھکو جامع مسجد رضواں پہ برتری ہے
عالم فریب منظر انداز دلبری ہے

جب تک ہے حوض جاری اس نام میں تری ہے
نیکی کی جڑ ہری ہے نیکی کی جڑ ہری ہے

جنت میں کیوں نمازی جائیں نماز پڑھنے
دلی میں جب فرشتے آئیں نماز پڑھنے

حامیِ دین احمد اورنگ زیب نامی
ارکان سلطنت کی لیتا رہا سلامی

لیکن رہا ہے کسکا جاہ و حشم دوامی
مغلوں کے دبدبہ میں آنے لگی خامی

ایسے سحر سے بیٹھے جلسوں میں شام کردی
ان عیشی جیوڑوں نے عمر کی تمام کردی

ایسے ہوئے محمد شاہ زماں رنگیلے
نقال بھانڈ ٹھٹھے مجرا کریں سجیلے

دربار میں طوائف آتے تھے بے وسیلے
شیشہ کی یہ صدا تھی جامِ شراب پی لے

رندوں کا لال قلعہ میخانہ بن رہا تھا
خود بادشاہ دہلی مستانہ بن رہا تھا

نادر کی فوج آئی نشہ حرام کرنے
پابندِ عیش جلسے کیوں روک تھام کرنے

مسجد میں آکے بیٹھا جب قتل عام کرنے
پہنچا وزیرِ اعظم جھک کر سلام کرنے

نادر ہوا روانہ پھینکے اٹھا کے لاشے
مست شراب عشرت کرنے لگے تماشے

چوپٹ تھے شاہ عالم اندھیر چھا رہا تھا
ظالم غلام قادر آنکھیں دکھا رہا تھا

ہر شخص اپنا اپنا نقشہ جما رہا تھا
ہلکر اچھل اچھل کر فتنے اٹھا رہا تھا

دہلی نے ہائے کیا کیا آشوب دہر جھیلے
آئے کبھی مرہٹے چھائے کبھی روہیلے

ساعت سعید آئی پھر وقت نیک آیا
دلی کو فتح کرنے انگریز ایک آیا

سب سے نجات پائی جب لارڈ لیک آیا
بارے ہوا بڑا دن کھانے میں کیک آیا

سکہ جما یا اپنا اب ایسٹ انڈیا نے
ہر سے کے شور و غل تھے بجتے تھے شادیانے

بس ایک لاکھ پنشن پاتا تھا شاہِ دہلی
بر نام تھا ابھی تک عالم پناہِ دہلی

پھر انقلاب آیا بگڑی سپاہِ دہلی
پھر خاک میں ملایا کالوں نے جاہِ دہلی

مغلوں کی سلطنت کا نام و نشاں نہ رکھا
بابر کا نام لیوا باقی یہاں نہ رکھا

تھے سب مشیر شاہی دربار میں بچھورے
گاتے رہے ملاریں سنتے رہے کٹورے

مارے گئے ہزاروں دمباز مفت خورے
ستھراؤ کر رہے تھے ہتھیار بند گورے

شاہ سخن کے اکثر مضمون قید کر کے
بھیجا ظفر کو آخر رنگون قید کر کے

شہزادیوں پہ توڑا ایسا غضب خدا نے
پھرتی تھیں سلے بلتی جنگل میں بے ٹھکانے

تھے خاک کے بچھونے ڈیرے نہ شامیانے
تکئے کے بدلے پتھر رکھنے لگیں سرہانے

پھولوں میں تل رہی تھیں نازوں پل رہی تھیں
وہ بے نقاب ہو کر گھر سے نکل رہی تھیں

ملکہ ہوئی یہاں کی وکٹوریہ پیاری
فرمان کر دیا تھا امن و اماں کا جاری

بازار میں لٹن کی نکلی بڑی سواری
دربارِ قیصری کی بڑھکر تھی شانداری

ہندوستاں کے راجا خیل و خدم سے آئے
اقبال و جاہ و حشمت جنکے قدم سے آئے

پھر ایڈورڈ ہفتم نے کی صلح پسندی
رشیا سے رشتہ جوڑا جرمن سے بھائی بندی

خوش انتظامیوں کے صدقے تھی عقلمندی
دہلی کا کارونیشن شاہانہ سربلندی

پیلِ دماں پہ نکلے کرزن سوار ہو کر
چلنے لگی سواری بادِ بہار ہو کر

اب آپ جارج پنجم دربار کر رہے ہیں
فیضِ قدم سے بن کو گلزار کر رہے ہیں

امن و اماں کا سب سے اقرار کر رہے ہیں
تعریف روزمرہ اخبار کر رہے ہیں

یہ جشن ہو مبارک یہ جشن ہو مبارک
ہندوستان دہلی انگلینڈ کو مبارک

چہرہ ہے نور افشاں کیا شانِ قیصری ہے
اقبال روز بڑھتے عالم کو تھرتھری ہے

قبضہ میں بحر و بر ہیں مشہور سروری ہے
نوشیرواں سے بڑھکر انصاف گستری ہے

زیر و زبر ہیں یکساں ایسی ہے حکمرانی
پیتے ہیں شیر بکری اب ایک گھاٹ پانی

ریلوں کی ہے ترقی جاری ہے ڈاکخانہ
زوروں پہ ہے تجارت صنعت کا ہے زمانہ

نہروں سے آبپاشی کھیتوں پہ آبیانہ
فوج و پولس معین بھرپور ہے خزانہ

سکھوں کا ڈھنگ دیکھا مغلوں کا طور دیکھا
ایسا نہ عہد دیکھا ایسا نہ دور دیکھا

اقبال کی رہے گی دولت شفیق جب تک
ہے عدل کی جہاں میں رحمت رفیق جب تک

آزادیوں کا حامی لبرل فریق جب تک
ہم بھی دعائیں دیں گے ہر دم خلیق جب تک

ملکہ و جارج پنجم انصاف و عدل پیشہ
زندہ رہیں ہمیشہ زندہ رہیں ہمیشہ

دہلی کی شان دگنی ہو جائیگی یقیں ہے
اجڑا ہوا نہیں ہے اجڑا ہوا نہیں ہے

خلدِ بریں سے بہتر اس شہر کی زمیں ہے
ہر نقش دلفزا ہے ہر بات دلنشیں ہے

لندن بنا ہوا ہے ہندوستاں میں دہلی
ہے انتخاب بے شک سارے جہاں میں دہلی

عبدالخالق خلیق دہلوی

چراغِ دہلی

آج ہے چرخ چہارم پہ دماغِ دہلی
تر دامانِ مسیحا ہے چراغِ دہلی

جلوۂ بنتِ عنب سے ہیں نگاہیں روشن
رشکِ خورشید کو دیتا ہے ایاغِ دہلی

ساغرِ گل سے عیاں پھول کی کیفیت ہے
رد کشِ میکدۂ عیش ہے باغِ دہلی

دامنِ قلب ہے آلودۂ صہبائے طرب
ڈوبا ہے رنگِ مسرت میں دماغِ دہلی

پتے پتے سے ہوا رنگ سعادت پیدا
سایۂ بالِ ہما ہے سرِ باغِ دہلی

گلِ عشرت وہ کھلے ہیں کہ چمن صحرا ہے
گلشنِ خلد نگاہوں میں ہے راغِ دہلی

غنچے تا خوں پہ ہیں مثلِ دلِ مضطر تو یاں
بنگیا ہے چمن ارمانوں کا باغِ دہلی

واہ رے دور کہ ہر ذرہ مثالِ خورشید
ہر طرف یاں کشا حسنِ فراغِ دہلی

بلبلیں باغ میں مستوں کی طرح جھومتی ہیں
مے عشرت سے ہے لبریز ایاغِ دہلی

عیش کا اسفل و اعلیٰ پہ اثر یکساں ہے
وجد میں صورتِ طاؤس ہیں زاغِ دہلی

ہر طرف دیکھئے تصویرِ سیہ مستی ہے
نغمۂ مرغِ چمن بانگِ کلاغِ دہلی

خندہ زن مہر پہ ہیں آتشِ گل کے شعلے
دامنِ خرمنِ صد برق ہے باغِ دہلی

بادۂ عیش سے جام دلِ محزوں سرشار
پنبۂ شیشۂ مے پنبۂ داغِ دہلی

شور گلزار میں ہر سو ہے سمن رویوں کا
لو کھلا دامنِ یورپ میں وہ باغِ دہلی

تختِ دہلی کو ہوا جارجِ پنجم سے فروغ
اب ملیگا نہ فلک پر بھی دماغِ دہلی

چرخ کو رشک زمیں پر ہے کہ قسمت چمکی
ذرہ ذرہ کو یہ دعویٰ ہوں چراغِ دہلی

مے عشرت بھی ہے تقدیر پہ اپنی نازاں
لبِ جاں بخش بنے حسنِ ایاغِ دہلی

غنچے مٹھی میں زرِ گل کو لئے مضطر ہیں
نذر دینے کے لئے جانبِ باغِ دہلی

ہر طرف ہے گلِ اخلاقِ شہنشاہ کی بو
واہ کیا آج معطر ہے دماغِ دہلی

دور تک غلغلۂ حسن ہے اب پوچھتے ہیں
آسماں والے مسیحا سے سراغِ دہلی

طولِ مدحت کو ندے امتیاز بالک سلام
یہ دعا کر جو ہے تو مستِ ایاغِ دہلی

یا خدا دہر میں تا حشر رہیں قیصرِ ہند
رنگِ نصفت بنے شادابیٔ باغِ دہلی

دل رعیت کے ہوں پروانہ کی صورت قرباں
جلوۂ شاہ رہے بنکے چراغِ دہلی

معین الدین سلام

وفات حسرت آیات

دلی رنج اور قلق کے ساتھہ یہہ خبر دی جاتی ھے کہ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی' اے' سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے ۲۶ فروری سنہ ۱۹۱۲ع کو دن کے گیارہ بجے اِس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کیا -

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

انڈین پریس الہ آباد



بسنت اور سرما

Indian Press, Allahabad.

ادیب

القدس الشریف

کرۂ خاک پر ایسا کوئی مقام نہیں جسکو دنیا کے تین بڑے بڑے مذہب متبرک و مقدس سمجھتے ہوں یہ شرف صرف ارض فلسطین کے اس خطہ کو حاصل ہے جسکا نام یروشلم بیت المقدس یا قدس الشریف ہے۔ اہلِ عرب اس کو قدس اور القدس الشریف کے نام سے پکارتے ہیں۔

مصر کے مشہور بندرگاہ پورٹ سعید سے قسطنطنیہ جاتے وقت پہلا بندر یافہ آتا ہے۔ انگریزی میں اس کو جافہ کہتے ہیں یہاں سے بیت المقدس صرف پانچ گھنٹہ کا راستہ ہے۔

یافہ بہت پرانا شہر ہے۔ اسکی اونچی اور گنجان عمارتیں سمندر میں میلوں کے فاصلہ سے نظر آتی ہیں۔ اس بندر کا سمندر ہمیشہ طوفانی رہتا ہے اجنبی مسافروں خاصکر عورتوں کو کنارے جاتے وقت بڑی زحمت ہوتی ہے۔ چونکہ بیت المقدس کی زیارت عیسائیوں مسلمانوں اور یہودیوں میں یکساں ثواب کا کام مانی جاتی ہے اس لئے ہمیشہ یافہ پر آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ ہر مذہب کے رہبر کنارے پر کھڑے رہتے ہیں جو زائرین کو بیت المقدس لیجانے یا پہنچانے میں مدد دیتے ہیں۔ اس میں اُن کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ یہودی اس علاقہ میں بکثرت آباد ہیں۔ باہر کے آنے والے یہودیوں کو کچھ زیادہ تکلیف کا سامنا نہیں ہوتا۔ عیسائی بھی کم نہیں ہیں اور ان کے سب کام ضابطہ اور قرینہ کے ہیں۔ اپنے حاجیوں کو تکلیف نہیں ہونے دیتے۔ مسلمان بھی اگر عربی زبان جانتے ہوں تو اُنہیں زحمت نہیں ہوتی۔ ورنہ ترجمان اور رہبر لوگ ناک میں دم کردیتے ہیں خصوصاً ہندوستان کے بھولے بھالے عقیدتمند مسلمانوں کے سر کُنڈے استرے سے مونڈے جاتے ہیں۔

یافہ سے بیت المقدس تک رات دن میں صرف دوبار ریل آتی جاتی ہے۔ فرانسیسی کمپنی نے یہ لائن بنائی ہے۔ کچھ بہت اچھی گاڑی نہیں ہے۔ راستہ سب پہاڑی ہے۔ پہاڑ سرسبز اور خوش منظر ہیں۔ چاروں طرف انگوروں کی بیلیں اور میوؤں کے

درخت نظر آتے ہیں۔ بیت المقدس پہاڑوں کی گود میں آباد ہے۔ قدیمی شہر گنجان میلا اور تاریک ہے۔ بعض مقامات پر پٹا ہوا ہے۔ جدید آبادی یورپین طرز کی ہے۔ جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ باشندے یہودی زیادہ ہیں۔ ان کے بعد عیسائی مسلمان بہت کم ہیں۔ لیکن اسلامی حکومت ہونے کے سبب باوجود افلاس زدہ ہونے کے ہر جگہ ممتاز اور با وقار دیکھے جاتے ہیں۔ بظاہر حالات تینوں قومیں شیر و شکر ہیں کوئی تفرقہ آپس میں نہیں پایا جاتا۔ اور جب سے ترکی پارلیمنٹ قائم ہوئی ہے غیر مسلم لوگ مسلمانوں سے زیادہ وابستہ ہو گئے ہیں۔ خصوصاً یہودی اتحاد و میل جول میں بہت جھک رہے ہیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت سب یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان کچھ نوکری پیشہ اور کچھ زمیندار ہیں۔ عیسائیوں میں زیادہ تعداد پادریوں کی ہے جو حجاج کی نذر نیاز پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ تھوڑے سے زمیندار بھی ہیں۔ لیکن یہودی زمینداری میں بھی عیسائیوں سے فائق ہیں۔ تمدن و حسن معاشرت میں پادری، یہودی، اور غریب مسلمان سب سے پیچھے ہیں۔ نئی روشنی کے عیسائی، چند لا مذہب یہودی، دولتمند مسلمان صفائی و ستھرائی کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

بیت المقدس کے اکثر بڑے گرجاؤں کے پادری شکل و صورت میں سب سے اعلیٰ مگر تمدن میں سب سے ادنیٰ ہیں۔ ہندو جوگیوں کی طرح لمبے لمبے بال رکھتے ہیں اور ان کو اچھی طرح صاف نہیں کرتے۔ گرجاؤں میں بھی صفائی کا معقول انتظام نہیں۔ دن کے وقت چراغ روشن رہتے ہیں۔ اس پر تاریکی کا یہ عالم رہتا ہے کہ اندر کی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں۔ یہاں آجتک برقی روشنی کا رواج نہیں ہوا کیونکہ یہ پادری نئے زمانہ کی کسی چیز کو ہاتھ لگانا گناہِ عظیم سمجھتے ہیں۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت کو جہلا کے ہاتھوں محرم اور بقرعید پر سخت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ہمیشہ کہیں نہ کہیں فساد ہوتا رہتا ہے۔ اس سے پانچ حصہ زیادہ ترکوں کو جاہل عیسائیوں کے ہاتھوں تکلیف ہے۔ انکے مختلف العقائد فرقے آپس میں کٹ مرنا ثواب جانتے ہیں اس واسطے حکومت کو ہر بڑے گرجے میں ایک مضبوط فوجی گارد رکھنا پڑتا ہے۔ ایک وقت میں دو فرقے کے آدمی گرجا میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ایک ہندوستانی کے لئے یہ نظارہ سب سے عجیب ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ملک میں سب سے زیادہ شائستہ عیسائیوں کو پاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دنیا میں عیسائیوں کے سوا کوئی قوم مہذب اور سنجیدہ نہیں۔ مگر بیت المقدس میں آنکر یہ خیال بدلنا پڑتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی عیسائی دنیا میں بے شمار آدمی ہندوستان کے احمق گنواروں سے زیادہ گئی گزری حالت میں ہیں۔

بیت المقدس میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی بکثرت زیارت گاہیں ہیں یہودی صرف ایک دیوار کو سب سے زیادہ مقدس سمجھتے ہیں یہ دیوار مسلمانوں کی مسجد اقصےٰ کی ہے۔ یہودی مسجد اقصےٰ کے اندر نہیں آتے کیونکہ اُنکے خیال کے موافق توراۃ وہاں دفن ہے۔ اندر آئیں گے تو وہ پامال ہوگی۔ مسجد کی دیوار کو چمٹ چمٹ کر بے اختیار روتے ہیں۔ یہ نظارہ بڑا موثر ہوتا ہے ناظرین تصویر کو دیکھیں یقیناً وہ بھی متاثر ہوں گے۔ بوڑھے جوان بچے عورتیں دیوار کو لپٹے ہوئے ہیں اور رو رہے ہیں۔ کچھ لوگ تپائیوں پر بیٹھے دعائیں پڑھ رہے ہیں۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی زیارت گاہ مسجد اقصےٰ ہے۔ اس کا نہایت وسیع حلقہ ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں شاندار عمارتیں تھیں۔ اب صرف دو عمارتیں باقی ہیں۔ ایک طرف صخرہ کا گنبد ہے۔

صخرہ ایک پتھر ہے جو حضرت سلیمان علیہ السّلام کے زمانہ سے یہاں رکھا ہے۔ پانچ چھ گز مربع ہوگا۔ اسی کے قریب اس کا دَل ہے۔ کہتے ہیں پہلے یہ بالکل معلق تھا۔ لوگ اس کے سامنے قربانیاں کرتے تھے جو قربانی قبول ہوتی اس کو آسمانی آگ آکر جلا ڈالتی تھی۔ مسلمانوں کے عہد میں عبدالملک بن مروان نے اس پتھر کے گرد میں دیوار بنا دی اور دونوں طرف سہارا لگا دیا۔ اب یہ پتھر بالکل معلق نہیں ہے۔ سہارے پر کھڑا ہے۔ تاہم ایک رخ سے معلق معلوم ہوتا ہے۔ لوگ اس کے نیچے جاکر نماز پڑھتے ہیں۔ اس پتھر کے اوپر بہت خوبصورت اور شاندار گنبد ہے رنگ برنگ کے پتھروں کی جالیاں دھوپ کی شعاعوں میں جگمگاتی ہیں تو عجب بہار ہوتی ہے۔ باہر کے رُخ چینی کا نہایت باریک اور نظر فریب کام ہے۔ اہل یورپ اس قبہ کو غلطی سے مسجد عمرؓ کہتے ہیں حالانکہ یہ محض قبۃ الصخرا ہے۔ اس قبہ کے سامنے حضرت عمرؓ کا ممبر ہے جو فتح کی یادگار میں بنایا گیا ہے۔ میدان کے دوسرے رخ پر سلطان صلاح الدین ایوبی کی بنائی ہوئی مسجد ہے۔ آجکل نماز اسی میں ہوتی ہے یہ بہت وسیع اور گنجائش دار جگہ ہے۔ مختلف کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً کئی بادشاہوں نے اسکی تعمیر میں حصّہ لیا ہے۔ اس مسجد کے پہلو میں حضرت عمرؓ کی وہ مسجد ہے جو فتح بیت المقدس کے وقت بنائی گئی تھی۔ یہ چونہ کی معمولی عمارت ہے۔ کسی قسم کی صنعت اس میں نہیں ہے۔ مسجد حضرت عمر کے نیچے حضرت سلیمان علیہ السلام کا اصطبل اور پُرانی مسجد کی عمارت ہے جو تہ خانہ کے طور پر بالکل مخفی ہوگئی ہے اندر جاکر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی مستحکم عمارت ہے۔

بیت المقدس میں عیسائیوں کا سب سے بڑا مقام زیارت حضرت مسیح کا صلیب خانہ ہے جہاں اُنکے عقیدہ کے موافق حضرت مسیح صلیب دیئے گئے۔ یہاں حضرت کا مزار بھی ہے جہاں سے ۳ دن کے بعد حضرت آسمان پر اُٹھالئے گئے۔

اسکے علاوہ متعدد مقامات بنے ہوئے ہیں جہاں حضرت کو یہودیوں نے قید رکھا اور عذاب دیا۔ عیسائی حاجی ان کل مقامات کی نہایت عقیدت سے زیارت کرتے ہیں۔

حضرت مریم کا مزار بھی عیسائیوں کے قبضہ میں ہے اور انکی نیز مسلمانوں کی شہرۂ آفاق زیارت گاہ ہے بیت المقدس سے ۶ میل کے فاصلہ پر بیت اللحم واقع ہے جہاں حضرت مسیح پیدا ہوئے۔ یہ جگہ بھی نہایت برگزیدہ مانی جاتی ہے مسلمان وعیسائی دونوں اسکی زیارت کو جاتے ہیں۔

قدس سے ۲۲ میل کے فاصلہ پر قصبہ خلیل الرحمٰن میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ حضرت یعقوبؑ حضرت اسحٰقؑ حضرت یوسفؑ جیسے نامور پیغمبروں کے مزارات ہیں۔ اسیطرح دوسری طرف ۲۲ میل کے فصل پر پہاڑ میں حضرت موسیٰ کا مزار ہے یہاں مسلمان عیسائی یہودی تینوں فرقے جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کا سالانہ عرس بہت دھوم سے ہوتا ہے۔ سب قوموں کے اتحاد وشرکت سے اس کی شان دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ تصویر میں متفقہ جلوس کی کیفیت سے ناظرین کو تھوڑا بہت اندازہ ہوگا کہ کس کرّوفر کا عرس ہوتا ہے۔

حضرت مسیح کا صلیب خانہ مسلمانوں کے تحت میں ہے یعنی اس گرجا کی کنجی مسلمانوں کے پاس ہے۔ صبح کے وقت شیخ آتا ہے اور گرجا کھول کر دروازہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ زائرین علی العموم تک نہایت آزادی سے جاتے آتے رہتے ہیں۔ رات کو شیخ گرجا بند کردیتا ہے پھر کسی کو داخلہ کا حق نہیں رہتا۔ یہ صرف اسی گرجا میں ہے باقی مقامات پر ہر جگہ عیسائی آزاد ہیں۔ سلطان

صلاح الدین ایوبی کے وقت سے برضامندی اقوام یورپ مسلمانوں کو اس گرجا کی کنجی دی گئی ہے۔ کیونکہ عیسائی قوموں کی باہمی رقابت کے سبب کسی صورت انتظام ممکن نہ تھا۔ اس واسطے ایک غیر شخص اسکا محافظ قرار پایا۔

بیت المقدس میں ایک خاص بات یہ دیکھی گئی کہ قدرتاً وہاں آدمی کے دماغ میں بلند تخیلات پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے وہاں کے تخیلات کو قلبند کر لیا تھا آج یہاں دیکھتا ہوں تو انکو اپنی سمجھ و بساط سے زیادہ پاتا ہوں۔ آثار قدیم کے قطع نظر آثار جدید میں دو چیزیں مجھکو بہت پسند آئیں جنکی تصویریں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک امریکن سوسائٹی، دوسرے شیخ محمد الصالح آفندی کا مدرسہ روضۃ المعارف۔ امریکن سوسائٹی عجیب و غریب جماعت ہے۔ اس میں ہر ملک کے عیسائی شریک ہو سکتے ہیں۔ عورت مرد بچے بوڑھے کی قید نہیں۔ اس جماعت کے مخصوص اوصاف یہ ہیں۔ مسیح کو خدا یا شریک خدا نہیں مانتے۔ دین کو دنیا پر مقدم سمجھتے ہیں۔ صبح شام کی نماز ایک جگہ جمع ہو کر پڑھتے ہیں اور کبھی ناغہ نہیں کرتے۔ شراب سگرٹ اور ہر نشہ کی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ ایک سن رسیدہ عورت اس سوسائٹی کی سرپرست ہے۔ ممبر جو کچھ کماتے ہیں سرپرست کے ہاتھ میں دیتے ہیں اور وہ اپنے اختیار سے سب کے کھانے کپڑے اور تمام ضروریات کا تدارک کرتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہزار روپیہ ماہوار کمانے والا اور پانچ روپیہ حاصل کرنے والا مساوی اور برابر کا حصہ پاتا ہے اور پھر آنکھ پر میل نہیں لاتا کہ میں نے اتنا کمایا مجھکو کچھ امتیاز ہونا چاہئے۔ ہر شخص خوش و خرم اور ایک دوسرے کا سگا بھائی ہے۔ سب ممبر ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ بال بچے بھی سبکے ساتھ ہیں۔ غرض ایک عجیب عملی سوسائٹی ہے جسکی کیفیت عقل اور زمانہ کے متغیر مشاہدہ سے بعید ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ایک شکل مساویانہ برتاؤ کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ شیخ محمد الصالح آفندی کا مدرسہ بھی عجیب ہے۔ ملک کے مقررہ نصاب تعلیم سے اسکا نصاب جدا ہے جسکو مدرسہ کے بانی محمد الصالح نے خود بنایا ہے۔ طریقہ تعلیم زود اثر اور کارآمد ہے۔ وقت کم خرچ ہو اور کام بہت ہو جائے یہ بات میں نے اس میں دیکھی۔ اس علاقہ میں محمد الصالح ہندوستانی سرسیدؔ کا سا کام کر رہا ہے۔ جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ لوگ اس کے بھی مخالف ہیں۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ مدرسہ روضۃ المعارف کی پوری حقیقت بیان کی جائے سفرنامہ میں مشرح لکھا گیا ہے جو دو چار ماہ کے بعد شائع ہوگا۔ سفرنامہ کے لئے تصاویر کا معقول ذخیرہ ساتھ آیا ہے۔ ان تصویروں میں سے چند ادیبؔ کی پیشگی نذر ہیں۔ جنکے دیکھنے سے ناظرین کو باقی تصاویر مصر شام و حجاز وغیرہ کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

تشریح تصاویر

(۱) مسجد اقصےٰ کے اندر وہ نقب جس کے تذکرے دنیا کے سب اخباروں میں چھپ چکے ہیں کہ چند یورپین لوگوں نے قدیمی تبرکات مثلاً تاج سلیمان و الواح توراۃ و عصائے موسیٰ چرانے کے ارادہ سے مسجد میں مخفی طور پر یہ نقب لگائی تھی مگر اصل مقصود تک نقب نہ پہنچنے پائی کہ خلقت کو خبر ہوگئی اور چور ناکام بھاگ گئے۔ میں نے خاص کوشش سے اس کے اندر داخل ہونے کی اجازت حاصل کی اور گورنر نے تمام اعیان و مشائخ کو جمع کر کے سبکی موجودگی میں مجھکو اندر بھیجا اور میں نے معلوم کیا کہ واقعی نقب ادھوری ہے اور اس حجرے تک نہیں پہنچی جہاں کے متعلق خیال ہے کہ وہاں تبرکات رکھے ہیں۔ نقب سے باہر آیا تو گورنر نے میرا فوٹو نقب کے دہانہ پر کھڑا کر کے کھچوایا سوراخ نقب کے ایک جانب جو دست بے آفندی



جناب خواجہ حسن نظامی صاحب و دیگر اعیان و مشائخ بیت المقدس
(مسجد اقصیٰ کے دہانۂ نقب پر)

گورنر بیت المقدس ہیں، اور دوسری طرف میری تصویر ہے۔ میرے برابر شیخ عبد القادر آفندی شیخ ہندی تکیہ ہیں انکے برابر شیخ ابراہیم حسن انصاری ہیں جو حرم بیت المقدس کے ممتاز شخص ہیں۔

گورنر کے پیچھے شیخ ابراہیم عبد القادر آفندی ہیں انکا رتبہ بھی مشائخ حرم میں اول شیخ کے مثل ہے۔ چند ہندوستانی حضرات بھی اسمیں تھے مگر انکی صورتیں صاف نہیں معلوم ہوتیں۔

(۴) مسجد حضرت سلیمان کے اندر حضرت مسیح کی پرورش کا ایک خاص مقام بنا ہوا ہے جہاں غیبی میوے حضرت مسیح کے پاس دیکھے جاتے تھے۔ نہایت ممتاز اور مقدس جگہ ہے۔ اسکے سامنے بھی تصویر لی گئی تھی چونکہ یہ ایک شاندار تاریخی جگہ ہے اور یہاں جماعت بھی صاف نظر آتی ہے اس لئے امید ہے کہ ناظرین اس منظر کو پسند کریں گے۔ میری پشت پر حاجی عبد الکریم سلیمان تاجر بمبئی کا چہرہ نظر آتا ہے۔

باقی تصاویر کی کیفیت ہر تصویر کے ساتھ درج ہے۔

حسن نظامی

(دبیر حلقۂ نظام المشائخ)

فلسفۂ سیاست (۳)

حکومت نامی ہے | آدمیوں کی جماعت (قبضۂ ملک، عصبیت اور حاکم و محکوم میں تفریق ہونے کے علاوہ ہر ایک حکومت میں، بڑھنے اور ترقی کرنے کی قابلیت ہوتی ہے یا یہ کہنا چاہئے کہ حکومت مثل دیگر اجسام کے نامی ہے۔ وہ پیدا ہوتی ہے، ترقی کرتی ہے اور ایک حد تک پہنچ کر یا بعض اسباب یا امراض کے جمع ہونے کی حالت میں مثل دیگر اجسام کے فنا ہوجانے کی خاصیت رکھتی ہے۔

حکومت مشین نہیں ہے | عام طور پر لوگ حکومت کو مشین یا کل سے تعبیر کیا کرتے ہیں لیکن یہ استعارہ سراسر غلط ہے۔ مشین خواہ کتنی ہی عمدہ اور مفید کیوں نہو اُس میں خود بخود، بلا خارجی امداد اور تغذیہ کے، کام کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اگر خارجی ذرائع سے چلانے کی قوت جسے موٹو پاور (Motive Power) کہتے ہیں نہ پہنچے، یا بالفاظ دیگر کسی دخانی انجن کو کوئلہ پانی یا برقی مشین کو برقی قوت، باہر سے نہ ملے، یا مشین کے پرزوں میں کافی روغن نہ لگایا جائے تو مشین بیکار ہو جاتی ہے۔ مشین خارجی قوت اور امداد کی تابع ہے، نہ اسمیں احساس کا مادّہ ہے کہ دھوپ اور گرمی کا خیال کرے، یا کسی پرزہ کو کوئی صدمہ پہنچے تو کل مشین انتقام لینے یا اسکی مدد کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ برخلاف اس کے حکومت مثل جسم انسان یا نباتات کے قوت نمو رکھتی اور کسی طرح پر ایک بے حس شے اور بے جان اور مردہ مشین نہیں کہلائی جاسکتی۔

خوبصورت تصویر کاغذ پر رنگ سے بنائی جاتی ہے لیکن صرف کاغذ اور مختلف قسم کے رنگوں کو ایک جگہ رکھدینے کا نام تصویر نہیں ہے، اس کے لئے نقاش یا مصوّر کی قوت متخیّلہ درکار ہے سنگ مرمر کے کسی خوبصورت بت کو دیکھو، محض مرمر کے ذرّوں کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ انسانی جسم علاوہ گوشت و استخوان کے کچھ اور بھی خصوصیات رکھتا ہے جسکی وجہ سے اسے دیگر جمادات پر

تفوق حاصل ہے، اسیطرح حکومت صرف چند آدمیوں اور قوانین کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک حسّی نظام ہے جسے اپنی قوت، عزّت اور وقعت کا احساس اسی طرح ہوتا ہے جسطرح ایک سمجھدار اور ذی روح انسان کو۔

حکومت اور فطرت ہم ایشیا والوں کے لئے جو ہر چیز کو قسمت اور قدرت پر محمول کرتے ہیں، شاید یہ بیان تعجب خیز معلوم ہوگا کہ حکومت آفرینشِ فطرت میں شمار نہیں کی جاسکتی بلکہ محض انسان کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اُن لوگوں کی دلجوئی کے لئے جو ہر چیز کو جبر و اختیار کی عینک سے دیکھتے ہیں اور قضا و قدر کی کاریگری ہر بات میں دیکھنا جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ حکومت سیاسی جد و جہد کا نتیجہ ہے اور انسانی زندگی میں اِس جد و جہد کا مادّہ فطرتاً پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے حکومت فطرتی کہلائی جاسکتی ہے۔ لیکن اس سیاسی رجحان کا عمل بالکل انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔

حکومت کس لحاظ سے نامی ہے؟ حکومت کو نامی کہنے سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مثل نباتات اور حیوانات کے اپنے لئے تغذیہ مہیا کرنے اور مادّی اشیاء کے پیدا کرنے کی قوت رکھتی ہے بلکہ ہم مندرجۂ ذیل خصوصیات پر نظر ڈالتے ہیں:۔

(۱) ہر نامی شے بڑھنے گھٹنے اور ترقی و تنزل کرنے کی خصوصیت رکھتی ہے اور دو چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے، جسم و روح، یعنی مادّی اور روحانی قوتوں کا۔

(ب) اگرچہ مجموعۂ جسم نامی ایک واحد شے کہلاتا ہے مگر اس کے مختلف حصص ہوتے ہیں، جو فرداً فرداً خاص احساس اور قابلیت اور قوت رکھتے ہیں تاکہ سب ملکر کل جسم کی مختلف ضروریات پوری کرسکیں۔

(ج) جسم نامی اندرونی قوتوں کے باعث پھیلتا اور ترقی کرتا ہے۔ یہ سب خصوصیات ہر حکومت میں بیّن طور پر پائی جاتی ہیں، اور اسی وجہ سے ہم حکومت کو نامی کہتے ہیں مثلاً

(۱) حکومت جسم و روح رکھتی ہے حکومت کا جسم و روح، ارادہ اور اعضائے متحرک ملکر ایک زندہ نظام متصور ہوتا ہے۔ قومی روح جو ہر فرد قوم کی روح سے کسیقدر مختلف ہے حکومت کی روح ہوتی ہے۔ قومی ارادہ جو افراد قوم کے ارادہ سے مختلف ہوتا ہے حکومت کی مرضی اور ارادہ ہے، نظام حکومت اور اس کی متعدد شاخیں جنکے ذریعے سے حکومت کی مرضی قانون کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، صوبجات اور اضلاع کے حاکم۔ پولیس جسکے ذریعہ سے حکومت کی مرضی کی تعمیل کرائی جاتی ہے، عدالتوں کے مجسٹریٹ اور منصف و دیگر عہدہ دار جو نظم و نسق میں مدد دیتے ہیں، عدالتیں جہاں انصاف ہوتا ہے، مجالس جو افراد قوم کو علمی اور روحانی غذا پہنچاتی ہیں، اور فوج جو حکومت کی قوت اور طاقت کو ظاہر کرتی ہے؛ یہ سب ملکر حکومت کا جسم ہیں اور انہیں کے ذریعے سے حکومت اپنی زندگی کا اظہار کرتی ہے جسطرح ہم ایک انسان کو دوسرے سے بہ لحاظ شکل و شمائل اور روحانی قابلیتوں کے مختلف پاتے ہیں، اسی طرح حکومتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ بنی نوع انسان کی ترقی منحصر ہے اس بات پر کہ مختلف حکومتیں اور افراد آپس میں شب و روز مقابلہ اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جد و جہد میں سرگرم رہیں۔

(ب) حکومت کے اعضا اور اُن کا کام حکومت مجموعہ ہے مختلف پولیٹیکل شعبوں کا۔ ہر ایک عہدہ اور پولیٹیکل جماعت بہ منزلہ عضو کے ہے جو کوئی نہ کوئی ضروری خدمت انجام دیتا ہے۔ لیکن حکومت کے اعضا کسی مشین کے پُرزوں کی طرح نہ سمجھنا چاہئے جو معینہ رفتار اور مقررہ طریقہ پر خارجی قوت کی مدد سے بلاکسی قسم کے احساس کے اپنا کام کئے چلے جاتے ہیں؛ برخلاف اس کے حکومت کے

اعضاء روحانی خصوصیات رکھتے ہیں اور بلحاظ زندگی اور ضرورت زمانہ کے لحاظ سے اُن کے نظام اور عمل میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ وہ خود زندہ رہتے اور دوسرے اجزاء حکومت کو زندہ رکھتے ہیں۔ جب حکومت کا کوئی شعبہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مثل مشین کے پُرزوں کے بے جان ہو جاتا ہے' یا محض ضابطہ اور ظاہر داری کے تنگ دائرہ میں محدود ہو جاتا ہے تو صرف یہی نہیں کہ وہ شعبہ تباہ و بیکار ہو جاتا ہو' بلکہ اسی کے ساتھ وہ کل حکومت کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ جہاں حکومت کے شعبوں اور عہدوں میں سے روح اور زندگی مفقود ہوئی حکومت بھی بے جان اور مُردہ ہو جاتی ہے۔

عہدہ اور عہدہ داروں میں روحانی اثر۔ نہ صرف عہدہ دار و عُمّال حکومت کی روح سے متاثر ہوتے ہیں بلکہ ہر ایک اعلیٰ عہدہ بطور خود ایک زندگی اور روح رکھتا ہے اور مثل دیگر نامی اجسام کے اس میں بھی قوتِ احساس ہوتی ہے۔ ہر عہدہ بیّن طور پر روحانی صفات اور خصوصیات رکھتا ہے اور جو شخص اس عہدہ پر مقرر ہوتا ہے اُن اثرات سے لامحالہ متاثر ہوتا ہے۔ کسی ملک کے وزراء پر خیال کرو ان جیسی قابلیت کے بکثرت آدمی ملک میں موجود ہوتے ہیں اور بلکہ باعتبار چال چلن اور دماغی قوت کے اُن سے کہیں بڑھے چڑھے لوگ ملیں گے' لیکن اعلیٰ عہدہ پر پہنچتے ہی اُن معمولی قابلیت کے آدمیوں میں اپنے علو مرتبت کا خاص احساس اور عہدہ کی ذمہ داریوں کا خیال اسقدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اپنی حالت میں بہ نسبت سابق کے بہت فرق پاتے ہیں۔ ہم اپنے ملک میں دیکھتے ہیں کہ جب کوئی کمزور اور ناتواں اور محض معمولی قابلیت کا آدمی بھی کسی عہدہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس عہدہ کی خصوصیات اور ذمہ داریاں اُسکی دماغی قوت اور انصاف پسندی کی عادت کو بڑھا دیتی ہیں اور اس کے اخلاق اور عادات میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کسی عہدہ کی روحانی خصوصیات عہدہ دار کی جبلّت کو نہیں بدل سکتی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ عہدہ پر پہنچنے سے انسان کے عادات اور چال چلن پر نہایت عمدہ اخلاقی اثر پڑتا ہے۔ کم از کم اس کو یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اپنے افعال اور عادات سے عہدہ کی بلند پایگی اور وقار میں کمی نہ ہونے دے۔ جو لوگ فطرتاً سلیم الطبع واقع ہوئے ہیں ان کے دل و دماغ پر یہ اثرات گہرا نقش چھوڑتے ہیں اور سونے میں سہاگہ کا کام دیتے ہیں اور اخلاقی اور روحانی قابلیت کے لحاظ سے وہ بڑی ترقی کرتے ہیں۔ کم از کم ہر ایک عہدہ دار خواہ کیسا ہی کوڑہ مغز کیوں نہ ہو یہ ضرور سمجھتا ہے کہ اس کا عہدہ خاص عزّت و وقعت رکھتا ہے۔

ج۔ حکومت ترقی پذیر ہے تمام قوموں اور حکومتوں میں ترقی کرنے اور بڑھنے کا مادّہ موجود ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی اور قوت کی ترقی کا حساب سالوں سے کیا جاتا ہے لیکن کسی قوم اور حکومت کی ترقی کا معیار قرنوں اور صدیوں سے کرنا پڑتا ہے اور جس طرح انسان اپنی عمر کے مختلف مدارج پر جسمانی اور روحانی ترقی کا اظہار کرتا ہے اسی طرح قومیں اور حکومتیں بھی ترقی کرتی اور بتدریج بڑھتی ہیں۔ یعنی مثل انسان کے قوموں اور حکومتوں کے لئے بھی طفولیت' شباب' اور کہولت وغیرہ خیال کیا جاتا ہے۔ جسطرح حکیم کسی مرض کا علاج کرتے یا کسی کمزور و ناتواں مریض کے لئے غذا تجویز کرتے وقت اُسکی عمر اور موسم کا لحاظ کرتا ہے اسیطرح مدبروں اور قومی ریفارمروں کو اپنی قوم اور ملک کی عمر' زمانہ کی روش وغیرہ سب باتوں پر لحاظ کرنا لازم آتا ہے۔

حالت نمو میں فرق نامی اجسام کے ساتھ اسقدر مشابہت ہونے کے باوجود حکومت اور نامی اجسام میں فرق ہے۔ انسانی' حیوانی' اور

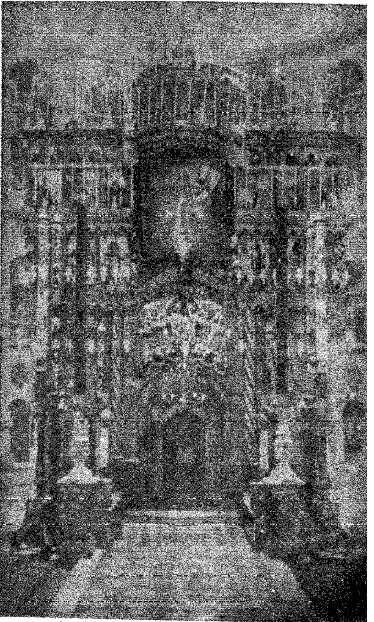
نباتی زندگی مقررہ اوقات کے ساتھ گھٹتی بڑھتی اور ترقی کرتی ہے لیکن حکومتوں اور سیاسی جماعتوں کی ترقی اور تنزل اس قدر باقاعدہ نہیں ہوتا۔ قوم کے افراد کے اعمال اور بیرونی واقعات کے اثر سے حکومت میں بہت جلد تغیر پیدا ہوجاتا ہے اور اسکی بقا حیات اور ممات پر بہت کچھ اثر پڑتا ہے۔ مثلاً ہندوستان میں صرف اکیلے سرسید احمد خاں رفعتہٗ نے اپنی قوم کے انحطاط اور تنزل کی رَو کو نہ صرف روک دیا بلکہ ترقی کیجانب جادہ پیمائی کرنے کی تدابیر پیدا کردیں: یا پرنس بسمارک نے جرمن قوم کی اتحاد و ترقی کو برانگیختہ کردیا؛ یا کمانڈور پیری[1] کے چار جہازوں نے تمام جاپان کو خواب غفلت سے بیدار کردیا۔ بعض اوقات افراد قوم کی بداطواری یا تمام قوم کے مذموم خیالات اور رسم ورواج کی بدولت حکومت تباہ و برباد ہوجاتی ہے جس کی صدہا مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں اور کسی توضیح کی محتاج نہیں۔ اس بحث سے ظاہر ہے کہ حکومتیں صرف نمو ہی نہیں رکھتیں بلکہ افراد قوم کے ذاتی اعمال اور رسم ورواج بھی اس کے عروج و زوال پر معتدبہ اثر ڈالتے ہیں۔

حکومت اخلاقی نظام ہے | تاریخ سے حکومت کا نامی ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی قوت نمو نباتات اور حیوانات کی نمو سے مختلف ہے اور بہ نسبت اُن کے اس کا نظام اعلیٰ قسم کا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ برخلاف نباتات اور حیوانات کے حکومت اخلاقی اور روحانی صفات رکھتی ہے اور ایک ایسا پُرشوکت نظام ہے جسمیں افراد قوم کے محسوسات اور خیالات کو جذب کرکے انھیں قانون کی شکل میں ظاہر کرنے اور قومی مرضی کو عملی صورت عطا کرنے کی قابلیت پائی جاتی ہے۔ جسطرح مختلف آدمیوں کے اخلاقی صفات میں فرق ہوتا ہے اسی طرح مختلف حکومتیں جداجدا اخلاقی خصوصیات سے متصف ہوتی ہیں۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حکومت میں علاوہ جسم و جان ہونیکے اپنی ذاتی مرضی اور ارادہ بھی ہوتا ہے۔

حکومت کی شوکت و رفعت نے ہمیشہ اپنے افراد قوم کے دلوں اور ہمتوں کو بڑھایا ہے اور انہیں ملک اور قوم کی خدمت میں ایثار نفسی اور جاں فروشی پر آمادہ کیا ہے۔ حکومت کی آزادی، خودمختاری اور حقوق کے حاصل کرنے کی غرض سے قوم کے اعیان و انصار نے اپنا مال و جان قربان کرنے میں ہمیشہ پیشقدمی کی ہے۔ اپنی حکومت کی شہرت اور قوت وجبروت کو وسعت دینے اور افراد قوم کو خوشحال اور فارغ البال بنانے کو فدایان قوم نے اپنے اعلیٰ اور اہم ترین فرائض میں سے سمجھا ہے۔ حکومت کے رنج و راحت میں تمام اہل قوم شریک ہوتے ہیں۔ اگر حکومتوں میں یہ بیش بہا اخلاقی قوت اور شخصیت مفقود ہوتی تو حب وطنی اور وطن پرستی کا احساس

[1] کمانڈور پیری ایک امریکن افسر تھا جس نے ۱۸۵۳ء میں اپنے تجارتی جہازوں کو جاپان کے کنارے لگایا۔ جاپانی بڑی مغرور قوم ہیں اور وہ ہمیشہ سے اپنے چھوٹے سے جزیرہ کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھتے آئے ہیں۔ ۱۸۵۳ء سے پہلے وہ اجنبیوں کو اپنے ملک میں نہیں آنے دیتے تھے۔ اپنے جزیرہ کے بندگاہوں میں پیتل کی توپیں رکھتے تھے جب کوئی اجنبی جہاز کنارہ کے قریب آتا ان توپوں سے پتھر کے گولے برساتے تھے۔ کمانڈور پیری چار جہاز لیکر جاپان پہنچا اور حسب دستور جاپانی عمال نے امریکن سوداگروں کو خشکی پر اُترنے سے روکا لیکن پیری نے چند گولے جہاز کی نوایجاد توپوں سے کنارہ پر برسائے اور ملک بربادکرنے کی دھمکی دی۔ یہ دیکھکر جاپانیوں کی آنکھیں کھلیں، اُن کو اپنی کمزوری، بےبسی اور اجنبیوں کی قوت کا اندازہ ہوا۔ وہ سمجھے کہ دنیا بہت ترقی کرگئی اور وہ اس خواب خرگوش میں رہے کہ ہم سے بڑھکر کوئی نہیں۔ کمانڈور پیری سے چار وناچار معاہدہ کیا۔ اس واقعہ سے تمام قوم کو اسقدر غیرت آئی کہ سب نے متفق ہوکر اصلاح کی جانب توجہ کی۔ ہزارہا برس سے وزیر کے خاندان میں شاہی قوت چلی آتی تھی جوقت اکابر قوم نے یہ طے کیا کہ ملکی ترقی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک تمام قوت ایک مرکز پر نہ لائی جائے

مسجد حضرت سلیمان کے سامنے کا منظر



حضرت مسیح کا صلیب خانہ و مقبرہ

انڈین پریس الہ آباد

بعید از قیاس ہوتا۔ انگریزی قوم کو دیکھو اس کے افراد اپنے ملک کے اقتدار اور عزّت کو بڑھانے میں کس درجہ انہماک اور ایثار نفسی کا اظہار کرتے ہیں۔ مسٹر سیسل روڈس آنجہانی کا جسنے جنوبی افریقہ میں انگریزی سلطنت کو مستحکم کیا، قول تھا کہ ہر ایک انگریز کا مذہب یہ ہونا چاہیئے کہ انگلستان کے مقبوضات کو وسعت دے تاکہ دنیا میں انگریزی اثر اور تہذیب کو قوت حاصل ہو۔

اس وقت تمام دنیا کی قومیں اپنے ملک اور حکومت کی ترقی اور بہبودی کے لئے شب و روز تگ و دو میں مصروف ہیں۔ جب تک حکومت کی شخصیت اور اخلاقی قوت افراد قوم کے دلوں کو ابھارتی رہتی ہے اور اُنکی ہمتوں کو بڑھاتی رہتی ہے وہ ہر وقت اپنا جان و مال اور ذاتی مفاد کو قومی بہبودی کے لئے قربان کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ جب اس شخصیت میں کمی ہونا شروع ہوتی ہے اور ہر فرد اپنے فتح کی خیر منانے لگتا ہے تو قوم کا انحطاط شروع ہوجاتا ہے۔ بقول ماسیو لبان[۵] "قوم کا تنزل اسی روز سے شروع ہوجاتا ہے جبدن اُس کے پاس کوئی ایسا تخیل نہ رہے جسکی حفاظت کے لئے ہر ایک فرد قوم اپنی جان دینے پر آمادہ ہو"

حکومت کی شخصیت | جس طرح انسان کا اپنی سوسائٹی میں ایک خاص مرتبہ اور روزمرہ کی زندگی میں ایک خاص شخصیت ہوتی ہے اسی طرح حکومت کے لئے اندرون ملک معاشری قوانین جاری کرنے اور دیگر اقوام کے ساتھ معاملہ کرنے کی غرض سے شخصیت کا ہونا ضروری ہے۔ آدمیوں کی طرح بین الاقوامی قوانین کے بموجب حکومت کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کے اثر سے اپنے حقوق کی نگہداشت اور اپنی مرضی کا اظہار کرتی ہے۔ لیکن حکومت کی مرضی کُل افراد قوم کی مرضی کا پر تو ہوتا ہے۔

قومی شخصیت اور مرضی کا احساس اور اظہار صرف انہیں حکومتوں تک محدود ہے جو بلحاظ قوانین و ضوابط تمدن و ترقی کے اعلیٰ رتبہ پر پہنچ گئی ہیں۔ شخصی سلطنتوں میں حکومت کی مرضی اور شخصیت محض بادشاہ ملک کی مرضی ہوتی ہے۔ تمام بیرونی معاملات میں اُسکی ذات پیش نظر رہتی ہے، اُسکی عزت تمام قوم کی عزت اور اُسکی ذلت تمام قوم کی ذلت ہوتی ہے۔

متذکرہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت آدمیوں کا مجموعہ ہے[۶] جو کسی حصہ ملک پر بصورت حاکم و محکوم قابض ہوں اور ایک نامی اور اخلاقی نظام کی شکل میں نظر آتے ہوں۔

ظفر عمر (علیگ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۸) اور بادشاہ کو قید تنہائی سے نکال کر سرگردہ نہ بنایا جائے۔ قومی ہمدردی کی مجالس میں آکر زیر شوگن تمام دنیاوی اقتدار اور قوت کو بخوشی بادشاہ کے قدموں پر نثار کرکے گوشہ نشین ہوگیا۔ بادشاہ بھی قید سے رہائی پاکر ہمہ تن ملکی ترقی کی جانب مصروف ہوا اور تعلیم کو سب سے مقدم سمجھا۔ کچھ دنوں بعد جب قوم تعلیم یافتہ ہوگئی شہنشاہ نے بلاطلب رعایا کو پارلیمنٹ عطا کیا یعنی اپنے حقوق رعایا کو دے دیئے۔ اس اتحاد اور جوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج جاپان تمام دنیا میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور متمدن یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں جاپان کی روش پر فخر کرتی ہیں۔ یہ کایا پلٹ صرف پچاس سال کے قلیل عرصہ میں ہوگئی۔ اسمیں شک نہیں کہ جب خدا کسی قوم کو بنانا چاہتا ہے خود بخود تمام افراد قوم میں ترقی کرنے کا جوش پھیل جاتا ہے۔ جاپان نے جو ناموری حاصل کی وہ اپنی سرگرمی اور محنت کے بدولت کی۔ وہ گمنام جاپانی جنہیں کمانڈر پیری نے پچاس سال ہوے خواب غفلت سے بیدار کیا تھا آج دنیا کو اپنی شجاعت، دانشمندی، صنعت و حرفت سے متحیر کر رہے ہیں۔ (حاشیہ مستقبل اسلام صفحہ ۱۰ و ۱۸۱) [۵] دیکھو تمدن عرب صفحہ ۵۴۳

[۶] حوالہ کے لئے دیکھو "تھوری آف اسٹیٹ" مؤلفہ پروفیسر بلنٹ شلے اور انٹروڈکشن ٹو پولیٹیکل سائنس مؤلفہ پروفیسر شلے۔

تکوین

کی بابت مختلف روایات اور خیالات

(۱)

مقدمہ

تکوین یعنی آفرینش عالم کے بارہ میں ہر زمانہ کے اہل فکر کے دل میں سوال پیدا ہوتا رہا ہے، جیسا تاریخی کوائف کی شہادت سے عیاں ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ یہ سوال شروع میں اُن انسانوں کے دلوں میں بھی متحرک ہوا ہو جو خدا نے پہلے پہل پیدا کئے تھے۔ "دنیا کب پیدا ہوئی اور کس طرح وجود میں آئی تھی؟" یہ سوال بڑا اہم اور زبردست ہے۔ ہر قوم نے اسے حل کرنے کی کوشش کی ہے جیسا اس کے دینی اور غیر دینی لٹریچر سے ظاہر ہے۔ راقم مضمون ہذا کا یہ ارادہ ہے کہ اُن تمام روایات، خیالات، اور مفروضات کو رسالہ ہذا کے ناظرین کے ہدیہ کرے جو قدیم اور جدید متمدن و غیر متمدن وحشی اور غیر مہذب اقوام کے درمیان رائج ہیں۔ میری طرف سے کسی خاص قوم کے خیالات کو افضل اور معقول ٹھہرانے کی کوشش نہیں ہوگی بلکہ صرف واقعات پیش کئے جائیں گے۔ ناظرین جو نتیجہ چاہیں واقعات کی بنا پر اخذ کر سکتے ہیں ہماری یہ غرض بالکل نہیں ہے کہ کسی گروہ کی دل شکنی ہو اور اس کے خیالات دربارہ آفرینش عالم کی تضحیک کی جائے۔ یہ صرف ایک خالص محققانہ اور طالب علمانہ بحث ہے جس سے امید ہے کہ پڑھنے والوں کو خاص عقلی حظ حاصل ہونے کے علاوہ اُنکی معلومات میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

۱۔وحشی قوموں کی روایات

مقدم التاریخ زمانہ کے آدمیونکے خیالات کیا تھے

اس دلچسپ بحث میں سب سے پہلے وحشی قوموں کے خیالات اور روایات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے شاید یہ سوال پوچھا جائے کہ ابتدائی زمانہ کے انسانوں کے خیالات دنیا کی پیدائش کی بابت کیا تھے؟ اس کا کوئی معتبر اور تسلّی بخش جواب ہم نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ قدیم زمانہ کے تحریری حالات دستیاب نہیں ہوسکتے۔ لیکن محققان یورپ زمانۂ حال کی وحشی قوموں کو جو اس وقت افریقہ، آسٹریلیا اور اوشینا کے جزائر میں آباد ہیں، ابتدائی زمانہ کے انسان اور اس کے طرز معاشرت اور تمدن کی نمایندہ اور قائم مقام تصوّر کرتے ہیں۔ اسوجہ سے مذکورۂ بالا استفسار کا جواب انہی وحشی قبائل کی روایات سے تلاش کرنا چاہئے، اور جو کچھ وہاں سے ہاتھ لگے اسے قبول کر لینا چاہئے۔ عالمان اثریات (Archæology) بھی اثری شہادت کی بنا پر ان قوموں کو ابتدائی انسان کا ہم رتبہ

زمانہ حال کے وحشی ابتدائی انسانوں کے ہم رتبہ ہیں

اور ہم تمدن قرار دیتے ہیں۔ لارڈ آوبری (سابق سر جان لبک) تاریخ تمدن[1] کی ابتدا انہی تہذیب نا آشنا گروہوں سے منسوب کرتے ہیں، اور ای۔ بی ٹائلر[2] نے عرصہ دراز کی تحقیق و تدقیق کے بعد لارڈ ممدوح سے اتفاق راے کیا ہے۔ اسنے "ابتدائی تہذیب" اور "بنی آدم کی ابتدائی تاریخ" پر بڑی قابلیت سے بحث کی ہے اور اس مسئلہ زیر غور کو ثابت کیا ہے بعض اقوام نے جنہیں خدا نے خاص برکتیں عطا فرمائی ہیں اپنے تمدن کی شاندار عمارت اسی بنیو پر اٹھائی ہے۔

علاوہ بریں یہ امر بھی مسلمہ ہے اور انتھروپالوجی (Anthropology)

[1] ملاحظہ ہو "ڈان آف سویلی زیشن" (آغاز تمدن) [2] (۱) "پرمٹو کلچر" (ابتدائی تہذیب) (۲) "ارلی ہسٹری آف مین کائنڈ" (بنی آدم کی ابتدائی تاریخ)

کے عالموں نے اسے اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ روایات اور رسوم نسل بعد نسل رائج اور قائم چلے جاتے ہیں۔ جانشین پود اُسے اپنے پیشرو بزرگوں کا مقدس ورثہ سمجھتی ہے۔ اور اسے قائم رکھنے کی خواہشمند رہتی ہے۔ یہ نہ صرف وحشیوں ہی کا خاصہ ہے بلکہ نیم مہذب اور مہذب قوموں میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اپنے ہی ملک کی حالت پر غور کرو۔ کوئی شہر۔ کوئی قصبہ اور کوئی گانوں ایسا نہو گا جہاں برسوں سے کوئی نہ کوئی روایت مروج نہو۔ ان امور کو ملحوظ خاطر رکھکر ترقی یافتہ اور وحشی قوموں کے خیالات اور روایات قدیمہ کا بآسانی پتہ چل سکتا ہے۔

تکوین (Cosmogony) کے بارہ میں جو روایات اور خیالات قدیم الایام سے رواج پذیر ہیں انہیں ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

تکوین کے خیالات کی تقسیم

اوّل ابتدائی خیالات۔ انہیں روایات کہنا بجا ہوگا۔ یہ اس زمانہ سے منسوب ہیں جب تمدن عالم طفولیت میں تھا۔ نوشت و خواند انسان کے خیال سے کوسوں دور تھی اور یہ وہ عہد ہے جسکے صحیح تاریخی حالات سے ہم زمانۂ حال والے ناواقف ہیں جیسا پیچھے مذکور ہوا۔ اس طبقہ میں آج کل کے تمام وحشی قبائل اور تہذیب ناآشنا گروہ شامل ہیں۔ دوم پُرانی مہذب قوموں کے خیالات۔ یہ اس زمانہ سے متعلق ہیں جب کئی قوموں نے تہذیب اور علوم و فنون میں بہت کچھ ترقی کر لی تھی۔ اسے تمدن کے شباب سے پیشتر کا زمانہ سمجھنا چاہیئے۔ اس گروہ میں ہندوستان، بابل، مصر فنشیا، ایران، چین، یونان اور روم شامل ہیں۔ تاریخ تمدن کے اس دور میں وہ تمام صدیاں شامل ہیں جو سن عیسوی کی ابتدا سے پانچ چھ ہزار برس پہلے گذر چکی ہیں۔ سوم جدید خیالات۔ اس میں زمانہ کے علمی اور فلسفی خیالات اور قیاسات ہیں۔ یکے بعد دیگرے ہم ان روایات اور خیالات کو ناظرین کے پیشکش کریں گے۔

اسکیمو لوگ جو کنیڈا کے منتہائے شمال جزیرہ گرین لینڈ اور منطقہ بارده شمالی کے کئی جزائر میں آباد ہیں، تہذیب کی ابتدائی منزل میں ہیں۔ مشہور محقق انتھروپالوجی (علم انواع انسان) انکی بابت یہ لکھتے ہیں۔ "آفرینش عالم کی بابت انکے دلوں میں کوئی خیال نہیں گزرتا ہے۔ شاید یہ کہنا بجا ہو گا کہ اسکیمو لوگوں کے قوائے عقلیہ میں کوئی ترقی نہیں ہوئی ہے۔ وہ بڑے ہی سادہ لوح انتہا درجہ کے نادان اور سخت جاہل ہیں۔ بلکہ ان چھوٹے لڑکوں کی مانند ہیں جنکا خیال لہو و لعب اور کھانے پینے کی چند مزیدار چیزوں کے سوا اور باتوں کی طرف بہت ہی کم رجوع ہوتا ہے۔

طفل طبیعت وحشی قبائل کی حالت

لارڈ آوبری کہتے ہیں کہ جنوبی افریقہ میں ایک وحشی قوم رہتی ہے جسکا نام ابی پون ہے اس کا خیال اجرام فلکی کی جانب کبھی مائل نہیں ہوا۔ اسے معلوم نہیں ہے کہ آسمان پر کیا ہو رہا ہے۔ دنیا کی ابتدا کی بابت اسکا یہ خیال ہے کہ دو عناصر کی ترکیب اور اختلاط سے عالم وجود میں آئی تھی ہر آفرینش سے پیشتر ہر جگہ پانی ہی پانی تھا۔

دنیا کا مبدا پانی ہے

یہ خیال اور بھی کئی ابتدائی اور نیم مہذب قوموں میں رائج تھا۔ کئی وحشی قوموں کا یہ گمان ہے کہ ابتدا میں زمین پانی کے اندر سے برآمد ہوئی تھی جیسے کوئی بڑی مچھلی تہ آب سے اوپر نکل آتی ہو۔ آسٹریلیا کے صوبہ وکٹوریہ کے وحشیوں کا یہ قیاس ہے کہ پند جل دیوتا نے جو پرندوں کا خالق ہے زمین بنائی پھر اپنے چھرے سے اس کا سینہ چاک کرکے وادیاں پیدا کر دیں۔ اسی علاقہ کے ایک اور وحشی قبیلہ کا یہ خیال ہے کہ ابتدائی نسل کے انسانوں نے جو نورانی کہلاتے تھے زمین کو پیدا کیا تھا۔ جنوبی افریقہ کے بش مین (بن مانس) گروہ میں تکوین کے بارہ میں کوئی روایت اور خیال نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی طرف اُنکی عقل کبھی مائل نہیں ہوئی۔ البتہ وہ یہ مانتے ہیں کہ "انسان نے سورج پیدا کیا ہے"

اسی خطّہ کے ایک وحشی سردار نے مشہور سیّاح آرپن سے بات چیت کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ دنیا کی پیدائش کوگن (Cogn) کے وسیلہ سے ہوئی، جو ایک قسم کا کیڑا تھا۔ اس کے حسب الارشاد تمام جاندار معرضِ ہستی میں آئے۔ دوسری روایت کی رو سے اس کیڑے نے اپنی دانائی اور حکمت سے کائنات بنائی تھی۔ اور بہت سے وحشی قبائل ہیں جنکے ہاں جانوروں، پودوں اور درختوں کی ابتدا کی بابت انواع و اقسام کی سیکڑوں روایتیں مشہور ہیں۔ مگر آفرینش عالم کی نسبت کوئی خیال اور کوئی روایت رائج نہیں ہے۔

عالم کا ایک خالق مانا جاتا ہو

کنیڈا میں ایک وحشی قبیلہ آباد ہے جو اراکوئی کے نام سے مشہور رہے۔ اس کے ہاں یہ روایت ہے کہ ابتدا میں ایک عورت آسمان سے نیچے پھینکی گئی جو ایک قمری پر گری اس سے دنیا بن گئی۔ شمالی امریکہ کا ایک اور وحشی گروہ یہ مانتا ہے کہ ابتدا میں سمندر کے درمیان ایک جزیرہ تھا جو رفتہ رفتہ دنیا کی صورت میں منتقل ہوگیا۔ امریکہ کے نزوج اور ڈوگرانڈین وحشی دنیا کی ابتدا کی بابت کوئی خاص خیال نہیں رکھتے ہیں۔ صرف یہ کہتے ہیں یہ شروع سے اسیطرح چلی آتی ہے۔ وَنی باگو وحشی لوگ روایت کرتے ہیں کہ ابتدا میں ایک عظیم ہستی تھی۔ جب وہ پیدا ہوئی تو اپنے کو تنہا پایا۔ اُس نے اپنے بدن کا ایک ٹکڑا کاٹا، اور ایک ٹکڑا زمین کا لیا اور اس سے انسان بنایا۔ اس روایت کے مطابق دنیا کا وجود مقدم ٹھہرتا ہے۔ گواٹیمالا (وسطی امریکہ) کے وحشیوں کا ایک گروہ یہ مانتا ہو کہ ایک الٰہی نسل کے افراد نے زمین بنائی تھی۔ جسکا سامان پیشتر سے موجود تھا۔ اسی سرزمین کا ایک قبیلہ یہ کہتا ہے کہ ایک زبردست ہستی نے زمین بنائی تھی جو ابتدا میں مکڑی کے جالے کی طرح تھی۔ مغربی فرلقیہ کے وحشیوں کا ایک فرقہ بھی اسی روایت کا قائل ہے۔ برٹش کلمبیا (کنیڈا) کے اصلی باشندوں کا ایک گروہ یہ مانتا ہو کہ ابتدا میں پانی تھا جسکے اندر ایک چھچھوندر تھی جب اسے بھوک لگی تو پانی کی تہ میں خوراک کی تلاش میں گئی وہاں کیچڑ کے سوا اور کچھ نہ تھا اپنی تھوتھنی میں اسی کو بھر لائی۔ اسے نکال نکال کر الگ پھینکتی گئی۔ آخر کار وہاں ایک بڑا ڈھیر جمع ہوگیا اور وہ ہوتے ہوتے دنیا کی شکل میں بدل گیا۔ ٹینہ قبیلہ کے وحشی یہ گمان کرتے ہیں کہ شروع میں ایک کتا تھا اسے دیوتاؤں نے مار ڈالا۔ اس کے جسم کے حصّوں سے دنیا کی مختلف چیزیں پیدا ہوگئیں۔

نیوزی لینڈ کے باشندے وحشیوں سے بہتر ہیں

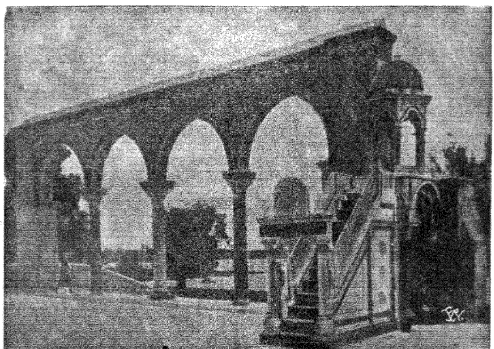
جن اقوام نے تہذیب کی شاہراہ پر قدم آگے کو بڑھانے کی کوشش کی ہے اور وحشت وجہالت کی حد سے کچھ آگے نکل گئی ہیں ان میں نیوزی لینڈ کے لوگ ہیں۔ انکے یہاں پُرانے بھجن ہیں جن سے یہ ظاہر ہے کہ دنیا کے عالم ظہور میں آنے سے پیشتر ہر جگہ تاریکی محیط تھی۔ عالم نیستی سے ہست ہوا۔ موجودات ایک عجیب وغریب طریقے سے پیدا کی گئیں۔ عالموں کا اسکی بابت یہ خیال ہے کہ ہندو اور بودھ خیالات کی رنگت اہل نیوزی لینڈ کے عقائد پر چڑھ گئی ہو۔ میوری لوگوں میں یہ روایت ہے کہ رانگی اور پاپا یعنی زمین و آسمان دو لامحدود ہستیاں ہیں اور وہ دونوں نَر و مادہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ شروع میں ہم آغوش تھیں۔ مگر انکی اولاد نے انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کو مجبور کیا۔ دیوتاؤں کے باب میں اُنکا یہ خیال ہو کہ دیوتا اپنی فطرت میں کچھ حیوانی عنصر بھی رکھتے ہیں۔ انسان جتنی بدیاں کرتا ہے ان کے وہ ذمہ دار یہی نہیں بلکہ تمام خطاکاریاں اُنکی تحریک سے سرزد ہوتی ہیں۔

بحیرۂ جنوبی (پالینیشیا) کے جزائر کے وحشیوں کا یہ قیاس ہے کہ ابتدا میں زمین و آسمان ایک دوسرے سے متحد تھے۔ مگر بعد ازاں جدا جدا ہوگئے۔

ٹائلر صاحب نے جاپانیوں کی ایک پُرانی روایت کا ایک دفعہ









(۱) مسجدالاقصیٰ بنا کردہ سلطان صلاح الدین ایوبی کا بیرونی نظارہ اور پرانا درخت زیتون جس سے آنحضرت صلعم معراج کی رات سہارا لگا کر کھڑے ہوئے (۲) موجودہ مسجد اقصیٰ کا اندرونی حصہ (۳) حضرت عمر کا ممبر – فتح بیت المقدس کی مشہور تاریخی یادگار (۴) معلق پتھر کی اصلی صورت–خاص قبلہ کے اندر کی تصویر

"جرنل آف انتھروپالوجی" میں ذکر کیا تھا جس کا لب لباب یہ ہے کہ جب زمین کیچ کی طرح لچلچی اور نرم تھی تو اس کے درمیان سے ناگر موتھا جسے "آستی" کے نام سے پکارا جاتا ہے نمودار ہوا۔ اس کے درمیان سے زمین کا خالق دیوتا نکلا۔ اس روایت کی رو سے زمین کی آفرینش سے پیشتر پانی مانا گیا ہے جیسے اور بہت سی قومیں بھی اس کے وجود ماقبل کو مانتی ہیں سویڈن

نواحیات کا اثر تکوین کے خیالات پر | ناروے کے پرانے باشندوں میں یہ روایت مشہور تھی کہ ابتداء عالم میں ایک نہایت تاریک، بے حد، اور ہولناک بے تھاہ گڑھا تھا اور برفانی ہیولی ہر جگہ محیط تھا۔ جب وہ حرارت سے پگھل گیا تو آیمر دیوتا پیدا ہوا اسکی بغل سے ایک عورت اور ایک مرد پیدا ہوا۔ ایک گائے آئی اُسنے سفید کہرہ چاٹ لیا۔ اسکے نیچے سے بَر نکلا۔ جس کے بیٹے اوڈن وائل اور دی تھے۔ انہوں نے آیمر کو مار ڈالا۔ اس کے گوشت سے زمین بنی۔ خون سے دریا سمندر وغیرہ پیدا ہوے۔ ہڈیوں سے پہاڑ دانتوں سے پتھر اور چٹانیں۔ اس کے بالوں سے انواع واقسام کے پودے پیدا ہوے۔

بیضہ کی روایت | پُرانے زمانہ کی کئی نیم متمدن قوموں اور نیز زمانہ حال کے کئی وحشی قبائل کے خیال کے مطابق دنیا شروع میں بیضہ کی مانند تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے ابتدائی عناصر لعینہ وہی تھے جو بیضہ کی زردی اور سفیدی میں پائے جاتے ہیں۔ اہل فنشیا مصر چین پالینیشیا اور فنلینڈ کے لوگوں میں بیضہ کی روایت عرصہ دراز سے رائج ہے۔ اسکے رو سے عالم بیضہ کی سی حالت میں تھا۔ اس میں سے رفتہ رفتہ جاندار ہستیاں نمودار ہوئیں۔ جیسے انڈے کے اندر سے کچھ عرصہ کے بعد بچہ نکل آتا ہے، اسیطرح موجودات وجود میں آئی تھیں۔ ان قوموں کے درمیان یہ بھی مانا جاتا ہے کہ خالق کائنات اسی قسم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بعض نوق البشر اور بعض کے ہاں وہ پچھوندر کی مانند سمجھا جاتا ہے۔ یہ خیال بہت عجیب اور ادق ہے بعض قوموں میں جنھوں نے اپنے زمانۂ عروج میں تمدن میں بڑی ترقی کی تھی یہ بہت مشہور اور اہم تھا۔

بہت سی قومیں پانی کی ہستی تکوین سے قبل مانتی ہیں۔ بعض قومیں یہ مانتی ہیں کہ موجودہ دنیا سے پیشتر اسی قسم کی اور دنیا تھی بعض کے ہاں یہ سلسلہ ابتدا سے اسی طرح چلا آتا ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ چند لاکھ یا کروڑ سالوں کے بعد دنیا بگڑ جاتی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد پھر از سرنو ترکیب پاتی ہے اس خیال کے سب سے بڑے حامی ہندو لوگ ہیں، اور آریہ فرقہ کے ہندو خصوصیت سے مانتے ہیں۔ کئی وحشی قوموں میں ایک نہایت ہولناک اور تباہ کن طوفان یا سیلاب کی نسبت روایات ہیں جس سے یہ دنیا وقتاً فوقتاً برباد ہوتی رہی ہے ان روایات میں طوفان نوح کی طرف اشارہ ہے یا یہ کہنا انسب ہوگا کہ ایک مدّت معیّنہ کے بعد قطبوں سے جو ہولناک برفانی سیلاب آتے اور روئیدگی اور موجودات کو خس خس کر دیا کرتے تھے ان کا قصوں میں ذکر ہے۔

(۲) قدیم زمانہ کی متمدن قوموں کے خیالات

۱۔ اہل مصر کے خیالات | وحشی قوموں کے روایات اور خیالات کا اجمال دینے کے بعد اب پُرانے زمانہ کی اُن قوموں کے قیاسات دئے جاتے ہیں جو علوم وفنون کی ترقیوں کے واسطے مشہور ہو چکی ہیں اس سلسلہ میں سب سے پہلے زمانۂ قدیم لعید کے مصریوں کے خیالات دیئے جاتے ہیں جنکا قومی وجود محو ہو چکا ہے مگر ان کے تمدن کے نشانات سرزمین مصر میں موجود ہیں۔ یورپین محققوں کی کوششوں سے انکے علوم اور تمدنی ترقیوں کے بیش قیمت خزاین برآمد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اثریات کی شہادت کے زور پر ہم قدیم مصر کے

لہ ماخوذ از "انسائیکلو پیڈیا بریٹانکہ" جلد نمبر ۶ صفحہ ۴۴۴-۴۴۵-۴۴۶ نہم ایڈیشن۔

تمدن کو اولین قرار دینے میں حق بجانب ہیں۔

مصر کے پُرانے شہروں اور مندروں کے کھنڈروں سے جتنے کتبے اور تحریریں خط تصویری میں آج تک برآمد ہوئی ہیں اُن سے اُنکے خیالات دربارۂ تکوین کا کوئی پتہ نہیں ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے علم آفرینش عالم کی کوئی تحریری شہادت ہمارے واسطے نہیں چھوڑی ہے مگر اُس دور اُفتادہ زمانہ کے اہل مصر بہت مہذب تھے۔ اُنہوں نے کئی قسم کے علوم و فنون میں قابل قدر ترقی کی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا خیال مظاہر ارض و سما اور دنیا و مافیہا کی طرف کیوں رجوع نہیں ہوا۔ قراین سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں کے ہاں ایسے خیالات تھے گو تحریروں سے ہنوز ظاہر نہیں ہوئے مگر جو کچھ معلوم ہوا ہے اسکی بناپر عالم یہ خیال کرتے ہیں کہ اہل مصر دنیا کی خلقت تین دیوتاؤں کی قدرت سے منسوب کرتے تھے۔ ایک کا نام پتاہ (Ptah) تھا جسکے لغوی معنی "توڑنے والا" ہیں۔ اسنے بیضۂ عالم کو توڑ کر دنیا پیدا کی تھی اور وہ سنسار اگنی یعنی حرارت عالم (Cosmic Fire) کا مالک تھا اُسنے اٰمن را (Amen-Ra) کے واسطے سامان بہم پہنچایا جسنے ترکیب دے کر دنیا کو قائم کردیا مگر آفرینش عالم کا اصلی کام را (Ra) دیوتا نے انجام دیا تھا۔ عوام اسے سورج دیوتا سمجھتے تھے مگر کاہنوں اور پجاریوں کے نزدیک روح عالم تھا۔ اسکا مظہر چشم تھا اسے الہی دم سمجھنا چاہئے۔ جسنے ابتدا میں پانیوں کو جنبش دی تھی۔ اُسنے دیوتا اور انسان پیدا کئے تھے۔ تھوتھ (Thoth) چاند دیوتا تھا اور حکمت آفرینش کا اوّل اصول بنا۔ اس کے ساتھ اور آٹھ سنسار شکتیوں (قوائے عالم) کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ جو "سنو" کہلاتی تھیں۔ یہ دیوتا "را کی زبان" سمجھا جاتا تھا۔

ایک جگہ مذکور ہے کہ را[1] دیوتا نے خود دنیا کو پیدا کیا تھا۔ فرانسیسی محقق اثریات مصر موسیو نیول کا یہ خیال ہے کہ مصریوں اور یہودیوں کے خیالات دربارۂ تکوین میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ ہردو کے مطابق شروع میں ہیولی روح الہی سورج کے وجود سے پیشتر نور کی پیدائش اور پھر تمام موجودات کا الہی ہستی کے ہاتھ سے وجود میں آنا مشترکہ خیالات ہیں۔

ب۔ اہل فنشیا کے خیالات | مصریوں کے بعد اہل فنشیا کے خیالات دیئے جاتے ہیں۔ یہ قوم بھی مصریوں کی طرح صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکی ہے۔ مشہور جرمن مورّخ سن کونیا تھون لکھتا ہے:۔

ابتدا میں تاریکی اور ایک قسم کی کثیف ہوا تھی۔ اور کدر ہیولی کی طرح ہر طرف محیط تھی۔ اس کی وسعت کی کوئی حد نہ تھی۔ قرنوں تک اُسکی یہی حالت رہی۔ مگر جب اس ہوا نے اپنے اصول اولی (پریم کارن) سے ارتباط پکڑا اور دونوں میں خوب موافقت اور اتحاد ہو گیا تو یہ "پوتاس" کہلایا اور اسی سے آفرینش عالم ہوئی۔ مگر ہیولا اپنی ابتدا اور اصل سے بالکل بے بہرہ تھا۔ جب وہ ہوا سے ملا تو "موٹ" پیدا ہوا جسے بعض کیچڑ کا اور بعض ترکیب آبی کا فضلہ پکارتے ہیں۔ اس سے عالم کا تخم برآمد ہوا، اور اسی سے بالآخر عالم کی پیدائش واقع ہوئی۔

بعض جاندار بھی تھے جو حس سے محروم تھے اُنسے ذی عقل جانور پیدا ہوئے۔ جو آسمانوں کے دیکھنے والے سمجھے جاتے تھے۔ وہ بیضہ کی صورت میں تھے۔ "موٹ" سے آفتاب عالمتاب پیدا ہوا اور اسی سے چاند ستارے اور دیگر اجرام علوی وجود میں آئے۔ ہوا کے پُر حرارت اثر سے جو بحر و بر پر ہوا جاندار وجود پذیر ہونے لگے تو عام ہوا اور بادل بھی معرض ہستی میں آئے۔ جب آسمان سے پانی اُترا تو دریا جھیلیں وغیرہ بن گئیں اور جب آفتاب کیطرح سے ان میں انتشار پیدا ہوا تو وہ اپنے

[1] ریکارڈس آف دی پاسٹ (کوائف ماضیہ) جلد دوم بحوالہ "انسائیکلوپیڈیا بری ٹانکہ" جلد نمبر ۴ صفحہ ۴۴

اصل ظرف چھوڑکر اور اطراف میں پھیل گئے۔ کرۂ ہوا میں ان سب کا ایک دوسرے سے تصادم ہوا اس سے کڑک اور برق پیدا ہوئی۔ بجلی کے دھماکے سے ذی عقل جانور چونک اُٹھے اور سخت خائف ہوگئے۔ بحروبر پر نر اور مادہ چلنے پھرنے لگے۔

فنیکی خیالات تکوین جنکی تحقیق فرانس کے نامی گرامی مورخ ارنسٹ رینان اور ایک جرمن محقق نے کی ہے، ایک سے زیادہ اعتبار سے بہت دل کش اور دل آویز ہیں۔ یہودی خیالات کو اُنسے خاص مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمسایہ قوم ہونے کے سبب سے ان میں راہ و رسم تھی۔

ج۔ اہل اکاد کے خیالات | ملک بابل[4] کا ابتدائی نام آکاد تھا۔ بائبل میں اسے شنار پکارا گیا ہے۔ تاریخی نام شمیر ہے ابتداً ایک شہر کا نام تھا۔ مگر پھر ملک پر عائد ہونے لگا۔ سن عیسوی سے تین ہزار برس پیشتر ملک بابل کے بادشاہ اُپنے خطابات اکادی سے مشہور ہوتے تھے۔ اس خطہ کے ابتدائی باشندوں نے تمدن میں اچھی ترقی کی تھی۔ عالموں کا ایک گروہ حروف تہجی کی ایجاد اور استعمال اسی قوم سے منسوب کرتا ہے۔ جب جنوب کی طرف سے ایک جنگلی اور گڈریہ قوم نے اکادیوں کو شکست دی اور ان کے ملک پر قبضہ قائم کرکے قیام پذیر ہوگئی تو اُسنے مفتوح قوم کے علوم و فنون، عادات، خیالات، رسم و رواج، عقائد اور متھالوجی بھی قبول کرلی۔ اس کے وجود کے نشانات بابل اور نینوہ کے کھنڈروں سے برآمد ہوئے ہیں۔ گو وہ خود سیکڑوں برسوں سے مفقود الوجود ہے۔ آفرینش عالم کی بابت اہل اکاد کا یہ خیال تھا کہ موجودات کی خلقت اور وجود کا وسیلہ واحد پانی تھا۔ اسے تحریک دینے کے لئے ایک خالق کی ضرورت ہوئی تو وہ اسی کے درمیان سے نکلا اور اُس نے دنیا و مافیہا کو موجودہ صورت میں ترتیب دیا۔ مبدأ عالم ایک عجیب و غریب ہستی تھی جسے ہیولیٰ اور اصول اولیٰ پر اختیار حاصل تھا اس خیال کی رو سے علت العلل ایک الٰہی ہستی ٹھرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اہل اکاد نے علم و فضل میں قابل تعریف ترقی کی تھی۔

د۔ اہل بابل کے خیالات | ۱۸۷۶ء سے پیشتر اہل بابل کے خیالات آفرینش عالم کے بارہ میں جو کچھ ہمیں معلوم تھا وہ ایک بابلی پروہت برآسوس (۳۰۰ ق م ۔ ۲۶۰ ق م)[5] کی مشہور تاریخی تصنیف سے اخذ ہوا تھا مگر بہت سے ارباب تحقیق و تجسس اس کے بیانات کی صحت و صداقت میں شک کرتے تھے۔ لیکن جارج اسمتھ[6] کی ان تھک کوششوں سے جو اُس نے خط میخی کے کتبے پڑھنے میں مصروف کی تھیں برآسوس کی تحریر قابل اعتبار سمجھی گئی یہ پروہت کوئی محقق مورخ نہ تھا مگر وہ خط میخی کے علم کا زبردست ماہر تھا۔ حق کا متلاشی تھا پُرانے زمانہ کے کاغذات تحریرات کتبے اور خشتی کتب کے کتب خانوں تک اسکی رسائی تھی حالانکہ یہ تحریریں ہمارے ہاتھ میں بہت بگڑی صورت میں آئی ہیں جو کچھ براسوس نے اپنی کتاب میں لکھا تھا اسے سائن سیلس وغیرہ نے باحتیاط کمال سنبھال کر رکھا۔ اور اس کا حصّہ کثیر ہمارے زمانہ تک سلامت پہنچا۔ اس کتاب میں اس نے آفرینش عالم کے بارہ میں اہل بابل کے خیالات ظاہر کئے ہیں جو یہودی خیالات سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک ابتدائی سیلاب کا ذکر کرتا ہے اور اسے "تھاؤ آتھ" کے نام سے پکارتا ہے اور عناصر کو علیحدہ کرکے دنیا کے پیدا کرنے کا تذکرہ بھی اسی کتاب میں موجود ہے۔ اُسنے ابتدائی

---

[4] "تاریخ عالم" جلد اول۔ دیباچہ۔ مطبوعہ ٹائمز لندن ۱۹۰۸ء [5] "قبل مسیح" قدرے لمبا لفظ ہے جو ولادت مسیح سے ماقبل زمانہ کے امتیاز کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ راقم نے اس کے بجائے سہولت کا خیال کرکے "ق م" لکھنا شروع کردیا ہے۔ جے۔آر۔آر۔ [6] یہ وہی جارج اسمتھ ہے جسنے اثریات بابل و شام کی تحقیق اور تلاش میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ ۱۸۷۶ء میں انتقال کیا۔ جے۔آر۔آر۔

سمندروں کے جانداروں کا بھی ذکر کیا ہے "سمندر" سے اسکی مراد "ایتھر" اور جانداروں سے اسکا مطلب[۱] سیارے ہیں۔ ابتدا میں[۲] ہر جگہ اندھیرا اور پانی تھا جسکے اندر خوفناک عفریت رہتے تھے۔ اس برہمی میں بیل دیوتا داخل ہوا ابتدائی پانی کے سمندر کو پھاڑ ڈالا، اور تاریکی کے حصے کئے۔ معمولی جانور عفریتوں کی جگہ آموجود ہوئے پھر انسان پیدا کیا گیا۔ سورج چاند اور پانچ سیارے بھی معرض وجود میں آئے۔

اسُوریہ کا نہایت مشہور اور زبردست بادشاہ اسرپینی پال ساتویں صدی (۶۶۸-۶۲۶ قبل مسیح) قبل مسیح میں گذرا ہے اس کے دارالریاست شہر نینوہ کے کھنڈروں سے جو خشتی کتابیں اور کتبے اور دیگر اشیا برآمد ہوئی ہیں اُن سے یہ ظاہر ہے کہ وہ بڑا علم دوست تھا۔ اُسنے ایک شاہی کتب خانہ قائم کیا تھا اسکی کتابیں جو اینٹوں پر مشتمل تھیں محققوں کے ہاتھ لگ گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک سلسلہ آفرنیش کے بیان کے متعلق ہے۔ مگر مکمل نہیں صرف بارہ لوحیں دستیاب ہوئی ہیں جو کسی اور نسخہ کی نقل سمجھی جاتی ہیں۔ جارج اسمتھ کی رائے میں اصل نسخہ مسیح سے دو ہزار برس پیشتر کا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب پہلے پہل پڑھنے لکھنے کا چرچا ہوا تھا۔ صاحب موصوف نے ان خشتی تختیوں کو ترتیب دیا اور خط میخی کی عبارت کو پڑھکر انگریزی میں ترجمہ کر دیا۔ اسوری خیال بابل والوں کی روایات سے بہت موافقت کھاتا ہے۔ اگر باقی لوحیں مل جائیں تو یہ بیان مکمل ہو جاتا۔ اس داستان اور موسوی بیان آفرنیش میں حسب ذیل امور مشترکہ ہیں (۱) خلقت کی ترکیب اور ترتیب (۲) متکلم دیوتا کا ظہور میں آنا۔ (۳) طوفان یا سیلاب کا نمودار ہوکر دنیا کو برباد کر دینا (۴) خلقت کی تکمیل اور خوبی پر خالق کا اظہار خوشنودی کرنا (۵) ستاروں سے تعین زمانہ ہونا یعنی دن رات مہینے سال قرن وغیرہ کی میعاد اجرام فلکی کی گردش کے مطابق قرار پانا جیسے ہندوؤں کے عقائد مختلف ہیں ویسے

ر۔ ہندوؤں کے خیالات

انکا تصور تخلیق بھی مختلف ہے۔ یہاں سب قسم کے خیالات اختصار کے ساتھ دیئے جاتے ہیں۔ رگوید ۱۰ منڈل اور ۱۲۹ منتر میں یہ لکھا ہے:۔

۱۔ ویدوں کا خیال دربارہ تکوین

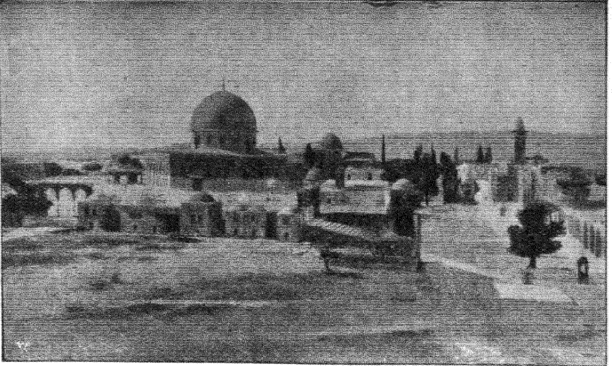
آدمیں نہ توست (ہست) اور نہ است (نیست) تھا۔ وہاں نہ تو کرہ ہوا تھا اور نہ آسمان۔۔۔۔ اسوقت نہ مرگ تھا اور نہ بقا۔ اسوقت دن اور رات کا امتیاز نہ تھا۔ **واحد** ہستی قائم بالذات موجود اور ہمیشگی سے دم لیتی تھی اس سے جدا اور اس سے بالا کوئی اور شے نہ تھی۔ ابتدا میں تاریکی ظلمت میں پوشیدہ موجود تھی۔ یہ سب ناقابل شناخت پانی تھا۔ **واجب الوجود** عدم شے میں لپٹا ہوا موجود تھا۔ تپ کی طاقت سے اسنے نشوونما پائی۔ اس کے اندر خواہش پیدا ہوئی جسمیں بدھی کا ابتدائی بیج موجود تھا۔ جسے رشیوں نے اپنی عقل سے ست اور است کے درمیان سمبندھ قرار دیا[۳] ہے۔۔۔۔۔ الخ۔

رگوید کے ایتریہ آرنیہ میں لکھا ہے:۔

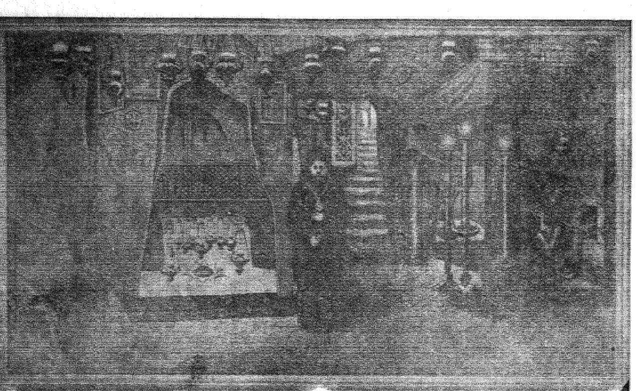
آربھ (ابتدا) میں یہ برہما نڈ کیول آتما تھا۔ اس کے سوا کوئی جاندار اور بے جان شے نہ تھی۔ اس نے سوچا میں عالم پیدا کروں گا پس اسنے مختلف دنیائیں پیدا کر دیں، پانی، روشنی، جاندار وغیرہ۔ اس نے خیال کیا، درحقیقت یہ عالم ہیں۔ میں انکے محافظ بھی پیدا

---

[۱] تاریخ عالم اول جلد دیباچہ [۲] "نیو انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا" مطبوعہ نیویارک جلد نمبر ۵ صفحہ نمبر ۵۰۴ [۳] "ہند فلاسفی" صفحہ ۴-۵-۶ مطبوعہ کلکتہ۔ اس کتاب کے مولف نے جو ایک بنگالی ہندو معلوم ہوتا ہے ذیلی حاشیہ میں کول بروک میکس مولر۔ میور وغیرہ یوروپین مستشرقین کی پیروی کی ہے۔ راقم مضمون نے انگریزی کتابوں سے اس مضمون کی ترتیب و تیاری میں بہت مدد لی ہے۔ جے۔ آر۔ آر۔







(۱) حرم بیت المقدس کا پورا منظر (۲) وہ دیوار جسکو چمٹ کر یہودی دعائیں مانگتے اور روتے ہیں (۳) بیت اللحم – حضرت مسیح کی تولد گاہ

انڈین پریس الہ آباد

کردوں گا۔ اسنے پانیوں میں سے کچھ نکالا اور ایک جسم ۔ ارشے (پُرش یا شخص) بنادی اس نے اسے غور سے دیکھا اس کا مُنہ کھل گیا۔ جیسے انڈا پھٹ جاتا ہے۔ مُنہ سے کلام نکلا۔ اور کلام سے آگ نکلی۔ نتھنے پھولے اور سانس نکلا۔ اور سانس سے ہوا پیدا ہوئی۔ اسکی آنکھیں کھلیں اُن سے شعاع نکلی اور اس سے سورج پیدا ہوا۔ اسکے کان چوڑے ہوگئے اس سے قوت سمع پیدا ہوئی اور اس سے خلا کے تمام خطّے بن گئے۔ جلد نے وسعت اختیار کی۔ اس سے بال پیدا ہوئے اور اس سے گھاس۔ جڑی بوٹیاں اور درخت پیدا ہوئے۔ سینہ پھٹا اور اس سے عقل نکلی اور عقل سے چاند وجود پذیر ہوا۔ ناف پھٹی اور اس سے کھانے کی طاقت پیدا ہوئی۔ اور اس سے موت لاحق ہوئی۔ آلۂ تناسل پھٹا اور اس سے جان والا تخم پیدا ہوا۔ اور اس سے سمندر بنے[1] .... الخ

یجر وید میں آیا ہے :۔

اس نے اپنا ثانی پیدا کرنے کی خواہش کی۔ فی الفور مرد و عورت ہم آغوش پیدا ہوگئے۔ اس نے اپنی ذات کے دو حصّہ کر دئیے۔ استری اور پرش بن گئے۔ اسطرح بنی آدم (منش جاتی) وجود میں آئے۔ استری کو حجاب معلوم ہوا اور گائے بن گئی۔ پرش نے بیل بنکر اس سے وصل کیا اسطرح گائیں پیدا ہوئیں۔ پھر وہ گھوڑی بنی اور یہ گھوڑا۔ اسطرح گھوڑے پیدا ہوئے اسی طرح وہ مختلف جانوروں کی صورتیں اختیار کرتے گئے اور انواع پیدا کرتے رہے۔

اسی وید میں ایک بیان یہ ہے :۔

ابتدا میں سمندر تھے یہ دنیا شروع میں پانی تھی۔ پرجاپتی (خداوند عالم) ہوا بنکر اسمیں چلتا پھرتا تھا۔ اس نے اس زمین کو دیکھا خود سور کی شکل اختیار کرلی اور اسے اوپر سنبھال لیا۔ پھر وشوکرم (لوہار) بنکر زمین کو ترکیب دی وہ اپرتھات (مشہور) اور یہ پرتھوی بنی۔ اس وجہ سے اسے یہ[2] نام دیا گیا۔

۲۔ برہمنوں کا خیال | ہر ایک وید کے ساتھ چند ضمیمے بھی ہیں۔ جو "برہمن[4]" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان میں رسوم اور قربانیوں کے طریقہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض معرکۃ الآرا مسائل مثلاً خدا کی ہستی۔ روح کی بقا۔ نجات اور دنیا کی ابتدا کے بارہ میں بھی ذکر ملتا ہے۔ ویدوں کے ان حصوں میں "پرجاپتی" کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ بالفاظ ڈاکٹر ولیم ڈل[5] حسب ذیل ہے :۔

(۱) ابتدا میں عدم وجود تھا۔ (۲) دیوتاؤں کے دل میں اسرار کے علم کی خواہش پیدا ہوئی اور سات مختلف قسم کے انسان پیدا کئے۔ (۳) انہوں نے کہا ہم سات انسان نہیں پیدا کر سکتے۔ آؤ ایک آدمی بنالو۔ اسطرح انہوں نے سات آدمیوں کا ایک ہی بنا دیا (۵) یہ انسان پرجاپتی بن گیا۔ وہ قرباں گاہ پر آگ کے طور پر رکھا گیا۔ (۸) اُسنے چاہا "میں اپنے کو بڑھاؤں میں بہتے کو پیدا کروں" چنانچہ اُسنے تپ (ریاضت) کیا۔ اور پرارتھنا قائم کی۔ جسے تین وید قرار دیا جاتا ہے (۹) اُسنے کلمہ سے پانی پیدا کیا۔ خلا ہی خلا تھا۔ کلمہ (واچ) اسی کا ہے۔ اسی نے اُسے پیدا کیا ہے۔ اور وہ عالم کے اندر محیط ہے (۱۰) اُسنے چاہا "میں پانیوں سے پیدا ہوجاؤں"! وہ وید کو لیکر پانی کے اندر داخل ہوگیا۔ جس میں سے بیضہ نکلا۔ اسنے اسے چھوا اور تین مرتبہ کہا "یہ ہوجائے گا"! اس سے پرارتھنا بنی" (شت پتھ برہمن۔ ۶ منڈل۔ اول سوکت (منتر)) "پرجاپتی ہی

---

۱ "دین حق کی تحقیق" صفحہ ۱۷-۱۸۔ ۲ انگریزی ترجمہ ۳ یہ دونوں اقتباس اسی کتاب سے ہیں۔ شت پتھ برہمن۔ ا منڈل ا-۲-۱-۴ بھی ملاحظہ ہو ۴ لفظ "برہمن" کے کئی معنی ہیں اس کا مفہوم واجب الوجود ہستی اور لے بھجن۔ گیت منتر۔ قوت۔ زہد۔ دینداری۔ وغیرہ وغیرہ ہیں اور برہمن ذات بھی ہے جو ہندوؤں میں سب سے اعلیٰ درجہ پر ہیں۔ جے۔ آر۔ آ۔ ۵ ملاحظہ ہو "ہندو اور مسیحی طریقہ نجات" صفحہ ۱۸۰-۱۸۱-۱۸۲۔

برہمانڈ تھا۔ داچ (کلمہ) اس کی رفیق وہمدم تھی۔ اس سے اُسنے وصل کیا اور وہ حاملہ ہوگئی اور دور بھاگ گئی۔ اس سے مخلوقات وجود میں آئی۔ وہ پھر پرجاپتی کی ذات میں ملکر غائب ہوگئی" (کاٹھک ۱۲ منڈل ۵ منتر)

۴۔ اپنشدکاروں کا خیال | ویدوں کے خیالات دربارہ آفرینش عالم کے بعد اب دوسرے طبقہ کے خیالات دئیے جاتے ہیں اور یہ اپنشدوں سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ یہ فلسفیانہ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ آیتریہ آرنیکہ میں جو رگوید کا اپنشد ہے یہ لکھا ہے :۔

ابتدا میں روح تھی۔ اُسنے خیال کیا۔ میں کچھ پیدا کروں اور اُسنے خلا پیدا کیا اور پھر پانی، روشنی اور انسان خلق کئے۔ خلا آسمان کے اوپر ہے۔ کرۂ ہوا میں روشنی ہے اور زمین پر انسان ہیں....الخ

پرش (ازلی و ابدی شخص۔ مبداء عالم) نے خیال کیا "یہ عالم ہیں اور عالم کے محافظ دیوتا ہیں۔ میں انکے لئے اب خوراک پیدا کروں گا۔ اسنے پانی میں دیکھا۔ وہاں سے "روپ" نکلا.. پھر پرماتما پرش نے یہ خیال کیا "یہ منش میرے بغیر کیسے جی سکتا ہے؟" اس نے اپنے دل میں سوچا کہ میں کس راستہ سے اس کے اندر داخل ہوں۔ اُسنے کھوپڑی کے دو ٹکڑوں کو الگ کیا اور داخل ہوگیا۔ اسطرح پرماتما انسان کے جسم میں جاکر روح انسانی بن گیا۔ الخ انسان نے عناصر کی دیکھ بھال کی۔ اور کہا "میں اس کے سوا یہاں اور کس کے وجود کا اعتراف کرسکتا ہوں" پرش یعنی برہم پر دھیان جمایا اور کہنے لگا "اسے میں نے دیکھ لیا ہے!" اس واسطے اسکا نام ادم درا (وہ دیکھا ہوا) ہوا۔ جو بعد ازاں آندر کہلایا۔

یجروید کے برہدارنیکیہ میں یہ لکھا ہے :۔

یہ برہمانڈ مع مختلف شکلوں اور ہستیوں کے پرش تھا۔ اُس نے چاروں طرف اپنے سوا اور کچھ نہ پایا۔ اور کہا "میں ہی میں ہوں" اسواسطے اسکا نام "میں" ہے۔

جیسے مکڑی جالا تنتی ہے جیسے پودے زمین پر اگتے ہیں۔ اور جیسے سر اور دھڑ پر بال نکلتے ہیں۔ اسیطرح ہر ایک شے اینا شی (ناقابل زوال وجود) سے نکلکر وجود پذیر ہوتی ہے" منڈک اپنشد پہلا منڈل۔ پہلا ادھیا ، شلوک۔ چھاندوگیہ اپنشد (۳ منڈل ۱۴ ادھیا ، شلوک) میں لکھا ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ برہم ہی برہم ہے۔ اسی سے نکلتا ہے اور اسی میں قائم رہتا اسی میں غائب ہوجاتا ہے" منڈک اپنشد (دوسرا منڈل۔ اوّل ادھیا ۔ ۱۰ شلوک) میں پرتما سے جو چیزیں نکلی تھیں انکی بابت یوں لکھا ہے :۔ اس سے آگ نکلی۔ جسکا منبع (ایندھن لغوی) سورج ہے۔ چاند سے پرجنیہ دبارش کا دیوتا) نکلا۔ اور اس سے زمین کی جڑی بوٹیاں پیدا ہوئیں۔ اسطرح پرش سے بہت سے جاندار پیدا ہوئے سچ چاند تارے۔ سچ۔ جھوٹ۔ عالم ومافیہا۔ دریا۔ پہاڑ، سمندر، روئیدگی الغرض سب چیزیں اسی سے وجود پذیر ہوئیں.... برہمانڈ پرش ہے۔ اعمال حسنہ (سبھ کرم) تپسیا، دعا اور سدا کا جیون سب پرش سے ہے۔

ج۔ آر۔ راے

* "ہندو فلاسفی" صفحہ ۲۹-۳۰-۳۱-۳۲ ملاحظہ ہو۔

قدیم ہندوستان میں کاشتکاروں کی حالت

اس دنیا کی شریف ترین خدمت بلاشبہ بنی نوع انسان کے لئے سامان خوردنی پیدا کرنا ہے۔ اور اس طرح بہ معنوی خوبیوں کے اعتبار سے کاشتکار کو جو درجہ حاصل ہونا چاہئے اور حقیقت میں تمام آزاد ممالک میں آج کل بھی ہے وہ بہت بڑے عزّ و وقار پر مبنی ہوتا ہے۔ ۱۸۵۸ء میں انگلستان کی نیو پورٹ کی زرعی نمائش کے موقعہ پر جو کچھ ہوا تھا وہ غالباً اکثر اخبار بین حضرات سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ اس موقعہ پر ہریفورڈ کے مویشی اور برکشائر کے سؤروں کے جو نہایت خوشنما نمونے نمایاں کئے گئے تھے وہ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم مرحوم و مغفور کے تھے جو اس زمانہ میں بھی پرنس آف ویلز تھے۔ اور انہی گلوں پر سب سے بڑے انعامات دیئے گئے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک میں فلاحت و زراعت کے مختلف شعبوں سے لوگوں کو کس قدر دلچسپی ہے۔

خود ہمارے ملک میں اہل مکان یا "گرہست" ہونے کے لئے کسی شخص کا کاشتکار ہونا کافی سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ آج تک ہندوستان کے بعض حصوں میں الفاظ "گرہستی" اور "گرہست" عام طور پر "کاشتکاری" اور "کاشتکار" کے مترادف خیال کئے جاتے ہیں۔ دیکھئے بشسٹ سنگھتا میں "گرہست" کا ذکر کس قدر ادب و احترام کے ساتھ کیا گیا ہے:-

جسطرح دریاؤں کا سہارا سمندر ہے ایسے ہی گرہست دوسرے طبقوں کے لوگوں کا سہارا ہوتا ہے جسطرح ماں تمام جانداروں کی پرورش کرتی ہے ایسے ہی گرہست مانگنے والی جماعتوں کو خیرات دے کر انکا سہارا بنتا ہے۔

ہر چند کہ زمانۂ موجودہ میں زراعت کے متعلق سنسکرت کی کتابیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں تاہم بہت سی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ سلف میں فن زراعت کا مطالعہ بہ حیثیت ایک سائنس (ودیا) کے کیا جاتا تھا۔ اور "وارتا" کے نام سے علوم میں اسے وہی درجہ حاصل تھا جو علم نظری اور الٰہیات کو ہے۔ امثال کا مجموعہ آجکل بنگالی زبان میں "کھنا بچن" کے نام سے موجود ہے وہ ایک معدوم زرعی سائنس ہی کا بقیہ معلوم ہوتا ہے۔ "امرکوش" میں وارتا کی نسبت ایک شلوک مذکور ہے جس میں اسے ویش کے پیشوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے اور اس کے تین طبقات کی تقسیم بتدریج حسب ذیل قائم کی گئی ہے:-

(۱) زرعی کاشتکاری (۲) مویشی کی پرورش اور (۳) تجارت۔

بخلاف آجکل کے اس زمانہ میں زراعت کو تجارت پر فوقیت دی جاتی تھی۔ فی الحقیقت سوسائٹی کی باقاعدہ حالت میں تجارت اسی وقت میدان میں نمودار ہوتی ہے جب زرعی ترقی کے باعث اغراض تبادلہ کے لئے روپیہ کی بہت سی مدامی بچت ہاتھ میں رہ جائے۔ جوں جوں یہ بچت بڑھتی جاتی تھی تجارت کی اہمیت زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ آخرکار یہ زراعت سے زیادہ منفعت بخش ثابت ہونے لگتی تھی۔ لیکن رتبہ اور عزت کے اعتبار سے تاجر بلاشبہ کاشتکار سے کمتر درجہ پر ہوتا تھا جیسا کہ آجکل بھی اکثر مہذب ممالک میں دیکھا جاتا ہے۔

قدیم ہندوستان میں زراعت اور تجارت یہ دونوں ویش ذات کے مخصوص پیشے سمجھے جاتے تھے۔ یاگیہ ولک سنگھتا کے شلوک ۱۱۹ میں مذکور ہے کہ "وس (یعنی ویش) قوم کے مخصوص پیشے روپیہ قرض دینا۔

کاشتکاری تجارت اور مویشی کی پرورش ہیں۔" زمانۂ حال کے برہمن پیدائش کی بناپر ورنوں کی تقسیم کے متعلق چاہے جو کچھ کہیں تاہم جو لوگ قدیم سنسکرت لٹریچر کا مطالعہ رکھتے ہیں وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ ذاتوں کی تقسیم میں پیدائش کو بہت ہی کم دخل ہوا کرتا تھا۔ ذاتوں کی تقسیم کے متعلق جو مذکور گیتا میں اور مہابھارت کے شانتی پرب میں ہے۔ اس کے معنی علی الترتیب یہ ہیں کہ "چال چلن اور پیشہ کے اعتبار سے تقسیم" اور "پیشہ کے لحاظ سے مختلف ذاتوں کی تقسیم" قدیم آریاؤں میں ذاتوں کی تقسیم مختلف پیشوں کے لحاظ سے ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ ویش اس لئے ویش ہوتا تھا کہ وہ کاشت کارتا جریا روپیہ کا لین دین کرنے والا تھا۔ ایسے ہی وہ سب لوگ ویش کہلا سکتے تھے جو حقیقت میں ویش ہوں محض نام کے ویش نہوں۔

اس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ویش یا کاشتکار کی سیاسی اور تمدنی حیثیت کیا ہوا کرتی تھی؟ جن لوگوں نے مہابھارت اور راماین کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ قدیم ہندوستان میں راجہ کو عام طور پر "وشم پتی" کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا جس کے معنی وس یا ویش یا کاشت کاروں کے محافظ کے ہیں چنانچہ کرشن جی یدھشٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

अप्रमत्तः स्थितो नित्यं प्रजाः पाहि विशाम्पते ।
पर्जन्यमिव भूतानि महाद्रुममिव द्विजाः ॥

३४ । अध्याय ७२ । सभा (राजसूय)

کیکئی نے بھی مہاراجہ دشرتھ کو بدیں الفاظ مخاطب کیا تھا:۔

अतिसृज्य ददामीति वरं मम विशाम्पतिः ।
स निरर्थं गत आसे सेतुं बन्धितुमिच्छति ॥

२३ । अ० १९ । अयोध्याकाण्ड ।

محل شاہی کے لئے مقام کا انتخاب کرنے میں راجہ کے سامنے ہی مقام کی سفارش کی جاتی تھی جہاں ویش بکثرت ہوں چنانچہ وشنو سنگھتا میں آیا ہے:۔

راجہ کو اپنی رہائش اس جنگلی زمین میں رکھنی چاہئے جہاں مویشی اور فصلیں بہتات سے ہوں اور زیادہ تر شودر اور ویش لوگ بستے ہوں۔

فی الحقیقت قدیم ہندوستان میں کشتریوں کا سرگردہ ہونے کی حیثیت میں راجہ کا درجہ وہی ہوا کرتا تھا جو افلاطون کی جمہوریت میں گڈریئے کے کتے کا ہے کیونکہ برہمن فلاسفر گڈریا اور ویش باعتبار پیداکن جماعت ہونے کے قابل تحفظ بھیڑ ہوتی تھی۔ برہمن اور کشتری تو زیادہ تر کھانے والے ہی ہوتے تھے۔ اور جسطرح کتے یا گڈریئے کا بھیڑ کے بغیر زندہ رہنا محال ہو ویسے ہی ویش لوگوں کے بغیر ان کا وجود نا ممکن ہوتا تھا۔ خیرات اور دان ویشوں کے خاص حقوق تسلیم کئے گئے ہیں چنانچہ مہابھارت میں آیا ہے:۔

برہمن کی بجلی اسکا ہاتھ ہے جو دیوتاؤں پر پوجا کی چیزیں چڑھاتا ہے کشتری کی بجلی اسکا جنگی رتھ۔ ویش کی بجلی اسکا دان اور سب سے چھوٹی جماعت (شودروں) کی بجلی دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔

مہاراجہ یدھشٹر کشتریوں اور منی نارد برہمنوں کے نمائندہ کی حیثیت میں کاشت کاروں کی صلاح و فلاح کے لئے کسقدر تشویش کا اظہار کرتے ہیں! چنانچہ نارد منی یدھشٹر سے کہتے ہیں:۔

تیری رعایا کو چوروں۔ حریص لوگوں۔ راجکماروں عورتوں یا خود تیری طرف سے تکلیف تو نہیں؟ کیا کاشتکار لوگ خوش حال ہیں؟ کیا تیرے ملک کے اندر بڑے بڑے اور لبریز تالاب مختلف مقامات میں مناسب فاصلہ پر موجود ہیں؟ زراعت کا مدار محض بارش پر نہونا چاہئے



مدرسہ روضۃالمعارف کا سالانہ جلسہ

Indian Press, Allahabad.

کاشتکار کے پاس کھانے اور بونے کے لئے کافی اناج موجود ہے ؟

ایسے ہی رامائن کے اجودھیا کانڈ میں رام چندر جی بھرت سے پوچھتے ہیں :-

جس ملک پر ہمارے بزرگ حکمراں تھے کیا اسکی انتہائی حدود تک قلبہ رانی ہوتی ہے ؟ کیا مویشی بکثرت موجود ہیں ؟ کیا لوگ حسد سے پاک ہیں ؟ کیا ان کا گذارہ بارش پر انحصار رکھنے کے بغیر چلا جاتا ہے ؟ کیا وہ خوش ہیں ؟ اور اُنھیں تباہ کن جنگلی جانور تو نہیں ستاتے ؟ کیا وہ ہر قسم کے خوف و خطر سے پاک ہیں ؟ کیا ملک میں معدنیات موجود ہیں ؟ کیا اس میں بدی کرنے والے تو نہیں ہیں ؟ کیا لوگ خوش اور خوشحال ہیں ؟ اے راگھو کیا مزارعین اور مویشی کی پرورش کرنے والے کاشتکار تجھ سے خوش ہیں ؟ -

لیکن اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ زراعت بلاشبہ ویش لوگوں سے مخصوص تھی ہم دیکھتے ہیں کہ کشتریوں کو بھی اس میں حصہ لینے کی ہدایت کی گئی ہے مثلاً :-

کشتریوں کو کاشتکاری کرکے برہمنوں اور دیوتاؤں کی پوجا کرنی چاہیئے -

حقیقت میں ہم دیکھتے ہیں کہ جسطرح مسٹر گلیڈ اسٹون آنجہانی کلھاڑا چلاکر خوش ہوا کرتے تھے ایسے ہی بڑے بڑے عزت دار راجہ ہل چلانے کو باعث فخر خیال کرتے تھے - مثال کے طور پر دیکھئے کہ راجہ جنک ودیہ رشی لسوامتر سے رام چندر جی کی موجودگی میں فخر سے خود کھیت میں کام کرنے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

جب میں کھیت میں ہل چلا رہا تھا (سیتا) ہل دکے ذریعہ بنی ہوئی ایک لکیر میں) سے نمودار ہوئی جسوقت میں ٹلائی کررہا تھا تو مجھے وہ حاصل ہوئی جس کا نام عرف عام میں سیتا ہے - ہرچند کہ وہ زمین کے اندر سے پیدا ہوئی ہے تاہم اسکی پرورش میں نے اپنی بیٹی کی طرح کی ہے -

ایسے ہی جب سیتا جی رام چندر جی کے ہمراہ بن باس میں تھیں تو وہ رشی اتری کی اہلیہ انسویہ سے فخریہ طور پر اپنے تگنی عظمت رکھنے والے باپ کی دستی مشقتوں کا ذکر کرتی ہیں - تگنی عظمت اس لئے کہ وہ ایک ہی وقت میں راجہ، رشی، اور کاشتکار تھا :-

وہ (راجہ جنک) ہل ہاتھ میں لئے اپنے کھیتوں میں قلبہ رانی کر رہا تھا کہ میں زمین کے اندر ایک درز میں سے نمودار ہوئی - راجہ خود مٹھیاں بھر بھر کر (راکھ) بکھیر رہا تھا جب اسنے مجھے راکھ سے بھرا ہوا دیکھا وہ نہایت حیران ہوا -

راکھ بکھیرنے سے کھاد ڈالنے کی طرف اشارہ ہے - ناظرین حیران ہوں گے کہ کسی زمانہ میں بڑے بڑے راجہ بھی اپنے ہاتھ سے ہل چلاتے اور کھاد ڈالا کرتے تھے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم ہندوستان میں برہمنوں تک کو مقدس موقعوں پر کھیت میں ہل چلانے کا حکم تھا - پراشر سنگھتا میں مذکور ہے :-

برہمن کو لازم ہے کہ وہ اپنے پنچ یگیہ روزمرہ ان چاولوں کے ذریعہ کرے جو اس نے ان کھیتوں سے حاصل کئے ہوں جن میں اُسنے خود ہل چلایا ہو -

اسکے علاوہ ہر ایک برہمن کو برہمچاری کی تربیت حاصل کرنے کے عرصہ میں اپنے گورو سے کھیتی باڑی کا کام بھی سیکھنا پڑتا تھا - چنانچہ مہابھارت میں آتا ہے کہ دھومی رشی کا ایک برہمچاری چیلا آرونی نامی تھا جسے اس نے کھیت کے شکستہ بند کی اس غرض سے مرمت کرنے بھیجا تھا کہ اس میں سے بارش کا پانی

نہ بہ جائے۔

آرونی نے پانی کو روکنے کی ہر چند کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہو سکا تو آخر کار خود اُس شکستہ مقام کے آگے لیٹ گیا اور اسطرح پر پانی کے بہاو کو روک دیا۔

اسی دھومی رشی کا ایک اور چیلا اُپ مینو نامی تھا جسکا کام گرو کے مویشی چرانا تھا چنانچہ وہ ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ برہسپتی کا بیٹا کچ جن ایام میں شکر آچاریہ کا چیلا تھا تو اُسے مویشی کی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔ اسی قسم کی نظیریں اوپنشدوں میں بھی بکثرت ملتی ہیں جنھیں دیکھکر خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تعلیم جس کی ابتدا آج کل زرعی کالجوں اور انسٹی ٹیوشن کی صورت میں ہونے لگی ہر کسی زمانہ میں ہندوستان کے اندر عام طور پر مروج تھی۔

زمانۂ قدیم میں کھیتوں کے اندر کام کاج کرنے والوں کی جو عزت تھی اسکی مثال کرشن جی اور بلرام کی زندگیوں سے ملتی ہے جن کی گوکل میں نند گوپ نے پرورش کی تھی۔ جہاں کرشن جی گئوئیں چراکر خوش ہوا کرتے تھے۔ عام ہندوؤں کے دلوں میں کرشن جی کی عظمت کس اعتبار سے ہے۔؟ اس لئے نہیں کہ انہوں نے ظالم کنس کو مارا یا ملعون ششو پال کو تباہ کیا تھا اس لئے نہیں کہ میدان کورو چھیتر میں انہوں نے فریقین میں صلح کرانے کی کوشش کی تھی اور اس لئے بھی نہیں کہ انہوں نے گیتا کی گہری فلاسفی ارجن پر منکشف کی تھی۔ درحقیقت وہ لوگ جو کرشن جی کو بمنزلہ اوتار خیال کرتے ہیں ان کے دلوں میں ان کی عظمت بہ حیثیت گوکل کے "گوپال لال" "مور مکٹ بنسی والے" اور "راکھل" کے ہے۔ جو گئوؤں کی ہر طرح نگرانی کرتے تھے حتے کہ بارش اور طوفان کے موقعہ پر ایک ہفتہ ان پر سایہ کئے رہے تھے۔ مہابھارت میں آیا ہے:۔

نوعمر لڑکا جنگل میں جاکر اپنی مدھر بانسری کے سروں سے گئوؤں کو خوش کیا کرتا تھا۔ اے دشمنوں کو مطیع کرنے والے! موسم برسات میں وہ شان وشوکت والا گوکل کو گیا جہاں واسدیو نے گوبردھن کا پہاڑ ایک ہفتہ بھر گئوؤں کو (بارش اور طوفان سے) بچانے کے لئے اٹھائے رکھا تھا بحالیکہ وہ ابھی بالکل چھوٹی عمر کا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ششو پال کو کرشن جی سے یہاں تک نفرت تھی کہ اس نے ان کے لئے "گوپ" کا لفظ حقارت کے ساتھ استعمال کیا تھا اور بھیشم کو ان الفاظ سے مخاطب کیا تھا:۔

تو ایک بڈھا اور دانا آدمی ہوکر اس گئوئیں چرانے والے کی تعریف کرتا ہے۔

لیکن ہر ایک پابند مذہب ہندو کو کرشن جی یا راکھل سے ایک چرواہے اور ان کے بھائی بلرام یا ہلدھر کی زندگی سے ایک کاشت کار کی عظمت کا سبق حاصل ہوتا ہے۔

جن اصحاب کو سنسکرت کتب یا ان کے تراجم پڑھنے کا موقعہ ملا ہے وہ جانتے ہوں گے کہ قدیم سنسکرت نظموں کے بعض شلوکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف زمانہ قدیم میں کاشت کا کام نہایت عمدہ طور سے ہوتا تھا بلکہ جن شعرا نے وہ نظمیں لکھی ہیں وہ خود بھی اس بارہ میں بہت بڑی واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ بھٹ کوی لکھتا ہے:۔

وہ خاص فصلوں کو دیکھکر خوش ہوا جو ویرانوں میں بوئی ہوئی۔ دور تک پھیلی ہوئی اور اپنی سرسبزی کے باعث آنکھوں کو طراوت دیتی تھیں۔ (پودوں کے) تمام حصے ہموار تھے۔ ان میں تیل ٹپک رہا تھا۔ اور وہ موٹے اور سیدھے تھے اور ان کی درمیانی جگہ میں خوب اچھی طرح نلائی کی ہوئی تھی۔

اس عبارت کا ایک ایک لفظ عملی کاشتکار کے لئے پر معنی ہے کیوں کہ وہ اس سے فوراً اندازہ کر سکتا ہے کہ مصنف نے مکئی۔ نیشکر، یا جوار کی سرسبز فصل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر محض شعر کہنا ہی نہ جانتا تھا بلکہ وہ ایک علمی کاشت کار کی پوری واقفیت رکھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ فصل کی عمدہ حالت میں ہونے کی علامات کو سمجھ سکا۔

رشی آپستمب نے اپنی سنگھتا میں بچھڑوں کی پرورش کے مندرجہ ذیل قواعد مقرر کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دودھ دینے والے جانوروں کی افزائش نسل کا فن ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ چکا تھا:۔

"پچھلے دو ماہ بچھڑے کو خوب دودھ پینے دو۔ اس کے بعد گائے کے دو تھن دوہ لیا کرو اور دو بچھڑے کے لئے چھوڑ دیا کرو۔ پانچویں اور چھٹے مہینے صرف ایک بار دن بھر میں دودھ دوہنا چاہیئے اس کے بعد جتنا چاہو دوہتے چلے جاؤ۔"

جس ملک میں مرغزار بکثرت ہوں۔ مویشی کی مصنوعی پرورش کے گراں طریقوں سے کبھی کام نہ لینا پڑے اور گائیں نسبتاً کم دودھ دیتی ہوں وہاں کے لئے اس سے اچھا قاعدہ بچھڑوں کو مضبوط اور صحت ور بنانے کا بمشکل قائم کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رشی آپستمب اس بات سے واقف تھا کہ کسی بچھڑے کی عمر میں نہایت نازک وقت اکثر وہ ہوا کرتا ہے جب تک کہ وہ چھ ماہ کا نہ ہو جائے۔ اور اگر اس عرصہ میں اسکی پورے طور سے پرورش نہ کی گئی تو آگے چلکر اسے کتنا بھی اچھی طرح کھلایا پلایا جائے تو کبھی مضبوط نہ ہو سکے گا۔ یورپ اور امریکہ میں جن بچھڑوں کو افزائش نسل کے لئے محفوظ رکھنا ہوا تھیں کبھی دودھ کی ٹوٹ نہیں دیجاتی۔ عام طور پر دودھ دوہنے کے لئے جو گائیں ان ممالک میں رکھی جاتی ہیں اُنکے بچھڑے تھوڑے عرصہ بعد قصاب کے ہاتھ بیچ دیئے جاتے ہیں۔ رشی آپستمب نے جو قاعدہ اس بارہ میں مقرر کیا ہے وہ مغربی مویشی داروں کے مقررہ قاعدہ پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے کہ اس سے افزائش نسل کے علاوہ دودھ دوہنے کا سلسلہ بھی برقرار رہتا ہے۔ ہندوستان میں آجکل بھی جو لوگ تہ دل سے افزائش نسل مویشی کے خواہشمند ہیں انھیں اسی قاعدہ پر عمل کرنا واجب ہے۔

ہندوستان یقیناً ایک زرعی ملک ہے۔ اس کے فلاح اور بہبودی کا دارومدار بہت بڑی حد تک زراعت ہی کو بدرجۂ تکمیل پہنچانے پر ہے۔ مغربی ہوا نے ہمارے کاشت کاروں کو کچھ مُدّت کے لئے ایک عجیب غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا جس میں پڑ کر وہ اپنی زندگی کے حقیقی اعزاز کو بھول گئے تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج زراعت پیشہ لوگ کس مپرسی کی حالت میں ہیں لیکن گورنمنٹ اب پھر جابجا زرعی کالج اور سکول قائم کر کے لوگوں کو اس لائن کی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ پُرانے زرعی طریقوں میں جدید کلوں اور نئی نئی دریافتوں کا پیوند لگایا جا رہا ہے۔ اس معاملہ میں اگر اہل ملک نے گورنمنٹ کا اسکی کوششوں میں ہاتھ بٹایا تو ہندوستان کا پھر اسی عروج پر پہنچ جانا بالکل قرین قیاس ہے جو ایک درجۂ اوّل کا زراعتی ملک ہونے کی حیثیت میں اسے کسی وقت حاصل تھا۔

تیرتھ رام

راجاؤں کا کہتے ہیں مہاراج تجھے　　کیوں دیں نہ سلاطینِ زمن باج تجھے
شاہوں کے شہنشاہ مبارک یہ جشن! [1]　　راس آئے ترا تخت ترا تاج تجھے

صدقے ہوتا ہے چرخ ہفتم تجھ پر　　کرتا ہے فلک نثار انجم تجھ پر
روشن رہے نام شش جہت میں تیرا [2]　　ہے ہند کو ناز جارج پنجم تجھ پر

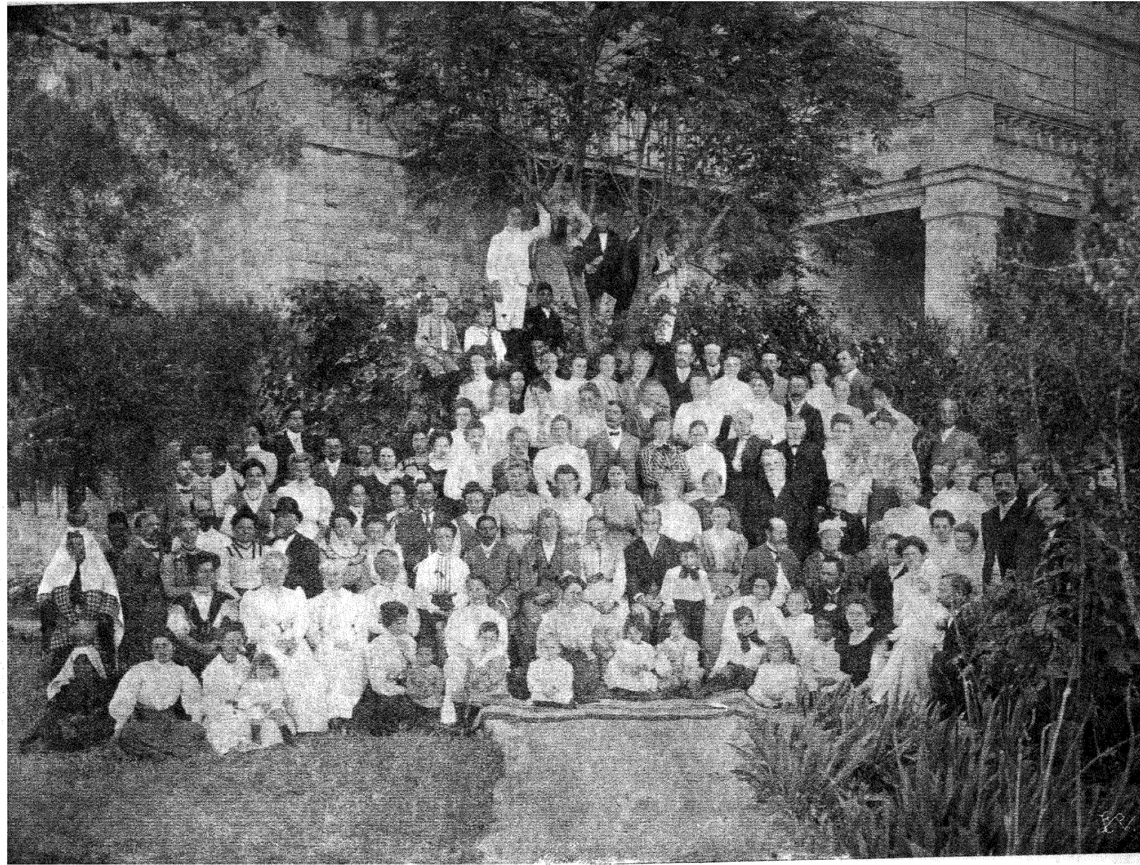
شفق عمادپوری

ابن رشد [1]

ابوالولید محمد ابن احمد ابن محمد ابن رشد ۱۱۲۶ء میں بمقام قرطبہ پیدا ہوا - ۱۱۹۸ء میں جبکہ اس کی عمر تقریباً اسّی سال کی تھی مراکش میں اس نے وفات پائی - اس کو اپنی زاد بوم کے ساتھ بڑا ہی اُنس تھا - چنانچہ اس کی اکثر تصانیف میں اسکی جھلک پائی جاتی ہے - فلاطوں کی کتاب "ری پبلک" کی تشریح کرتے ہوے اس مقام پر جہاں فلاطوں نے یونانیوں کو دماغی ترقیات میں دنیا کی قابل ترین قوم شمار کیا ہے مشرح نے اندلس والوں کے بھی اسی درجہ میں ہونے کا دعویٰ کیا ہے - اسیطرح اپنی زبردست تصنیف "کلیات" میں گیلن کی تردید کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ موسمی لحاظ سے بہترین مقام وہ منطقہ ہے جس میں قرطبہ واقع ہے - دربار المنصور کا ایک واقعہ بھی اس بیان کی تائید کرتا ہے - سلطان المنصور کے دربار میں ایک دفعہ ابن رشد اور ابوبکر ابن زہر باشندۂ اشبیلیہ کے درمیان اپنے اپنے وطن کی خصوصیات و برتری کے متعلق گفتگو ہونے لگی - ابن رشد نے کہا کہ اگر اشبیلیہ میں کوئی عالم وفات پائے اور اس کی کتابوں کو فروخت کرنے کی ضرورت ہو تو لوگ ان کو قرطبہ لے جاتے ہیں جہاں کتابوں کی معقول قیمت دستیاب ہونے کا ان کو یقین ہوتا ہے اور اسی طرح اگر کوئی بڑا مغنی قرطبہ میں انتقال کر جائے تو اس کے آلات موسیقی بیچنے کی غرض سے اشبیلیہ بھیجدیئے جاتے ہیں - کیونکہ ان کے قدرداں وہیں ملتے ہیں -

ابن رشد کا خاندان اندلس میں بہت موقر تھا اور حکومت کی طرف سے اس کی خاص عزت کی جاتی تھی - ابن رشد کے دادا کا نام بھی ابوالولید محمد تھا اور وہ بھی ابن رشد کی طرح قرطبہ کی قضاۃ کے اعلیٰ عہدہ پر ممتاز تھا - ابوالولید محمد اپنے زمانہ کا بہت بڑا فقیہ اور قانون داں تھا علم و فضل میں اپنی نظیر آپ تھا - فرانس کی نیشنل لائبریری میں اس کی تصانیف کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف اسپین میں بلکہ یورپ کے سارے حصوں میں اسکی خداداد لیاقت اور غیر معمولی فضل و کمال کا شہرہ تھا اور اکثر غیر ممالک کے حکمراں اس متبحر شخص کی غیر معمولی قانونی قابلیت سے مستفید ہوتے تھے - غرض ابن رشد ایک ایسے سربرآوردہ نامور خاندان کا چشم و چراغ تھا جس کے علم و فضل کی روشنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کے تمام افراد کئی پشت سے علم و حکمت اور فضل و کمال میں شہرۂ آفاق تھے - اس طرح ابن رشد کو علم و فضل گویا ورثے میں ملا تھا -

ابن رشد کو ابتدا میں مذہبی تعلیم دی گئی جس کے بعد فلسفہ، طب، ریاضی، ہیئت، طبعیات اور قانون وغیرہ کی تحصیل کی طرف اس فاضل شخص نے توجہ کی - ابن رشد کو خوش قسمتی سے اس زمانہ کے مشہور و معروف علماء اور فقہاء کے سامنے زانوے شاگردی تہ کرنے کا فخر حاصل ہوا - ابوجعفر ہارون، ابن طفیل اور ابن ماجہ جیسے کاملان فن کے فیضان صحبت کا ابن رشد کی ہونہار طبیعت پر بہت کچھ اثر ہوا اور جس طرح ایسے بڑے بڑے مشاہیر کی شاگردی کی فضیلت ابن رشد کو نصیب ہوئی اسیطرح ابن رشد کے ہمعصر بھی بہت غیر معمولی قابلیت کے وہ باکمال زبردست محقق تھے جنھوں نے علوم و فنون کو بہت بڑی ترقیاں بخشیں اور اکتشافات کئے ہیں - ابوبکر ابن زہر، ابو مروان اور ابن عربی کا



شرکائے امریکن سوسائٹی، بیت المقدس - مدر یعنی سر پرست پر نشان بنا دیا گیا ہے

Indian Press, Allahabad.

رتبۂ علمی دنیا میں جسقدر بلند ہے اس کو کون نہیں جانتا۔ یہ سب ابن رشد کے ہم صحبت اور ہم جلیس تھے۔

جب ابن رشد کی قابلیتوں کا چاروں طرف شہرہ ہونے لگا تو اسکے غیر معمولی فضل و کمال کے چرچے شدہ شدہ سلطان وقت امیر عبد المومن کے کانوں تک بھی پہونچے جو خاندان الموحدین کا بہت بڑا خلیفہ ہوا ہے۔ امیر عبد المومن کو اپنے زمانہ کے نامی گرامی علما کو اپنے دربار میں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ ابن رشد کے علاوہ اس صدی کے تمام مشہور فلسفی ابن زہر، ابن ماجہ اور ابن طفیل اس کے دربار میں موجود تھے۔ ۵۴۸ھ میں ابن رشد پہلے پہل بمقام مراکش دربار خلافت میں پیش ہوا۔ امیر عبد المومن کو ابن رشد کی اعانت سے اعلےٰ اعلےٰ مدارس قایم کرکے اپنا علمی شوق پورا کرنے میں بڑی مدد ملی۔ امیر عبد المومن کے جانشین امیر یوسف کی علم دوستی اس کے پیشرو سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ امیر یوسف کے عہد میں تو ابن رشد نے بہت بڑی ترقی کی۔ اس زمانہ میں باوجود اس کے کہ وہ سلطنت کی بڑی بڑی خدمتوں پر ممتاز رہا اور جلیل القدر عہدوں کی ذمہ داریوں میں بمشکل اسکو تصانیف کا سلسلہ جاری رکھنے کا موقع مل سکتا تھا اس کے علمی مشاغل بہت ہی سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ جاری تھے۔ ان دنوں اسنے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے اکثر تو امیر یوسف کی فرمایش پر لکھی گئی ہیں۔ امیر یوسف اس قسم کی تصنیفات کے لئے ابن رشد کو سب سے زیادہ موزوں اور عالی پایہ شخص تصور کرتا تھا۔ اور ایسا سمجھنے میں وہ بیشک حق بجانب بھی تھا۔ امیر یوسف کی اس گردیدگی کا باعث ابن رشد کی غیر معمولی لیاقت کے علاوہ ابن طفیل کی عنایت بھی ہے۔ ابن طفیل رئیس الاطبا ہونے کے سوا منصب وزارت سے بھی سرفراز تھا اور اس کو دربار شاہی میں بہت بڑا رسوخ حاصل تھا۔ ابن طفیل ہی نے ابن رشد کی خداداد قابلیتیں امیر کے گوشگذار کیں۔ اور ابن طفیل ہی کی سفارش پر ابن رشد امیر یوسف کے دربار میں پیش ہوا۔ چنانچہ ابن رشد اکثر اپنے دوستوں سے امیر یوسف کے دربار میں اول مرتبہ اپنے پیش ہونے کا حال جن الفاظ میں بیان کرتا تھا ان کو عبد الواحد مشہور مورخ نے اپنی کتاب میں اس طرح نقل کیا ہے کہ

جب میں امیر المومنین کے حضور میں داخل ہوا تو اس وقت ابن طفیل کے سوا امیر کے پاس کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا۔ ابن طفیل نے میری بے انتہا تعریف کرنی شروع کی اور میرے خاندان کی قدامت اور بزرگی بیان کی۔ میری عالی خاندانی کو بہت شد و مد کے ساتھ بیان کرنے کے بعد ابن طفیل نے میرے ذاتی اوصاف کے متعلق ایسے تعریفی کلمات اپنی نوازش و مہربانی سے استعمال کئے جن کا میں اپنے تئیں مستحق نہیں سمجھتا۔ اس تقریر کے بعد امیر نے میرا اور میرے باپ کا نام اور میرا خاندانی حال دریافت کرکے سلسلۂ کلام یوں شروع کیا کہ افلاک کی حقیقت کے متعلق حکما کی کیا راے ہے؟ قدیم ہیں یا حادث؟ اس سوال سے میں اس درجہ خوف زدہ ہوا کہ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ اس سوال کے جواب سے بچنے کے واسطے میں کوئی عذر پیش کرنے کی فکر میں تھا اور یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اس قسم کے مسائل پر غور نہیں کیا ہے۔ کیونکہ مجھے اس کی خبر نہ تھی کہ امیر یوسف اور ابن طفیل نے اسطرح میری آزمائش چاہی تھی۔ میں ابھی اسی ادھیڑ بن ہی کے عالم میں تھا کہ امیر نے خود اس مسئلہ پر تقریر کرنی شروع کی۔ ارسطو، فلاطون، اور دوسرے حکما کے خیالات بیان کرکے اس نے اس مسئلہ پر متکلمین اہل اسلام کی رائیں بیان کیں۔ امیر کی اس غیر معمولی قوت حافظہ اور معلومات پر میں متحیر تھا۔ مجھے سخت استعجاب تھا کہ اس تاجدار کو ان اہم مسائل پر کس طرح ایسا عبور حاصل ہے جو بمشکل ان حکما کو نصیب ہو سکتا ہے جو اپنی ساری عمر

صرف ان ہی مباحث کے پیچھے صرف کر ڈالتے ہیں۔ غرض امیر نے اس طرح میرے دل سے اس رعب کو مٹانے کی بہت عمدہ تدبیر نکالی جو بُری طرح مجھ پر طاری تھا۔ امیر کی تقریر سے مجھ کو ایک گونہ سکون ہوا اور مجھے اس بات کی جرأت ہوئی کہ میں بھی اس مسئلہ پر زبان کھول سکا اور یوں امیر کو اس بات کا اندازہ کرنے کا موقعہ ملا کہ فلسفہ میں میری معلومات کس پایہ کی ہیں۔ اس صحبت کے ختم ہونے پر امیر نے ایک معقول رقم ایک خلعت فاخرہ اور ایک بیش قیمت گھوڑی مرحمت خسروانہ مرحمت فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔

اس بات کے ثبوت میں کہ ابن رشد نے ارسطو کی کتابوں کی شرحیں ابن طفیل کی سفارش اور امیر یوسف کی تاکیدی فرمایش پر لکھیں۔ وہی مورخ عبد الواحد خود ابن رشد کی زبانی اس طرح لکھتا ہے۔

ایک روز ابن طفیل نے مجھے بلا کر کہا کہ امیر المومنین آج ارسطو اور اسکے مترجمین کے دقیق مغلق مشکل اور پیچیدہ طرز کی شکایت کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ وہ انشاء اللہ کسی ایسے شخص کو ڈھونڈھ نکالیں گے جو ان تصانیف پر نہایت مفصل شرحیں لکھے اور ان کے مسائل اس عمدگی اور سلاست کے ساتھ بہت آسان پیرایہ میں بیان کرے جس کو ہر شخص بغیر کسی مشکل کے سمجھ سکے۔ ابن طفیل نے امیر کی یہ تقریر دہرا کر مجھ سے کہا کہ اس کام کو انجام دینے کے تم ہر طرح اہل ہو اور تمہارے پاس اس کا پورا سامان موجود ہے لہذا تم اس کو شروع کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔ کیونکہ مجھے تمہاری اعلیٰ قابلیت، علمی وسعت، تیز فہمی، جودت طبع اور تمہارے انتہا درجہ کے ذوق کتب بینی کا حال معلوم ہے اس لئے میں یہ یقین کرنے کی کافی وجہ رکھتا ہوں کہ تم اس کام کو بہت قابل تعریف طریقہ سے کر لے جاؤ گے۔ میں خود اس کام کی طرف اس لئے توجہ نہیں کر سکتا ہوں کہ میری عمر اب اس قابل نہیں رہی ہے۔ اس کے سوا سلطنت کے مختلف شعبوں کی خدمات کچھ ایسے میرے ذمہ ہیں کہ میں بالکل اس کام کے شروع کرنے سے معذور ہوں۔ اس کے بعد سے میں نے اپنی تمام تر توجہ اس جانب مبذول کی اور ابن طفیل کی تحریک پر عمل پیرا ہونے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ارسطو کی تصانیف پر جو شرحیں اور تلخیصیں میں نے لکھی ہیں ان کی ابتدا بس اس طرح ہوئی۔

غرض امیر یوسف کی قدر دانی اور ہنر پروری اور ابن طفیل کی پر اثر تائید کی بدولت ابن رشد نے نہایت سرگرمی اور جاں کاہی کے ساتھ اپنا وہ مشن پورا کرنا شروع کر دیا جس کے لئے مبدء فیاض نے اسے غیر معمولی دل و دماغ مرحمت فرمایا تھا۔ ۱۱۶۹ء میں ہم ابن رشد کو اشبیلیہ کی مسند قضارة پر جلوہ آرا دیکھتے ہیں۔ اسی سال اس نے ارسطو کی کتاب الحیوان کی مشہور شرح کو ختم کیا۔ چنانچہ اس میں ایک جگہ ان لغزشوں کی معذرت چاہی ہے جن کا اس کو احتمال تھا کہ شائد شرح لکھنے میں فرایض منصبی کی بے انتہا مصروفیتوں اور نیز اپنے کتب خانہ سے جو قرطبہ میں تھا دور ہونے کے باعث سرزد ہو گئی ہوں۔ ۱۱۷۱ء میں ابن رشد قرطبہ واپس ہوا اور اسی تاریخ سے اسنے اپنی بڑی بڑی معرکۃ الآرا شرحیں لکھنی شروع کیں۔ اس زمانہ میں بھی اسے بہت کم فرصت نصیب ہوتی تھی۔ عہدہ کی ذمہ داریوں اور مشاغل کے ہجوم میں اسے بمشکل تصنیف و تالیف کا شوق پورا کرنے کا موقعہ ملتا تھا۔ مگر اس نے اپنے علمی مشغلے کو اس عدیم الفرصتی میں بھی برابر جاری رکھا۔ ان ہی دنوں میں ابن رشد نے مجسطی کی تلخیص کی۔ اس کے پہلے باب کے آخر میں اس نے اپنی قلیل الوقتی کا حال یوں بیان کیا ہے کہ اسے صرف نہایت اہم اور ضروری مباحث پر قلم اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ اپنی اس زمانہ کی حالت کو بالکل ایک

ایسے شخص کے مشابہ پاتا تھا جو چاروں طرف سے آگ میں گھر گیا ہو۔ اس کا سارا گھر بار آگ کے شعلوں کی نذر ہو رہا ہو اور اسے صرف اتنی مہلت ہو کہ اپنے سامان میں سے نہایت درجہ ضروری چیزوں کو لیکر آگ سے نکل جائے اور جان بچالے۔ ابن رشد کو اپنے فرایض منصبی کے لحاظ سے سلطنت الموحدین کے تمام حصوں کا ہمیشہ دورہ کرنا پڑتا تھا۔ کبھی وہ مراکش میں ہوتا تھا۔ کبھی اشبیلیہ میں اور کبھی قرطبہ میں۔ مگر ان ایام میں بھی وہ کبھی اپنی تصانیف کا سلسلہ منقطع نہونے دیتا تھا۔ اس کی کتابیں ان ہی مختلف مقامات سے برابر نکلتی رہتی تھیں۔ ۱۱۷۸ء میں اس نے بمقام مراکش ایک بہت بڑی تصنیف ختم کی۔ ۱۱۷۹ء میں بمقام اشبیلیہ اس نے دینیات پر ایک کتاب لکھی۔ ۱۱۸۲ء میں امیر یوسف نے ابن رشد کو پھر مراکش بلایا اور ابن طفیل کی جگہ اس کو اپنے دربار کا رئیس الاطباء مقرر کیا۔ اسکے بعد ابن رشد کو اپنی وہی موروثی خدمت سرفراز ہوئی جو اس کے باپ اور دادا کو یکے بعد دیگرے ملی تھی یعنی وہ قرطبہ کا قاضی القضاۃ بنایا گیا۔

امیر یوسف کے بعد جب یعقوب المنصور تاج و تخت کا مالک ہوا تو ابن رشد کا رسوخ اور بھی بڑھ گیا۔ یعقوب المنصور ہمیشہ بڑے بڑے علمی مباحث پر اس سے گفتگو کیا کرتا تھا اور ہر دم اس کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۱۹۵ء میں جب یعقوب المنصور قسطیلیہ کے حاکم الفانسو نہم کے ساتھ معرکہ آرائیوں میں مصروف تھا تو اس حالت میں بھی بڈھا فلاسفر ابن رشد اسکے ہمراہ رکاب تھا۔

لیکن افسوس ہے کہ ابن رشد کا یہی غیر معمولی تقرب اخیر عمر میں اس کی مصیبت کا باعث ہوا۔ امیر کے ساتھ اسکے بے تکلفانہ تعلقات کو دیکھکر بعض درباری اس کے دشمن ہو گئے اور اس بات کی کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح اس کے رسوخ کو زائل کریں۔ ابن رشد کے فلسفیانہ عقاید سے بھی اکثر لوگ مانوس نہ تھے۔ اس سے ابن رشد کے دشمنوں کو اور زیادہ تقویت ہو گئی۔ انہوں نے اپنے دلی بغض و عداوت کو ظاہر کرنے کا یہ پیرایہ اختیار کیا کہ ابن رشد پر الحاد و کفر کا الزام رکھا بعض جھوٹے اتہامات اس کی طرف منسوب کئے اور اس کی تصانیف کو مخرب اسلام قرار دے کر امیر منصور کے پاس اس کی شکایت کی۔ ابن رشد کے دشمنوں نے عوام الناس کو کچھ اسطرح اکسایا تھا کہ امیر منصور کو بھی ان کی برافروختگی سے گھبرانا پڑا اور سوائے اس کے کہ اپنے فلسفیانہ مذاق کو ایک طرف رکھ کے ابن رشد کو اپنے پاس سے علیحدہ کرے کوئی چارہ نہ تھا۔ امیر یعقوب المنصور باللہ نے آخر یہی کیا اور شہر کے مشہور لوگوں کو جمع کر کے اس کے متعلق گفتگو کرنے کے بعد ابن رشد کو قرطبہ کے قریب بمقام لوتیئن نظر بند کر کے عوام الناس کی ناراضی و برہمی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ابن رشد کا یہ زمانہ بہت بُری طرح گزرا۔ اس کی سخت نگرانی کی جاتی تھی اور اس کو کسی سے ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ مشرق کا مشہور زبردست علامہ تاج الدین حموی ابن رشد کی قابلیتوں کا شہرہ سنکر اس سے ملنے کے شوق میں طول طویل سفر کی صعوبتیں گوارا کر کے ہسپانیہ پہنچا مگر باوجود بڑی کوشش کے حکیم ابن رشد سے ملاقات نہو سکی۔ مشہور مورخین عبدالواحد الانصاری ابن ابی اصیبعہ وغیرہ نے بہت تفصیل کے ساتھ ان تمام واقعات کو قلمبند کیا ہے جو اس بُرے وقت میں ابن رشد پر گزرے ہیں۔ ان واقعات کو پڑھ کر سخت عبرت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب دہر کے اثر سے کوئی شخص خواہ وہ کیسا ہی بڑا فلسفی حکیم اور فاضل اجل کیوں نہ ہو نہیں بچ سکتا۔ سچ ہے کہ زمانہ کو پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ وہی ابن رشد جو امیر یعقوب المنصور کا اس درجہ مقرب اور معتمد علیہ تھا کہ امیر کسی وقت اس کو اپنے پاس سے جدا

کرنا پسند نکرتا تھا اور جو امیر کی خاص مسند پر اس کے برابر بیٹھکر بالکل مساوات کے لہجہ میں بےتکلفانہ گفتگو کیا کرتا تھا آخر اسکی ذلت وخواری کی نوبت یہاں تک پہونچی کہ ایک دفعہ جب وہ اپنے فرزند عبد اللہ کے ساتھ قرطبہ کی جامع مسجد میں داخل ہوا تو لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے۔ سخت حقارت کے ساتھ ملامت کرنے اور گالیاں دینے لگے اور بےطرح شور وغل کرکے اسے نکال باہر کیا۔ مورخ الانصاری کا بیان ہے کہ ابن رشد بعد میں ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اس سے بڑی ذلت اس کو کبھی عمر بھر نصیب نہیں ہوئی۔

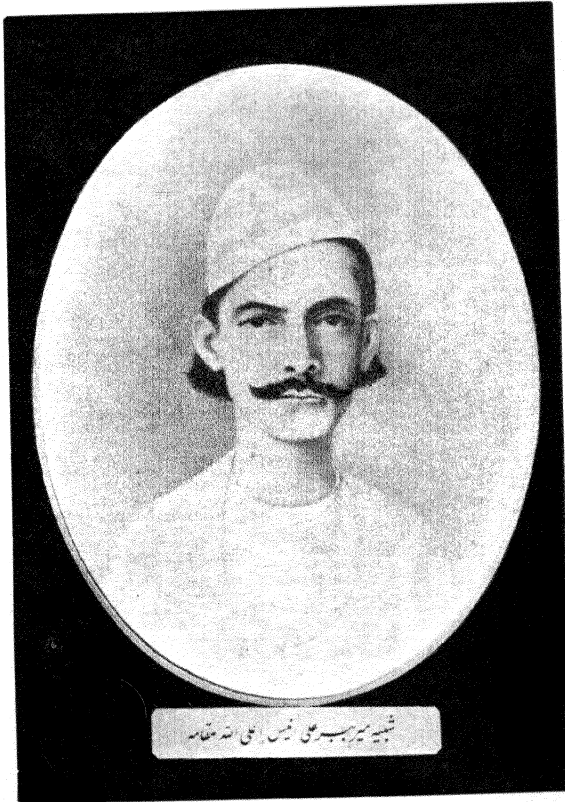
ابن رشد کے مصائب کا یہ زمانہ بہت جلد ختم ہوگیا۔ کیونکہ وہ محض سازشوں اور نافہم جہلا کے غیظ وغضب کا شکار رہا تھا اس لئے اسکی بےگناہی بہت جلد ثابت ہوگئی۔ امیر یعقوب المنصور نے اپنے پچھلے حکم کو منسوخ کرکے حکیم ابن رشد کو پھر اپنے پاس بلالیا۔ اس کے بعد ابن رشد بہت کم دنوں زندہ رہا۔ ۹ صفر المظفر ۵۹۵ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۱۹۸ء کو جمعرات کے روز اس بلند پایہ حکیم نے اسی برس کی عمر میں بمقام مراکش وفات پائی۔ مورخ لیون لا فریکن نے ابن رشد کا سال وفات ۱۲۰۶ء لکھا ہے جس حساب سے اس کی عمر رحلت کے وقت چھیاسی برس کی ہوئی۔ ڈاکٹر لی بان نے اپنی مشہور ومعروف کتاب "تمدن عرب" میں ابن رشد کا سال پیدایش ۱۱۲۶ء اور سال وفات ۱۱۹۸ء لکھا ہے اور فرح انطون نے اپنی کتاب "ابن رشد وفلسفہ" میں سال پیدایش ۵۲۰ھ م ۱۱۲۶ء اور سال وفات ۵۹۵ھ م ۱۱۹۸ء۔ مگر ان سب میں وہی تاریخ زیادہ تر مستند اور صحیح ہے جو پہلے لکھی گئی ہے۔

الانصاری کے بیان کے مطابق ابن رشد کو اولاً مراکش میں دفن کیا گیا مگر تین مہینوں کے بعد اس کی لاش قرطبہ بھیجی گئی جہاں اس مشہور آفاق حکیم کو اس کے خاندانی مقبرہ میں جو ابن عباس کے قبرستان میں واقع ہے ہمیشہ کے لئے تہ خاک کیا گیا۔ اگرچہ لیون لا فریکن نے لکھا ہے کہ ابن رشد مراکش میں مدفون ہے اور اس نے خود اپنی آنکھ سے اس کی قبر مراکش میں دیکھی جسپر ایک کتبہ بھی نصب ہے۔ مگر اس بیان کی تردید میں یہ زبردست ثبوت موجود ہے کہ ابن عربی نے ابن رشد کے تابوت کو مراکش سے قرطبہ منتقل کیا جاتا ہوا بچشم خود دیکھنا بیان کیا ہے۔

ابن رشد کے کئی فرزند تھے جن میں سے اکثر فقہ اور قانون میں خاص طور پر قابل تھے اور مختلف شہروں کی قضاۃ کے عہدوں پر مامور رہے۔ ابن رشد کی اولاد میں سب سے زیادہ ابو محمد عبد اللہ مشہور رہے جو اپنے زمانہ کا بہت بڑا نامور طبیب تھا۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس کے حالات زندگی بھی قلمبند کئے ہیں اور اس کے باپ ابن رشد کی سوانح عمری کے بعد ہی ان کو درج کیا ہے۔ ابو محمد عبد اللہ امیر الناصر کے طبیب خاص کے بلند منصب پر ممتاز تھا اور امیر کے دربار میں بہت رسوخ رکھتا تھا۔ ابن رشد کے فرزند اگرچہ بجائے خود اپنے اپنے فن میں بہت کامل تھے لیکن ان میں سے کسی کو وہ مرتبہ اور وہ پایہ حاصل نہ ہو سکا جو ابن رشد کی ذات کے ساتھ وابستہ تھا اور نہ ان کے کارناموں سے ابن رشد کی شہرت و ناموری میں کوئی اضافہ ہوا۔ سچ ہے ؎ (حالی)

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

سید خورشید علی



شبیہ میر ببر علی انیس اعلی اللہ مقامہ

میر ببر علی انیس لکھنوی (۱)

میر انیس بھی اُن کاملین فن سے ہیں جنکی شہرت اور مقبولیت اُس وقت تک باقی رہے گی جب تک مجلس سخن طرازی میں شعرائے نازک خیال اپنی معنی آفرینیوں سے نقادان سخن کو خوش کرتے رہیں گے۔ وہ کون مبصر ہے جو میر انیس کے فصیحانہ رنگ پر عشعش نہیں کرتا۔ نہ صرف لکھنؤ بلکہ اطراف ہندوستان کے انصاف پسند اہل مذاق نے میر انیس کی خداداد فصاحت اور رطب اللسانی، سلاست بیان، اور شیریں زبانی کا اعتراف کر لیا ہے۔ مرنے کے بعد انکی شہرت مہر نصف النہار بنی ہوئی ہے۔ وقتاً فوقتاً اخبارات اور ادبی رسالے انکی شاعری سے اردو زبان کے ماہرین کو خوش اور محظوظ کیا کرتے ہیں۔ ادیب بھی اس یگانۂ روزگار کی مختصر سوانح عمری اور طرز سخنوری پر تنقیدی نظر ڈالنا چاہتا ہے، کیونکہ ادیب کا فرض منصبی ہی یہ ہے کہ وہ اردو لٹریچر کے عمدہ نمونے سخن سنج اصحاب کے سامنے پیش کرے۔ اور جو لوگ شاعرانہ مذاق رکھتے ہیں وہ فصیح البیانی کی شان دیکھیں اور سمجھیں بلکہ استفادہ کریں۔ ہرچند میر انیس اسقدر مشہور شخص ہیں کہ انکے حالات زیادہ تشریح و توضیح کے محتاج نہیں لیکن میرے خیال میں اب بھی کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو انکی رنگیں بیانی کے نظارہ سے محروم ہوں گے اور اصل تو یہ ہے کہ دلاویز کلام ہزار مرتبہ پڑھنے اور سننے کے بعد بھی نیا مزہ دیتا ہے۔ یقینی وہ لوگ بھی جو میر انیس کا کلام سن چکے ہیں اس مقام پر پھر داد سخنوری دیں گے۔

میر انیس ایک خاندانی اہل فن ہیں اور گو مرثیہ گوئی ان سے منسوب ہے لیکن دراصل وہ تمام اصناف شاعری پر قادر تھے۔ میر مستحسن خلیق، انیس کے والد ماجد کا نام نامی ہے۔ انکی ولادت ۱۲۱۶ھ بیان ہوئی ہے اور ۱۲۹۲ھ ہجری سنہ رحلت ہے۔ عنفوان شباب ہی سے شاعری کا شوق ہوا۔ شاعری کا شوق کیسا یہ مذاق تو گویا انکی گھٹی ہی میں پڑا ہوا تھا۔ علوم متداولہ حاصل کرنے کے بعد شاعری میں کامل بصیرت ہوئی۔ میر انیس کی عربی۔ فارسی کی قابلیت ضروری حد تک تھی گو وہ عالم نہ تسلیم کئے گئے لیکن وہ عربی میں فاضلانہ ادراک رکھتے تھے اور یہ مقولہ کہ یک من علم را دہ من عقل باید ان پر صادق آتا تھا۔ ایک ایسا شخص جو خود بھی ذہین و فریس ہو اور خاندانی طور پر اس کا مذاق شاعرانہ ہو کیونکر دنیا کی نگاہوں میں وقیع اور قابل نہ سمجھا جائے۔ بعض اصحاب نے انیس کی عربیت کا امتحان بھی لیا مگر بعض مقامات سدرہ وغیرہ کے معمولی بات سمجھکر سمجھا دی۔ ذہانت ایک ایسا جوہر ہے جو ہر شخص کو نہیں ملتا۔ میر انیس کو فصیح البیانی میں جو دستگاہ تھی وہ انکا خاص حصہ تھی۔ میر انیس کتب بینی کے بڑے شایق تھے اور اُن کے کتب خانہ میں ہر علم و فن کی ضروری کتابیں موجود تھیں۔ میر انیس کی تہذیب و تربیت کا کیا کہنا انکی والدہ خود ایک خاتون مہذب اور ضروری تعلیم پائے ہوئے تھیں۔ انکی زندگی ایک اعلیٰ نمونۂ تہذیب اپنی ہمجنسوں میں پیش کرتی تھی اور معزز خواتین کو انسے ملنے کا شوق رہتا تھا۔ میر انیس کی تعلیم اُن کے خاندان ہی میں ہوئی۔ میر انیس کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی۔ کیونکہ میر خلیق زیادہ تر وہیں

رہتے تھے اور کبھی کبھی لکھنؤ بھی آتے تھے۔ میر انیس کا نام "ببر علی" ہے اور یہ نام انکی وجاہت سے رکھا گیا۔

میر انیس میں تمام وہ اوصاف موجود تھے جو ایک کامل اور نازک خیال شاعر میں ہونا چاہئیں وہ تہذیب و ادب تمکین وضع داری کے پابند تھے اور چونکہ فرمانروائے اقلیم سخن تھے مزاج میں شاہانہ شان تھی۔ انکی نازک مزاجیاں علی حزیں کا جواب تھیں انکی ملاقات کے اصول اور وقت مقرر تھے اور کوئی بازاری طرز و انداز ان کے کمرہ ملاقات میں نہیں دیکھے۔ لوگ اب تک میر انیس کی صحبت اور ملاقات کو یاد کرکے افسوس کرتے ہیں۔ میر انیس کی وضع قطع ثقات لکھنؤ کی تھی۔ انگرکھا، کرتہ، پنج گوشہ ٹوپی، ڈھیلا پاجامہ، مخملی جوتہ، فنس کی سواری، اور پیدل بھی معمولی وضع سے نکلتے تھے۔ قدیم زمانہ کی تہذیب عمائد کے موافق میر انیس کو ورزش اور بعض فنون سپہگری کا بھی شوق تھا مگر بالاعلان نہیں۔

میر انیس باوجود مہذب وضع اور طرز معاشرت کے ڈاڑھی منڈاتے تھے اور لکھنؤ میں یہ وضع اکثر مہذب اہل تشیع کی تھی اور بعض سنی اشخاص بھی یہی وضع رکھتے تھے مگر تاہم اکثر ڈاڑھی نہیں بھی منڈاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاڑھی منڈوانا فیشن میں داخل ہوگیا تھا اور اب بھی یہ طریقہ مسلمانوں اور ہنود میں کم وبیش جاری ہے۔ حلق لحیہ (ڈاڑھی منڈوانا) مذہبی اصول کے تو بالکل خلاف ہے۔ بہرحال میر انیس اس زمانہ کی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھے۔

میر انیس جب فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو آتش و ناسخ کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ادھر میر انیس کا خاندان مرثیہ گوئی میں کوس لمن الملکی بجا رہا تھا۔ میر خلیق نے اپنے لائق اور ہونہار لڑکے کو مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے طرز کی تعلیم شروع کی اور اپنے ساتھ میر انیس کو بعض نامی اور ستھری مجالس میں لیجانے لگے۔ میر انیس اپنے والد کے طرز خواندگی وکمال کا نقشہ اُتارنے لگے اور بعد چندے وہ ممبر پر جاکر مرثیہ پڑھنے میں ذرا بھی نہ جھجکتے تھے اور اہل مجلس مرثیہ کی داد میں اپنے دلی جوش کا اظہار کرتے تھے اور اب میر انیس ایک اچھے مشاق مرثیہ گو کی طرح بیباک پڑھنے لگے اور حاضرین مجلس انکی نازک خیالیوں پر صدائے احسنت و آفریں بلند کرکے دل بڑھاتے تھے اور میر خلیق اپنے فرزند دلبند کی لیاقت پر دل میں بیحد خوش ہوتے تھے۔ انکی شہرت کا پھیلنا کتنی بڑی بات تھی کس باپ کے بیٹے تھے گویا تمام لکھنؤ اُنکا مدح خواں تھا۔

میر انیس کی شہرت ذاتی قابلیتوں کی وجہ سے تو تھی ہی لیکن مرزا دبیر کا انکے مقابل میں اُٹھ کھڑا ہونا سونے میں سہاگہ ہوگیا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ فن کو رقابت سے دونی شہرت ہوتی ہے۔

شعرائے فارسی اور اردو کو یہ رقابت گویا میراث میں ملی ہے۔ میر سے لیکر امیر و داغ پر اس کا خاتمہ ہوا اور انکے بعض تلامذہ میں بھی کچھ اثر باقی ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کے فرق پر جو خیالات ظاہر کئے گئے اور کئے جاتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔

میر انیس کا خاندانی مرثیہ گو ہونا مسلم ہے لیکن مرزا دبیر نے اپنے ذاتی شوق سے یہ بات پیدا کی کہ میر انیس ایسے شخص کے حریف اور مقابل تسلیم کرلئے گئے اور اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو شاید دونوں کے طرفداروں کی تعداد مساوی یا کسی قدر کم وبیش ہے۔ انیس کی کئی سوانح عمریاں مرتب ہوچکی ہیں۔ مولانا شبلی نے "موازنۂ انیس و دبیر" چاہے جس پایہ کا لکھا ہو لیکن چونکہ متقابلانہ حالت دکھانے کے بعد دبیر کا درجہ کم کیا گیا ہے اس سے وہ دبیر کے

طرفداروں میں پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا گیا اور اسکی تردید بھی لکھی گئی اور حال میں مرزا دبیر کی سوانح عمری کی تیاری کا اشتہار دیکھا گیا ہے - غالباً راقم سوانح عمری نے مولانا شبلی کے خیالات کا جواب دیا ہوگا - مجھے اس مضمون میں تقابل پر زور ڈالنا فضول سا معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ یہ بالکل طے شدہ بات ہے کہ دبیر کے طرفدار بھی کم نہیں ہیں - مگر دونوں کا اسلوب بیان جداگانہ ہے اور انصافاً یہ مان لینا چاہئے کہ دونوں کامل تھے اگر انیس فصیح اور دبیر بلاغت پسند ہیں تو اس میں کیا مضائقہ ہے فصاحت و بلاغت دونوں شاعری کی جان ہیں اور درحقیقت شاعری کی تکمیل بغیر دونوں کے نہیں ہوسکتی - انداز بیان کا فرق جبلی ہے - اُستاد شاگرد اور باپ بیٹے کا رنگ نہیں ملتا - اور حریفانہ حالت کو ملاحظہ کیجئے تو بھی اسکی کچھ حد نہیں - باپ بیٹے اور اُستاد شاگرد میں رہی ہے - اور یہ دعوی بھی قابل تسلیم نہیں ہے کہ چونکہ دبیر خاندانی شاعر نہ تھے انمیں فصاحت نہیں پیدا ہوئی - اکثر شاعر ایسے ہیں جو اپنی ذاتی قابلیت اور جبلی مناسبت سے خلاف خاندان نامی شاعر اور طبیب وغیرہ ہوگئے - ذوق، غالب، آتش، ناسخ، اسیر، امیر، داغ وغیرہ کو ملاحظہ کیجئے - کتنے انکی اُستادی کو نہیں مانا -

بہرحال انیس و دبیر میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا اگر صحیح بھی ہو تو پبلک اسکی قائل نہ ہوگی - لیکن اگر کوئی شخص انیس کو بے مثل فصیح مانتا ہے تو یہ خیال اسکا ذاتی اور ایک حد تک درست ہے -

تصنیف کا کام ایسا اہم اور نازک ہے کہ شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جسکے کلام میں سُست اشعار نظر نہ آئیں اور اُسکی ذات ہدفِ سہامِ اعتراض نہوئی ہو - مگر ضعف تصنیف سے شاعر کا درجہ کم نہیں ہوتا - شاعر کی شہرت اسکے مجموعی کلام سے نہیں بلکہ بعض غزلوں یا برجستہ اشعار یا کسی زوردار قصیدہ سے ہوجایا کرتی ہے اور جو شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں اُنہیں کو سرمایۂ شہرت سمجھنا چاہئے - انیس و دبیر بھی اعتراضات سے محفوظ نہیں رہے ہیں - لیکن یہ اعتراضات انکے کمال فن کے سامنے بے حقیقت تھے اور جسطرح دریا خس و خاشاک سے متاثر نہیں ہوتا اسی طرح معترضین کامیاب نہیں ہوے -

لکھنؤ کے امرا اور عمائد بھی انیس و دبیر کے قریباً یکساں طرفدار تھے - گو یہ دونوں اُستاد ایک مجلس میں فراہم نہ ہوتے تھے مگر ایک بار واجد علی شاہ مرحوم نے بعض مصاحبین کی ترغیب سے ان دونوں حریفوں کو یکجا کرنے پر توجہ فرمائی - شاہی حکم کی تعمیل کے لحاظ سے دبیر مجلس معینہ میں پہلے آئے - اور جب انیس کو یہ خبر ہوگئی تو ان کو کچھ تکلف ہوا - جب زیادہ تاخیر ہوئی تو شاہی چوبدار کی یاددہانی سے میر انیس فنس پر سوار ہوکر آئے - بادشاہ خوش ہوئے مگر حاضرین کو اس اجتماع ضدین سے حیرت ہوئی - آفتاب و ماہتاب کی قربت سے دونوں کے طرفداروں میں قیامت کی بے چینی پیدا ہوئی - میر انیس کے خودداری نہ تکلف نے طرفداران دبیر پر خاص اثر کیا - مجلس شروع ہوئی اور پہلے مرزا دبیر پڑھے بے حد تعریف ہوئی - اس موقع پر میر انیس کی نسبت حیات انیس میں جناب اشہری مرحوم نے کسی کے بیان کے موافق یوں لکھا ہے کہ جب میر انیس کو بادشاہ نے پڑھنے کا حکم دیا تو میر صاحب چونکہ اپنے ساتھ کوئی مرثیہ نہ لے گئے تھے تو میر مونس (برادر میر انیس) سے پوچھا کہ کچھ ساتھ لائے ہو؟ اُنہوں نے ایک سلام اور مرثیہ پیش کیا اسکو دیکھا اور فوراً ایک مطلع تصنیف کیا اور ممبر پر تشریف لے گئے - مطلع حسب ذیل تھا ؎

غیر کی مدح کردں شہ کا ثنا خواں ہوکر   مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہوکر

اس مطلع میں بادشاہ پر ایک قسم کی چوٹ کی گئی ہے یعنی وہ شہ (حضرت امام حسنؑ یا حسینؑ یا علیؑ) کا ثنا خواں ہوکر غیر کی مدح کرے۔ غیر سے مراد صریحی بادشاہ سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مجلس عزا تھی جس میں صرف مرثیہ خوانی کی جاتی ہے اور یہ کوئی دربار قصیدہ خوانی کا نہ تھا جسمیں بادشاہ کی تعریف سے بھی روگردانی کیجاتی۔ میرانیسؔ ایسے مہذب کے لئے بادشاہ پر یہ آوازا کسنا سمجھ میں نہیں آتا اور یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اس مطلع کی حد سے زیادہ تعریف ہوئی۔ مگر بادشاہ تو دل میں اس شاعرانہ طنز کو سمجھکر ضرور کبیدہ خاطر ہوئے ہوں گے مگر بادشاہ کا یہ اخلاق کہ انہوں نے میرانیسؔ کو سامنے بلوایا اور تعریف کی۔ مگر مرزا دبیرؔ کی تعریف بھی کی۔ مرزا دبیرؔ نے درباری آداب کے لحاظ سے اگر ایک رباعی بادشاہ کی تعریف میں پڑھی تو کچھ بے جا نہیں کیا۔ بہر حال اس مجلس میں دبیرؔ و انیسؔ کا درجہ قریباً برابر ہی سا نظر آتا ہے اور طرز بیان سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیدینا اور بات ہے حالانکہ اس مضمون میں میرانیسؔ ہی کی سخنوری کی داد دینا مقصود ہے لیکن امر حق پر پردہ ڈالنا انصاف کے خلاف ہے۔ کسی سوانح نویس کو اپنے دلی رجحان کے موافق رائے نہ ظاہر کرنا چاہیے بلکہ وہ پبلک کے جذبات کو دیکھکر منصفانہ رائے دے۔

میرانیسؔ کی شہرت اور انکی فصیح البیانی کا شہرہ درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ عظیم آباد، کلکتہ، بہار، مرشد آباد وغیرہ میں میرانیسؔ کے قدرداں اور طالب موجود تھے اور انکی مرثیہ خوانی کے شیدائی بڑی بڑی شاندار مجلسوں میں میرانیسؔ پڑھنے جاتے تھے۔ مشتاقان کا ہجوم بھی بے حد ہوتا تھا اور دادِ سخن بھی شایانِ کلام ہی کے موافق ملا کرتی تھی۔ حیدرآباد بھی میرانیسؔ سر سالار جنگ مرحوم کی اصلی تحریک سے بوساطت نواب تہور جنگ بہادر گئے۔ اس شاہانہ مجلس کا کیا کہنا۔ حیدرآباد ایسا شہر اور اس میں سر سالار جنگ ایسے ذی رتبہ اور صاحب اثر اور تمام عمائدین و امرا کا آنا مجلس کی شان کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر سرآسماں جاہ بہادر نے بھی میرانیسؔ کو پڑھوانا چاہا۔ مگر معلوم نہیں سرآسماں جاہ بہادر نے یہ زمیں دوز شرط میرانیسؔ کے ساتھ کیوں لگائی کہ وہ حیدرآباد کی منصبداری پگڑی سر پر رکھ کر مرثیہ پڑہیں۔ مگر میرانیسؔ نے اس موقع پر اپنی بات رکھنے کے لئے دنیاوی دولت کی پرواہ نہ کرکے شرط مذکورہ بالا کو نامنظور کیا۔ علیٰ ہذا اور مجالس میں بھی میرانیسؔ کی خوب خوب قدر دانیاں ہوئیں اور لکھنؤ تو گویا انکے لئے ایسا تھا جیسے عندلیب کے لئے گلستاں۔

میرانیسؔ ایک بڑے ہی پرگو اور جیّد مصنّف تھے۔ انکے مرثیوں کی تعداد ہزاروں بیان کی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن مطبوعہ کلام کی مقدار تو اتنی نہیں ہے لیکن جو کچھ ہے وہ کیا کم ہے۔ میرانیسؔ مرثیہ گوئی کے سوا تغزل کے رنگ میں بھی ڈوبے ہوئے تھے اور نیچرل مناظر (سین) کی مصوری تو اُنکا خاص حصّہ تھا۔ اگر میرانیسؔ کا بقیہ کلام بھی کوشش سے فراہم ہوکر چھپ جاتا تو بہت خوب تھا۔

میرانیسؔ یا مرزا دبیرؔ کی مرثیہ گوئی کی زیادہ دھوم کیوں مچ گئی اور کیوں یہ کہا جاتا ہے کہ مرثیہ گوئی کا انہیں پر خاتمہ ہے؟ غالبؔ ایسے زباں آور نے بھی اس بات کا اعتراف اس موقع پر کیا ہے جب انسے ایک ذی اثر شخص نے مرثیہ کی فرمائش کی تو انہوں نے صاف کہدیا کہ یہ کام میرانیسؔ و دبیرؔ کا ہے۔ فارسی شعرا نے بھی مرثیہ کہا ہے۔ فارسی میں ملا مقبل وغیرہ کے مرثیے قابل تحسین ہیں۔ انکی نازک خیالیوں اور ادا بندیوں کا جواب ہی

نہیں مگر فردوسی، سعدی، و امیر خسرو نے بھی مراثی لکھے ہیں اور خود اردو میں ضمیر، سودا اور دیگر شعراء نے مراثی لکھے ہیں۔ لیکن میر انیس وغیرہ نے ان مراثی پر گویا خط نسخ کھینچ دیا۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ انیس نے نیچرل جذبات کے ساتھ مراثی کو لکھا ہے اور اسکی تمہید میں حد کا زور طبع دکھایا ہے۔ مبصر اس بات کو سمجھتا ہے کہ انیس وغیرہ نے مرثیوں میں جا بجا شان تغزل بھی دکھا دی ہے ورنہ محض واقعات کربلا کو نظم کرکے اس درجہ کامیابی نہیں حاصل ہو سکتی۔ یہ مانا کہ واقعات کربلا حد درجہ دردناک اور دلخراش ہیں مگر انکی دردمندی اہل مذہب کے لئے ہے اور اُنسے صرف قلب پر اثر پڑ سکتا ہے لیکن اس میں نازک خیالیوں کی روح پھونکنا آسان کام نہ تھا۔ فارسی کے جو مرثیے اس شان کے تھے وہ خاص لوگوں کی دلچسپی کا باعث تھے۔ مگر عوام یا اردو کا رنگ پسند کرنے والے انسے زیادہ حظ نہ اٹھا سکتے تھے۔ مگر انیس نے مراثی، سلام اور رباعیات میں وہ سحر طرازی دکھائی کہ لوگ دنگ ہو گئے۔ میر انیس نے مرثیوں کا ٹھاٹھ قدما سے الگ تھلگ رکھا ہے۔ وہاں بالکل سادگی یا معمولی معنی آفرینی تھی مگر انہوں نے اس کا خاص اہتمام کیا۔ ہر مرثیہ میں ایک پھڑکتی ہوئی تمہید اور چونکہ طبیعت میں خداداد روانی تھی مرثیہ میں نور کا عالم پیدا ہو گیا۔ رنگیں بیانی کے ساتھ رزم بزم اور دیگر مناظر نیچرل کا فراہم ہو جانا ایک طرفہ معجون ہو گیا۔

فردوسی رزم کے لئے مشہور ہیں، نظامی بزم کے لئے۔ مگر انیس کی ہمہ گیر طبیعت نے رزم و بزم دونوں پر قابو حاصل کیا۔ اس بیان کرنے سے یہ غرض نہیں ہے کہ انیس کا درجہ فردوسی یا نظامی سے بڑھ گیا۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے تو وہ انصاف کی خونریزی کرنا چاہتا ہے مگر چونکہ انیس ایک خاص رنگ کے موجد ہیں تو ان کو ہندوستان کا فردوسی اور نظامی کہنا بیجا بھی نہ ہوگا۔

میر انیس یکفنی تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر سے شاعری شروع کی اور ستر برس یا کچھ متجاوز ہو کر دنیا کو خیرباد کہا۔ اس حساب سے گویا پچاس برس سے دو چار برس زیادہ مشق سخن رہی۔ انیس کی قدردانیاں بھی ایسی ہوئیں کہ باید و شاید۔ انیس کی مرثیہ گوئی یا شاعری میں تمام وہی خوبیاں کسی قدر زیادتی سے موجود ہیں جو اور مشہور نیچرل رنگ لکھنے والے شعرا کے یہاں ہیں۔ لوازم شاعری (تشبیہ استعارہ مبالغہ غلو) بھی بدستور ہیں جو کچھ فرق ہے وہ طرز بیان کا۔ صبح و شام، بحر و بر، صحرا و باغ، زمین و آسمان، رنج و غم، رحم و غضب، دلیری، بزدلی، تلوار، اور گھوڑے کی تعریفیں، تمام شعرائے فارسی نے حسب موقع کی ہیں اور خوب خوب مضامین لکھے ہیں۔ لیکن انیس نے تلوار اور گھوڑے کی تعریفوں میں مختلف انداز اور ترکیب سے قلم اٹھایا ہے اور چونکہ ایشیائی شاعری کے دلدادہ سلاست اور حسن بیان پر مٹے ہوئے ہیں اس لئے وہ اُن سے ایک خاص لطف حاصل کرتے ہیں۔ لیکن نفس مطلب پر غور کرنے والا مبصر مبالغہ سے زیادہ خوش نہیں ہوتا۔ وہ حسن بیان کے ساتھ معانی کی بلندی اور بلاغت اور خیال کی جدت پر بھی نظر ڈالتا ہے اور جن لوگوں نے اساتذۂ فارسی کے کلام کی سیر عمدہ طور پر کی ہے وہ اردو شاعری کا فارسی شاعری سے موازنہ خوب کر سکتے ہیں۔

میر انیس کو انتقال کئے ہوئے پچاس برس کے قریب ہو گئے۔ گو میر انیس کی فصاحت اور لطف بیان مسلم ہے مگر پچاس برس کے بعد اب اُردو زبان نے پھر کسی قدر رنگ بدلا ہے۔ اگر کوئی بڑا تغیر عظیم نہیں ہوا تو اتنا تو ضرور ہوا کہ کچھ وہ الفاظ اور محاورے جو اُس زمانہ میں تھے اب نہیں بولے جاتے لیکن اس تغیر سے فن پر کوئی الزام نہیں آ سکتا۔ ابھی معلوم نہیں زبان میں اور کتنے تغیرات

ہونے والے ہیں۔

مجھ ہیچمدان کی ناقص رائے یہ ہے کہ تنقید میں تا امکان ذاتی رائے کو دخل دینا نہ چاہیئے اگر صرف کسی شاعر کی مدح سرائی مقصود ہے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن دو شاعروں کو متقابلانہ اسٹیج پر لاکر جب سخن پروری سے کام لیا جاتا ہے تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ مولانا شبلی نے باوجود اس علم و فضل کے "موازنہ انیس و دبیر" میں میر انیس کے بعض ان اشعار کو بھی انتخاب کر لیا ہے جنکے انتخاب کی ضرورت نہ تھی۔ ضعفت تالیف کسی شاعر کے لئے تو غیر معمولی بات نہیں ہے مگر انتخاب میں جب معمولی شعر لیا جاتا ہے تو اس سے منتخب کی طرفداری یا غیر مبصری ثابت ہوتی ہے۔ لیکن مولانا شبلی تو فاضل اور فارسی زبان کے عمدہ شاعر ہیں انکی طرف ایسا خیال ہو نہیں سکتا۔ مگر "موازنہ انیس و دبیر" میں انیس کے یہ اشعار بھی انتخاب کئے گئے ہیں ؎

یوں روح کے طائر تن دسر چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

مصرعہ اولیٰ میں روح کی خصوصیت تن و سر سے کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ روح کا تعلق تو رگ رگ سے ہے صرف بدن یا تن کہنا کافی ہو سکتا تھا۔ مصرعہ ثانی مثالیہ ہے۔ میں یا کوئی اس شعر کو غلط نہیں کہہ سکتا لیکن یہ شعر اعلیٰ درجہ کا بھی نہیں ہے۔

علیٰ ہذا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

مردم سیاہ پوش ہیں سب اور گھر سفید
جیسے بیاض چشم ادھر اور اُدھر سفید

مصرعہ اولیٰ میں رعایت لفظی ہے اور دوسرا مصرعہ گویا اسکی شرح ہے۔ شعر معمولی ہے۔ تلوار کی تعریف ؎

جوہر* میں پیچ و تاب تھا زلفوں کی چال کا بجلی کی زرق برق تھی چم خم ہلال کا

شعر بامعنی ہے مصرعہ اولیٰ میں "زلفوں کی چال" کی موشگافی کی جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ جوہر تیغ کا پیچ و تاب مثل زلف یار کے تھا لیکن زلفوں کی چال کیا معنی۔ دوسرے مصرعہ میں زرق برق صرف بجلی کی رعایت سے ہے حالانکہ زرق برق ہونا پوشاک کے لئے کہا جاتا ہے مگر ممکن ہے کہ کسی قدیم شاعر اردو نے یوں بھی کہا ہو۔

یہ شعر بھی اسی صنف کا ہے ؎

یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جھول کو
جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

مصرعہ ثانی میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ پھول کا روکنا شہ زوری کو نہیں چاہتا بلکہ کمزور بھی روک سکتا ہے اور تلوار کی زد کو ڈھال پر روکنا ایک معمولی بات ہے۔ البتہ چہرہ پر یا ہاتھ پر روکنا غیر معمولی شجاعت اور دلیری ہے۔ اس لئے یہ مثال کچھ زیادہ لطیف نہیں ہو سکتی۔

اڑ کر گری زمیں پہ سناں اس نکان سے گرتا ہے جیسے تیر شہاب آسمان سے

میرا خیال یہ ہے کہ سناں میں پروا نکی کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی البتہ سناں دست راکب میں بلند ہوتی ہے۔ بان یا ہوائی میں البتہ یہ حالت دیکھی گئی ہے کہ وہ مثل تیر شہاب کے بلند ہو کر زمین پر گرتی ہے مگر سناں میں یہ بات نہیں پیدا ہو سکتی۔ تشبیہ دی گئی ہے مگر لطیف و کامل نہیں ہے۔

حاشا یہ نکتہ چینی معترضانہ حیثیت سے نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ کیسا ہی قادر الکلام شاعر کیوں نہو بتقاضائے انسانیت بعض اشعار میں کمزوری پیدا ہی ہو جاتی ہے۔ بعض اشعار کا مفہوم ایسا الجھا ہوا ہوتا ہے کہ دوسرے اسکو عمدگی سے نہیں سمجھ سکتے۔ اساتذۂ فارسی کے بعض اشعار بھی اس قسم کے

*ہمارے خیال میں صحیح مصرعہ یوں ہے :۔ "جوہر میں پیچ و تاب تھا زلفوں کے جال کا"۔ ایڈیٹر

ہیں۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض اشعار میں برابر کے مصرعے نہیں ہوتے یعنی ایک مصرعہ چست ہے اور دوسرا سست۔ ایک دوسرے رنگ کا ہے اور دوسرا دوسرے طرز کا۔ ایسے ہی اشعار پر نکتہ چینی کی جا سکتی ہے۔ انیس نے صبح و شام وغیرہ کے جو مناظر دکھائے ہیں واقعی ان میں حد درجہ صفائی اور لطافت معنوی ہے مگر یہ دعوی نہیں کیا جا سکتا کہ شعرائے فارسی نے اس رنگ کے لکھنے میں عجز طبیعت دکھایا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نظامی گنجوی ہی کو لیجئے انہوں نے شب اور طلوع آفتاب وغیرہ کی مختصر تمہید لکھی ہے اس کا جواب ہی نہیں ہو سکتا۔ میں دو چار شعر کا انتخاب کرتا ہوں ناظرین انکی بلاغت و فصاحت اور معنی خیزی کو غور سے ملاحظہ فرمائیں ؎

علم برکش اے آفتاب بلند   خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
بنال اے دلِ رعد چوں کوسِ شاہ   بخند اے لبِ برق چوں صبحگاہ
ببار اے ہوا قطرۂ ناب را   بگیر اے صدف دُر کن آں آب را
برآ اے دُر از قعر دریاے خویش   بتاجِ ~~شہ~~ کن جاے خویش

ان اشعار کا بلیغ مفہوم و معنی یہ ہے کہ اول آفتاب گرمی کرتا ہے پھر اس سے بخارات پیدا ہوتے ہیں پھر ان بخارات کے تصادم سے رعد پیدا ہوتا ہے اور اسی تصادم سے برق پیدا ہوتی ہے اور پھر اس سے صدف اکتساب آب کرتی ہے اور اس سے دُر شہوار پیدا ہوتا ہے اور دُر قعر دریا سے باہر آتا اور وہ تاج شاہ (ممدوح مصنف نصرۃ الدین) میں جگہ کرتا ہے۔ ناظرین اس بلیغانہ ترکیب کو ملاحظہ فرمائیں۔

ایک دوسرے مقام پر جہاں لشکر سکندر نے فیروزی حاصل کی ہے اس صبح کی مصوری یوں کی ہے ؎

سپاہِ سحر چوں علم برکشید   جہاں حرفِ شب را قلم برکشید
دماغِ زمیں از تفِ آفتاب   بسر سام سودا در آمد بخواب

یہ منظر بھی ملاحظہ ہو ؎

چو روزِ سپید از شبِ زاغ رنگ   برآمد چو کافور زا تصاے زنگ
ہوا صاف از دود گیتی ز گرد   فلک روے خود شست از لاجورد
فروزندہ روزے چو فردوس پاک   برآورد سر گنجِ قارون ز خاک
بعزلت کمر بستہ باد خزاں   نسیم بہاری زہر سو دواں
ہمہ کوہ و گلشن ہمہ دشت و باغ   جہاں چشم روشن بزیں چراغ

شعرائے فارسی نے کوئی منظر (آفتاب) ایسا نہیں ہے جو اپنی تصانیف میں یادگار نہ چھوڑا ہو۔ انگریزی مصنفین شکسپیر وغیرہ نے جو مناظر صبح و شام وغیرہ دکھائے ہیں گو وہ کیسے ہی صاف اور دلنشیں کیوں نہوں لیکن ایشیائی شعرا اُن سے کم نہیں رہے ہیں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اُردو شعرا نے قدماے فارسی ہی سے فیض حاصل کیا ہے۔

میر انیس نے مذکورۂ بالا مناظر میں خوب خوب زور طبیعت دکھایا ہے اور اسکی داد بھی انہوں نے خوب حاصل کی اور یہ حد کی بات ہے کہ مرنے کے بعد بھی ان کی سحر نگاری کی تعریف کی جاتی ہے اور یہ سب بجا و درست ہے۔

میر انیس نے ایک مرثیہ کی تمہید اس طور پر لکھی ہے کہ اس میں صبح و آخری شب کی حالت دکھائی ہے اور درحقیقت یہ مرثیہ بہت ہی زوردار ہے۔ اس میں حضرت قاسم کی جنگ کا بیان ہے اسکی تمہید ایسی دلکش ہے جو بعض شعرائے فارسی کے رنگ پر بھی غالب آنا چاہتی ہے۔ نظامی کے جو چند اشعار لکھے گئے ہیں اُنسے انکو ملائیے تو امر حقیقت آشکار ہو۔ مگر مبصر سمجھتا ہے کہ نظامی کی بلاغت کا رنگ اور ہے۔ اُردو میں اس قسم کی بلاغت اور معنی آفرینی کی یا تو گنجایش نہیں ہے اور یا ایسے رنگِ کلام دکھانے کی

کوشش نہیں کی گئی - سنسکرت اور ہندی میں ایسے خیالات البتہ قلمبند کیے گئے ہیں۔ بہرحال میر انیس نے اپنے قلم معجز رقم سے جو سین کھینچا ہے وہ لاجواب ہے۔ درحقیقت یہ مرثیہ جواہر میں تولنے کے قابل ہے اور مجھے تعجب ہے کہ کیوں نہیں کلیم (شاعر فارسی) کی طرح میر انیس کو کسی قدر دان نے زر و سیم میں تول کر قدر دانی کی نظیر نہ قائم کی یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح — سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گزار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا — کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا
چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دمبدم — وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا
وہ صبح نور اور وہ سبزہ وہ لالہ زار — کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغ بہشت نعیم کے — ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے
آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں — ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں
ہر نخل پر ضیائے سر کوہ طور تھی — گویا فلک سے بارش باران نور تھی
اوج زمیں سے پست تھا چرخ زبرجدی — کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمردی

اسی مرثیہ میں میر انیس نے مبارزین اور اسلحہ کی حالت بھی شاعرانہ خوبیوں سے نظم کی ہے اور جب اس کا مقابلہ نظامی یا فردوسی کی نظم سے کیا جائے تو اُن سے درجہا بہت گھٹی ہوئی نہ ہوگی۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ فردوسی اور نظامی نے یہ مقامات بہت شان سے لکھے ہیں۔ یہ لطف اُردو میں نہیں پیدا ہو سکا مثلاً نظامی لکھتے ہیں کہ

رسیدند لشکر بجائے مصاف — دو پرکار بستند چوں کوہ قاف

اور اس شعر کا مبالغہ اور لطف بیان تو اپنا مثال ہی نہیں رکھتا۔

ز سم ستوران دراں پہن دشت — زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

اس شعر میں مبالغہ ہے مگر کتنا صاف کہ سم ستوران سے زمین کا ایک طبق آسمان پر اڑ گیا اور سات آسمان کے آٹھ ہو گئے اور زمین کے سات طبقے تھے مگر اب چھ ہیں۔

پھر ایک شعر کا مبالغہ اور واقفیت ملاحظہ ہو۔

چناں گرم شد آتش کارزار — کہ از نعل اسپاں بر آمد شرار

ضرب اور صدمہ سے لوہے سے آگ کا نکلنا کتنی بدیہی بات ہے اور پھر مبالغہ بھی حد کا۔ اور اس شعر کی آمد اور شوکت بھی ملاحظہ ہو

بر آمد ز قلب دو لشکر خروش — رسید آسماں را قیامت بگوش

انیس ؎

تھا لشکر یزید میں سامان قتل شاہ — ہر سو جما رہا تھا صفیں شمر روسیاہ
اک صف میں برچھیوں کی چمک تھی کہ الحذر — انیاں وہ توڑ ڈالیں جو فولاد کا جگر
جب بندھ گئیں صفیں تو علم کھل گئے تمام — غل پڑ گیا کہ جنگ کو نکلیں شہ امام

حضرت قاسم کی دلیری کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

غازی تھے صف شکن تھے جری تھے دلیر تھے — جسمیں علی رہے اسی بیشہ کے شیر تھے

انیس نے گھوڑے کی تکاپو کا یہ شعر کتنا بلند کہا ہے نظامی کے شعر کو ملا کر موازنہ کیجئے ؎

میخیں زمیں کی اسکی تکاپو سے ہل گئیں — دونوں کنوتیاں بھی کھڑے ہو کے مل گئیں

میدان جنگ کے ہولناک ہونے کی تصویر کیا خوب اتاری۔ نظامی نے زمین کا ایک طبق سم ستوران سے اڑایا ہے۔ انیس نے میدان جنگ کی گرد آفتاب کے چہرہ تک پہونچائی ہے ؎

چہرہ پہ آفتاب کے مقتل کی گرد تھی — یہ خوف تھا کہ دھوپ کی رنگت بھی زرد تھی

میر انیس نے جس میدان جنگ کی تصویر کھینچی ہے وہ مذہبی رنگ کا پیرایہ لئے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ مقدس شہیدان کربلا کو کس مجبوری کے عالم میں اشقیا سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ اہلبیت اطہار نے مدافعت کے طور پر مقابلہ کیا اور نہ طرفین کا تقابل برابر کا تھا اور نظامی و فردوسی نے جن میدان جنگ

کا نقشہ دکھایا ہے وہ درحقیقت دو حریفوں کا شاہانہ تقابل تھا اور اس میں جو کچھ سامان حرب و ضرب تھا اعلیٰ پیمانہ پر تھا۔ اس لئے دونوں کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ تاہم انیسؔ نے قادر الکلامی سے اس مذہبی جنگ کو نہایت شان سے نظم کیا ہے۔

اعجاز لکھنوی

سرزمینِ دہلی

پر ذُوا ذناب آفتاب و ماہتاب کا نزولِ اجلال

لوگ اس پہیلی کو سُنکر تعجب کریں گے اور بے ساختہ یہی کہیں گے کہ آسمان پر تو ذُوا ذناب سیّاروں کو دیکھا اور اُن کے حالات کتابوں میں پڑھے، مگر زمین پر ذُوا ذناب کا آنا اور جلوہ گر ہو کر خرام کرنا کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ اُن کا طلوع صدیوں میں ہوتا اور بڑے بڑے انجم پرستوں، تو ہمات گرفتوں کو فکر و اَوہام باطلہ میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن وہ بھی درحقیقت زیبندۂ فضاے آسمان ہوتے ہیں۔ اُن کا لاکھوں کروڑوں سیّاروں میں سے گزرنا اور دور تک اپنے وابستہ سیّاروں کی لانگاٹیر دکھانا، ایک دلکش و فرحت افزا تماشا ہوتا ہے۔

یہ دُنبالہ دار سیّارے باوجودیکہ نہایت سریع السیر ہوتے ہیں، مگر پھر بھی اہلِ زمین کو اپنا جلوہ کبھی اوّل، کبھی وسط، اور کبھی اخیر شب میں دکھا دیتے ہیں۔ لیکن دن دہاڑے کسی کے سامنے نہیں آتے، اور نہ اپنی آمد کے وقت کڑکناتے، توپ کی سی کڑک وَنادَن کی آواز، بجلی کی سی چمک، بندوقوں کی سی باڑ سے ایسی دُھوم مچا دیتے ہیں، جس سے تمام جہان گونج اُٹھے۔

ہم جن دو نُورانی ذُوا ذناب بلکہ جہانتاب سیّاروں کا ذکر کرتے ہیں، اِنکی روشنی کے آگے آفتابِ نصف النہار بھی ماند تھا۔ جن میں ایک سورج اور ایک چاند تھا۔ انکی آمد آمد میں زمینی سیّاروں کا جھُرمٹ رنگ رنگ کی چمک دمک دکھا رہا تھا۔ یہ گیتی افروز سیّارے ایسے قرینے سے صف بستہ قطار در قطار، کہیں بشکلِ ہلال کہیں بہ ہیئتِ سوار پرا جمائے کھڑے تھے کہ دنیا کے کسی بہت بڑے نورٌ علےٰ نور دو ذُوا ذناب سیّاروں کے منتظر ہیں۔ دکنی سیّارے دکن سے جھُومر کھیلنے آئے ہیں، تو راجپوتانہ کے سیّارے سُوئی سُوئی پگڑیاں باندھ کر بھگوا لینے اور رہس کا جلوہ دکھانے تشریف لائے ہیں۔

تم دیکھ لینا ان دونوں تقدس مآب سیّاروں کا قدم مبارک اور ایسا مبارک ہوگا کہ سیکڑوں برس کے مُردوں کو اپنی مسیحائی سے ایک ہی ٹھوکر میں زندہ کر دکھائے گا۔ اُنکی رعیمانہ آبپاشی اور رونق افروزی سے افسردہ دلوں کے چہروں پر پانی پھر جائے گا۔ مرادمندروں کی مرادیں بر آئیں گی۔ علم کی روشنی تمام ہندوستان میں پھیل جائے گی۔ انہیں انجم سیاہ کہنا بیجا نہوگا۔ سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کے زمانہ کو بھول جائیں گے۔ یہ آفتابی و مہتابی زمانہ رہتی دنیا تک آباد و یادگار رہے گا۔ نہیں نہیں! اس وقت کے بعد بھی یہ دونوں جگمگاتے ہوئے سیّارے

آفتاب و ماہتابِ ہند و انگلینڈ کہلائینگے۔

بھلا ! اِس عجیب و غریب پہیلی کی بُوجھ کیا ہے ؟ اگر سمجھ گئے تو بُوجھو اور اگر نہیں سمجھے تو ہم سے پُوچھو۔

یہ بارہ دسمبر ۱۹۱۱ء کے دربار دُربار کے اُس وقت کا سماں ہے جس وقت ہمارے کیواں بارگاہ شہنشاہِ معظم **جارج پنجم** دام اقبالہم اور ثریا مرتبت والاجاہ ہماری مادرِ مہربان عُلیا حضرت ملکۂ معظمہ **میری** دام اقبالہا نے دربار تاجپوشی کے موقع پر انگلستان کے دستور کے موافق شاہانہ لباس جسے انگریزی میں ٹرین کہتے ہیں زیب تن فرمایا۔ چونکہ اس شاہانہ پوشاک کا پچھلا آنچل بجانب پائیں گزوں دور تک پھیلا ہوا ہوتا ہے اِس وجہ سے چھوٹے چھوٹے شہزادے، رئیس زادے، نوابزادے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں اِسے زمین سے اُدھر اُٹھا ئے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ ایسا دل کش و نظر افروز ہوتا ہے کہ اُس وقت بے اختیار دنبالہ دار سیّاروں سے تشبیہ دینے کو دل چاہتا ہے۔ ٹرین کا لفظ خود دلالت کرتا ہے کہ آگے آگے آفتاب و ماہتاب اپنے اپنے سر مبارک پر مُرصّع تاج قیصری رکھے ہوئے جس کا ایک ایک انمول ہیرا لفظِ ہیرو پکار رہا ہے خراماں خراماں چل رہے ہیں اور پیچھے پیچھے اِن خرُد سال سیّاروں کی ٹرین پَرا باندھے مفاخرانہ انداز سے ساتھ ساتھ چلی آتی ہے۔ اوّل جہاں پناہ اور ملکۂ معظمہ ایمفی تھیٹر کے شامیانہ میں تختِ شاہی پر عجب شان و شوکت اور تجمل و احتشام سے رونق افروز ہوئے ہیں۔

تمام اراکین سلطنت اور رؤسا ہند درجہ بدرجہ آداب بجالائے ہیں۔ پھر اسی انداز سے تاجپوشی کی خوشنما بُرجی میں پا پیادہ تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں احکام شاہی سناکر تمام ملک کو مرہونِ احسان اور گرویدۂ اخلاق ذی شان بنا لیا ہے۔

جڑاؤ تاج کی جگمگاتی ہوئی روشنی ثابت کر رہی ہے کہ دربار کی زمین آسمان ہے۔ اراکین سلطنت **سبع سیّارے**، رؤسا و امرا ہند **پروین**، حاضرین دربار اور سب کے سب تماشائی ثوابت ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر رنگ رنگ کا لباس پہنے ہوئے جمے کھڑے ہیں۔ سواروں اور پیدلوں کی قطاریں کہکشاں ہیں۔ تخت پر جلوہ افروزی کا شامیانہ **خانۂ آفتاب** ہے اور تاجپوشی کی بُرجی **بُرجِ قمر**۔

جس وقت شہنشاہ اور شہنشاہ بیگم اِس کرّو فر سے اوّل شامیانے سے تاجپوشی کی مکلّف و آراستہ خوشنما بُرجی کی طرف تشریف فرما ہوئے تو سب کے دلوں نے اِس بات کو مان لیا کہ یہ دونوں تاجدار دنبالہ دار سیّارے ہیں، اور خدائے تعالیٰ نے آج یہ دونوں شمس و قمر دہلی کی سرزمین کو پونے تین سو برس بعد از سر نو فخر و امتیاز بخشنے، قدیم دارالخلافہ سے بہتر دارالسلطنت بنا دینے کے واسطے اپنا سایۂ رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ ادھر دِلّی کے دن پھرے اُدھر رعایا کی من مانی مُرادیں پوری ہوئیں۔

اللہ اللہ ! یہ شان و شوکت سے بھرا ہوا بارہ دسمبر ۱۹۱۱ء ٹھیک دوپہر کا دربار بھی موجودہ نسلوں کو تا بہ زندگی یاد اور ذکر کے ساتھ دل شاد کرنے والا رہے گا، اور آیندہ نسلوں کیواسطے تاریخ ہند کے مطلّا اوراق میں سب سے بہتر زمانہ سمجھا جائے گا۔ اس کا ذکر سنتے ہی لوگوں کے کان اُدھر لگ جائیں گے اور سامعین آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں گے کہ کہیں وہی ٹھاٹھ پھر تو نہیں جما۔ جشن **جمشید** افسانہ ہوگا اور جشن **شاہجہاں** داستان پاستاں۔ ہندوستان کا دل جسے دِلّی کہتے ہیں اسی دربار کی بدولت مرکز جی اُٹھا اور اس میں امن و امان نیز رحیمانہ و فیاضانہ فرمان کا ڈنکا بج گیا۔ اپنے شہنشاہ کے دیدارِ فیض آثار سے ادنیٰ و اعلیٰ پھُولے پھُولے پھرے، اور ایسے

خوش ہوئے کہ پھولے نہ سمائے۔ ہر ایک کی وہ دلجوئی اور ہنگامہ دربار کے موقع پر محافظت ہوئی کہ پانوں تلے کی چیونٹی کو بھی اذیت نہ پہنچی۔

اب تو اس پہیلی کی بوجھ معلوم ہوگئی۔ لو آؤ اور صدق دلسے اپنے شہنشاہ جارج پنجم نیز اُنکی ملکہ معظمہ کیواسطے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دعا مانگو کہ خدا انکی عمر۔ دولت۔ اقبال وثروت۔ انصاف و معدلت۔ رعایا پروری۔ وضیع وشریف نوازی۔ زمانۂ امن وامان آل واولاد امجاد اور تمام خاندان کو قیامت تک سلامت با کرامت رکھے۔ آمین ثم آمین

سید احمد دہلوی

جو ہو چکا سو ہو چکا

نئے سال میں داخل ہوتے وقت اپنے نقصانوں اور دکھوں کی یاد تازہ مت کرو، اور نہ یہ رام کہانی دوسروں کو سناتے پھرو۔

جو ہو چکا سو ہو چکا

فرض کرو کہ ایک مہربان دوست فاخرہ لباس کے لئے کپڑا تمہارے نذر کرتا ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ تم اس کو اٹھا کر پھینکدو اور ہتک آمیز لہجہ میں اُن پوشاکوں کا ذکر چھیڑ دو، جو تم پہلے پہن چکے ہو؟

نیا سال تمکو کتاب زندگی کا نیا ورق اُلٹنے کا موقعہ دیتا ہے پس گئی گزری باتوں کے یاد کرنے اور گزشتہ خوشیوں، برکتوں اور فائدوں کے ذکر کرنے سے کیا حاصل؟

یہ نہ کہو کہ کامیابی اور خوشی کے حاصل کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ یا کہ تمہارا جی دکھیارا اور بیکل ہو رہا ہے۔ جی صفات ربانی سے متصف ہے اور کبھی دکھیارا اور بیکل نہیں ہو سکتا۔

تمہارے جسمانی دکھ درد تمہارے من سے پیدا ہوئے ہیں۔ آتما کو مضبوط بناؤ اور نئے سال میں صحت، امید اور خوشی کے طلبگار رہو۔

بھول جاؤ اُس ٹوٹے کو جو تم اٹھا چکے ہو۔ اُن غلطیوں کو جو تم سے سرزد ہوئیں۔ اُن تکلیفوں کو جو تم پر ٹوٹ پڑیں، اور ان ناکامیوں کو جن سے تم کو پالا پڑا۔

البتہ اُس حقیقی رنج کو جو کسی پیارے کی جُدائی، یا کسی مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے سے لاحق ہوتا ہے، فراموش کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ایسی آزمائشیں تمہاری طبیعت کو مالا مال کرنے اور تم میں انسانیت اور ہمدردی کا مادہ بڑھانے کے لئے بھیجی گئی ہیں، اور اگر وہ الٹا تمہاری طبیعت میں چڑچڑاپن اور ترشروئی پیدا کریں۔ تو جان لو کہ تم ان کے اصلی فائدہ سے محروم رہے جاتے ہو۔

یہ سمجھ بیٹھنا کہ مصیبت کا پہاڑ فقط تمہارے ہی سر پر ٹوٹ پڑا ہے، بزدلی اور نافہمی میں داخل ہے۔ دنیا میں کوئی بشر رنج وغم سے آزاد نہیں۔ پس نئے سال کے آغاز میں ٹھان لو کہ تم اُن تمام تکلیفوں کو جو تم پر نازل ہوں گی، اپنے جی اور روح کی تربیت کا موجب سمجھو گے اور جو کچھ تمہارے ساتھ بیت چکی ہے تم اُسکی

مدد سے اپنی خصلت کو نیک شعار شاندار اور اپنی زندگی کو کامیابی کا نمونہ بناکر دکھلاؤ گے۔

یہ مت سمجھو کہ اب تم عمر رسیدہ ہوگئے ہو۔

عمر محض وہم ہے۔ تم عمر کا خیال چھوڑ دو، اور عمر تمہارا خیال چھوڑ دے گی۔

کھانے پینے میں اعتدال رکھو۔ ایسے ٹھنڈے پانی سے نہاؤ جیسا کہ قدرتی برساتی پانی ہوا کرتا ہے، اور خوب باقاعدہ ورزش کرتے رہو۔

سر سے پیر تک زندگی کا احساس کرو۔ گہرے سانس لیا کرو تاکہ صبح و شام کم از کم پانچ منٹ تک پھیپھڑوں کے تمام خانے ہوا سے خوب بھر جائیں، اور سانس لیتے وقت یہ خیال مد نظر رکھو کہ تم صحت، دانشمندی، اور کامیابی کو اپنی طرف کھینچ رہے ہو۔

صحت اور تندرستی کی امید رکھو، اور اگر انکے آنے میں وقفہ پڑ جائے تو اسے محض عارضی توقف سمجھکر کبھی بیدل مت ہو۔

اگر کوئی جسمانی دکھ درد آجائے تو اُسے محض عارضی تکلیف سمجھو، اور ایک لمحہ کے لئے یہ نہ خیال کرو کہ تم ہمیشہ کے لئے بیمار اور لاچار ہوگئے ہو۔

فرانس کے نوجوان سونا بنانے کی امید میں کیمیاگری کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں لیکن اگر تم اپنی ذات اور اسکی لا انتہا طاقتوں پر غور و خوض کروگے تو تم اِس رازِ سربستہ سے بہرہ ور ہو جاؤ گے، جو ابھی تک کسی کیمیاگر پر ظاہر نہیں ہوا، اور جسکی مدد سے تمہاری دلی آرزوئیں بر آئیں گی۔

جسم کو ایک روپہلی صندوقچہ سمجھو، تن کو ریشمی استر، اور روح کو ہیرا۔ صندوقچہ کو مصفّا اور گرد و غبار سے پاک صاف رکھو لیکن یاد رہے کہ اندر والا ہیرا ہی سب سے قیمتی چیز ہے۔

یہ سمجھو کہ تم بے نظیر کامیابی کی دہلیز پر قدم رکھنے کو ہو۔ تمہارے سامنے پورا سال پڑا ہے تم اس میں کیا کچھ نہیں کر سکتے؟ تم چاہو تو سال کے اندر صحت، دولت، اطمینانِ قلب، اور خوشی کی بازیافت کر سکتے ہو۔ ہاں بڑھے چلو۔ پکڑو۔ پکڑو۔

(ترجمہ از "خیال نو") حکم چند کمار بی۔ اے

غزل فارسی

اے کہ گفتی رہ و رسمِ تو نہ ایں مے باید ۔۔۔ ما ہمینیم کہ ہستیم و ہمیں مے باید
ہاں بیا تا کنم از بوسہ، نشاں بر لبِ تو ۔۔۔ شاہِ حسنی و ترا نقش و نگیں مے باید
از تو با بوسہ و آغوش تسلّی نہ شوم ۔۔۔ شبِ وصل است و بساماں ترازیں مے باید
لطف با قہر در آمیختہ در کار است ۔۔۔ خندہ بر لب و چینے بہ جبیں مے باید
عرشیاں را بتواں گفت، شبِ وصل زمن ۔۔۔ "کاشبم گوشۂ از عرشِ بریں مے باید"
غیر را حرف بدی گفت بہ خرسندیِ من ۔۔۔ ویں نہ دانستہ کہ برشیوۂ کیں مے باید
شبلیا کیست کزو دادِ سخن می طلبی ۔۔۔ گر نظیری نہ بود شیخ حزیں مے باید

شبلی



جناب مولانا شیخ احمد علی صاحب شوق' قدوائی' لکھنوی

انڈین پریس الہ آباد

نیرنگِ جمال

ایک نوجوان نے ریلوے ٹرین میں اسٹیشن پر ایک نوخیز حسین عورت دیکھی، یہ اُس کے حُسن پر وارفتہ ہو کے دیکھتا رہا، اتنے میں ٹرین روانہ ہو گئی اسے معلوم نہیں کہ وہ کون تھی، اور کہاں گئی، اب یہ اُس کے حُسن اور اُسکی اداؤں کو یاد کر کر کے عشقِ ولولہ انگیز کے خیالات میں محو ہے۔

کیا خبر، میں ہوں کہاں، آپ میں تو ہوں نہیں
کیا میں ہوں حواس میں، کیا مجھے جنوں نہیں
ہوش کچھ جنوں میں ہے، کچھ جنوں ہے ہوش میں
جوش کچھ سکوں میں ہے، کچھ سکوں ہے جوش میں
کیوں جنوں ہے، کیا کہوں، حسن کے اثر سے ہے
دل پہ حسن کا اثر عشق کی نظر سے ہے
کیوں سکوں ہے، اس لئے تاکہ دل ٹھہر رہے
میرے دل میں، اُس کا رُخ، چین سے جما رہے
یہ جنوں ہے عشق کا، عشق دل کی جان ہے
آ کے عشق جائے پھر، یہ غلط گمان ہے
یہ سکوں ہے جبر کا، اس کا اعتبار کیا
دل تڑپ اُٹھے، تو پھر اس پہ اختیار کیا
یوں ہی دل کو ہے تپش، اور کچھ بڑھے تو پھر
گرمیِ غمِ فراق، بنکے تپ، چڑھے تو پھر
دل بغل میں ہے، تو ہو، اب یہ حسن ہی کا ہے
ہو جنون یا سکون، سب یہ حسن ہی کا ہے
پھر لیا سکوں کا نام، بہکی او زبان کیوں
عشق اور سکوں! چہ خوش!! وہم کیوں، گمان کیوں
حُسنِ دل فریب کو دل گلے لگا چکا +
عشقِ دل گداز سے دل پہ داغ آ چکا

حسن لے چکا ہے دل، لے کے پھیر دے تو کیوں
عشق دے چکا ہے دل، دیکے پھیر لے تو کیوں
مل چکی نظر، مگر، ہاتھ مل کے رہ گئی
دور تک ٹرین کے ساتھ چل کے رہ گئی
کیا خبر کہ ہجر میں کیا ہوا اور کیا نہ ہو
میرے عشق کی خبر، اُس کو ہو بھی یا نہ ہو
شکل تھی پیام بر میرے دردِ عشق کی +
تھی شہادت اس کے ساتھ، رنگِ زردِ عشق کی
ترچھی چتونوں سے وہ دیکھتی تھی بار بار
میرے رُخ پہ کی نظر اُس نے تین چار بار
ہر نظر کے بعد، کچھ، رنگ رُخ کا اڑ گیا
کہتی ہو گی دل میں، لو، اور گُل کھلا نیا
سمجھی ہو گی کچھ ضرور، ہیں شعور کے یہ دن
ابتدا شباب کی، ہے یہی سمجھ کا سن
مان لوں کہ سمجھی وہ، سمجھی بھی تو کیا ہوا
چشمِ عشق سے نہاں حسنِ خود نما ہوا
کون تھی، کدھر گئی، دل کو لیکے چل بھی دی
وار کر کے چل بھی دی، داغ دیکے چل بھی دی
کون تھی وہ، جس کے بال دلکو چھین لے گئے
کون تھی وہ، جسکے گال مجھکو داغ دے گئے
اُس کے بے حجاب گال اور دبے عتاب سُرخ
بال بے بنائے جال، دیدے بے شراب سُرخ
اُس جبینِ صاف سے چاندنی کا پھول گرد
مہر کا رُخ اُس سے زرد، ماہ کا دل اُس سے سرد
جا کے لے نظر وہیں، تم جہاں چھپاؤ دل
ہر پلک اشارے سے کہتی تھی کہ لاؤ دل +

یوں کھُلے لب، اُن پہ جب مُسکراہٹ آچلی
جیسے نخلِ گُل میں ہو کچھ کھِلی ہوئی کلی ؎
ہنس پڑی، تو یوں ہوئے لعلِ گُل فشاں جُدا
جس طرح ہوا سے ہوں گُل کی پتّیاں جدا
صاف صاف اُس کے دانت، کھُل گئے، چمک پڑے
وہ چمک کہ دانتوں اور موتیوں میں تنک پڑے
پان سے دہن ابھی شاید آشنا نہ تھا
پائے بندِ رسم تھی، بیاہ ابھی ہوا نہ تھا ؎
گال پر شکن بھی کچھ پڑتی تھی ہنسی کے ساتھ
لے رہی تھی وہ شکن، دل کو، دل لگی کے ساتھ
آتے تھے ہوا سے بال اُڑ کے اُس کے گال پر
حسن ڈالتا تھا جال، بار بار، لال پر
لب پہ دانت تھے کبھی، اور اس کا لب تھا لال
لال لب، سپید دانت، لال پر سپید خال
گال دونوں صاف صاف، دو سپید پھول سے
رنگ کچھ دبا ہوا راستے کی دھول سے
ذرّے کچھ دکھا گئے رُخ کے پھرنے پر چمک
اس چمک سے بڑھ گئی حسن کی چمک دمک
دیدے، اُن میں پُتلیاں پھرتی تھیں اِدھر اُدھر
شام اُدھر، سحر اِدھر، شام اِدھر، سحر اُدھر
کھڑکیاں کھلی تھیں، اور وہ کھڑی تھی ناز سے
شوشے چھوڑتی تھی خوب، چشمِ فتنہ ساز سے
جھانکتی اِدھر اُدھر، سر کو کچھ نکال کر ؎
سامنے کی اوڑھنی ہاتھ سے سنبھال کر
قد کبھی اِدھر جھکا، سر کبھی اُدھر جھکا

اِس طرف شجر جھکا، اُس طرف ثمر جھکا ؎
ابروؤں کو تھی کبھی یوں وہ بل دیئے ہوئے
جیسے ہو ہرن کی شاخ پیچ و خم لئے ہوئے
پڑ رہی تھی ہر طرف وہ نگاہ مست سی
حسن کی شراب سے تھی سیاہ مست سی
دلفریب انگلیاں، خوشنما ہتھیلیاں
بے حنا تھیں اُنگلیاں، بے حنا ہتھیلیاں
بے حنا تو تھیں، مگر، رنگ خود ہی لال تھا
تھے ہتھیلیوں پہ نقش، یا نفیس جال تھا
بائیں سمت، سیٹ پر، اس کی ماں ہو یا بہن
رُخ اُدھر کو پھیر کر، ہوتی تھی وہ ہم سخن
بولتی جو زیرِ لب، آتی اس طرح صدا
جیسے کر رہا ہو ریز کوئی مرغِ خوش نوا
کچھ لٹیں کھلی ہوئی، تھیں جبینِ صاف پر
چھوٹی چھوٹی ناگنیں تھیں زمینِ صاف پر
دم بہ دم، ہوا کے ساتھ، پلٹے کھاتی تھیں لٹیں
ناگنیں، اِدھر اُدھر، لے رہی تھیں کروٹیں ؎
ایک بار، پھر کے وہ، دیکھنے لگی اُدھر ؎
نصف جسم پھر گیا، دوہری ہو گئی کمر
سامنے نہ آ سکی، گو، کمر حجاب سے
رازِ ناز کی کھلا، اُس کے پیچ و تاب سے
رکھی اُس نے ایک بار انگلی اپنے گال پر
ترچھی چتونوں سے پھر، دیکھنے لگی اِدھر
اُنگلی اُس کی جب ہٹی، رنگ لایا گال اور
تھی جو نازک اُس کی جِلد، ہو گیا وہ لال اور

کہہ رہا تھا رُخ کہ ہے ابتدا شباب کی
بڑھ رہی ہے دَم بدَم، دولت آب و تاب کی
اِس کا دل اُمنگ کا لطف پا چلا ہے اَب
حسن کے غرور کا وقت آ چلا ہے اَب
کچھ سمجھ چلی، کہ ہاں، میں بھی کوئی چیز ہوں
حسن ہو جسے عزیز، اُس کو میں عزیز ہوں
دیکھتی تھی آرسی، ہاتھ اُٹھا کے، بار بار
تیوریاں چڑھاتی تھی، مُسکرا کے بار بار
چڑھ کے اِس کی تیوریاں، مستحق تھیں ناز کی
خوبیاں دکھاتی تھیں حُسنِ خانہ ساز کی
بجلیاں لَووں میں تھیں، اور ہل رہی تھیں وہ
چومنے کو، بار بار، رُخ سے مل رہی تھیں وہ
ناک میں سپید لَونگ، جس کا حُسن جلوہ گر
پڑ رہی تھی جس کی چھُوٹ، اُس کے بائیں گال پر
سیب کچھ لئے تھے مول، ہاتھ کو بڑھا کے جب
ہٹ گئی تھی اوڑھنی، ہاتھ کھُل گیا تھا سب
بازوِ حسیں پہ تھا اِک طلائی نَورتن
ہر رتن کے نور پر ہوں نثار سو رتن
خوشنما کریلیاں، خوشنما کلائیاں
بیلیں یا کریلیاں، شاخیں یا کلائیاں
تیلکڑی کے دو کڑے، چوڑیوں کے ساتھ ساتھ
تھے طلائی وہ کڑے، اور نقرئی تھے ہاتھ
سر سے اوڑھنی گری جب ڈھلک کے دوش پر
اِس ادا نے کر دیا وار میرے ہوش پر
سر کے بال بھی کھُلے، خط بھی مانگ کا کھُلا
بند تھا سوادِ حُسن، اُس کا راستا کھُلا
سامنا جو بار بار گرد اور ہوا کا تھا
چشمِ نیم باز سے دیکھنا بلا کا تھا
پہلے مجھ پہ جب نظر چلتی پھرتی پڑ گئی
تھی مری نظر اُدھر، اِس سے مِلکے لڑ گئی
لڑ گئی تو چھپ کر، دوسری طرف پھری
برق مجھ کو نذر کر اور ہی کہیں گری
دیکھ لیتی تھی، مگر، شرمگیں نگاہ سے
بھیجتی تھی کچھ پیام، پتلیوں کی راہ سے
پھر، وہ کھیلنے لگی اپنی اوڑھنی کے ساتھ
سر کو وہ جھکائے تھی، اور چُن رہے تھے ہاتھ
چُنَّٹ اوڑھنی میں وہ چٹکیوں سے ڈالتی
اوڑھنی کو تان کر پھر شکن نکالتی
میرے دل پہ ناز سے، چلتی تھیں وہ چٹکیاں
لیکے چٹکیاں، اِسے، مَلتی تھیں وہ چٹکیاں
لاین اس ٹرین کی بدلی اتفاق سے
دوسری طرف گیا میں بھی اشتیاق سے
وہ بھی آ کھڑی ہوئی سر جھکا کے سامنے
تھا جو دل پہ کچھ اثر، جھجکی آ کے سامنے
شرم سے نہ پھر سکی گرچہ گردن اِس طرف
دل اِدھر ہی تھا، کہ تھی ترچھی چتون اِس طرف
چل کھڑی ہوئی ٹرین، اور میں وہیں رہا
میں تو رہ گیا، مگر، دل مرا نہیں رہا
چُوک مجھ گئی، کہ اب، مَل رہا ہوں ہاتھ، مَیں
چل دیا ٹرین پر، کیوں نہ اُس کے ساتھ مَیں
دب گیا تھا ضبط سے، ہائے، میرا جوش کیوں
دل کے ساتھ، حُسن نے، لے لئے تھے ہوش کیوں

شوق میرے رنگ کو دیکھتے تھے بار بار
دیکھتے ہی دیکھتے رنگ اڑا ہزار بار

آ ہی جاتا ہوش میں، وہ جو تو کہتے مجھے
پھر تو میں نہ مانتا، لاکھ رو کتے مجھے

احمد علی شوق قدوائی

آثارِ قدیمہ

کیا مٹائے ہیں زمانے نے پرانے آثار — نہ ہیں شاہان اولو العزم نہ انکے دربار
وہ قدامت کے کتابے وہ عمارات لطیف — شہر آراستہ پیراستہ مینا بازار
اعلےٰ اعلےٰ شعرا ناظم جادو تقریر — کیسے کیسے فصحا ابلغ و دانا ہشیار
پڑ گئے سب پہ قدامت کے کچھ ایسے پردے — کہ نظر تک نہیں آتے ہیں کسی کے آثار
لڑکھڑاتی ہوئی چلتی تھی جہاں وہ نسیم — اب ہیں وہ باغ کہاں اور کہاں انکی بہار

اگلی دنیا کا اگر نام و نشاں باقی ہے
تو وہ ٹوٹی ہوئی قبریں ہیں پرانی دو چار

خوابِ نوشیں کا مزا لیتے ہیں رہنے والے — چین سے سوتے ہیں مرقد میں صغار اور کبار
جب کبھی گورِ غریباں کی طرف جا نکلے — انکو دیکھا کہ ہیں سب منتظرِ روزِ شمار
فاتحہ پڑھنے کو جب ہاتھ اٹھایا ہمنے — دیکھکر دیدۂ عبرت سے ہمیں اور بسیار
دل بھر آیا تو ہیں اور آنکھوں سے آنسو ٹپکے — بیکسی انکی محافظ تھی الم چوکیدار
نیست نابود ہوے سیکڑوں کہنہ تکیے — لوحِ تربت کا پتہ ہے نہ کہیں نقشِ مزار
بعض قبروں کو زمانے نے مٹایا تو بہت — مٹ سکیں وہ نہ مٹانے سے کبھی آخر کار

درحقیقت ہیں زمانے میں وہی خوش تقدیر
نام مرنے پہ بھی مٹتا نہیں جنکا زنہار

دیکھئے کھول کے اوراق تقادیم کہن — ذکر کچھ اہل وفا کا ہے جہاں حسرت بار
ہیں وہاں بعض ستم کیش بھی ایسے ایسے — نقدِ جاں جن سے بچانا تھا جہاں کو دشوار
سچ اگر پوچھئے تو واقعی آثار قدیم — جتنے برباد ہوئے اُتنے ہیں عبرت آثار
کہنہ قصوں میں جو ہے لطف اسے کیا کہئے — اگلے بڈھوں کی تقاریر میں دُرِّ شہوار

عشرت ان کہنہ عمارات کو دیکھے کوئی
منھ سے کہدیتی ہے سب حال شکستہ دیوار

عشرت لکھنوی

تارا

جناب مسٹر جے۔ آر۔ راے صاحب نے "عالم و مافی العالم" والے مضمون میں تارے پر عالمانہ خیالات ظاہر فرمائے ہیں، اور میں نے اس نظم میں تارے کا صرف "نظارہ" (یعنی وہ رُخ جو پیش نظر ہے) لیا ہے۔ آپ اور آپ کے پرچہ کے شایقین ایک ہیئت داں عالم کے خیالات سے تو محظوظ ہو چکے، اب دیکھئے کہ تارے کی نسبت ایک شاعر کیا کہتا ہے، اور اس کے خیالات کیا ہیں۔

او شام سے فلک پر آکر چمکنے والے! — او رہ نوردِ عالم دم بھر نہ تھکنے والے!
او تیز رو مسافر تو کس قدر حسیں ہے، — صورت تو دیکھو پیاری پیاری، او حسن دلنشیں ہے
اعجاز حق نما ہے یا کوئی رمزِ قدرت — آخر مجھے بتا تو کیا ہے تری حقیقت؟
کیا چرخ چنبری کا نورِ نظر کہوں میں — "چھوٹا سا ہے قمر کا لختِ جگر" کہوں میں
پُر نور تیرا رُخ ہے، روشن تری جبیں ہے، — تارا ہے، یا فضا میں رقصاں کوئی حسیں ہے؟
کیا دور سے نمایاں تیری چمک دمک ہے — تو رونقِ سما ہے، تو زینتِ فلک ہے
تو فرش چرخ پر ہے نقشِ قدم کسی کا — یا سبزہ زار میں ہے اک پھول اشرفی کا
جگنو میں تجھکو سمجھوں یا آگ کا شرارا — رہتا ہے رات بھر تو بے شبہ عالم آرا
کس دلربا سے سیکھا اندازِ دل نشینی — کس خرمنِ ضیا سے کرتا ہے خوشہ چینی
کسکی چمک سے تونے یہ نور لے لیا ہے — کس مہر وش سے تونے کسبِ ضیا کیا ہے
کیا تیری آنکھ کو ہے فکرِ کرشمہ سازی — کیوں جانبِ زمیں ہے محوِ نظارہ بازی
مانا حسیں ہے لیکن نخوت میں کھو نہ جانا — سیمیں تنی پہ اپنی مغرور ہو نہ جانا

مغلوب گو نہیں ہے تو تابشِ قمر سے   سورج کے آگے پنہاں ہو جائیگا نظر سے
افروختہ رہا ہے شب بھر سحر کی صورت   چھپنا پڑے گا دن بھر تجھکو نظر کی صورت
ہے رات بھر کی مہماں تیری نظر فریبی   تنویر مہر زائل کر دے گی دیدہ زیبی
جب جان پر بن آئی سوزِ غمِ نہاں سے   گو شعلہ بن کے لوٹا رخصت ہوا جہاں سے
ہیں موسمی تغیر وابستہ تیرے دم سے   ہوتی ہیں کشت زاریں تازہ ترے کرم سے
غربت میں ہر مسافر کو راہ تو بتائے   گم گشتہ راہ تجھ سے منزل کی راہ پائے

اس سطحِ نیلگوں پر چھٹکے ہوئے ستارو!   افشاں ہو یا ہو وس شب کی عبیہیں کے سپارو!
یہ کہکشاں تمہاری چھوٹی سی انجمن ہے   ہر ایک رکن جسکا دنیا میں ضوفگن ہے
میں ہی فقط نہیں ہوں گرویدہ اے کواکب   اک صغر سن جماعت بھی ہے تمہاری طالب
ہر روز شام ہی سے کرتے ہیں یاد بچے   جب دیکھتے ہیں تمکو ہوتے ہیں شاد بچے
مجھ غم نصیب کے بھی ہو غم شریک تم سب   گن گن کے تمکو میں نے کاٹی ہے ہجر کی شب
محوِ خیالِ جاناں رہتا ہوں رات بھر میں   ہو جاتی ہے سحر بھی تھکتا نہیں مگر میں
ہے شانِ حُسنِ دلبر تم سے کچھ آشکارا   میری نظر سے پنہاں ہونا نہ تم خدارا
تم آسماں نشیں ہو میں مجرہ نشیں ہوں   تم انجم فلک ہو میں اخگرِ زمیں ہوں
لیکن سحاب سے اب مجبور ہو گئے تم   بادل جو گھر کے آیا نظروں سے کھو گئے تم
روشن تھا تم سے عالم اب ہو گیا اندھیرا   پھیلی رہے گی ظلمت جب تک ہو سویرا

کالی گھٹا سے ظلمت دنیا پہ چھا رہی ہے
سو جاؤ پڑ کے محوی اب نیند آ رہی ہے

محمد حسین محوی لکھنوی

رباعی انیس

ہموار ہے گر تو کچھ تجھے باک نہیں   سرکش ہے اگر تو عقل و ادراک نہیں
پاتا نہیں تند خو کدورت کے سوا   دامن میں ہوا کے کچھ بجز خاک نہیں

تہنیت مراجعت

عالیجناب مولینا الحاج خواجہ غلام الثقلین صاحب بی اے۔ ایل ایل بی سفر طواف حرمین شریفین و کربلاء معلےٰ و مشہد مقدس سے آٹھ ماہ کے بعد میرٹھ واپس تشریف لائے۔ مجدد السنۃ مشرقیہ قبلہ و کعبہ مولینا احمد حسن صاحب شوکت مدظلہٗ نے مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے:- (شعیب احمد ندرت)

بگو مادِ من از کجا آمدی   سرت گردم از کربلا آمدی
سرِ دیدہ و چشم و دستت دہم بوسہا   کہ از مضجع مصطفےٰ آمدی
من اے سر بپا لا فدایت شوم   کہ از قبرِ آلِ عبا آمدی
ز قبرِ حسینؑ و ز قبرِ حسنؑ   بہ آہ و بکا و عزا آمدی
ہمانا رضا جوے حق بودہ   ز قبرِ امام رضا آمدی
زیارت گہ اہل دیں گشتہ   پئے مومناں مقتدا آمدی
لباما یہ رفعت اندوختی   ز چرخ علی علا آمدی
چہ شوری کہ غمہا ربودی ز دل   چہ نوری کہ در چشم ما آمدی
جہادے بہ نفس لعیں کردہ   بفتح و ظفر از غزا آمدی
ضعیفان اسلام نازاں بتو   عصا بہر پشت دوتا آمدی

چہ ہدیہ بود درخور مقدمت
زشوکت بجز مرحبا آمدی

شوکت میرٹھی

سال نو

سالِ نو آتے ہی محشر کھل گیا در بارِ حسن   اللہ اللہ جنوری کی گرمی بازارِ حسن
عید نوروزی کی عشرت اور حسینانِ فرنگ   جس طرف اٹھی نظر دیکھا اسے سرشارِ حسن
گردش آنکھوں کی ہے اب دورِ زمانہ کی طرح   کوئی بھولے سے بھی کہہ سکتا نہیں بیمارِ حسن
سال کیا بدلا کہ فیشن نے بھی بدلا اپنا رنگ   ہو گئے تقسیم کیا کیا خلعتِ سرکارِ حسن

سالِ نو کی جلوہ آرائی ہوئی شکلِ عروس بنکے نوشہ پھر بھی نکلا ہے پئے دیدارِ حُسن
وصل کی سوجھیں نئی تدبیریں اہلِ عشق کو ظلم کرنے کو مبدل ہوگئی رفتارِ حُسن
کہنہ گلکاری دسمبر ساتھ اپنے لے گیا اب نیا ہے موسمِ گل اور نیا گلزارِ حسن
تہنیت نامے لکھے جانے لگے معشوقوں کو جسکا ایک ایک نکتہ اک اک فقرا اسرارِ حسن
ہو رہا ہے مِس سے اور مسٹر سے باہم شیک ہینڈ کوئی ہے غمخوارِ عشق اور کوئی ہے غمخوارِ حسن
وہ اشارات اب ہیں اسرارِ علومِ مغربی جنمیں ہوتا ہے سوالِ وصل پر انکارِ حسن
قتلِ عاشق کے لئے تیغِ صفاہانی نہیں ہوگئے تیر و کماں اسال ننگ و عارِ حسن
وہ رموزِ خاص ہیں تہذیبِ تعلیمِ جدید جنمیں اب اک جنبشِ مژگاں سے ہے اقرارِ حسن
العرض حسنِ تغیّر کا جہاں میں دور ہے
ہیئتِ اصلی کہاں دیکھو جسے وہ اور ہے

محشر لکھنوی

منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی

اے فزایندۂ حسنِ رخِ زیبائے سخن شمعِ دانش سے ہے تو انجمن آرائے سخن
بھر دیا تو نے مئے لطف سے مینائے سخن بحر اردو میں رواں تجھ سے ہے دریائے سخن
جمگھٹے تیرے درِ فن پہ پڑے رہتے ہیں
ہاتھ باندھے ہوئے مضمون کھڑے رہتے ہیں
تو ہی صدرِ انجمنِ علمِ ادب ہے۔ اے شوق تجھ سے آراستہ یہ بزمِ طرب ہے۔ اے شوق
شوق کہتے ہیں تجھے سب تو سبب ہے اے شوق تو ہی شوقِ دلِ ہر لطف طلب ہے اے شوق
ملک میں پھیل گئے نغمۂ شیریں تیرے
مایۂ ناز ہیں اردو کو مضامیں تیرے
باعثِ گرمیٔ محفل ترے اشعار ہوئے لوگ لذت کشِ شیرینیٔ گفتار ہوئے
تیرے اشعار جو صفحوں پہ گہربار ہوئے جمع دامانِ سخن میں دُرِ شہوار ہوئے
آج مانے ہوئے لوہا ہے زمانہ تیرا
رقص کرتا ہے زبانوں پہ ترانہ[1] تیرا
تو ہر اک طرز میں شان اپنی دکھا دیتا ہے بحرِ مَوّاجِ مضامیں کو بہا دیتا ہے
چمنِ نظم میں تو پھول کھلا دیتا ہے حسن تو شاہدِ معنی کا بڑھا دیتا ہے
ہمنے جب تیرے خیالات کا عالم[2] دیکھا
اونمیں جذبات کی شکلوں کو مجسم دیکھا
رشتۂ نظم میں وہ تو نے پروئے موتی صدفِ بحر نے شرما کے ڈبوئے موتی
سنکے نظمیں تری۔ ہاتھ آب سے دھوئے موتی ہمہ تن اشک بنے۔ جھیپ کے روئے موتی
نور بھرتی ہے تری طبعِ سلیم آنکھوں میں
کھبتی ہے "مثنویٔ دُرِّ یتیم[3]" آنکھوں میں
حسن کا حسن بڑھا تیرے کرم سے واللہ حسن کو حسن دیا تو نے قلم سے واللہ
حسن میں جان پڑی ہے ترے دم سے واللہ حسن[4] چمکا ہے ترے حسنِ رقم سے واللہ
شرح کی فلسفۂ حسن کی ہاں ہاں تو نے
بھر کے رنگ اس کو بنایا ہے گلستاں تو نے
ہونے کو خشک سی اک شاخِ شجر ہے خامہ تیرے ہاتھوں سے مگر کانِ گہر ہے خامہ
بسکہ دم سے ترے ممنونِ اثر ہے خامہ سامنے تیرے جھکائے ہوئے سر ہے خامہ
پھونک دی روح نئی پیکرِ فن میں تو نے
ڈالدی جان نئے سر سے سخن میں تو نے
فلسفہ[5] نظم میں ایجادِ سخن تیرا ہے جسنے فطرت کو کیا بس میں وہ فن تیرا ہے
جسپہ نازاں ہے فصاحت وہ دہن تیرا ہے گُلِ بے خار ہیں جسمیں وہ چمن تیرا ہے
قابض اے شوق ہے اقلیمِ بیاں پر تو ہی
حکمراں آج ہے اُردو کے جہاں پر تو ہی

---

[1] مثنوی ترانۂ شوق کی طرف اشارہ ہے [2] نظم "عالم خیال" سے مُراد ہے۔ جس کا آخری رُخ **ادیب** میں شائع ہوا ہے [3] مثنوی دُرِّ یتیم
[4] مثنوی حُسن جس کا دیباچہ منشی جوالاپرشاد برق مرحوم نے لکھا تھا [5] نظم۔ سائنس اینڈ ریلجن وغیرہ کی طرف اشارہ ہے۔

بنکے چلتا ہے مصوّر دمِ تحریر قلم — کھینچ دیتا ہے ہر اک شکل کی تصویر قلم
حسن اور عشق کی کرتا ہی جو تفسیر قلم — کھچتے ہیں قلب دکھاتا ہے وہ تاثیر قلم

مثلِ ارشد کے تجھے اہلِ سخن مان گئے
ہند میں سحر بیاں لوگ تجھے جان گئے

ارشد تھانوی

تازہ غزلیں

پنڈت بشن نراین صاحب در، المتخلص بہ آبر لکھنوی

ہم جلیسوں کا اثر کچھ مجھ پہ گلشن میں نہیں — گل ہوں لیکن داغِ شبنم میرے دامن میں نہیں
قوم باقی ہے کہاں لیکن وہ بزم آرائے قوم — حیف جس دانہ سے خرمن ہو وہ خرمن میں نہیں
نعمتِ دنیا کے بھوکے ہوگئے ایسے امیر — بھیک کے ٹکڑے بھی درویشوں کے دامن میں نہیں
پست ہمت کرتے ہیں منت کشی دربان کی — کیا درِ دولت پہ رکھا ہی جو روزن میں نہیں
محو ہی چشمِ مصوّر جسپہ وہ رنگِ بہار — لالہ و گُل میں نہیں نسرین و سوسن میں نہیں
کب عروسِ دہر سے میں نے کیا ہی اختلاط — بوے عطرِ فتنہ میرے جامۂ تن میں نہیں
کیا اُصولِ شرع و دیں سے مردِ عارف کو غرض — حاجتِ شمعِ شبستاں، روزِ روشن میں نہیں
رونقِ بزمِ وطن ہُوں پر وطن سے ہُوں جدا — وہ نسیمِ نوبہاری ہوں جو گلشن میں نہیں
تیرہ فہموں پر ہو روشن کیا حقیقت علم کی — یہ وہ رازِ دوست ہی جو وہم دشمن میں نہیں
صنعتِ تصویر ہی خالی مصوّر کا خیال — کلک و کاغذ میں نہیں وہ رنگ روغن میں نہیں
جانتے ہیں وعظ کی مجلس میں مے پینا حرام — ہاتھ اپنا جب تلک واعظ کی گردن میں نہیں

گلشنِ کشمیر اب بھی ابر ہے جنت نظیر
وہ گل و سرو و صنوبر تیرے گلشن میں نہیں

ڈاکٹر ٹی ریمل صاحب لطیف

تختۂ دنیا ست بازارِ کسے — ویں دلِ شیدا خریدارِ کسے
نقدِ دل دادم بہ دیدارِ کسے — من خریدارم بہ بازارِ کسے
دل بہ جوش آید زگفتارِ کسے — جاں بہ تن آید ز دیدارِ کسے
کفر در کعبہ ہماں بیسنم کہ بود — کم ز تسبیح نیست زنّارِ کسے
قدسیاں بر عرش رقصے می کنند — جاں سپارد چوں گنہگارِ کسے
تا بکے ایں امتحانِ جانگاہ — یک نظر بر حالتِ زارِ کسے
زادِ رہ بگرفتہ در راہِ عدم — می رود خنداں گنہکارِ کسے
چشم می داریم زاں جامے کہ ما — تا ابد باشیم سرشارِ کسے
بارِ عصیاں می کشم واحسرتا — کس نمی بینم چہ غمخوارِ کسے

جنسِ عقبیٰ را خریدن بایدم
ہاں لطیفا دست بازارِ کسے

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

ہم گزشتہ صحبتوں کو یاد کرتے جائیں گے — آنے والے روز بھی یوں ہی گزرتے جائیں گے
کچھ خدا کا بھی خیال اب دل میں کرتے جائیں گے — بتکدے جاتے ہیں کعبہ میں ٹھہرتے جائیں گے
حسن خود آرا پہ جب اتنا سنورتے جائیں گے — مرنیوالے اور بھی بے وقت مرتے جائیں گے
یہ تو سوچو دل ہی کیا ہے مجرمانِ عشق کا — سامنے جائیں گے، لیکن ڈرتے ڈرتے جائیں گے
حسن ہو جس رنگ میں محتاجِ آرائش نہیں — وہ بگڑتے جائیں گے جتنا سنورتے جائیں گے
اک نہ اک دن دیکھ لینا یہ ورق اُڑ جائیگا — چند آہیں ایسی ہم دنیا میں بھرتے جائیں گے
مرنے والوں نے دکھائیں ہیں بہت کچھ قوتیں — خیر آہِ بے اثر اک ہم بھی کرتے جائیں گے
کاتبِ اعمال کا جو فرض ہی محدود ہے — حالِ دل بھی اپنا ہم تحریر کرتے جائیں گے
دن قیامت کا معیّن کر نہیں سکتا کوئی — وہ کریں گے ہم سے وعدہ اور مکرتے جائیں گے
دیکھنا ہی ہمکو آثارِ قدیمہ عشق کے — وادیٔ مجنوں میں دم بھر کو ٹھہرتے جائیں گے
در پہ آئے ہیں تمہارے، تم ملو گے یا نہیں — آج جھگڑے عمر بھر کے ختم کرتے جائیں گے
تم نقاب الٹو تو دیکھو دیکھنے والوں کا حال — رنگ اڑتے جائیں گے، چہرے اترتے جائیں گے
دیگئے بیمار کو تسکین، اتنا کہہ کے وہ — زندہ ہوتے جائیں گے، جو لوگ مرتے جائیں گے

جب تلک ہوگا نہ ہر قطرے میں روحانی اثر　　رنگ دل کا اپنے ہر آنسو میں بھرتے جائینگے

دوں گا ہدیہ آفتابِ روزِ محشر کو عزیز
میرے زخمِ دل سے جو بہاہے اُترتے جائینگے

سید علی رضا صاحب ماہر کنتوری

شام و سحر یہ گردشِ لیل و نہار ہے　　دو دن خزاں چمن میں ہے دو دن بہار ہے
تیغ کشیدہ سرمۂ دنبالہ دار ہے　　ترچھی نگاہ یار کی خنجر کی دھار ہے
وہ جسم ہے نہ جسم کا نقش و نگار ہے　　اعضا ہیں ریزہ ریزہ شکستہ مزار ہے
حیرت فزا جو گرمئ رُخسارِ یار ہے　　سیماب کی طرح مرا دل بے قرار ہے
روئے سخن جو میری طرف بار بار ہے　　گفتار کہہ رہی ہے کہ دل میں غبار ہے
ضبطِ فغاں سے لب پہ مری جان زار ہے　　کیا دردِ دل کہوں کہ زباں رازدار ہے
انکار ہے کبھی کبھی قول و قرار ہے　　اُس بے وفا کی بات کا کیا اعتبار ہے
ان گلرخوں کے عشق میں طرفہ بہار ہے　　جو داغ ہے وہ رشکِ دہ لالہ زار ہے
پھر ول مریضِ غم کی جو کھلتی نہیں ہے آنکھ　　پنہاں ہے کون کسکی پلک پردہ دار ہے
کھلتا نہیں جہاں میں بشر کیا طلسم ہے　　مجبور ہے کہیں کہیں با اختیار ہے
چھریاں نہ کسطرح سے چلیں عندلیب پر　　دوشِ صبا پہ نکہتِ گل پھر سوار ہے
لوٹا ٹھگوں نے راہ میں یہ کس غریب کو　　غربت پہ کسکی چشمِ فلک اشکبار ہے
صحنِ چمن میں آج ہے دیوانوں کا ہجوم　　نشتر بکف جو موجِ نسیمِ بہار ہے
کرتا ہوں جو کہیں گے وہ اعضا بروزِ حشر　　کسکو بتاؤں کون مرا رازدار ہے
جس کے لئے زمانہ میں ہم خاک ہوگئے　　پوچھا نہ اُسنے مڑکے یہ کسکا مزار ہے
اللہ رے شوقِ دید کہ مرنے کے بعد بھی　　آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ترا انتظار ہے
نالوں سے میرے دیکھئے نالاں ہے ساری خلق　　جو آہ ہے وہ سینۂ گردوں کے پار ہے
محشر میں بھی جھپکتی نہیں آنکھ یار کی　　تیور وہی جبیں پہ شکن بار بار ہے
کسکے الم میں دامنِ گلُ چاک چاک ہے　　بیٹھی ہوئی چمن میں بھی صورت بزار ہے
پیری میں اب نہیں ہیں وہ باتیں شباب کی　　یادِ شراب ہے نہ کبھی ذکرِ یار ہے

ماہر کہاں سے آئے ہو کیوں دل پہ ہاتھ ہے
سینہ میں درد لب پہ فغاں بار بار ہے

مرزا عالم صاحب لکھنوی

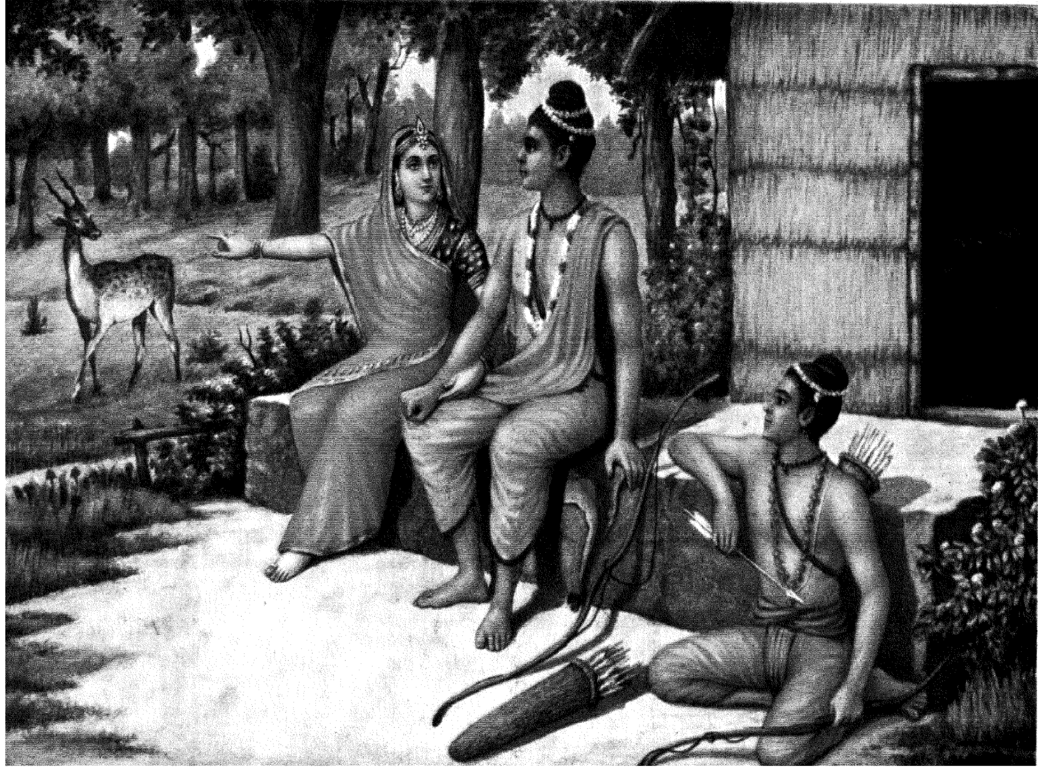
چارہ گر کیا کھو نہیں سکتا تو اس آزار کو　　غور سے کیوں دیکھتا ہے چہرۂ بیمار کو
نزع کی الجھن میں تو نے بے سبب ڈالا ہمیں　　کیوں کیا برہم مزاجِ گیسوئے خمدار کو
اب نہ آؤ گے کہ آؤ گے یہ ہے کسکا سوال　　کچھ تو دیتے جاؤ ڈھارس تم دلِ بیمار کو
اسیر بھی جنگل کی تصویریں نظر آنے لگیں　　دیکھنے دو قید خانہ کے در و دیوار کو
قتل کرنا یا نہ کرنا یہ ہے تم کو اختیار　　میرے کہنے سے اٹھا لو ہاتھ میں تلوار کو
دیکھ ظالم اور بڑھ جائینگی ٹیسیں درد کی　　غش سے کیوں ہشیار کرتا ہے دلِ بیمار کو
جسکو کہتے ہیں زمانہ وہ بھی تیرا نام ہے　　کون سمجھا آج تک ظالم تری رفتار کو
پیچھے پیچھے ہیں جنازہ کے وہ یہ کہتے ہوئے　　کیا زمیں میں دفن کردوگے مرے بیمار کو

لوگ کہتے ہیں کہ اب آثار بچنے کے نہیں
جاؤ تم بھی دیکھ آؤ عالمِ بیمار کو

تصریح تصاویر

اس ماہ کی رنگین تصویر جو انڈین پریس کے ایک مصوّر کی صناعی کا نمونہ ہے، موسم کے حسب حال ہے۔ اس میں موسم بسنت کو ایک نوخیز لڑکے کی صورت میں دکھایا گیا ہے جو معمّر موسم سرما کو پھولوں کی بارش کے ساتھ رخصت کر رہا ہے۔

حضرت شوق قدوائی کی سحر بیانیوں نے اُن سخن فہموں کے دلوں کو مسخّر کر لیا ہے جو حقیقت میں نکتہ سنج دماغ اور جذبات انسانی کا اثر پذیر دل رکھتے ہیں۔ حکیم بریم کا یہ قول بہت صحیح ہے کہ جناب لسان الملک شوق قدوائی کے کلام کی داد روح القدس سے ملتی ہے مجھے زیادہ مسرت اس بات کی ہے کہ اب صرف ادیب ہی میں جناب شوق قدوائی کی وہ دلچسپ اور بلند پایہ نظمیں نظر آتی ہیں جنکو بقول حضرت راشد الخیری سدا بہار پھول کہنا چاہیے۔ حضرت شوق قدوائی نے شاکر کے محبتانہ اثر کو اپنے دل و دماغ پر قبول فرمایا ہے تو شاکر بھی نہایت شکرگزاری کے ساتھ اُس اثر کے محبتانہ اثر کو اپنے دل و دماغ پر قبول کر کے امید کرتا ہے کہ ادیب کے دامنوں میں انکی لاجواب نظموں کے گران بہا جواہر یونہی بھرتے رہیں گے اور شاکر اپنے حقیقی معنی کا حق ادا کرتا رہیگا۔ حضرت شوق کی تصویر کے



مایا مرگ

Indian Press, Allahabad.

ادیب

اُردو

ہندوستان کی قومی زبان کی حیثیت سے

قومی زبان کا مسئلہ نہایت اہم ہے، اور اس لحاظ سے کہ ہندوستان کے مذاہب و ملل کے درمیان باوجود اختلاف عقائد کے ایک مشترکہ زبان ہی سے اتفاق و اتحاد کی بنیاد پڑ سکتی ہے، ہر ایک بہی خواہ ملک کا فرض ہے کہ اس باب میں صحیح و معتدل رائے قائم کرکے آخری نتیجہ تک پہنچے۔ ہندوستان میں سیکڑوں اور ہزاروں زبانیں مروّج ہیں۔ اور یہ قدرتی بات ہے کہ ہر شخص اپنی مخصوص زبان کی ترجیح کرے گا۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ جو زبانیں مختلف حصص ملک میں محدود ہوں اور جنہیں عام زبان بننے کے خواص طبعاً مفقود ہوں، وہ مجموعی طور سے کُل باشندگان ہند کی بولی کیسے قرار پا سکتی ہیں۔ البتہ اُردو کو یہ امتیاز ہے کہ وہ "مقامی زبان" کی تعریف میں نہیں آسکتی! اور اندرونی و خارجی اسباب اس کے قومی و ملکی زبان بنائے جانے کی سفارش کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کا لٹریچر ایسا گراں قدر نہیں، کہ یورپ کی کسی زبان کے بالمقابل لایا جا سکے، بلکہ خود ہندوستان کی بعض زبانوں کی حالت اُس سے بدرجہا افضل ہو گی۔ لیکن اس افراتفری اور کس مپرسی کے عالم میں بھی اُس کا خزانۂ ادب اکثر نایاب جواہر ریزوں سے لبریز ہے اور اقوامِ ہند کی معمولی سی بھی متفقہ معاونت اُسے معاصر السنہ میں محسود بنا سکتی ہے۔

اس مضمون میں بھی جسکا ترجمہ ہم ہدیۂ ناظرین کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر ششی کانت چٹو پادھیا آنجہانی نے اسی مبحث پر اپنے وزندار خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جنکی افسوسناک وفات نے ہندوستان کے ذی علم طبقے سے ایک بہترین رکن کی کمی کردی ہے، ہمارے ملک کے روشن ضمیر اور وسیع الخیال بزرگوں میں تھے، اور آپ کی بالغ نظری کا شائبہ اس مضمون میں بھی موجود ہے جسکا محققانہ طرز استدلال آپ کی دقت پسندی اور معاملہ فہمی کی کافی دلیل ہے۔ آپ نے اپنے دعاوی کے ثبوت میں یورپ کے

اُن جیّد علما کی بیش قیمت آرا سے بھی استنا دکیا ہے، جنکی عظمت علم اللسان کے ماہر ہونے کی حیثیت سے دُنیا کے تمام علمی حلقوں میں یکساں طور سے قایم ہے۔ آپ بنگالی ہونے کے باوجود اُردو کے "لنگوا فرنیکا" اور "نیشنل لنگوایج" بنائے جانے کے حامی ہیں، اور اس لحاظ سے یہ مضمون اُن اصحاب کی خاص توجہ کا مستحق ہے جو ہندوستان کی اس شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ (سیّد محمد فاروق)

۱

ہندوستان کی قومی زبان آخر انگریزی کیوں نہ بنائی جائے؟

یہ سوال ہے میرے ایک انگریز نما ہندستانی دوست کا جو طویل اقامت یورپ کی وجہ سے اپنے وطن کی زبان تک تقریباً بھول چکے ہیں۔ گزشتہ سالہا سال سے انگریزی زبان ہمارے دوست کا اوڑھنا بچھونا بنی ہوئی ہے۔ اس لئے اُنہیں اِس قسم کی رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر تمام ہندوستانی اُنکی مثال کی تقلید اور اُنہیں کی طرح عمل کریں تو "بہت اچھی بات ہوگی"۔ انگریزی پہلے ہی سے ملک بھر میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں، کانگریسوں، کانفرنسوں، جلسوں، انجمنوں، اخبارات اور رسالوں، عدالتوں اور محکموں کی زبان بنی ہوئی ہے۔ کیا یہ بتدریج تمام ملک کی زبان نہیں بنائی جاسکتی؟ نہیں! کیونکہ یہ امر ناممکن اور ناپسندیدہ ہے۔ یہ جواب ہے جو ہر طرف اور ہر طبقے کی جانب سے صاف صاف سُننے میں آرہا ہے۔ ورنہ میں اُسے تمام باشندگان ہند کی طرف سے نہ صرف مسرّت آمیز بلکہ پُرجوش خیر مقدم کہتا۔ کیونکہ اگر کہیں وسیع برّاعظم ہند کے تیس کرور بلکہ اس سے زاید رہنے والوں کے لئے اس شیریں اور مفید زبان کو جس کے بولنے والوں کی تعداد دُنیا میں ہر ایک زبان سے زیادہ ہے اور جس کا تقدس شکسپیر اور ملٹن، ایڈیسن اور مکالے، برک اور رایٹ، بیرن اور ٹینیسن، اسکاٹ اور ڈکنس، جان مل اور جان مارلے ایسے درخشندہ ناموں کے ساتھ وابستہ ہے، اپنی خاص زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنا ممکن ہوتا تو ہمارے قومی مسائل اور لسانی مشکلات کتنی سہولت سے حل نہ ہوجاتیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ انضمام خواہ اُس کے لئے کوئی دل سے کسی قدر متمنّی کیوں نہو ناممکن الوقوع اور خلاف رائے ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی بہر نوع قلیل التعداد ہونے سے گویا ہندی آبادی کے ذخّار سمندر میں بمنزلہ ایک قطرے کے ہیں۔ غالب حصّہ یعنی عوام کا ذریعہ تکلّم وہ کئی سو زبانیں ہیں جو تقریباً ۱/۲ ۱ ملین مربع میل کے رقبہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ زیادہ تر یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکاّم نے دیسی زبانوں کی تعلیم وترقی کے لئے ہمیشہ غیر معمولی زور دیا ہے۔ میکالے ۱۸۳۵ء والے مورد ملامت تعلیمی منٹ میں اسکی جھلک محسوس ہوتی ہے لیکن عملاً سرایی ووڈ کے تعلیمی مراسلہ (۱۸۵۴ء) میں جسکو ہندوستان کی تعلیم یونیورسٹی کا میگنا چارٹا (سند شاہی) سمجھنا چاہیئے، اس کی خاص طور پر ضرورت دکھائی گئی ہے۔ کیونکہ دیسی زبانوں کی اشاعت وترویج ہی صرف ایک ایسی حکمت عملی ہے جس کے ذریعہ سے حکام انگریزی باشندگان ہند اور اُن کے خیالات وآرا، اُن کی عادات ومراسم، اور اُن کے طور وطریق سے واقفیت پیدا کرسکتے ہیں۔ بلکہ یہ بات سنسکرت اور فارسی وعربی کے تحصیل سے بھی جو ہند کی مفروضہ کلاسیکل زبانیں سمجھی جاتی ہیں، اور جنکی اشاعت زیادہ تر شروع شروع میں وارن ہیسٹنگز، سرولیم جونس اور کولبروک، کی معاونت سے ہوئی، نہیں حاصل ہوسکتی۔ کیونکہ (اُن کے متعلق) یہ بہت جلد معلوم ہوگیا کہ جیسا حال یورپ

میں لاطینی اور یونانی زبانوں کا تھا اُسی طرح فارسی اور سنسکرت یہاں کے اعلیٰ طبقے اور اہل قلم و ملازمت پیشہ اشخاص کے دایرہ میں محدود تھیں۔ بیشک فارسی عہد مغلیہ میں سرکاری زبان تھی اور اس لئے اس کا رواج تمام ملک کے تعلیم یافتوں اور حکام میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان بہت تھا۔ فارسی کی حیثیت سلطنت مغلیہ میں وہی تھی جو کم و بیش انگریزی کو حکومت برطانیہ میں حاصل ہے۔ لیکن اب سلطنت مغلیہ کا وجود بھی باقی نہیں۔ اس صورت میں اُس عہد کی سرکاری زبان کا جو غیر ملکی بھی ہے قایم رہنا کس طرح ممکن تھا۔ (یہ امر البتہ قابل غور رہی) کہ کیا ہندوستان میں کوئی زبان ایسی نہیں تھی جو یہیں کے مرز و بوم سے پیدا ہوئی ہو اور جو باقاعدہ اشاعت و معاونت کا سامان پا کر رفتہ رفتہ فارسی کی جانشین بن سکتی۔ لاریب، جیسا کہ مین پہلے ظاہر کر چکا ہوں، دیسی زبانوں کی کوئی انتہا نہیں۔ حقیقت میں یہاں کثیر التعداد زبانیں تھیں اور اُن میں سے ہر ایک اپنی فضیلت کے لئے کوشاں تھی۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا یہاں ایک بھی ایسی زبان موجود نہیں جو اپنی قدیم تاریخ، اپنی لسانی کیفیات، اور عملی صورت، اور لوچدار ہونے کی وجہ سے اور زبانوں کے مقابلے میں "لنگوا فرنیکا" اور نیز قومی زبان بننے کے قابل سمجھی جا سکے۔ اس کا جواب ہے کہ ہاں! پہلے ہی سے ایک زبان میدان میں موجود ہے جس کی نشو و نما کئی صدیوں سے ہوتی آرہی ہے اور اُس کا نام اُردو یا ہندوستانی ہے۔ جیسا کہ اُس کے نام سے جو ترکی میں "لشکر بازار" کا ہم معنی ہے ظاہر ہوتا ہے "اُردو" اپنے ابتدائی ایّام میں اُس مخلوط و مرکب بول چال کا نام تھا جو مغلوں کے لشکروں میں اُن کے آغاز تسلّط کے وقت جاری تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے متعدد شہروں دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، احمد آباد، حیدر آباد دکن، اور بنگال کے ڈھاکہ اور مرشد آباد میں اُردوے معلےٰ کا وجود تھا اور اب بھی ہے۔ انگریزی کی طرح یہ زبان بھی مخلوط اور لوچدار اور ہندو اور اسلامی عنصر سے مرکب ہے یعنی اس میں ہندی سنسکرت اور فارسی عربی بلکہ ترکی الفاظ تک شامل ہیں۔ یہ پہلے ہی سے ایک طرح "لنگوا فرنیکا" (عام زبان) بنی ہوئی ہے۔ اور مختلف شکل و صورت میں تمام ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کے بولنے اور جاننے والے تمام موجودہ زبانوں سے شمار میں زیادہ ہیں۔ (غور کرنا چاہیئے کہ) آخر اسی کو گورنمنٹ کی سرپرستی میں اسکی صرف و نحو ترتیب دے کر اُسے شمالی ہند کی علمی زبان کیوں نہ بنا دیا جاے۔ دہلی، آگرہ، لکھنؤ سے کیوں نہ ایک معقول تعداد اہل علم اصحاب کی بلا کر اُنسے سائنٹفک اور عملی مضامین پر مفید مطلب کتابیں لکھوائی جائیں، جو نہ صرف نصاب مدارس میں کام آئیں گی بلکہ انگریزی حکام سول و فوج کے واسطے جن کے لئے ہندی و ہندوستانی کی معمولی واقفیت ملازمت ہند کے معیار قابلیت میں شامل ہونا ضرور رہے کارآمد ہو سکتی ہے (اسی نمونہ پر) ۱۸ویں صدی کے خاتمہ سے پیشتر اور ۱۹ویں صدی کے بالکل آغاز میں بمقام کلکتہ مارکویس آف ولزلی وایسراے و گورنر جنرل کی سرپرستی میں فورٹ ولیم کالج قایم کیا گیا تھا اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ اولین پرنسپل کے جوش کا جس کے ساتھ اُنھوں نے اپنے آپ کو اپنے عزیز اور ذمہ دارانہ کام میں وقف کر دیا تھا، یہ عالم تھا کہ بہت تھوڑے عرصہ میں اُنھوں نے مذکورہ بالا شہروں سے مشاہیر ماہران علم کی ایک معقول تعداد اپنے گرد فراہم کر لی تھی۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ان لایق و فایق اشخاص کے ذمہ زیادہ تر فارسی و سنسکرت کی مشہور و معروف کتب کو ہندی اور ہندوستانی ترجمہ کا لباس

پہنانے کی خدمت سپرد کر رکھی تھی۔ اسی کے ساتھ اُنھوں نے ایک جماعت ایسی تیار کی تھی جسکا کام تھا کہ انہیں دو زبانوں میں تاریخ و جغرافیہ و ریاضی کے مضامین پر ایسی مستقل کتابیں تصنیف و تالیف کی جائیں جیسا کہ یورپ میں رواج ہے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے زیر نگرانی فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنفین یہ لوگ تھے:
سید محمد حیدر بخش حیدری جنہوں نے طوطا کہانی کے مشہور قصے کا ترجمہ کیا، میر امن دہلوی جنہوں نے اس سے بھی زیادہ شہرت پذیر کتاب باغ و بہار کا ترجمہ کیا، سری للولال کوی مترجم پریم ساگر و بیتال پچیسی، شیر علی افسوس، کاظم علی جوان، مظہر علی المتخلص بہ ولا وغیرہم۔ ان میں سے بعض کتب کے مطالعہ سے جو حال میں میرا مشغلہ رہ چکا ہے جو بات خصوصیت سے محسوس ہوتی ہے وہ ان کا صاف و سادہ اور شاندار طرز تحریر ہے جو ہندی اور ہندوستانی دونوں میں یکساں طور سے موجود ہے۔ کاش ہمارے موجودہ مصنفین اُردو بجائے شعراء دہلی و لکھنؤ کے مغلق اور بعید از فہم طریقے پر مائل ہونے کے کلکتہ کے ابتدائی نمونے کی پیروی پر قایم رہتے! اگر اُنھوں نے ایسا ہی کیا ہوتا تو کوئی شبہ نہیں کہ میر امن کی یہ سچی پیشین گوئی کہ ؎

سو اُردو کی آراستہ کر زباں
کیا میں نے بنگالہ ہندوستاں

پوری ہو کر رہتی۔

ہم اس بات کے ثابت کرنے میں کہ انگریزی حکام ہند نے اپنی خاص زبان کو باشندگان ہند میں رائج کرنے کے بجائے اس ملک کی دیسی زبانوں اور بالخصوص شمال ہند کی ہندی و ہندوستانی کی اشاعت و تعلیم میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اس معاملہ میں کس قدر پیش بینی سے کام لیا اور گویا اضطراری طور پر اس جگہ فورٹ ولیم کالج کا جو ہندوستانی علم ادب کی تعلیم گاہ اور اسکی موجودہ تاریخ کا ماقبل آخر دور کہا جا سکتا ہے مختصر خاکہ کھینچا ہے، اور اسی لحاظ سے جو لوگ برٹش گورنمنٹ کو جدید ہندوستانی نثر کا "روحانی باپ" کہتے ہیں وہ حق بجانب ہیں، اور میں اس کے علاوہ تقریباً اُن تمام رائج الوقت دیسی زبانوں کا بھی اضافہ کر سکتا ہوں جن کے ادب نثر نے اب تک کچھ نہ کچھ ترقی کی ہے۔ اور اگر حکومت برطانیہ کو روحانی باپ کا درجہ حاصل ہے تو عیسائی مشنریوں اور ہندو مسلمانوں کے بعض اصلاح پسند فریق کو مساوی طور پر دایہ اور کھلائی کہلانے کا جائز حق ہے۔ لیکن اس کا ذکر پھر ہوگا۔ بالفعل مجھے اس شاہراہ کو چھوڑ کر اُردو زبان کے مختصر حالات بالکل آغاز سے مسلسل لکھنا چاہیئے تاکہ یہ بات صاف ہو جائے کہ میں تمام دیسی زبانوں میں اُردو کو جدید ہند کی قومی زبان بنائے جانے کے واسطے سب سے زیادہ کیوں کارآمد سمجھتا ہوں۔ مگر میں نہایت سختی سے اُس کو اُردو کا لقب دینے کا مخالف ہوں۔ اس کو بالکل اڑا دینا چاہیئے خصوصاً اس کے ہندوستان کی قومی زبان بنائے جانے کے دعاوی کے خیال سے "ہندوستانی" ہر طرح سے نہایت مناسب لفظ ہوگا۔ اور میں نے اکثر اس بات پر استعجاب ظاہر کیا ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی بجائے اردو کے کیوں یہی نام علی العموم استعمال نہیں کرتے جس سے اس کے خالص ملکی ابتدائی اور ایک مخصوص نوعیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ ہندوستانی اپنے نشو و نما کے اولین زمانہ میں لشکر میں رائج رہ چکی ہے اور اسی بنا پر اسے اُردو کہا جاتا ہے اس کا یہ نام جاری رکھنا کچھ زیادہ قرین صواب نہیں ہو سکتا، جس طرح آدمی کو صرف اس لئے بندر

کہنا کہ ڈارون کی تھیوری کے مطابق اس کا مفروضہ تعلق "انسان نما میموں" سے بتایا جاتا ہے۔

۲

ہندوستانی زبان کی واقعی ابتدا کس طرح ہوئی؟ اس کے آغاز کا کھوج برج بھاشا سے لگانا چاہئے جو اسکی حقیقی ماں کے درجہ پر ہے۔ برج بھاشا سے ہماری مراد وہ ہندی ہے جو دہلی اور اس کے ملحقہ علاقے میں بولی جاتی تھی۔ اسی برج بھاشا میں بتدریج فارسی عربی اور نیز ترکی الفاظ اور جملے بھی شامل ہو گئے تھے جسے ہندؤں اور اسلامی فاتحوں کے جو آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں آئے شاہراہ زندگی کے دائمی اور مستقل میل ملاپ کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ دریائے سندھ کے پار یا ہمالیہ کے شمال سے آنے والی فاتح جماعتیں کم و بیش فارسی زبان بولتی تھیں اور یہی سبب ہے کہ ہندوستانی میں عربی و ترکی کی بہ نسبت فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ نارمن فرنچ کو جو نسبت اینگلوسیکس سے ہے وہی فارسی کو ہندی کے ساتھ ہے اس لئے اگر ہندی کو ہندوستانی کی ماں کہا جائے تو فارسی کو باپ کا درجہ ملنا چاہئے اور عربی کو نسبتی جد ہونے کا۔ بشرطیکہ ہم اس لقب کے استعمال کرنے کا مجاز ہوں۔ کیونکہ اس کا حقیقی رشتہ اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ فارس اور ہندوستان کی لسانی برادری سے عربی کو براہ راست کوئی واسطہ نہیں، اسی وجہ سے ہندوستانی کا اسے نسبتی جد کہا ہے۔ کیونکہ تعلقات مابعد کی بنا پر باوقعت حیثیت پیدا کر لینے پر بھی وہ اجنبی تھی اور آج کے دن تک ہے جسطرح انگریزی میں لاطینی۔ ہندوستانی میں کسی نظم یا کہانی کا لکھنا عربی کا ایک حرف استعمال کئے بغیر ممکن ہے حالانکہ یہ بات ہندی اور فارسی الفاظ کے بدون دشوار ہے۔

اسی طرح اینگلوسیکس اور نارمن فرنچ الفاظ کے بغیر فصیح انگریزی ممکن نہیں حالانکہ بلا لاطینی اور یونانی الفاظ کے ایسا ہونا قریب الامکان ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک انگریزی مصنف جو لاطینی کم اور یونانی کمتر جانتا تھا، تاہم انگریزی زبان کا سربرآوردہ ترین مصنف تھا۔ با ایں ہمہ اگرچہ قدیم ہندی میں فارسی عربی اور دوسرے غیر ملکی عناصر کے اسطرح شامل ہو جانے سے اس میں ایک جداگانہ زبان ہونے کی حیثیت پیدا ہو گئی لیکن پھر بھی اس میں جسے اُردو یا ہندوستانی کہتے ہیں قدیم ہندی کی مخصوص نحو، لہجہ، اور تصریف باقی ہے، اور اس لئے لسانی نقطۂ خیال سے اس کو ایک بالکل علیحدہ اور جُداز بان سمجھنا سخت غلطی ہے۔ اس بات کے یقین کرنے کی بھی کافی وجوہات موجود ہیں کہ اگرچہ فارسی اور عربی عناصر ہندی میں کئی صدیوں سے داخل ہو چکے تھے لیکن ہندوستانی زبان نے سولھویں صدی تک کوئی خاص امتیازی شکل وصورت نہیں قبول کی تھی جیسا کہ مسٹر بیمس کہتے ہیں:-

> قطب الدین ایبک، جو دہلی کا پہلا اسلامی فرمانروا تھا، کی فتوحات کے بعد کئی نسلوں تک فاتحان اسلام نے اپنی خاص زبان فارسی اور مفتوح قوم نے ہندی قائم رکھی۔ مسلمان ایک عرصہ تک فصیح ہندی بولنے کے عادی تھے اور کچھ انہوں نے ہندی میں فارسی الفاظ نہیں شامل کئے بلکہ خود ہندو مذکورۂ بالا زمانہ میں ٹوڈرمل کے "طریق مالگذاری" کے رواج کی وجہ سے فارسی سیکھنے پر مجبور ہوئے۔

میں ناظرین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کراؤں گا کہ خود ہندؤں نے اکبر کے "ریوینیو سسٹم" کے نفوذ پر جو ٹوڈرمل ایسے پیدائشی وتربیتی راسخ العقیدت ہندو کا طبعزاد تھا ہندی

میں فارسی الفاظ کے شمول کی شروعات کی۔ اس لحاظ سے فارسی کی تحصیل ہندوؤں پر اس طرح جبری نہ تھی جس طرح اہل فارس و باشندگان اسپین کے لئے عربی کی تعلیم شاید رہی ہو۔ بلکہ انہوں نے اس کو بخوشی قبول کر کے اُسے برضامندی اپنی خاص زبان میں شامل کیا اور اس اعتبار سے مسلمانوں کی طرح اُنہیں بھی ہندوستانی کے وجود میں لانے کا کریڈٹ ملنا چاہیئے۔ ایڈورڈ اول کے عہد حکومت میں جو حال انگریزی کا تین صدی پیشتر تھا اُسی طرح ہندوستانی بھی سولہویں صدی کے آخر میں بزمانہ اکبر اعظم عالم طفلی میں تھی۔ اس لئے قومی گورنمنٹ اور قومی مذہب یعنی دین الٰہی کی طرح ہندوستانی زبان کی ابتدا کے لئے بھی جس کے آیندہ قومی زبان ہونے کی قوی امید ہے اکبر کے وقت سے کھوج لگانا چاہیئے .... عہد اکبری واقعی طور پر ہندوستانی کی پیدائش کا زمانہ تھا اور اس کی تصدیق میر امن دہلوی نے بھی کی ہے۔ وہ اپنے دیباچہ باغ و بہار میں اسی امر کے متعلق لکھتے ہیں :۔

> جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سنکر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔

اس کے علاوہ مولوی محمد حسین آزاد بھی اپنی مشہور کتاب آب حیات میں اسی خیال کو اپنے شاندار اور عدیم النظیر تحریر میں اسطرح ظاہر کرتے ہیں :۔

> رفتہ رفتہ اکبر کے عہد سے کہ ہندو مسلمان شیر و شکر ہو گئے یہ نوبت ہوئی کہ ادھر بادشاہ اور اُس کے اعلیٰ درجہ کے اہل دربار نے جبہ و دستار کے ساتھ ڈاڑھیوں کو خدا حافظ کہا اور جامے پہنکر کھڑکی دار پگڑیاں باندھ بیٹھے۔ اُدھر ہندو شرفا بلکہ راجے مہاراجے ایرانی لباس پہننے اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے بلکہ "مرزا" کے خطاب کو بڑے شوق سے لینے لگے۔

۳

لیکن جس طرح اکبر کے زمانہ میں ہندوستانی شمالی ہند میں عالم وجود میں آرہی تھی اُسی طرح اور تقریباً اسی وقت اُس کی عمزاد خواہر دکھنی گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں میں نشو و نما حاصل کر رہی تھی۔ بلاشبہ اس بات کا دعوے جائز فخر کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اُردو یا ہندوستانی کے قدیم ترین مصنفین اُنھیں بعض اسلامی خاندانوں کی سرپرستی میں گزرے ہیں اور اُن کی تصنیفات اُنہیں کے عہد کی یادگار ہیں جو قدیم سلطنت بہمنی کے زوال کے بعد وجود میں آئیں۔ خواہ اس وجہ سے کہ حکومت بہمنی کا بانی ایک برہمن کا چیلہ تھا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے یا اس لئے کہ خاندان ہائے بہمنی بعض بانیان ہندو یا شاید برہمن نومسلم تھے جس طرح کہ برار اور احمد نگر والے یقیناً تھے یا اس سبب سے کہ دکن کے اسلامی حکمراں اور رؤسا ہندو خواتین کو رشتۂ مناکحت میں منسلک کرنے کے عادی تھے جیسا کہ ان کی اکثر اولاد کا اب تک یہی قاعدہ ہے، یا اس کے برعکس، یا اس بات سے کہ مذہبی آزادی کی حکمت عملی پر بالعموم کاربند ہونے سے جسکا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں کی تعداد سرکاری ملازموں میں بہت زیادہ تھی اسوقت اس حصۂ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی تعلقات نہایت صلح آمیز اور حد سے زیادہ خوش گوار تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مخلوط زبان جسے ریختہ کہتے ہیں

اور جو شمال کی ہندوستانی سے بہت مشابہ تھی دو صدی کے اندر دکن میں موجود تھی ۔ صوبہ سرحدی اور پنجاب سے جو ایک عرصہ تک افغانستان اور وسط ایشیا کی حملہ آور جماعتوں کا مرکز رہ چکے ہیں جدا اور نسل و مذہب کے اُن شدید قضیوں سے جو وہاں کے لئے آئے دن کی بات تھے علیحدہ رہنے کی وجہ سے سلاطین گجرات اور دکن کے ملوک بہمنی کو امن آمیز انتظام اور اندرونی ترقی کا اپنے شمالی معاصر سے زیادہ تر موقع حاصل تھا ۔ چنانچہ اُردو کا نہایت قدیم شاعر شجاع الدین نوری گجرات کا باشندہ تھا اور اکبر اعظم کے درباری شاعر فیضی کا ہمعصر تھا ۔ اُسے سلطان ابوالحسن قطب شاہ والی گولکنڈہ کے وزیرزادے کی اتالیقی کی خدمت سپرد تھی اور اس کی چند ہندوستانی غزلیات کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اب تک محفوظ ہیں ۔ قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ (۱۵۸۱-۱۵۸۶ء) اور نیز اس کے جانشین عبداللہ قطب شاہ (۱۶۱۱ء) ان دونوں نے اپنے کلام کا مجموعہ جسمیں غزلیات، رباعیات، مثنویاں اور قصائد شامل ہیں بطور یادگار چھوڑے ہیں ۔ اور موخرالذکر کے زمانہ میں ابن نشاطی نے دو کتابیں دکھنی زبان میں طوطی نامہ اور پھول بن کے نام سے لکھی ہیں ۔ اس لحاظ سے ہندوستانی علم ادب کی بنیاد گولکنڈہ میں پڑی یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ بمقام حیدرآباد دکن حضور نظام کی مملکت میں، جو قدیم سلاطین بہمنی کے مقبوضہ ممالک کے غالب حصہ پر حکومت کر رہے ہیں جسکا علم ناظرین کو بجائے خود ہے ۔ ہز ہائینس میر محبوب علی خاں کے قبضہ میں ملوک بہمنی کی صرف سطوت و مملکت ہی نہیں آئی بلکہ آپ ہندوستانی زبان و ادب کی سرپرستی کرنے میں بھی موخرالذکر کے نقش قدم پر چلے ہیں ۔ یہ سبھوں کو معلوم ہے کہ ہز ہائینس نظام خود ہندوستانی کے اعلےٰ درجہ کے سخنگو ہیں اور غزلیات آصف آپ کے ممالک محروسہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گائی جاتی ہیں ۔ اسی طرح ہز ہائینس کے وزیر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد جن کا تخلص شادؔ اس وجہ سے نہایت موزوں واقع ہوا ہے کہ آپ مہاراجہ چندولال شاداںؔ کے جو آپ ہی کی طرح اپنے زمانہ کے ایک نامی شاعر تھے نواسے ہیں ۔ ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا اور مجھے یہ امید و یقین کرنے کی وجہ موجہ حاصل ہے کہ ان ہر دو ذی مرتبت اور عالی مناقب نفوس کے ظل عاطفت اور فیاضانہ معاونت سے ہندوستانی زبان اور لٹریچر کو جدید ہندوستان کی تمام دیگر مروجہ زبانوں کے مقابلہ میں ترقی حاصل کرنے اور عروج پانے کا بہترین موقع ہے ۔ کاش ہندوستانی زبان و ادب کے محافظ اس سنہرے موقع کی قدر و قیمت کو سمجھیں اور اُن سے صحیح طور پر فائدہ اُٹھا کر ان میں وہ بات پیدا کردیں کہ تمام اقوام ہند کو مجبوراً اُن کی عظمت کا قائل ہونا پڑے ۱؎ ۔

۴

ہندوستانی زبان و ادب کی ابتدا اور اُسکی ترقی کے متعلق مذکورۂ بالا خیالات کا اظہار مختصراً امپیریل گزیٹیر جلد اول کے صفحات ۳۶۵ و ۳۶۶ میں اس طرح کیا گیا ہے :-

لیکن ہندوستانی جو مغربی ہندی کی شاخ ہے معمولی طور پر کوئی مقامی زبان نہیں بلکہ برّاعظم ہند کے شمال و مغرب میں

۱؎ یہ مضمون اُس وقت کا لکھا ہوا ہے جب حیدرآباد کی مسند حکومت کو سلطان دکن میر محبوب علی خاں مرحوم کی ذات والا صفات پر فخر کرنے کا موقع حاصل تھا ۔ اب دکن کی عنان فرماں روائی آپ کے جانشین محترم میر عثمان علی خاں بہادر بالقابہم کے دست مبارک میں ہے اور امید ہے کہ آپ بھی اپنے والد مکرم کے نقش قدم پر چلیں گے اور آپ کا دربار اہل کمال و ماہران فن سے بدستور معمور رہے گا ۔ (مترجم)

بھی تمام وہ زبان ثانیہ کے طریقے پر بولی جاتی اور عدالتوں اور بازاروں میں عموماً مستعمل ہے۔ مسلمان اور ہندو دونوں کے ہاتھوں اُسے معتدبہ علمی تقویت پہنچی ہے۔ اوّل الذکر نے لکھنے میں فارسی رسم الخط استعمال کیا اور اس کے لغت میں فارسی و عربی کا کثیر ذخیرہ شامل کر دیا۔ جب اس قسم کے مستعار الفاظ کی کثرت انتہائی درجہ کو پہنچ جاتی ہے جیسا کہ اتفاقاً لکھنؤ کا رواج پیش کیا جا سکتا ہے اس وقت صرف تعلیم یافتہ مسلمان اور وہ ہندو جنہیں اسلامی طرز پر تعلیم دی گئی ہو اس زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔ دکن میں اُردو زیادہ تر مسلمانوں میں رائج ہے اور یہیں اُردو علم ادب نے ابتدائی نشو و نما بھی پائی ہے۔ دکھنی ہندوستانی جیسا کہ عام طور پر اس کا نام لیا جاتا ہے دہلی و لکھنؤ کے موجودہ معیار سے کسی قدر مختلف ہے اور اس میں بہت سی قدیم خصوصیات اب تک ایسی باقی ہیں جنکا شمال میں پتہ بھی نہیں۔

گولکنڈہ کے قطب شاہیوں کی طرح عادل شاہی سلاطین بیجاپور بھی ہندوستانی علم ادب کی سرپرستی کے لئے مشہور ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ (۱۵۷۹-۱۶۲۶) جسکی اکیلی منکوحہ بیگم ایک مرہٹہ خاتون بابو جی خانم نام کی تھی نورس کا مصنف تھا لیکن اس کی یہ تصنیف اُردو کے بجائے ہندی کہے جانے کی زیادہ تر مستحق ہے۔ علی عادل شاہ کا درباری شاعر ایک برہمن تھا اور اسی برہمن سخنگو نے جس کا تخلص نصرتی تھا ۱۶۵۷ء میں ایک مثنوی گلشن عشق کے نام سے لکھی تھی۔ لیکن گولکنڈہ و بیجاپور کے یہ قدما واقعی معنوں میں صرف راستہ صاف کرنے والے تھے اعد اُردو کا اولین اور مقبول انام معیار ادب ولی دکھنی اورنگ آبادی کا (جس نے اورنگ زیب کا آخری زمانہ پایا اور بہادر شاہ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد حکومت کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا) قایم کیا ہوا ہے۔ اس کا نام بابائے ریختہ رکھا گیا ہے اور اُسے اُردو کا چاسر کہنا درست ہوگا۔ جب ولی کا دیوان دہلی میں بعہد محمد شاہ اول مرتبہ آیا تو اُسے دیکھکر تمام شمالی ہند والے متحیر تھے۔ اور یہ بات عام طور سے تسلیم کر لی گئی ہے کہ اٹھارویں صدی میں نظم اُردو کی ساری ترقیات زیادہ تر ولی کی نظیر اور مثال کا نتیجہ تھیں۔ ولی کا دیوان یورپ میں پہلے پہل میرے محترم اُستاد اور عالی مرتبت دوست پروفیسر گرسین ڈی ٹاسی ساکن پیرس کے اہتمام سے جو ہندی و ہندوستانی کے ایک محنت پسند اور متبحر عالم گذرے ہیں اور جنکی تین جلدوں میں ترتیب دی ہوئی ہندی و ہندوستانی زبان و لٹریچر کی تاریخ معلومات و تحقیقات کی ایک ایسی بیش قیمت کان ہے جس کے بغیر ہندی اور ہندوستانی کے کسی طالب علم کو چارہ نہیں ہو سکتا شائع ہوا تھا میں ان کا آخری شاگرد تھا اور اس ہشتاد سالہ فرخ عالم کی اس متواضعانہ خلق اور غایت مہربانی کو میں کبھی نہیں بھول سکتا جو انہوں نے کتب مشرقی کے نادر الوجود مجموعہ کا خزانہ میرے سپرد کرنے اور دار السلطنت فرانس و یورپ میں بٹھکر مجھے پریم ساگر ہندی اور باغ و بہار ہندوستانی کے مطالعہ میں امداد دینے میں ظاہر فرمائی۔

جس زمانہ میں نظام الملک آصف جاہ بہادر ملک دکن میں اپنا تسلط جما رہے تھے ولی دربار دہلی میں شاعرانہ امتیاز پیدا کر رہا تھا جہاں حاتم، سودا، میر تقی، آرزو، درد اور بہت شعرا نے اُسکو اپنا اُستاد تسلیم کیا اور اُس کے پُرجوش مقلد اور پیرو بن گئے۔ جب نادر شاہ، مرہٹوں، اور دُرّانیوں کے حملوں کی وجہ سے ان میں سے اکثر شعرا شجاع الدولہ کے دربار میں لکھنؤ چلے آئے تو وہاں اُن کے بعد ایسے قابل و لایق شاگرد پیدا ہوئے جیسے میر حسن، میر سوز، آتش، انیس، انیس واجد علی شاہ اختر کا بھی شمار ہو سکتا ہے جو لکھنؤ کا آخری اور بدنصیب نواب وزیر تھا۔

*



بسنت رت

(از بابو ابنندرو ناتھہ ٹیگور کلکتہ)

انڈین پریس الہ آباد

اور گولکنڈہ کے آخری فرمان فرما تانا شاہ کی طرح خود بھی ایک بڑا شاعر اور ماہر فن موسیقی تھا۔ اگرچہ اختر کا قیام کلکتہ میں بمقام مٹیا برج ایک اسیر سلطانی کی حیثیت سے تھا با ایں ہمہ دارالسلطنت ہند میں اس کی صرف موجودگی ہی سے بنگال کی اُردو و فارسی شاعری کے چراغ سحری میں جس کی مدہم روشنی دربار مرشدآباد اور ڈھاکہ اور مشرقی بنگال کے چند قدیم ذی اختیار خاندانوں میں پائی جاتی تھی نئی جان ڈالدی۔ اُس کی دو مشہور غزلیں

جب چھوڑ چلے لکھنؤ نگری

اور شاہزادۂ عالم تیرے لئے

مشرقی اور مغربی بنگال میں جس ذوق و شوق سے گائی جاتی تھیں اور اس کے سننے سے بنگالیوں کے گھروں اور دلوں میں معزول بادشاہ اودھ کی حالت پر جو ہمدردانہ جذبات پیدا ہوتے تھے وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ اس زمانے میں بنگال میں بالعموم اور مشرقی بنگال میں خصوصیت سے ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات البتہ اب سے مختلف تھے۔

اُردو زبان و ادب کا مختصر خاکہ مندرجہ بالا سطور میں کھینچنے کے بعد ہم اب اس پہلو سے بحث کرنا اور دکھانا چاہتے ہیں کہ اُردو کو تمام رایج الوقت دیسی زبانوں کے مقابلہ میں ہندوستان کی قومی زبان بننے کے لئے کیوں حق مرجح حاصل ہے۔

(۱) اُردو ایک طرح سے کم وبیش ہندوستان کی لنگوا فرینکا (عام بولی) رہ چکی ہے، اور اب بھی ہے۔ ڈھاکہ سے کراچی تک اور لاہور سے تنجور تک یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس وجہ سے اور ہر ایک زبان سے اس کے سمجھنے والے تعداد میں زیادہ ہیں

(۲) اُردو انگریزی کی طرح ایک مخلوط اور مرکب زبان ہے جس میں موزوں تناسب کے ساتھ ہندو اور اسلامی عنصر دونوں پائے جاتے ہیں اور یہ صفت ہر ہندوستانی انسٹی ٹیوشن کے لئے، خواہ وہ معاشرتی ہو یا مذہبی، ملکی ہو یا لسانی، لازمی ہے۔

(۳) اس کے ماسوا یہ انگریزی کی طرح ایک عملی اور لوچدار زبان ہے۔ جو نہ اضعان صرف و نحو کے ہاتھوں مکلف بنائی گئی ہے نہ حریص واقفان علم اللسان نے اسے بطور خود ایجاد کیا ہے۔ بلکہ اس کا وجود ضرورت واقعی اور ہندو مسلمانوں کے صدہا سال کے روزمرّہ کاروبار پر مبنی ہے اس کے لوچدار ہونے سے اس میں یہ قابلیت پیدا ہوگئی ہے کہ حسب ضرورت نئے اجزاء اس میں شریک ہوسکتے ہیں اور اس اعتبار سے اس میں آیندہ غیر محدود ترقی کا سامان موجود ہے آزاد بھی اسی بات کو کس خوبصورتی سے کہتے ہیں:۔

> بیان ہائے مذکورۂ بالا سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ اس میں ہوا کسی کی تحریک یا ارادہ سے نہیں ہوا بلکہ زبان مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے سنسکرت آئی اس سے مل گئی۔ عربی، فارسی آئی اُس سے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ (آب حیات ص ۲)

(۴) اُسے کم وبیش برٹش گورنمنٹ ہند کی سرپرستی کا فخر حاصل رہ چکا ہے اور اب بھی ہے۔ مسٹر بیمس کے قول کے مطابق وہ "فاتح قوم کی مخصوص محبوبہ ہے" اور اسی لئے مذہب، قوم اور زبان، کے خوفناک تنازعوں میں بھی جو اس وسیع براعظم ہند میں روز بروز شدید ہوتے جاتے ہیں اُسے آیندہ ترقی کے مواقع ہر دیگر ہندوستانی زبان سے زیادہ حاصل ہیں۔

(۵) اس کا رسم الخط ناگری بلکہ تمام دوسرے خطوں سے جو خالص ہندو دیسی زبانوں کے لئے مستعمل ہیں آسان تر ہے۔

اور ہندو مسلمان دونوں صدیوں تک اسے استعمال کر چکے ہیں۔ اُردو رسم الخط ایک طرح سے مختصر نویسی کا نمونہ ہے اور تھوڑی سی مشق کے بعد تقریباً ہر شخص اُسے نہایت روانی کے ساتھ خوشخط لکھ سکتا ہے۔ فارسی اُردو کا ہر ایک نستعلیق نوشتہ جو کسی اُستاد کا لکھا ہوا ہو فنِ خوشنویسی کا ایک نہایت دیدہ زیب اور پُر صنعت نمونہ ہوتا ہے جس کی نظیر انسان کی نگاہ میں بمشکل آسکتی ہے۔ (باقی آیندہ)

سید محمد فاروق (شاہپوری)

سلاجقہ روم کے نقرئی سکہ جات

سلجوق کی اولاد نے مغربی ایشیا میں جو عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی، وہ سو برس کے اندر اندر متعدد حصّوں میں منقسم ہو گئی۔ جلال الدین ملکشاہ ۴۸۵ھ ۱۰۹۲ء کے انتقال پر محمد اور برکیارق میں جب خانہ جنگیاں شروع ہوئیں تو سلطنت کو روز بروز انحطاط ہونے لگا جس سے فائدہ اٹھا کر چند سلجوقی شہزادوں نے کرمان عراق شام روم وغیرہ میں اپنی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کرلیں جو سلطان معز الدین سنجر ۵۵۲ھ ۱۱۵۷ء کے مرنے تک مطیع و منقاد رہیں پھر انہوں نے خودسری اختیار کرلی۔

رومی شاخ کا سلسلہ سلجوق کے بیٹے اسرائیل تک پہنچتا ہے۔ ۴۵۵ھ ۱۰۶۳ء میں جب الپ ارسلاں تخت نشین ہوا تو قتلمش نے اسکی مخالفت کی اور ترکمانوں سے امداد حاصل کر کے بہت سے علاقوں پر قابض ہو گیا۔ الپ ارسلاں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اُس نے اس بغاوت کا انسداد کرنا چاہا اور کثیر التعداد سپاہی ہمراہ لے کر لشکرکشی کردی دامغان کے پاس مقابلہ ہوا عین معرکہ میں قتلمش کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ ایک چٹان پر گر پڑا جس کے صدمہ سے دماغ پاش پاش ہو گیا اور روح پرواز کر گئی[1]

اس کے بعد الپ ارسلاں نے اس کے اہل و عیال کو قتل کرنا چاہا۔ مگر جب نظام الملک طوسی نے سفارش کی تو بادشاہ نے نہ صرف اپنا ارادہ فسخ کردیا بلکہ سلیمان بن قتلمش کو شام کی سپہ سالاری بھی دیدی۔ سلیمان نے شام میں پہنچ کر اپنے علاقہ کو وسیع کرنے کا ارادہ کیا۔ اور قرب وجوار کے شہروں پر یورشیں شروع کیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں حلب و انطاکیہ فتح ہو گئے ان فتوحات سے برہم ہو کر تاج الدولہ تتش بن الپ ارسلاں ۴۷۹ھ ۱۰۸۶ء نے سلیمان کے مقبوضات پر حملہ کردیا۔ سلیمان نے پریشان ہو کر خودکشی کرلی۔ اور تمام علاقہ تتش کے قبضہ میں آگیا۔ ملکشاہ نے ان واقعات کو سنکر اپنی ناراضگی ظاہر کی اور سلیمان کے بیٹے داؤد کو تمام ملک واپس دلا دیا[2]۔ اس کے بعد یہاں کی حکومت اس خاندان میں موروثی ہو گئی داؤد کے انتقال پر ملکشاہ اور مسعود نے یکے بعد دیگرے ۷۱ سال حکمرانی کی اور اپنی زندگی میں سلاجقہ اعظم کے زیر فرماں رہے۔ سنہ میں جب قلج ارسلان بر سر حکومت ہوا تو اس نے آزادی حاصل کرلی اور سب سے پہلے اپنے نام کا خطبہ وسکہ جاری کیا[3]

---

[1] تاریخ گزیدہ طبع لنڈن ص ۴۴۴ [2] تاریخ گزیدہ مصنفہ حمداللہ مستوفی طبع لنڈن ص ۴۸۰ [3] جرنل آف دی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۴۲ صفحہ ۲۷۴

یہ سلطنت ۴۷۰ھ ۱۰۷۷ء سے لیکر ۷۰۰ھ ۱۳۰۰ء تک قریباً ۲ سو برس قائم رہی اور ۱۶ بادشاہ برسر حکومت ہوے جنکے سنین جلوس اور شجرۂ نسب ذیل میں درج ہیں[1]

سنین جلوس

۱ سلیمان اول بن قتلمش ۴۷۰ھ-۴۷۹ھ ۱۰۷۷ء-۱۰۸۶ء

وقفہ (وہ زمانہ جبکہ تاج الدولہ تتش کا قبضہ رہا) ۴۷۹ھ-۴۸۵ھ ۱۰۸۶ء-۱۰۹۲ء

۲ داؤد قلیچ ارسلان ۴۸۵ھ-۵۰۰ھ ۱۰۹۲ء-۱۱۰۶ء

۳ ملک شاہ اول ۵۰۰ھ-۵۱۰ھ ۱۱۰۶ء-۱۱۱۶ء

۴ مسعود اول ۵۱۰ھ-۵۵۱ھ ۱۱۱۶ء-۱۱۵۶ء

۵ اعز الدین قلیچ ارسلان ثانی ۵۵۱ھ-۵۸۴ھ ۱۱۵۶ء-۱۱۸۸ء

۶ قطب الدین ملکشاہ ثانی ۵۸۴ھ-۵۸۸ھ ۱۱۸۸ء-۱۱۹۲ء

۷ غیاث الدین کیخسرو اول ۵۸۸ھ-۵۹۷ھ ۱۱۹۲ء-۱۲۰۰ء

۸ رکن الدین سلیمان ثانی ۵۹۷ھ-۶۰۰ھ ۱۲۰۰ء-۱۲۰۳ء

۹ قلیچ ارسلان ثالث ۶۰۰ھ-۶۰۱ھ ۱۲۰۳ء-۱۲۰۴ء

کیخسرو اول (مکرر) ۶۰۱ھ-۶۰۷ھ ۱۲۰۴ء-۱۲۱۰ء

۱۰ اعز الدین کیکاؤس اول ۶۰۷ھ-۶۱۶ھ ۱۲۱۰ء-۱۲۱۹ء

۱۱ علاء الدین کیقباد اول ۶۱۶ھ-۶۳۴ھ ۱۲۱۹ء-۱۲۳۶ء

۱۲ غیاث الدین کیخسرو ثانی ۶۳۴ھ-۶۴۳ھ ۱۲۳۶ء-۱۲۴۵ء

۱۳ اعز الدین کیکاؤس ثانی ۶۴۳ھ-۶۵۵ھ ۱۲۴۵ء-۱۲۵۷ء

۱۴ رکن الدین قلیچ ارسلان رابع ۶۵۵ھ-۶۶۶ھ ۱۲۵۷ء-۱۲۶۷ء

۱۵ غیاث الدین کیخسرو ثالث ۶۶۶ھ-۶۸۶ھ ۱۲۶۷ء-۱۲۸۳ء

۱۶ غیاث الدین مسعود ثانی ۶۸۶ھ-۶۹۶ھ ۱۲۸۳ء-۱۲۹۶ء

۱۷ علاء الدین کیقباد ثانی ۶۹۶ھ-۷۰۰ھ ۱۲۹۶ء-۱۳۰۰ء

---

[1] کتاب محمڈن ڈائناسٹی مصنفۂ مسٹر اسٹینلی لین پول صفحہ ۱۵۵

شجرۂ نسب

قتلمش
- (۱) سلیمان
  - (۲) داؤد قلیچ ارسلان
    - (۳) ملکشاہ اول
    - (۴) مسعود اول
      - (۵) قلیچ ارسلان ثانی
        - (۶) ملکشاہ ثانی
        - (۷) کیخسرو اول
          - (۱۰) کیکاؤس اول
          - (۱۱) کیقباد اول
            - (۱۲) کیخسرو ثانی
              - (۱۳) کیکاؤس ثانی
                - (۱۶) مسعود
              - (۱۴) قلیچ ارسلان رابع
                - (۱۵) کیخسرو ثالث
              - (۱۷) کیقباد ثانی
        - (۸) سلیمان ثانی
          - (۹) قلیچ ارسلان ثالث

تفصیل سکہ جات

(۵) قلیچ ارسلان

۱- دار الضرب- قونیہ- تاریخ- ۵۸۲ھ ہجری

رخ اول لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ

الناصر لدین اللہ امیر المومنین

حاشیہ ضرب ہذا الدینار بقونیتہ

رخ دوم محمد رسول اللہ- صلے اللہ علیہ

السلطان المعظم- قلیچ ارسلان

حاشیہ سنۃ ثنتین وثمنین وخمس مائۃ

(۷) کیخسرو اول

۲- دار الضرب قونیہ- تاریخ- ۵۹۲ھ ہجری

رخ اول لا الہ الا اللہ- وحدہ لا شریک لہ

الناصر لدین اللہ- امیر المومنین

حاشیہ ضرب ہذا الدرہم- بقونیہ

رخ دوم محمد رسول اللہ - السلطان المعظم
کیخسرو بن - قلج ارسلان
حاشیہ سنتہ اثنین وتسعین وخمس مائۃ

(۸) سلیمان دوم

۳ - دارالضرب - قیصریہ تاریخ ۵۹۷ھ ہجری -
رخ اول گھوڑا سوار
حاشیہ لا الہ الا اللہ - محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ
الناصر لدین اللہ امیر المومنین
رخ دوم السلطان القاہر ابوالفتح سلیمان بن
قلج ارسلان ناصر - امیر المومنین
حاشیہ ارسلہ بالہدیٰ و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ضرب
بمدینۃ قیصریہ سنۃ سبع وتسعین وخمس مائۃ

(۱۰) کیکاؤس اول

۴ - دارالضرب - قونیہ تاریخ ۶۱۰ھ ہجری
رخ اول الامام الناصر - لدین اللہ - امیر المومنین
حاشیہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
رخ دوم السلطان الغالب - عز الدنیا والدین - کیکاؤس بن کیخسرو
حاشیہ ضرب ہذا - الدرہم - بقونیۃ - سنتہ عشرۃ وستمائۃ
ن اسی قسم کے سکہ جات سیواس میں بھی مضروب ہوئے ہیں

(۱۱) کیقباد اول

۵ - دارالضرب - قونیہ تاریخ ۶۱۷ھ ہجری
رخ اول السلطان المعظم علاء الدنیا والدین کیقباد بن کیخسرو
حاشیہ ضرب - ہذا - الدرہم - بقونیۃ
رخ دوم الامام - الناصر لدین اللہ - امیر المومنین
حاشیہ سنتہ سبع عشر وستمائۃ

۶ - دارالضرب - سیواس تاریخ ۶۱۶ھ ہجری
رخ اول السلطان المعظم کیقباد بن کیخسرو
حاشیہ ضرب - ہذا - الدرہم - بسیواس
رخ دوم المومنین - الامام الناصر - لدین اللہ امیر
حاشیہ سنتہ - ست عشرۃ - وستمائۃ

(۱۱) کیخسرو دوم

۷ - دارالضرب - سیواس تاریخ ۶۳۴ھ ہجری
رخ اول السلطان الاعظم - کیخسرو - بن کیقباد
حاشیہ ضرب ہذا - الدرہم - بسیواس
رخ دوم الامام - المستنصر - باللہ امیر المومنین
حاشیہ سنتہ اربع - ثلثین وستمائۃ
۸ - دارالضرب سیواس - تاریخ ۶۳۷ھ ہجری
رخ اول الامام - المستنصر - باللہ امیر - المومنین
حاشیہ سنتہ سبع ثلثین وستمائۃ
رخ دوم السلطان الاعظم غیاث الدنیا والدین - کیخسرو بن کیقباد
حاشیہ ضرب ہذا - الدرہم - بسیواس
۹ - دارالضرب قونیہ تاریخ ۶۴۴ھ ہجری
رخ اول بسم اللہ الرحمن الرحیم - لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
الامام المستعصم - باللہ امیر المومنین -
حاشیہ فی سنتہ - اربع - اربعین - وستمائۃ
رخ دوم السلطان الاعظم - ظل اللہ فی العالم - غیاث الدنیا
والدین - کیخسرو بن کیقباد - قسیم امیر المومنین
حاشیہ ضرب ہذا - الدرہم - بمدینہ - قونیہ
ن اس قسم کے قیصریہ میں بھی مضروب ہوئے ہیں - مگر ان کا
سنہ نہیں پڑھا گیا -

(۱۳) کیکاؤس دوم

۱۰- دارالضرب سیواس- تاریخ ۶۴۴ھ ہجری

رخ اول الامام المستعصم- باللہ- امیرالمومنین

حاشیہ سنۃ- اربعۃ- واربعین- وستمائۃ

رخ دوم السلطان المعظم- عزالدنیا والدین- ابوالفتح کیکاؤس بن کیخسرو

حاشیہ ضرب ہذا- درہم- بسیواس

۱۱- دارالضرب- سیواس- تاریخ ۶۴۴ھ ہجری

رخ اول السلطان الاعظم- ظل اللہ فی العالم- عزالدنیا والدین کیکاؤس بن کیخسرو

حاشیہ ضرب ہذا- الدرہم- بسیواس

رخ دوم لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ- الامام المستعصم باللہ امیرالمومنین

حاشیہ سنۃ اربعۃ- واربعین- وستمائۃ

۱۲- دارالضرب- قونیہ تاریخ ۶۴۵ھ ہجری

رخ اول السلطان المعظم- عزالدنیا والدین- ابوالفتح کیکاؤس بن کیخسرو

حاشیہ ضرب ہذا الدرہم بقونیۃ سنۃ خمس واربعین وستمائۃ

رخ دوم لاالہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ- محمد رسول اللہ

حاشیہ الامام المستعصم باللہ امیرالمومنین

(۱۴) قلج ارسلان رابع

۱۳- دارالضرب سیواس تاریخ ۶۴۶ھ ہجری

رخ اول گھوڑا سوار

حاشیہ السلطان الاعظم رکن الدنیا والدین قلج ارسلان بن کیخسرو

رخ دوم ۔۔قسیم امیرالمومنین

الامام- المستعصم باللہ امیرالمومنین-

حاشیہ ضرب ہذا الدرہم بسیواس فی سنۃ ست واربعین وستمائۃ

۱۴- دارالضرب- معدن تاریخ ۶۵۵ھ ہجری

رخ اول ضرب بمعدن الامام المستعصم- باللہ امیرالمومنین سنۃ خمس وخمسین وستمائۃ

رخ دوم السلطان الاعظم رکن الدنیا والدین- قلج ارسلان بن کیخسرو- برہان امیرالمومنین

اعزالدین کیکاؤس

رکن الدین قلج ارسلان

علاءالدین کیقباد

۱۵- دارالضرب بسیواس تاریخ ۶۵۳ھ ہجری

رخ اول لاالہ الا اللہ- محمد رسول اللہ الامام- المستعصم باللہ امیرالمومنین

ضرب بسیواس سنۃ ثلثۃ خمسین وستمائۃ

رخ دوم السلاطین الاعاظم- عزالدنیا والدین کیکاؤس- ورکن الدنیا والدین قلج ارسلان وعلاءالدنیا والدین کیقباد

بنو کیخسرو براہین امیرالمومنین

(۱۵) کیخسرو ثالث

۱۶- دارالضرب بسیواس تاریخ ۶۶۳ھ ہجری

رخ اول الملک اللہ

حاشیہ ضرب بسیواس سنۃ ثلث وستین وستمائۃ

رخ دوم السلطان الاعظم- غیاث الدنیا والدین- کیخسرو بن قلج ارسلان

۱۷- دارالضرب ارزنجان تاریخ ۶۷۱ھ ہجری

رخ اول سنۃ ۷۱- لاالہ الا اللہ- محمد رسول اللہ الامام المعصوم امیرالمومنین وستمائۃ

رخ دوم ضرب بارزنجان- السلطان الاعظم- غیاث الدنیا والدین کیخسرو بن قلج ارسلان- برہان امیرالمومنین

(۱۶) مسعود دوم

۱۸- دار الضرب سیواس تاریخ ۶۰۸ھ ہجری

رخ اول لا الہ الا اللہ ۔ محمد رسول اللہ

حاشیہ ضرب بسیواس سنۃ احد ثمانین وستمائۃ

رخ دوم الخلیفۃ اللہ ۔ السلطان الاعظم ۔ غیاث الدنیا والدین

ابو الفتح مسعود بن کیکاؤس

۱۹- دار الضرب - لاجمو تاریخ ۔ ۶۰۰ھ ہجری

رخ اول لا الہ الا اللہ ۔ محمد رسول اللہ ۔ ضرب بمدینہ لاجموفی

..... ستمائۃ

رخ دوم السلطان الاعظم ۔ غیاث الدنیا والدین ۔ ابو الفتح

مسعود ۔ بن کیکاؤس

ن رائل نومسمیٹک سوسائٹی کے رسالوں اور نیز مسٹر اسٹینلی لین پول کی بعض تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قونیہ ۔ سیواس مدینہ ارزنجان ۔ مدینہ لولو ۔ معدن بابرت ۔ ساردس ۔ قیصریہ میں سلاجقہ روم کے دار الضرب واقع تھے ۔ چنانچہ ان مقامات کے مضروب شدہ سکہ جات ۔ لندن، پیرس، برلن، وائنا سینٹ پیٹرزبرگ وغیرہ کے عجائب خانوں میں اب تک موجود ہیں ۔

حکیم سید شمس اللہ قادری

ہندو مسلمانوں کی تفریق سطحی ہے

" سمندروں اور پہاڑوں سے گھرا ہوا ہندوستان بلاشبہ جغرافیائی حیثیت سے ایک ہے ۔ اور اس لحاظ سے بجا طور پر اسے ایک ہی نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ اس ملک کی تہذیب میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جو اسے دنیا کے تمام دوسرے علاقوں سے ممیز کرتی ہیں ۔ گو اس اعتبار سے کہ یہ خصوصیتیں سارے ملک یا یوں کہنا چاہئے کہ اس سارے براعظم میں کافی مقدار میں پائی جاتی ہیں اسے انسانی، تمدنی، اور ذہنی ترقی کی تاریخ میں فرد تصور کیا جا سکتا ہے " " ہندوستان کی ابتدائی تاریخ " (صفحہ ۵) مصنفہ مسٹر وی ۔ اے ۔ اسمتھ صاحب

" ہندوستان کی تمدنی حالتوں کا سطحی اختلاف ہر شخص کو نظر آتا ہے لیکن اکثر اوقات اس اختلاف کی بنا یعنی کوہ ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک زندگی کی تہ میں جو یکسانیت پائی جاتی ہے اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے مگر ہندوستانی زندگی کا اتحاد صرف ان مسائل تک ہی محدود نہیں جو اس ملک کے علاوہ باقی ماندہ دنیا میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ یہاں کا غیر محدود اختلاف ایک مخصوص ہندوستانی رنگت کے دھاگے سے بندھا ہوا ہے ۔ اس ابتدائی مسئلہ کو نہ سمجھنے ہی کے باعث ہندوستان کی آبادی کے مختلف حصوں میں حسد، کینہ اور بغض موجود پایا جاتا ہے ۔ جہاں یہ لوگ ملکر کام کرتے ہیں انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے خیالات اگرچہ بالکل یکساں نہیں تاہم ایک دوسرے سے بہت کچھ تطابق رکھتے ہیں ۔ لیکن بلاد شرقیہ میں سطحی امور کی طاقت بڑی زبردست ہوتی ہے اور اسے صرف اسی طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ ان خیالات کا احتیاط اور غور کے ساتھ مطالعہ کیا جائے جو حقیقت میں مختلف ناموں اور انسٹی ٹیوشنوں کے

پیچھے موجود ہیں۔ مسٹر ونسنٹ اسمتھ ایسے یورپینوں کی نظر سے بھی جو جدید ہندوستان کی زندگی اور خیالات سے گہری علمی واقفیت رکھتے ہیں یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ "اقوام ہند کی زندگی اور محنت" صفحات ۳۰۵ تا ۳۱۰ (۱۹۱۱ء) مصنفہ مسٹر عبداللہ یوسف علی صاحب

بنی نوع انسان کے تو حد کے پیچھے اور اس کی تہ میں تدریجی حالات کا ایک ایسا اجتماع پایا جاتا ہے جو ان چٹانوں کی ساخت کی داستان سے کچھ کم دلچسپ نہیں جو مادہ کے تہ در تہ جمع ہوتے جانے سے تیار ہوئی ہوں۔ دونوں کی دلچسپی میں کلام نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے آخر الذکر عمل زیادہ اچھی طرح واضح ہو چکا ہے اور اول الذکر نہیں ہوا نسل کے بعد نسل، تہذیب کے بعد تہذیب، قرن کے بعد قرن، زمانہ گذرتا چلا گیا۔ تارکان وطن کی لہر پر لہر بہتی رہی ان میں ایک دوسرے سے ملنے کا رجحان پیدا ہوا اور اس کے بعد آخر میں سب ایک دوسرے سے مل جل گئیں۔ ایک لہر کے دوسری سے ملنے اور ان سب کا ایک ہو جانے کے بعد مقامی حالات کے زیر اثر خیالات اور اطوار کے خاص خاص سسٹم نمودار ہوئے۔ قدیم مصر کے پس پشت عناصر کے تاریخی اختلاط میں کتنا عظیم عرصہ صرف ہوا ہوگا! اس ایک شاندار ترکیبی جسم کے ذہن انسانی کے روبرو نمودار ہونے سے پہلے ایک نسل کے دوسری نسل سے ملنے میں کتنی طویل مدت لگی ہوگی! بایں ہمہ قدیم مصری فرد انسانی کی حیثیت میں اپنے ہمعصر فنکی، کریٹن، یا بابلی کے مقابلہ میں ایک امتیاز خاص رکھتا تھا۔ انہی باتوں کا امکان آجکل اس صورت میں دیکھا جاتا ہے کہ زمانۂ حال کے امریکن لوگ باعتبار نسل بالکل جداگانہ نہ ہوتے ہوئے بھی بعض خصوصیتیں اس قسم کی رکھتے ہیں جو انہیں انگریزی، روسی، اور اطالوی نسلوں سے (جن سے ان کی ترکیب ہوئی ہے) ممیز کرتی ہیں۔

مخفی نہ رہے کہ اتحاد انسانی کے متعلق یہ تمام معجزات مقام کی طرف سے ظہور میں آتے ہیں۔ ابتدا میں انسان خود اپنا گھر بناتا ہے لیکن انجام کار وہ گھر اسی کے اندر عجیب وغریب تبدیلیاں پیدا کر دکھاتا ہے۔ ان تمام اسباب میں جو کسی ایسی خصوصیت کو تیار کرتے ہیں کوئی بات ایسی بااثر، اس قدر ملانے اور نوع انسان کو ڈھالنے والی نہیں ہوتی جیسے وہ زمین جس کے وہ لوگ رہنے والے ہوں۔ روحانی طور پر انسان خدا کا بیٹا ہے۔ لیکن مادی طور پر زمین اسکی پرورش کرتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بلاوجہ زمین کے بچے نہیں کہتے۔ دریائے نیل مصریوں کے لئے ماں کا درجہ رکھتا تھا۔ بحیرہ شام کے سواحل نے فنکیوں کو وہ بنایا جو وہ آخر کار ثابت ہوئے۔ اہل بابل دریائی میدان اور ڈلٹا کی اولاد تھے اور بنگالی حقیقی معنوں میں ماتری گنگا کا بیٹا ہے۔

لیکن ہر حالت میں مقامی اثر کا پیدا کردہ اتحادی رجحان ایک دوسرے سے ملنے والے نسلی عناصر کی مدد سے بہت بڑھ جاتا ہے۔ آدمی آدمی سے سبق سیکھتا ہے۔ زمانۂ گذشتہ میں ہم نے جو ترقیات حاصل کی تھیں ان سے بڑھ کر ترقی حاصل کرنے کے لئے ہمیں بے انتہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس دائرہ تک ہم پہنچ چکے ہیں اس سے بالاتر اصول ذہنی کو مدنظر رکھیں۔ پانی اس سطح تک بآسانی اٹھ آتا ہے جہاں تک وہ ایک مرتبہ

پہنچ چکے۔ لیکن اس کو اس سے اوپر لے جانے کے لئے بہت کچھ جد و جہد درکار ہوتی ہے۔ کوئی بہت بڑا مدبّر کامیابی سے دنیا پر کسی عہدنامہ کی شرائط عاید کر دیتا ہے تو اس سے اس کے ہم مکتب لوگوں کی یاد کھیلوں کے میدان اور جماعت کے کمرہ میں اس کی کامیابیوں کے متعلق تازہ ہوتی ہے۔ بہت سے مشہور جرنیل ایسے ہو گزرے ہیں جنھوں نے ابتدا میں ٹین کے سپاہیوں کی مدد سے فن جنگ کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مستقبل زمانہ ماضی ہی کو جدید ترکیبی صورتوں میں تبدیل شدہ مسائل کے تناسب کو مدنظر رکھکر دوہراتا ہے۔

اس طرح پر ہم قوموں کی پیدایش کے مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر پہنچتے ہیں:۔ جو ملک جغرافیائی طور پر الگ ہو وہ کسی نہ کسی قومیت کا گہوارا ابھی ثابت ہو سکتا ہے۔ قومی اتحاد کا دار و مدار مقام پر ہوتا ہے۔ طبقہ انسانی میں کسی قوم کے درجہ کا اندازہ اس کے اجزاے مشترکہ کی پیچیدگی اور اہمیت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے اجزا میں سے کسی ایک نے جو کامیابی عہد گذشتہ میں حاصل کی تھی ویسی ہی کامیابی زمانہ مستقبل میں وہ قوم بہ ہیئت مجموعی حاصل کرنے کی متوقع ہو سکتی ہے۔ اجزا کی پیچیدگی کو جب مقام کے قومیت پیدا کرنے والے اثر کے تحت میں رکھا جاے تو وہ قوم کے لئے باعث تقویت ہوتا ہے۔ کمزوری کا موجب نہیں۔

ہندوستان چونکہ بحالت موجودہ درمیانی حالت سے نکل کر جدید حالت میں آرہا ہے اور اس کے اندر قومیت کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے اس لئے یہاں ان قوانین کا نہایت وضاحت کے ساتھ مطالعہ ہو سکتا ہے۔ بہت سے مشاہدہ کرنے والے اس بات سے باخبر ہوتے ہوئے کہ اہل ہند خود اس تبدیلی کو پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اپنے سامنے سواے مایوسی اور شکست یا ناکامی کے اور کچھ نہیں دیکھتے اس تماشہ کے لوگ کہتے ہیں:۔

> ہندوستان میں بہت سی مختلف زبانیں مروج ہیں۔ ایک صوبہ کے مراسم دوسرے سے نہیں ملتے۔ اور نہ ایک کے باشندے ان سے دست بردار ہونے پر رضامند ہیں۔ اس جگہ سیاہ، زرد، اور سفید تینوں نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور ہر ایک پورے تعصب کے ساتھ اپنی خصوصیت پر قایم ہے۔ اس ملک کے تمام باشندوں میں ویسا ہی اختلاف عظیم موجود ہے جیسے ایک بنگالی اور پنجابی میں۔ باقی فرقوں کو نظرانداز کر دیا جاے تو پھر بھی ہندوستان ہندو اور مسلمان دو عظیم قوموں پر منقسم ہے۔ جن میں ایک دوسرے سے بدرجہ اتم اختلاف پایا جاتا ہے۔ بھلا ایسی مختلف اور متنوع حالتوں میں اتحاد کے راگ گانا حماقت نہیں تو کیا ہے؟

یہ راے چند تنگ خیال اور محدود نظر ہندوستانیوں کے دلوں تک ہی محدود نہیں بلکہ بڑے بڑے فاضل یورپین بھی (جو ہندوستان کی سیر و سیاحت کر گئے ہیں) یہی راے رکھتے ہیں۔ لیکن باوجود ان باتوں کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعات سے صرف یہی نتایج برآمد نہیں ہوتے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ سمجھدار آدمی کو اس وقت تک فیصلہ نہ دینا چاہیئے جب تک وہ فریقین کی باتیں نہ سن لے۔

پس سوال پیدا ہوتا ہے کیا اہل ہند کے مختلف فرقوں میں کوئی اس قسم کی معاشرتی یا نسلی یکسانیت پائی جاتی ہے جو جلد یا بدیر ہندی قومیت کو عدم سے وجود میں لانے کا ذریعہ ثابت ہو سکے؟ شاید یہ بات سچ ہے کہ بنگالی ہندوستان کا



سید بندہ کاظم صاحب جاوید لکھنوی

Indian Press, Allahabad.

آئرش مین، مرہٹہ اسکاٹ، یا باشندۂ اسکاٹ لینڈ اور پنجابی؛ ویلشمین، یا ہائی لینڈ ہے لیکن جو تعلق ایک آئرش مین ایک اسکاٹ، ایک ہائی لینڈر، یا ویلشمین کو برطانیت کے جزو مرکزی سے ہے کیا وہی یا قریباً ویسا تعلق باہم ایک بنگالی، پنجابی، مرہٹہ، اور مدراسی، میں نہیں پایا جاتا؟ اگر اس بات کا جواب اثبات میں ملتا ہے تو واقعی اس ملک میں بھی ایک قومی عمارت تیار ہو سکتی ہے اور اگر نہیں تو پھر ہمیں اس خیال ہی سے ہاتھ دھو ڈالنے چاہئیں۔

کسی قوم کی بہترین دولت، یعنی جغرافیائی علیحدگی اور امتیاز، بلاشبہ ہندوستان کو بہت بڑی حد تک حاصل ہے۔ اس کے پانوں میں نیلگوں سمندر موجیں مار رہا ہے اور جانب شمال ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ اس جغرافیائی تقسیم سے قطع نظر یہاں جو قومیں آباد ہیں وہ شمال مشرق کی قوم منگولین اور شمال مغرب کی سامی قوموں سے بالکل جدا ہیں۔

اس ملک کے اندر دیگر تمام عناصر پر آریہ نسل کے اصول ذہنی اور عقائد کو فوقیت حاصل ہے۔ خیال کا ایک مخصوص نظام یہاں کے بیرونی آرگنائیزیشن پر سبقت رکھتا ہے اور اس طریق پر خصوصیتوں کے یکجائی اجتماع ہی سے نسلی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مخصوص خیالات کا تعلق اس بات سے ہے کہ زمانہ قدیم سے لیکر اس ملک میں عظیم الشان صداقتوں کا دور دورہ رہا ہے۔ نہ تو جینی اور نہ مسلمان ویدوں یا اپنشدوں کو تسلیم کرتے ہیں تاہم دونوں ان سے حاصل کی ہوئی تہذیب سے متاثر ضرور ہیں۔ ہندوستان میں ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیم کا سلسلہ اُس زمانہ سے چلا آتا ہے جبکہ مصر ابھی اپنے مینار تیار کر رہا تھا۔ وہ تہذیب جس کی ابتدا اس قدیم زمانہ میں ہوئی تھی اب تک اپنی جگہ پر قائم ہے اور اسکی بدولت ہندوستان کی سوسائٹی کے اندر خیال اور احساس کا درجہ اتنا بلند ہو چکا ہے جس کی نظیر بہت کم دیگر ممالک میں پائی جاتی ہے۔ ہندی شخصیت کا امر مخصوص جذبات کی وہ انتہائی ترقی اور لطافت ہے جو اس وسیع ملک کے مہذب ترین لوگوں سے لیکر نہایت ادنیٰ طبقات میں بھی پائی جاتی ہے۔

ہندوستان میں بخلاف ممالک عرب کنبہ کے سب لوگوں کے یکجا رہائش کرنے کے طریق پر جو ہندو مسلمان دونو جماعتوں میں پایا جاتا ہے اکثر مصلح اعتراض کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں سنت نہال سنگھ نے جن کے مضامین اکثر انگریزی رسائل میں نکلتے رہتے ہیں اس پر بہت کچھ لے دے کی تھی۔ لیکن اس بارہ میں ایک یورپین کی رائے بھی قابل غور ہے چنانچہ سسٹر نویدیتا مرحومہ اپنے ایک مضمون کے دوران میں لکھتی ہیں :۔

> ہندوستان کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر کنبہ کے لوگوں میں جو محبت پائی جاتی ہے اسکی بہت بڑی وجہ وہ احساس ہے جو ایک بیٹا اپنی ماں کی نسبت دل میں رکھتا ہے۔ اس رشتہ کے پیار و محبت اور عمق میں کہیں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اس میں شخصی محبت مذہبی جذبہ کی انتہا تک پہنچتی ہے۔ فی الحقیقت یہ ہمارے Madonnahood کی ایک مشرقی علامت ہے۔

مشرقی گھروں میں بلاتفریق بڑوں بوڑھوں کی زندگی کا حصہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ قومی تہذیب کی یہ ایک خوشنما

علامت ہے کہ بوڑھوں کو کنبہ کا لازمی جزو خیال کیا جاتا ہے۔ ان کی دانائی ایک نہایت قیمتی اثاثہ کا درجہ رکھتی ہے اور ان کے اندر مذاق پسند طبیعت کی جو جھلک پائی جاتی ہے وہ ان کے وجود کو اور بھی قابلِ قدر بنا دیتی ہے۔ اہل ہند کے دلوں میں عظیم فرصت کی جو یاد پائی جاتی ہے اسے محنت کرتے رہنے کے وہ اصول ذہنی دبا نہیں سکتے جو انسان کو اس وقت اپنے آپ کو نکما محسوس کروانے لگتے ہیں جب اس کے کام کرنے کا زمانہ گزر چکتا ہو۔ ہند اس بات کو سمجھتا ہو کہ جب عملی طور پر کام کرنے کا زمانہ ختم ہو جاتا ہو تو اسوقت تجربہ کے بیش قیمت ثمر درجۂ پختگی تک پہنچتے ہیں ممکن ہو لوہاروں اور آرہ کشوں کو جوانی کی طاقت درکار ہو تاہم مدبّر اور ریفارمر ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر ہی میں تیار ہوا کرتے ہیں۔

ہندوستان بھر میں گاڑی والوں کو نہایت ادنیٰ اخلاق کے لوگ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض حالتوں میں ان لوگوں کے اندر بھی خود ضبطی، ایثار، اور خدمت گذاری کا قابل ذکر مادّہ پایا جاتا ہے۔ مسٹر نیویدتا ایک گاڑیبان کا ذکر کرتی ہیں جنہوں نے سخت بھیڑ بھڑکے کے عالم میں اپنا وقت ہرج کر کے ایک بڑھیا کو لوگوں کے ہجوم میں سے نکالا تھا۔ قرآن شریف میں آیا ہے:۔

(۱) وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسَانًا (سورۂ احقاف) یعنی ہمنے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی تاکید کی ہے۔

(۲) وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ کِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا ۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ۔ (سورہ بنی اسرائیل) یعنی اور (اے پیغمبر) تمہارے پروردگار نے قطعی حکم دیدیا ہے کہ (لوگو!) اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا (اے مخاطب!) اگر والدین میں سے ایک یا دونو تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچیں، تو ان کے آگے ہُوں بھی نہ کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا۔ ان سے (کچھ) کہنا (سننا ہو تو) ادب کے ساتھ کہنا (سننا) اور محبت سے خاکساری کا پہلو اُن کے آگے جھکائے رکھنا۔ اور (انکے حق میں) دعا کرتے رہنا۔ کہ اے میرے پروردگار جس طرح انہوں نے مجھے چھوٹے سے کو پالا ہے اور (میرے حال پر رحم کرتے رہے ہیں) اسی طرح تو بھی ان پر اپنا رحم کیجیو۔

ماں کے ساتھ محبت کرنے اور بوڑھوں کے احترام کے لحاظ سے ہندو اور مسلمان اعلیٰ اور ادنیٰ سب یکساں ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی جو سطحی اختلاف پایا جاتا ہے وہ اتنا گہرا نہیں جتنا جینوا اور روما یا لندن اور ڈنڈی کا اختلاف ہے۔ مسلمانوں میں صوفیہ کا طبقہ ہنود کے ویدانتیوں سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ فی الحقیقت ان دو عظیم قوموں کے اختلاف کی بنا ان کے اصول نہیں جو فلسفیانہ طور پر فہمید سے بعید نہیں ہیں بلکہ اس اختلاف کی بنا ان کے مراسم ہیں۔

تہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اندر جو یگانگت پائی جاتی ہے اسکا بیّن ثبوت ریاستوں میں ملتا ہے۔ ایک یورپین مضمون نگار لکھتا ہے کہ حضور نظام کی ریاست میں جس قدر اظہار عقیدت اہلِ ہنود کی طرف سے ہوتا ہے اسکی مثال بہت کم مل سکتی ہے۔ ایسے ہی بنارس میں جو ایک ہندو ریاست اور ہندوؤں کا مقدس ترین تیرتھ ہے کئی صدیوں سے ہندو مسلمان شیر و شکر چلے آرہے ہیں۔

القصہ باوجود اختلافات سطحی اور تفریقِ ظاہری کے ہندوستان کی مختلف جماعتیں تہ میں ایک ہیں۔ بنگالی، مرہٹہ، پنجابی اور

مدراسی اپنی اپنی جگہ پر بعض خصوصیتیں رکھتا ہے، لیکن اس جملہ تفریق کی تہ میں ہمیں ان کے انتہائی مقاصد کی یکسانیت صاف طور پر نظر آتی ہے۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان دونو کے دلوں میں قومی بیداری کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔

تیرتھ رام

علم و عمل

جس دن سے انسان قفسِ جسم میں بند ہو کر آغوشِ مادر میں آنکھیں کھولتا ہے اور گرد و پیش کے اشیا پر نظر ڈالنا شروع کرتا ہے، اسی وقت سے ابتدائی صورت میں تحصیلِ علم کے سلسلہ کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے پہل شیرخوار بچہ کو دور و نزدیک، یگانہ و بیگانہ، سرد و گرم، روشنی و تاریکی، شیرینی و تلخی، خوشبو و بدبو کے امتیاز میں وہ ہی دقت ہوتی ہے جو ایک طفلِ مکتب کو کسی نئی زبان کے حروف پہچاننے یا علم حساب کے اعداد ذہن نشیں کرنے میں ہوا کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ مثل اجنبی شخص کے نام، رنگ، باہمی تعلقات اشیاء، انسان سے وہ مانوس ہوتا ہے غرضکہ بچپن ہی سے ہر شے کے جاننے بوجھنے کا چسکا اس کو پڑ جاتا ہے۔

علم کا شوق ہر انسان میں فطری ہوتا ہے، جن لوگوں کو خوش طالعی سے تعلیم و تعلّم کا موقع ملتا ہے وہ اس خواہش کو تکمیل کی حد تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور طرح طرح کے علوم و فنون کے مطالعہ و تحقیقات میں اپنی عمرِ عزیز صرف کرتے ہیں، مگر سیری نہیں ہوتی۔ یہ مسلم ہے کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں، ظاہر و باطن۔ موحدین کا عقیدہ ہے کہ انسان روح و جسم کے مجموعہ کا نام ہے۔ روح کا علم اور اس کے رموزِ حقائق علم ظاہر کے طریقۂ استدلال سے غیر ممکن ہے۔ چشمِ ظاہر سے صرف ظاہری اشیاء کا احساس ہو سکتا ہے ؎

بو نہیں رنگ نہیں نور نہیں نار نہیں   معرفت کیوں نہ ہو دشوار الٰہی تیری

علم و عمل لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ بچہ کو پہلے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آگ کی خاصیت جلانا ہے، وہ جب کسی آگ کے قریب جانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی ماں یا باپ اُسے منع کرتے ہیں، بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ باوجود ممانعت وہ از خود آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے، جلنے پر تجربہ ہوتا ہے اور دوبارہ اس سے ایسی حرکت سرزد نہیں ہوتی اس موقع پر عمل سے اُسے اس امر کا علم ہوا کہ آگ کا خاصہ جلا دینا ہے۔ علم دو طرح کا ہوتا ہے۔ اول وہ جو ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ دوئم دوسروں کے تجربہ و عمل کا نتیجہ جو ہمیں اقوال و کتاب کی صورت میں ملتا ہے، ہر شخص میں اسقدر استعداد، وقت و شوق نہیں ہوتا کہ وہ براہ راست ہر شے کا بذریعہ عمل تجربہ کر کے علم حاصل کرے۔ علم و عمل کے باہمی مزاولت کی مدد سے علم طبیعیات، علم کیمیا، علم الانفس وغیرہ میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ علم ظاہر کی ترقی کا دارو مدار ہر دو علم و عمل پر مشترکہ حیثیت سے ہے۔ جس چیز کا آج اہل سائنس کو نسبتاً علم ہوتا ہے، وہ اس پر عملاً کاربند ہونے کی

کوشش کرتے ہیں۔ اس مستعدانہ پیروی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ گذشتہ تجربہ کی بناپر موجودہ مسائل پر کافی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ فرض کرو کہ متعدد جدید تجربوں کے بعد انہیں یہ ثابت ہوجاے کہ فلاں شے کا استعمال صحت جسمانی کے لئے مضر ہو تو فوراً اس کو ترک کردیں گے۔ نظریہ کی صورت میں علمی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ بعدہ ان پر بذریعہ عمل تجربہ کیا جاتا ہے اگر مفید ثابت ہوے تو وہ تدوین کردئے گئے ورنہ پس پشت ڈال دئے جاتے ہیں۔

علم وعمل کا دور دورہ جب عالم ظاہر میں اس درجہ مسلم ہو تو باطن میں، ظاہر ہے کہ بغیر ان کے ایک قدم آگے بڑھنا صرف مشکل نہیں بلکہ محال ہے۔ ظاہر کو باطن سے وہی تعلق ہے جو جسم کو جان سے، یا ناخن کو گوشت سے۔ اہل باطن علوم ظاہری کی تحصیل کو ایک حد تک ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی واسطے مسلمانوں اور ہندؤں میں عرصہ سے رائج ہے کہ طالب علم کو پہلے علوم ظاہر مثل علم ادب، معانی، بیان، منطق، ریاضی، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم دیتے ہیں بعدہٗ اگر طالب علم میں کافی شوق پایا اور استعداد ہوئی تو علوم باطن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک سالک اپنی ذاتی محنت و جفاکشی سے تزکیۂ نفس و اخلاق نہیں کرلیتا مرشد اس کو اُس راہ کے رموز وحقائق کے جاننے کا اہل نہیں سمجھتے۔ ہر طالب کا فرضِ اولین یہ ہونا چاہئے کہ جو کچھ شریعت وعلم اخلاق میں ضروری ہدایات ملیں ان پر کاربند ہو۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ جب مرشد طالب کو ضروری شرائط کے مطابق عامل پاتے ہیں تو خود ہی بلا جستجو اس کی طرف متوجہ ہوکر روحانی تعلیم کی تلقین کرتے ہیں۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد　　اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

جسطرح اکل وشرب جسم کی غذا ہے، اسی طرح نیکی، صبر، محبت، ایثار نفسی وغیرہ روح کی غذائیں ہیں، بغیر انکے روحانی ترقی ممکن نہیں۔ یہ مسلم ہے کہ جب تک غذا جزو بدن نہیں ہوجاتی طاقت پیدا نہیں ہوتی بعینہ اسیطرح جبتک علم پر عمل نہیں ہوتا روحانی طاقت نصیب نہیں ہوتی۔

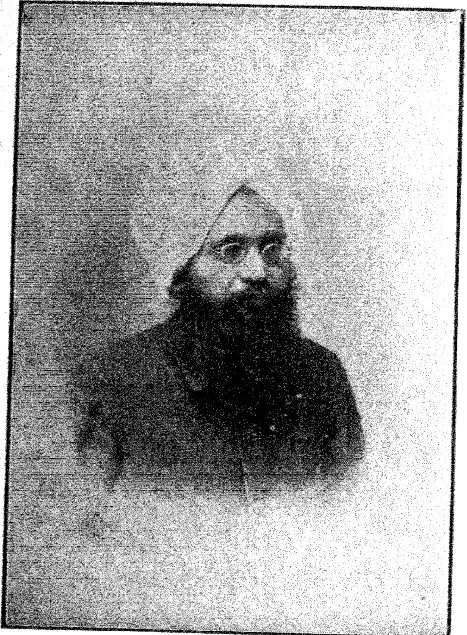
ہماری حالت بجنسہٖ اُس ناعاقبت اندیش شخص کی ہے جسکے گھر میں انواع واقسام کی غذائیں اور لذیذ پکوان بھرے پڑے ہوں، اور وہ فاقہ کرتا ہو۔ جب تک ہم کسی احکام الٰہی کی مزاولت نہ کریں گے ہم میں روحانی مدارج کو طے کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اسیواسطے اسلام نے تلاوت قرآن کی تاکید کی ہے۔ اگر ہم روز کلام خدا کو پڑھیں گے تو ضروری ہے کہ دل میں اُسکا دھیان بندھا رہے گا اور ہمارے افعال و اقوال بھی اس کے مطابق ہونگے۔ جس شے کا ہم باربار خیال کرتے ہیں وہی خیال فعل کی صورت ہم سے بلا ارادہ سرزد ہوتا ہے۔ اگر ہم راستبازی کو اپنا شیوہ بنانا چاہیں تو ہمیں چاہئے کہ ہر روز راستبازی کے فوائد پر تھوڑی دیر توجہ کے ساتھ غور کریں۔ کذب کے نقائص اور اس کے پے در پے نقصانات جو متصوّر ہوتے ہوں ان کو بخوبی ذہن نشین کریں بعدہٗ سارے دن اپنے ہر ایک قول وفعل میں راستبازی کو مدنظر رکھیں۔ اس طرح پر کچھ روز عمل کا یہ نتیجہ ہوگا کہ راستبازی ہماری فطرت ثانی ہوجاے گی۔

موجودہ علوم سے فائدہ بذریعہ عمل حاصل ہوسکتا ہے۔ اسی طرح عمل کی مزاولت سے علم میں ترقی ہوتی ہے علم الیقین عین الیقین۔ حق الیقین یہ تین درجے ہیں جنکی تکمیل علم وعمل کی باہمی ہمدردی سے ہوتی ہے۔ راہ ہستی کے جویاں اکثر لوگ ہوتے ہیں مگر

لالہ ہنس راج صاحب بی، اے - آنریری پرنسپل، دیانند انگلو ویدک کالج، لاہور



سنہ ۱۸۸۶ع



سنہ ۱۹۱۱ع

Indian Press, Allahabad.

کافی توجہ اور استقلال سے اس پل صراط پر جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز کہی جاتی ہے، چلتے ہوئے گھبراتے ہیں طالب کا فرض ہے کہ اگر ایک راہ سے منزلِ مقصود کا پتہ نہ چلے تو دوسری راہ پر چلنے کی کوشش کرے، اگر علم ظاہر سے تشفی نہ ہو تو اقلیم باطن کی سیر ضرور کرے ممکن ہے کہ اس ذریعہ سے اس کی تسکین ہو سکے

من نمی گویم سمندر باش یا پروانہ باش
گر بہ فکرِ سوختن باشی بیا مردانہ باش

سیّد ظہیر علی

ضبطِ طبیعت اور خوشی

ضبطِ طبیعت کے یہ معنی ہیں کہ انسان خود اپنے دل پر اختیار رکھے۔ جس کا اپنے دل پر اختیار نہیں وہ ہمیشہ مصیبت و آلام کا شکار بنا رہتا ہے۔ ایشور پرماتما نے تمکو دل اس لئے دیا ہے کہ تم اس کے مالک بنے رہو نہ کہ دل کو اپنا مالک بنا کر رنج و غم کے نشانہ ہو۔ یہ سب جانتے ہیں کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ اسیطرح ہمارا دل بھی پانی کی رَو ہے اور وہ بھی آسانی کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ دیکھو اپنے ننھّے سے پیارے بچّے کو دیکھو۔ اس کی طبیعت شرارت کی طرف کیسی جھکی ہوئی ہے۔ وہ ہر شخص کو مارتا ہے۔ وہ گالیاں بھی دیتا ہے۔ تم حیران ہو کہ یہ اتنا شریر کیسے ہو گیا۔ اس کو گالیاں دینی کس نے سکھائیں۔ تم اس قسم کی باتیں اس لئے کیا کرتے ہو کیونکہ تم نے کبھی بچّوں کی حرکات پر غور نہیں کیا۔ بچے بُری باتیں جلد سیکھ جاتے ہیں۔ انکے دل میں شرارت کے لئے اختراع کا مادہ موجود ہے۔ اِن سے اگر گالیاں دلوانا چاہو تو ہزار دلوا لو لیکن کسی بزرگ کو سلام کرنے کے لئے ہزار خوشامد کرو لاکھ پچکارو کیا مجال کہ سلام کرے، اور اگر سلام کیا بھی تو بڑی بددلی سے اور تمہاری زورازوری۔ تم دیکھتے ہو کہ شریر لڑکوں کی بُری عادتیں چھڑانے کے لئے ماں باپ اُستاد اور بزرگوں کو کیسی کیسی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ بچے بھی بعض اوقات بدعادت کو چھوڑنے میں عاجز آجاتے ہیں، اور اُنکو اُس بدعادت کو چھوڑ کر نیک عادت کے اختیار کرنے میں بڑی مشقت اور دردسری کرنی پڑتی ہے۔

بچوں ہی پر کیا حصر ہے۔ بڑوں کو دیکھو۔ تمہیں جب فرصت ملتی ہے مثلاً اتوار کو دوپہر کے وقت، تم اپنے نشست کے کمرے میں بیٹھے ہو۔ یار دوست ہمجنس ہمچشم گرد اگرد بیٹھے ہیں۔ ہنسی مذاق دل لگی چہل پہل کا بازار گرم ہے اب تمہارا کوئی دوست کسی بھلے مانس کا ذکر کرتا ہے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ کسی کا ذکرِ خیر کرنے والے تو وہی ہوتے ہیں جو ضابط ہیں جنہوں نے اپنے دل کے میلان اور رجحان پر پورا قابو پایا ہے۔ البتہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہوگی جو یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کی غیبت کریں۔ چاہے خود میں اتنی بُرائیاں اور عیب ہوں جتنے کہ چھلنی میں چھید لیکن پھر بھی وہ دوسروں کی عیب جوئی ضرور کریں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی حالت قابلِ رحم ہے، وہ نفرت کے قابل نہیں

ہیں بلکہ ہمکو چاہئے کہ ان پر ترس کھائیں۔ وہ نفس پرست ہیں اور نفس کے ہاتھوں تباہ ہو رہے ہیں۔ ان کا دل ان کا مالک ہے اور وہ بیچارے زیر دست ہیں۔ دل ان کو روز بروز سیاہ دل بنا رہا ہے۔ ان کے دل کا دریا بدی کے نشیب کی طرف رجوع ہو رہا ہے اور ایک دن اسی طرح ان کو تحت الثریٰ تک پہنچا دے گا۔ لیکن کیا تم اپنے دل کی بہتی ہوئی رَو کو نہیں پلٹ سکتے؟ کیا تم میں نفس پرستی کا اتنا دخل ہو گیا ہے کہ تم بالکل اپنے دل کے اسیر ہو گئے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ لوگوں کی بُرائیاں کرنی تمہاری دوسری خصلت بن گئی ہے؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ یہ عارضہ تمہیں ایسا لاحق ہوا ہے کہ بالکل لاعلاج ہے؟

اگر تمہارا یہ خیال ہے تو لو علاج سنو۔ تم دیکھتے ہو کہ گو قدرتاً پانی نشیب کی طرف جاتا ہے لیکن دنیا میں ایسے مدبّر سائنس داں حضرات ہو گزرے ہیں جنہوں نے مصنوعی طاقت سے پانی کو اونچائی کی طرف بہنے کو مجبور کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب پانی نشیب کی طرف بہتا ہے تو اس وقت بظاہر کسی طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن پانی کو اونچائی کی طرف رجوع کرنے کے لئے انجنوں وغیرہ کی بے حد مادّی طاقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح ہمارے دل کی رَو بھی آسانی (یعنی عادتِ بد وغیرہ) کی جانب فوراً رجوع ہو جاتی ہے لیکن اگر تم چاہو تو اس رَو کے بہاؤ کو پلٹ سکتے ہو۔ تمہاری زبردست ضبطِ طبیعت کی روحانی طاقت تمہارے نیچے گرتے ہوئے دل کو اُٹھا کر بلندی کی طرف لے جائے گی۔ اور بالآخر تمکو تاریک غار میں گرنے سے بچائے گی۔ ہاں! اس سے انکار نہیں کہ دل کو بُرائی کی طرف سے پھیرنے کے لئے ضبطِ طبیعت کی زبردست طاقت کو استعمال میں لانا پڑے گا۔ لیکن کچھ پروا نہ کرو۔ ایک دفعہ ضبطِ طبیعت کی عادت بنا لو، پھر دل پر حکومت کرنی کچھ مشکل نہیں۔

جو شخص اپنی عادات وخصائل کو بس پردہ رکھتا ہے اور ہمیشہ اپنے اصلی چال چلن کو لوگوں کی نظروں میں مخفی رکھتا ہے اس لئے کہ لوگ اس کی تعریف کریں اور اس کو حد درجہ کا شریف اور نیک اطوار سمجھیں وہ حد درجہ کا فریبی اور مکّار ہے۔ اُسکی خود خصلت میں ظاہرداری اور زمانہ سازی کا مادّہ زور دار ہے۔ ایسے شخص کو ضابط اور نفس کُش نہیں کہہ سکتے۔ ضابط وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو بُرائی سے اس لئے بچاتا ہے کہ اُس کا نصب العین بہت بلند ہے۔ وہ روحانی پاکیزگی کو نجات کا باعث سمجھتا ہے لیکن زمانہ ساز شخص خودستائی پر مفتوں ہے۔ جس طرح سائنس داں کوئلے کی گیس بناتا ہے اور پانی سے بھاپ بناتا ہے اور یہ پیدا شدہ لطیف طاقتیں بنی نوع انسان کے آرام و آسایش کے لئے استعمال میں لاتا ہے اسی طرح جو لوگ دل پر قابو رکھتے ہیں وہ اپنی ادنیٰ درجہ کی رغبتوں کو دانائی اور اخلاق کے پُرلطف اوصاف میں بدل لیتے ہیں تاکہ ان کو بھی خوشی حاصل ہو اور دنیا کو بھی۔

انسان جسقدر زیادہ ضابط ہوگا اتنا ہی زیادہ خوش ہوگا اور عقلمند بھی ہو گا اور وقعت کے قابل بھی سمجھا جائے گا۔ لیکن جس شخص کی حیوانی فطرت اس کے خیالات اور افعال پر قابض ہے وہ بدبخت، جاہل، اور کمینہ ہے۔ یہ سمجھ لو کہ جس کا اپنا آپا بس میں ہے اُس کے بس میں زندگی موت اور قسمت سب کچھ ہیں۔ اُسکے پاس خوشی کا ایسا خزانہ ہے جو کبھی نہ کم ہوگا اور نہ جدا ہو گا۔ برعکس اس کے جس شخص کو اپنے اوپر اختیار نہیں ہے وہ اپنے جذبات اور قسمت کا غلام ہے اگر اسکی ادنےٰ سے ادنےٰ اور نامناسب

سے نامناسب خواہش بھی پوری نہیں ہوتی وہ سخت مایوس ہوجاتا ہے اور کام کرنے کی ہمت چھوڑ بیٹھتا ہے۔ اُسکی متلوّن خوشی کا انحصار بیرونی چیزوں پر ہوتا ہے۔

دنیا میں ایسی کوئی طاقت نہیں جو ضائع ہوتی ہو طاقت شکلیں بدل سکتی ہے لیکن غارت نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی نے بُری عادتیں ترک کردی ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اُس نے نیک عادتیں اختیار کرلی ہیں۔ ترک سے پہلے تولید ہے۔ بیج اس لئے تباہ اور برباد ہوتا ہے کہ پودا اُگے اور پھول لائے۔

اس میں کلام نہیں کہ ضبطِ طبیعت میں کلفت اور مشقّت ہے۔ جو بُری عادتیں مدت العمر سے پڑگئی ہیں اور اب وہ دوسرے درجہ پر خصلت بن گئی ہیں انکو ترک کرنے کے لئے بڑی جدّ و جہد درکار ہے۔ جو لوگ صابر اور مستقل مزاج ہوتے ہیں وہ اس جد و جہد کو جاری رکھتے ہیں اور کبھی ہمّت نہیں ہارتے لیکن جو مشکلوں کا مقابلہ کرنے کا عادی نہیں وہ ایسے موقع پر منہ کے بل گر پڑتا ہے، اور اس کی پُرانی بُری عادتوں کا قبضہ دل پر اور بھی اٹل ہوجاتا ہے، وہ ضبط طبیعت کو اسی لئے چھوڑ بیٹھتا ہے کیونکہ اُس میں اتنی ہمت نہیں کہ دشواریوں کا تعاقب کرکے اُن پر فتح پائے! ایسے لوگوں کو لامتناہی خوشی نصیب نہیں ہوتی اور وہ عمر بھر بدی سے چھٹکارا نہیں پاسکتے۔

بعض لوگ جب کسی پر غصّہ ہوتے ہیں اور دوسرا دب جاتا ہے تو خوش ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ بعض لوگ شراب پیتے ہیں اور اس کو اپنی خوشی کا باعث خیال کرتے ہیں۔ بعض شخص اسی قسم کے اور افعال قبیحہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خوشی دراصل غصّہ ہونے میں نہیں ہے۔ مُسرّت اور شادمانی کو شراب خواری سے کوئی تعلق نہیں۔ بُرے کاموں میں خوشی کبھی نہیں ہوتی بلکہ خوشی اسی میں ہے کہ انسان اپنے آپ کو اعمال بد سے علیحدہ رکھے لیکن اعمال بد سے علیحدگی اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ہمکو اپنے نفس پر پورا پورا اختیار ہو۔ اگر کوئی شخص خود دار اور ضابط کم ہے تو اس کو خوشی بھی کم ہی ہوگی۔ بلکہ وہ رفتہ رفتہ آفت و مصیبت میں پھنستا چلا جائے گا۔ اگر تم نے کبھی کسی شخص کی زندگی کے واقعات پر غور کیا ہے تو دیکھا ہوگا کہ وہ صرف ایک دفعہ ہی بے سوچے سمجھے بولنے یا تلخ جواب دینے یا دھوکہ دینے یا غصّہ ہونے کی وجہ سے کسقدر اپنے لئے تباہی اور مصیبت کا موجب ہوا ہے۔ وہ رات دن اپنی ناشائستہ حرکات پر تاسف کرتا ہے، اور شب و روز اسی غم میں گُھلا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب آفتیں اُس پر اس وجہ سے نازل ہوئی ہیں کہ اسنے ایک لمحہ کے لئے ضبطِ طبیعت کو خیرباد کہا تھا۔ اِسکے مقابلہ میں اُس شخص کو بھی دیکھو جو ضابط ہے، اور اپنے افعال و اقوال پر قابو رکھتا ہے۔ وہ چونکہ کسی کے ساتھ بدی نہیں کرتا اس لئے اس کو پشیمانی کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑتا۔ چونکہ وہ خود غرض نہیں ہے اس لئے اس کو کوئی فکر و افسوس نہیں ہے چونکہ راستی اُس کا شعار ہے اس لئے اس کو کوئی غم بھی نہیں ہے

یہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ جس شخص کو اپنے اوپر اختیار نہیں وہ دوسروں پر حکومت نہیں کرسکتا۔ کنفیوشس کا یہ قول ہے کہ انسان دوسروں پر حکومت کرنے سے پہلے اپنے اوپر حکومت کرنا سیکھے۔ جو لوگ حاکم ہوکر ہمیشہ اپنے محکوموں کی طرف سے مشتبہ رہتے ہیں اور بات بات پر جھنجلاتے رہتے ہیں وہ اس قابل نہیں کہ کوئی ذمہ داری کا کام اُنکے سپرد کیا جائے

بلکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ معمولی فرائض کی ادائیگی میں بھی عاجز رہتے ہیں۔

حواسوں کا روکنا آسان ہے، لیکن دل کا روکنا سخت دشوار ہے۔ وہی شخص جواں مرد ہے جو دل کو روک سکتا ہے اس ضمن میں حضرت قہر نے یوں گہر افشانی کی ہے ۔ رباعی

رو کے بھی حواس ظاہری گر غافل — کچھ سود نہیں ہے گر نہیں رُکتا دل
لذّات و تصوّرات سے دلکو روک — پھر دیکھ کہ ہوتا ہے تجھے کیا حاصل
کرتا ہے دشمنوں کا مُنھ زرد وہی — یکتا ہے ہزاروں میں وہی فرد وہی
مارا ہے جس نے نفس سرکش اپنا — مردوں میں ہے اے قہر جوانمرد وہی

اور جس طرح حواس ظاہری کے روکنے والے کی عمر اور خوشی اور جسمانی طاقت روز افزوں ہوتی جاتی ہے، اسی طرح خیالات اور دل پر قابو رکھنے والے شخص کی روحانی زندگی، حقیقی خوشی، اور روحانی طاقت دن دُگنی رات چوگنی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور اس طرح کی ضبطِ طبیعت سے نہ صرف خوشی ہی حاصل ہوتی ہے بلکہ علم اور ادراک میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ جوں ہی جہالت اور خودغرضی کے دروازے بند ہوجاتے ہیں، علم اور ادراک کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ آدمی نیک چلن ہوجاتا ہے اور دل پاکیزہ ہوکر ایشوریہ تیج (نور الٰہی) سے بھر جاتا ہے

یہ چند الفاظ ذہن نشین کرلو کہ دل کو لذّات اور تصوّرات سے روکنے میں ہی اصلی خوشی ہے ضبطِ طبیعت سے ہی اطمینانِ قلب، طمانیت، اور روشن ضمیری کا آغاز ہے اور ضبطِ طبیعت میں ہی ان اوصاف کی انتہائی ترقی ہے۔ دراصل رشک کے قابل زندگی اس شخص ہی کی ہے جو اعلیٰ درجہ کا نفس کُش اور خود اختیار رہے۔

ڈپٹی لال نگم

مالک الدولہ صولت (۴)

اس کے دانتوں کے مقابل جو گُہر جلتا ہے — دل سے گرجاتا ہے آنکھوں سے اتر جاتا ہے
یوں ہی صحرا میں ہوا پر ترے وحشی کا غبار — جیسے دیوانہ کوئی خاک بسر جاتا ہے
آتشِ حسن کو پانی سے بھڑکتے دیکھا — جب نہاتا ہے تو وہ اور نکھر جاتا ہے
جسم سے جان جدا ہوکے بھلا خاک آئے — کہ نکلکر نہیں پتھّر میں شرر جاتا ہے
آمدِ فصلِ خزاں بھی ہے قیامت سے فزوں — چہرۂ بلبلِ تصویر اُتر جاتا ہے
دستِ صیاد سے بلبل کی رہائی کے لئے — غنچہ مٹھی میں دبائے ہوئے زر جاتا ہے
ہر حبابِ لبِ جو کہتا ہے باچشمِ پُرآب — یہ زمانہ فقط آنکھوں میں گزر جاتا ہے

اس زمین میں غبار کے جانے کا انداز اور بلبلِ تصویر کا چہرہ اُتر جانے میں ایہام تناسب مجھے لطف دیتا ہے اور حبابِ لب جُو والا شعر تو بے مثل ہے۔ شرر و زر کے قافیہ میں ردیف اچھی نہ رہی اور یہ دیکھنے کی بات ہے کہ ردیف کے نہ چلنے سے شعر کس قدر سست ہوجاتا ہے۔

بہ نسبت اسم و حرف کے فعل میں ایہام زیادہ لطف دیتا ہے۔ صائب

شکار اگرچہ دریں پہن دشت بسیار است — مرا گرفتن عبرت ز روزگار بس است

عرفی۔ عدلِ تو لبِ فرزندی برداشت ستم را۔ یہاں گرفتن اور برداشت



اجنتا کے غار نمبر ۱۷ کی ایک تصویر

(ایک معزز خاتون اپنی سہیلیوں کے ساتھ سنگار میں مشغول ہے)

Indian Press, Allahabad.

نے جو لطف دیا ہے اگر ایڈیسن سنتا تو اُسے بھی اپنی راے سے رجوع کرنا پڑتا۔

حرم میں حق دیر میں صنم ہے، اِدھر کو اب یا اُدھر کو چلئے
کہاں یہ کم ہوگی دل کی وحشت، یہ ہے تردد کدھر کو چلئے
کہیں وہ دیکھیں نہ اس طرف کو، بچا کے اُن کی نظر کو چلئے
پڑے نہ آکر خدنگِ مژگاں، چھپا کے ان سے جگر کو چلئے
گزر گئی اب شبِ جوانی، ہے آمدِ مرگ ناگہانی
یہ صبح پیری کی ہے زبانی، کمر کو کسئے سفر کو چلئے
مین بھیج کر خط ہوا ہوں مضطر، نہ قاصد آیا نہ وہ ستمگر
تلاش کیجے نشان دلبر، کہ ڈھونڈھنے نامہ بر کو چلئے
یہ دل میں ٹھانی ہی ہم نے منّت، وطن میں کسکو دکھائیں صورت
بغیر شاہِ اودھ کے صولت، کبھی نہ اختر نگر کو چلئے

بادشاہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لکھنو کا نام اختر نگر بھی ہے اور اسی مناسبت سے مین نے چاہا کہ اپنا تخلص اختر رکھوں مگر معلوم ہوا کہ اختر کسی کا تخلص ہے تو مین نے اُن سے تخلص مول لے لیا۔ جن سے بادشاہ نے تخلص مول لیا وہ قاضی محمد صادق خاں اختر ہیں یہ بنگالہ سے آکر لکھنؤ میں ایسا رہے کہ پورے لکھنوی ہوگئے یہیں تحصیل علم کی یہیں فنِ شعر میں کمال پیدا کیا اور یہیں سے جاگیر و زر و مال حاصل کیا۔ ان کا اہل زبان میں شمار ہے لکھنؤ کی زبان ان کی اکتسابی نہ تھی بلکہ اُن کے گھر کی زبان ہوگئی تھی تعلق ازدواج بھی انھوں نے اہل شہر میں کیا۔ میرے ایک عزیز مرحوم نواب یوسف حسین خاں ان کے نواسے ہیں اور اُن کی جاگیر کے مالک تھے اور یہ تخلص کا بیچنا کچھ بادشاہ کی خاطر سے تھا ورنہ انھوں نے کبھی اپنا تخلص نہیں بدلا۔

وہ پردہ میں ہیں نور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی | کیا روشنیِ طور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
مین کوہ پہ فرہاد ہوا دشت میں مجنوں | قصّہ مرا مشہور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
وہ کہتے ہیں بدنام کیا خلق میں تم نے | سن لو وہی مذکور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
کس سمت سے قاصد کو ملے جلد گھر اُنکا | دو راستے ہیں۔ دور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

اتنی بڑی ردیفوں میں مین نے بھی دیکھا ہے کہ کوئی شعر ایسا جو نشتر بدل ہو نہیں نکلتا ایسی زمینوں میں فقط ردیف کا چمک جانا اور محاورہ میں پورا اُترنا انتہائی خوبی ہے۔

وہ ملے تدبیر ایسی چاہیے | بس مجھے تقدیر ایسی چاہیے
تیرے ابرو دیکھکر بسمل ہے دل | برق دم شمشیر ایسی چاہیے
تا قیامت جسمیں رہنا ہو تمہیں | غافلو تعمیر ایسی چاہیے

غزل کے مضامین میں بے ثباتی دنیا کا مضمون بہت ہی پیش پا افتادہ ہے اہل تہذیب ہمیشہ سے اس کوشش میں ہیں کہ غزل میں اس کے علاوہ بھی اخلاقی مضامین کی گنجایش ہوسکے صائب نے اس کی راہیں بہت اچھی نکالیں کہ اخلاقی مضمون ہے اور پھر بھی غزل کا شعر معلوم ہوتا ہے ؎

تا ترا چوں دگراں دیدنِ ظاہر کار ست | چشم بر روے تو چوں آئینہ بر دیوار ست
زیر شمشیر حوادث پائے برجائیم ما | رو نمی تابیم از سیلاب دریائیم ما
دل بستگیِ خلق بہ عمر گزراں چیست | استادگیِ عکس دریں آبِ رواں چیست
گل بے خار اگر بود دریں باغستاں | دامنے بود کہ از صحبتِ مردم چیدند
نریخت تا گہر عاریت ز دامن خویش | غبار تیرگی از چہرۂ سحاب نرفت
چو ماہ نو قدِ خم گشتہ در سپہر وجود | اشارئیست کہ آمادہ باش رفتن را
بزرگ اوست کہ بر خاک ہمچو سایۂ ابر | چناں رود کہ دل مور را نیازارد
چاہا بہت کہ راز محبت نہاں رہے | کیا کیجیے کہ آنکھ سے آنسو رواں رہے
صیّاد اب تو ہم کو رہا کر پئے خدا | دل میں نہ مرتے دم ہوسِ بوستاں رہے
یوسف کی جستجو نے ہمیں خاک کر دیا | مثلِ غبار راہ پسِ کارواں رہے
دنیا پہ فتح پائی کسی نے نہ آج تک | اہلِ ہوس اسیر طلسمِ جہاں رہے

گو ہم چمن سے دور ہیں لیکن یہ ہے دعا   گلشن رہے بہار رہے باغباں رہے
آفت سے دور رہنا قضا کی دلیل ہے   اڑ جاؤں میں خدنگ سے زاغ کماں رہے

مطلع میں ایک درد ہے۔ صیّاد والے شعر میں اب تو سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ طائر اسیر کو اپنے مرنے کا یقین ہو گیا ہے۔ کاروان کی رعایت سے یوسف کی جست وجو کو باندھا ہے ورنہ یوسف کی جگہ منزل کا لفظ بھی کہہ سکتے تھے۔ جہاں کو شعرا ہمیشہ سے طلسم سمجھا کئے اور آج کل کے علوم جدیدہ نے اس کا طلسم ہونا ثابت کر دیا اس سے بڑھ کر طلسم میں کیا ہو گا کہ عالم میں خاموشی محض ہے اور ہمیں آوازیں سنائی دیتی ہیں نیوٹن ثابت کر چکا ہے کہ عالم میں اندھیرا ہے آفتاب و کواکب سیاہ ہیں اور ہمیں دنیا روشن دکھائی دیتی ہے اب ہمیں اس کا انتظار ہے کہ یہ مسئلہ بھی کوئی ثابت کر دے کہ عالم معدوم ہے اور ہم اُسے موجود سمجھ رہے ہیں۔ باغباں والا شعر مجھے بہت پسند ہے۔ آفت سے دور رہنا بھاگنے کے معنی پر ہے ورنہ مضمون میں سستی پیدا ہوگی

خلاف قاعدہ کیوں ہو خفا کہو تو سہی   قصور کوئی گنہ، کچھ خطا کہو تو سہی
ہمیں یہ سخت کلامی کی تاب لاتے ہیں   کسی کو اور ہمارے سوا کہو تو سہی
بیان کاوشِ تیرِ مژہ پہ، وہ بولے   کہاں کہاں ہے نشاں زخم کا کہو تو سہی

یہ زمین مخدّرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ عالم کی نکالی ہوئی ہے ؎

تمہارا دل تو نہ عالم اسیر گیسو تھا   یہ کس طرح سے ہوا مبتلا کہو تو سہی
نہ وہ مزاج نہ وہ چہچہے نہ وہ ہنسیاں   اُداس رہنے کا باعث ہے کیا کہو تو سہی

بیگم صاحبہ نے یہ غزل کہی اور خود ہی اس کی دُھن رکھی گانوں کو حکم ہوا کہ یاد کریں مجھے یاد ہے کہ اس غزل کا ایسا رنگ بندھا کہ اکثر لوگوں نے اِس زمین میں طبع آزمائی کی کسی نے ردیف میں تصرف کر کے سنو تو سہی کر دیا ع سنبھالو تیغِ ادا کو ذرا سنو تو سہی۔ صولت کے اس شعر میں ع کسی کو اور ہمارے سوا کہو تو سہی ردیف کا لطف اور زبان کی خوبی داد چاہتی ہے۔

نواب مخدرۂ عظمیٰ کی اس غزل پر نواب محبوب عالم صاحبہ نے مصرعے لگائے ہیں ان دونوں بیگموں کو منشی ماہر صاحب سے مشورہ تھا دونوں صاحب دیوان ہیں مگر محبوب محل کا دیوان شاید تلف ہو گیا۔

یکایک آئی کہاں سے بلا کہو تو سہی   یہ کیوں اُتر گیا منہ چاند سا کہو تو سہی
ہوئی ہے کاہشوں کی وجہ کیا کہو تو سہی   یہ حال عشق میں کس کے ہوا کہو تو سہی
ہلال کیوں ہوے اے مہ لقا کہو تو سہی

ہیں یاد تجھکو دغابازیاں زمانے کی   ہمیشہ سے یونہیں عادت ہے قسمیں کھانے کی
فقط یہ گھات ہے پہلو سے اٹھ کے جانے کی   عبث عبث نہ قسم کھاؤ کل کے آنے کی
کیا ہے کون سا وعدہ وفا کہو تو سہی

ہمیں کو رنج دمِ قیل و قال دیتے ہو   رقیب کو نہیں ایسا ملال دیتے ہو
جواب غیر کو قبل از سوال دیتے ہو   ہماری بات جو سن سن کے ٹال دیتے ہو
مزا ہے دل کے جلانے میں کیا کہو تو سہی

کہیں کچلیں نہ یہ ادھ کچلے دل آ کر پاؤں کے نیچے
کہ ہیں گیسو تمہارے، سر کے اوپر پاؤں کے نیچے
سوم کو بھی نہ آئے فاتحہ کو قبرِ عاشق پر
نہ روندی تم نے یہ پھولوں کی چادر پاؤں کے نیچے
تپے گا چرخ سے بالائے سر مہر مبیں آکر
زمیں تانبے کی ہو گی روزِ محشر پاؤں کے نیچے

یہ زمین بادشاہ کی طرح کی ہوئی ہے شعرائے سبعہ سیارہ اور تمام سخن سنجان دربار نے ٹوٹ ٹوٹ کر فکر کی تھی یہیں ختم یک صحبت نہ تھا مگر غزلیں اکثر لوگوں کی سنیں اگر وہ مشاعرہ چھپتا تو انتخاب میں اچھے اچھے شعر ہاتھ آتے۔

گر زباں ہو ہر دہانِ زخم بسمل کے لئے   مانگے خالق سے دعائے خیر قاتل کے لئے

جان نے گا کاکل ان زلف ساقی کا خیال   بال آجانے کا ڈر ہے شیشۂ دل کے لئے
دو قدم چلنے پہ غش آتا ہو اب یہ حال ہو   پہلے میں عاجز نہ تھا دو چار منزل کے لئے

زلف کی رعایت سے بال آجانے کا لفظ شعر میں لائے ہیں رعایت جہاں بھرتی معلوم ہو وہاں بے شک بُری معلوم ہوتی ہے جیسے حافظ کے اس شعر میں ؎

یار گندم گون اگر میل کرے نیم جو   ہر دو عالم پیش چشم ما نمود یک عدس

اگر رعایت بے تکلف آجائے اور مبتذل بھی نہو تو اب بھی لطف دے جاتی ہے۔

لاکھ ہم نیند کا بہانہ کریں   دخل کیا ہے جو چشم تر سوئے
گزری اوقات عین غفلت میں   آکے دنیا میں عمر بھر سوئے
کبھی چونکے نہ ہوشیار ہوئے   اجل آپہنچی اس قدر سوئے
جاکے سوئے عدم نہ لی کروٹ   واہ صولت یہ بے خبر سوئے

پہلے شعر میں اگر چشم تر کی جگہ دیدۂ تر کردیں تو مصرع جب بھی موزوں رہتا ہے قافیہ جو پہلے تھا وہی اب بھی رہا لیکن ردیف بدل جائے گی یعنی سوئے پہلے فعلن کے وزن پر تھا اب فاع کے وزن پر ہوگیا اس سبب سے یہ مصرع دخل کیا ہے جو دیدۂ تر سوئے۔ باوجود اس کے کہ بحر وہی ہے قافیہ وہی ہے ردیف بھی دیکھنے میں وہی ہے مگر دوسری زمین میں ہے اور زمین کے بدل جانے سے اس زمین میں یہ مصرع ہو تو غلط سمجھا جائے گا طالب فن کو اس کا خیال ضرور چاہئے۔ مثنوی میں ایسی غلطی اکثر مین نے دیکھی ہے مثلاً ؎

جانب پشت تو گدھے کا تھا منھ   اس کی دُم کی طرف تھا اُن کا منھ

دیکھنے میں تھا کا قافیہ کا صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن تھا کا الف گر گیا اور کا میں الف باقی ہے اس سبب سے اس شعر میں قافیہ نہیں رہا یا مثلاً یہ شعر ؎

ابر آیا ہے بادہ خوار آئے   اب بے پئے کس طرح قرار آئے

اس میں بھی پہلے مصرع میں آئے فعلن کے وزن پر ہے اور دوسرے مصرع میں فاع کے وزن پر ہے۔ غرض کہ اس شعر کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ زمین بدل گئی پہلے مصرع کا وزن مفعول مفاعلن فعلن ہے اور دوسرے مصرع میں فعولن کی جگہ مفاعیل ہوگیا۔ آزاد مرحوم اس نکتہ کو نہ سمجھے آب حیات میں جرأت کی اس غزل پر ؎

اجل گر اپنی خیال جمال یار میں آئے   تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے
خراب کیوں کہ تو شہر دل کی آبادی   ہمیشہ لوٹنے والے ہی اس دیار میں آئے

اعتراض کرتے ہیں کہ کس دھوم کی غزل تھی مگر آئے کہیں واحد ہے کہیں جمع ہوگیا ہے۔ اگر جرأت نے یوں کہا ہوتا ع پری کی بجائے فرشتہ مزار میں آئے۔ تو البتہ زمین بدل جاتی واحد وجمع کو کیا دخل ہے جو یہاں تکلیف دی گئی۔

خفا ہو چکے آؤ مل جاؤ اب   چلو بس جبیں پر شکن پڑ چکی
نزاکت اگر ایسی ہی ہے تو پھر   یہ تلوار اے تیغ زن پڑ چکی
جو تقدیر ہی میں ہے فرقت لکھی   تو پھر کوئی تدبیر بن پڑ چکی
سبب شور کا گل نے پوچھا تو کب   جب آواز مرغ چمن پڑ چکی
کہی حکم اختر سے صولت غزل   کہ شستہ سے بنائے سخن پڑ چکی

ایسی کڈھب زمینیں بادشاہ ہی نکالا کرتے تھے کہ رسن پڑ چکی اور شکن پڑ چکی کے سوا کوئی قافیہ ردیف سے نہیں لپٹتا مگر مالک الدولہ نے اچھے شعر نکال لئے۔

شکل پیش نظر کسی کی ہے   ایک صورت یہ دل لگی کی ہے
میرا دل تو نہ تھا کسی لائق   نظر لطف آپ ہی کی ہے
اور کچھ تم سے واسطہ نہ سہی   جان پہچان تو کبھی کی ہے
دیں ہمیں دل ہمیں ہوں مجرم   واہ کیا خوب منصفی کی ہے

شورشِ قلب زار سن سن کر   اس نے کیسی جلی کٹی کی ہے

ان اشعار میں تغزل کا لطف بھرا ہوا ہے اور یہی رنگ اُن کے دیوان میں زیادہ تر ہے مگر بادشاہ کی طبیعت تصنّع کو بہت پسند کرتی تھی یعنی برق و بحر و خواجہ وزیر جس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے وہی رنگ بادشاہ پسند تھا ان لوگونکا شمار زبان اُردو کے اساتذہ میں تھا میر انیس سے شاعر معجز بیاں نے بحر کے ایک شعر پر مصرعے لگائے اور سر منبر پڑھے غرض کہ مالک الدولہ میں کچھ خاندانی اثر کچھ بادشاہ کی پسند کا خیال ضرور تھا اس رنگ کے شعر بھی ان کے دیوان میں موجود ہیں مثلاً کہتے ہیں ؎

چاہیے قیدی جو تو ارزق بلا منتِ غیر   ہے یقیں دامن زنجیر سے خرمن ہوجا
کمر یار کی ہے چاہ میں رشتہ کا مرض   کافی اب ڈوبنے کو چشمۂ سوزن ہوجا

مگر یہ رنگ غیر طبعی ہونے کے سبب سے کبھی عام پسند نہیں ہوا لکھنؤ میں ہمیشہ آتش و انیس و نسیم دہلوی کے جرگہ والے اسکا مضحکہ کیا کرتے تھے۔ رشک کے اکثر اشعار نقل محفل تھے لیکن یہ خیال لوگوں کا کہ یہ رنگ لکھنؤ کے ساتھ مخصوص ہے نفس الامر سے مطابقت نہیں رکھتا شاہ نصیر کا دیوان اُٹھا کر دیکھیں کہ اوّل سے آخر تک اسی تصنع سے بھرا ہوا ہے ذوق کا کلام بھی اس سے خالی نہیں ہے مومن کا اور غالب کا اُردو دیوان بھی جادۂ مستقیم سے الگ ہے انہوں نے اس قسم کے تصنع کو چھوڑا دوسری قسم کا تصنع اختیار کیا اس سبب سے کہ جو غزل میں جدّت نہ کرے وہ شاعر ہی نہیں۔ لکھنو کے امرا میں نواب غضنفر الدولہ بہادر مرحوم شعر تو نہیں کہتے تھے مگر بڑے سخن فہم تھے اور شوق کا یہ حال تھا کہ شہر کا کوئی مشاعرہ ان سے نہ چھوٹتا تھا مجھسے کہنے لگے کہ بھئی شعر کا شوق کیا ہے تو ایک بات ہماری یاد رکھنا خدا کے لئے جدت پیدا کرنے کا زیادہ خیال نہ کرنا۔ رباعی

ہے ماہ صیام دل سے کر یاد الٰہ   لا دھیان میں ایام جوانی کے گناہ
آئینہ میں دیکھ صبح پیری کا طلوع   خیط ابیض ہے تیرا ہر موے سیاہ

پیری کے حال کی یہ رباعی بیاض انتخاب میں لکھنے کے قابل ہے۔ موے سیاہ کا خیط ابیض ہوجانا لطف سے خالی نہیں۔ رباعی کے اوزان میں ایک مغالطہ عامۃ الورود ہوا کرتا ہے کہ مفعولن مستفعلن مفاعیل فع کے وزن پر بعض مصرع کہہ جایا کرتے ہیں اور یہ کوئی وزن رباعی کا نہیں اس سے احتراز واجب ہے۔ اور طالب فن کو یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ رباعی کا وزن حقیقی مفعول مفاعلن مفاعیل فعل ہے اور وزن الحاقی مفعول مفاعیل مفاعیل فعل ہے۔ یہ دونوں وزن مطبوع ہیں۔ الحاق کا سبب یہ ہے کہ دونوں وزنوں میں نہایت مشابہت ہے ایک میں مفاعلن ہے اور ایک میں مفاعیل ہے مفاعلن میں پانچواں حرف متحرک اور چھٹا ساکن ہے اور مفاعیل میں پانچواں ساکن اور چھٹا متحرک ہے اس کے سوا اور کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ وزن حقیقی میں بعمل تخنیق تین صورتیں پیدا ہوتی ہیں مفعولن فاعلن مفاعیل فعل۔ مفعول مفاعلن مفاعیلن فع۔ مفعولن فاعلن مفاعیلن فع۔ وزن الحاقی میں بعمل تخنیق سات صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مفعولن مفعول مفاعیل فعل۔ مفعول مفاعیل مفاعیلن فع۔ مفعول مفاعیلن مفعول فعل۔ مفعولن مفعول مفاعیلن فع۔ مفعول مفاعیلن مفعولن فع۔ مفعولن مفعولن مفعول فعل۔ مفعولن مفعولن مفعولن فع۔ دو وزن وہ اور دس تخنیق سے پیدا ہوئے۔ یہ سب بارہ وزن ہوئے۔ اب بموجب اس قاعدہ کلیہ کے کہ چاہیں مصرعہ کو ایک ہی ساکن پر ختم کردیں چاہیں آخر میں ایک ساکن اور

بڑھا دیں ان بارہ وزنوں کے آخر میں جہاں جہاں فعَل ہے اُسے فعول کر سکتے ہیں جہاں جہاں فع ہے اُسے فاع کر سکتے ہیں۔ یہ چوبیس وزن رباعی کے کہلاتے ہیں۔ ان سب اوزان کے پڑھنے کی ایک سہل سی صورت یہ ہے کہ مفاعلن اور فاعلن کے سوا جہاں جہاں نون ہو اُسے متحرک کرکے پڑھو وزن مطبوع پیدا ہو جائیگا برخلاف مفعولن مستفعلن مفاعیلن فعع کے کہ اس کے نون متحرک کرکے پڑھو تو اور بھی ناموزوں ہو جائے۔ بہت عرصہ ہوا کہ وزن رباعی پر میں ایک مفصل مضمون شائع کر چکا ہوں اُسے دیکھنا چاہئے۔ اس وزن میں ہزار برس سے گتھی پڑی ہوئی تھی جسے اس ہیچمدان نے سلجھایا ہے۔

تاریخ وفات نواب مصلح السلطان بہادر

انجم الدولہ مصلح السلطان — پیش بگرفت راہ از ہستی
گفت صولت پئے سنہ رحلت — بعدم رفت آہ از ہستی ۱۲۹۰

نواب انجم الدولہ بہادر مصلح السلطان پشتہا پشت کے امیر تھے دربار اودھ میں ان کا مرتبہ وزارت کے قریب قریب تھا صورت پر امارت برستی تھی شاعر تو نہ تھے مگر فارسی و اُردو کے صدہا شعر جوئی کے یاد تھے کہ جس صحبت میں شعر پڑھنا شروع کرتے تھے لوگ محو ہو جاتے تھے۔ پوشاک کی نفاست اور عطر کا شوق ان کے مزاج سے مخصوص تھا۔ بادشاہ نے بنارس سے دخانی کشتیوں پر سفر کیا تو یہ بھی ساتھ تھے۔ خلیج بنگال کے طوفان میں کئی کشتیاں ڈوب گئیں ان میں نواب صاحب کا پوشاک خانہ تلف ہو گیا مگر اس پر بھی پشمینہ اور جامدانی کی قبائیں ایسی ایسی باقی رہ گئی تھیں کہ نمایش میں رکھی جاتی تھیں اور اُن کا مثل اب کشمیر یا ڈھاکہ میں دستیاب نہ تھا۔ رفعتہ الدولہ مرحوم ایک دفعہ کہنے لگے کہ میں جب عطر لگاتا تھا بیسن سے ہاتھ دھوتا تھا آج نواب انجم الدولہ کو میں نے دیکھا کہ عطر لگا کر انہوں نے ہاتھ نہیں دھوئے ذرا سا کیوڑا یا گلاب ہاتھ پر چھڑکا اور دستی رومال سے رگڑ کر دونوں ہاتھ پوچھ ڈالے عطر کی چکنائی بھی چھوٹ گئی اور خوشبو بھی ہاتھوں میں باقی رہ گئی مجھے یہ بات نہایت پسند آئی۔

تاریخ خطاب وزیر السلطان

اے برادر تو شکوہ و حشمت نازد — بر اختر ہند شان و شوکت نازد
صولت نازد بمصرع سال خطاب — حق اینکہ بجاہ تو وزارت نازد ۱۲۹۲

نواب سید امیر علی خاں بارھہ کے رہنے والے ہائیکورٹ کے وکیل تھے مٹیا برج میں بادشاہ کے ملازم ہوئے بتدریج ایسی ترقی کی اور اس قدر تقرب حاصل کیا کہ وزیر السلطان خطاب ہوا اور تمام اہل دربار ان سے رشک کرنے لگے ہر ایک کو فکر ہوئی کہ انہیں بادشاہ کی نظر سے گرائیں۔ غدر کے زمانہ میں انہوں نے میجر کونیا قلعہ دار ولیم فورٹ کو ایک جھوٹی خبر پہنچائی تھی کہ راجہ مان سنگھ لکھنؤ سے چھپ کر آئے اور بادشاہ سے ملے اور ایک فرمان مزین بمہر شاہی لکھوا کر لے گئے ہیں کہ اہل اودھ غدر کرکے انگریزی تسلط کو اٹھا دیں میجر کونیا نے فوراً یہ خبر نواب گورنر جنرل کے حضور میں عرض کیا وہاں سے بادشاہ کو قید کر لینے کا حکم صادر ہوا۔

۲۳ شوال ۱۲۷۳ھ صبح کا وقت تھا بادشاہ وظیفہ میں مشغول تھے کہ داہنی طرف مڑ کر دیکھا کہ دریا سے بہاگارتی میں تین جنگی جہاز نے ایوان شاہی کے محاذی لنگر ڈال دیا گورے وردیاں پہنے مسلح منتظر حکم کھڑے ہیں توپوں کا مُنہ سلطان خانہ کی طرف ہے۔ بائیں جانب مڑ کر دیکھا تو کئی پلٹنیں گوروں کی کوٹھی کو محاصرہ کئے ہوئے ہیں اور سب پھاٹکوں پر کئی گھڑ چڑھی توپیں لگی ہوئی

ہیں۔ اسی اثنا میں مصلح السلطان انجم الدولہ بہادر زیر پرتلہ ولایتی لگائے حضور میں حاضر ہوئے عرض کی کہ میجر کونیا کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں حکم ہوا کہ بلالو میجر کونیا نے نواب گورنر جنرل بہادر کا پیغام پہنچایا کہ جب تک ہندوستان میں غدر ہے آپ کا ولیم فورٹ میں رہنا مناسب ہے جہاز اسی واسطے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ سوار ہو کر قلعہ میں رونق افروز ہوں۔ بادشاہ نے جہاز میں سوار ہونے سے انکار کیا اس پر نواب گورنر جنرل کی سواری کی گاڑی فوراً منگائی گئی بادشاہ ایک تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے سوار ہوئے ایک فوجی افسر نے چاہا کہ پہلو میں بادشاہ کے بیٹھ جائے نواب مجاہد الدولہ مصلح کھڑے ہوئے تھے اُسے روک دیا اور خود حسب قاعدہ پہلو میں بیٹھ گئے میجر کونیا سامنے بیٹھے شاگرد پیشہ والوں میں سے ایک شخص گاڑی کے پیچھے کھڑا ہونے لگا کہ نواب دیانۃ الدولہ بہادر نے اسے ہٹا کر کہا کہ آج یہ مقام ہم غلاموں کا ہے ان کے ساتھ عشرۃ الدولہ رفیق مجاہد الدولہ بھی گاڑی کے پیچھے کھڑے ہو گئے جو کڑی مٹیا برج سے چلی اور ولیم فورٹ میں داخل ہو گئی۔ میجر کونیا نے اپنے روز نامچے میں اسطرح یہ سارا واقعہ لکھا ہے کہ میرے گوئندہ امیر علی نے مجھے خبر دی کہ کل راجہ مان سنگھ چھپ کر آئے اور بادشاہ سے غدر کے لئے فرمان لے گئے لیکن بعد کو معلوم ہو گیا کہ وہ خبر جھوٹی تھی اس روز تو راجہ مان سنگھ لکھنؤ میں موجود تھے۔ حریفوں نے میجر کونیا کا روز نامچہ منگایا اور شاہزادہ مرزا جہاں قدر بہادر کی وساطت سے بادشاہ تک پہنچا دیا مگر بادشاہ عجب نفس رکھتے تھے فرمایا کہ اس زمانہ میں امیر علی میرے ملازم نہ تھے۔

رد ناسخ و جواب انتخاب نقص کی تاریخ

۶۔ کامل کو جو ناقص کہے خود ہو گا وہ ناقص۔ ۱۲۹۶ ہجری۔

ناسخ نے میر انیس و مرزا دبیر کے کلام پر اعتراضات شائع کئے تھے منشی مظفر علی اسیر شعرائے سبعہ میں سے تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے مرزا صاحب کے پرانے شاگردوں میں تھے انہوں نے رد ناسخ میں ایک کتاب لکھی صولت نے اسکی تاریخ میں یہ مادہ بہت بے تکلف نکالا ہے منشی اسیر صاحب نے وہ ساری کتاب اوّل سے آخر تک مجھے بھی سُنائی تھی بہت ہی دندان شکن جواب تھے افسوس ہے کہ چھپی نہیں اُس کے تھوڑے دنوں بعد ان کے مکان میں آگ لگی اور وہ ساری محنت ان کی تلف ہو گئی وہ ایک باتیں مجھے یاد رہ گئیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ نشتر کی طرح پیر گئی ہر رگ و پے میں۔ اس پر یہ اعتراض تھا کہ تلوار کو نشتر کہا اور پھر نشتر ہر رگ و پے میں پیر تا کب ہے۔ یوں کہنا چاہئے تھا کہ ع۔ سوزن کی طرح پیر گئی ہر رگ و پے میں۔ اسیر نے جواب دیا کہ نشتر کے لفظ میں کاتب اور معترض دونوں نے دھوکا کھایا میرے پاس وہی مرثیہ قلمی موجود ہے اس میں نشتر کی جگہ نشہ کا لفظ ہے۔ ایک اور بات پر مجھے بہت ہنسی آئی تھی وہ یہ ہے کہ ع گل تھا چراغ چشم ثریا مثال کا۔ اعتراض یہ تھا کہ ثریا میں بہت کم روشنی ہوتی ہے اور اُسے چشم سے تشبیہ دی تو کیا دی۔ اسیر نے جواب دیا کہ معترض کو یہ نہ سوجھا کہ چشم نابینا کی مدح میں یہ مصرع ہے اور نابینا ہونا اس لفظ سے بخوبی ظاہر ہے کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ گل تھا چراغ۔ غرض اسیر کا جواب بہت پر لطف و پر مغز تھا وہ تو آتش زدگی میں رائگاں ہوا مگر راجہ امیر حسن خاں مرحوم نے ان ہفوات کا ایک جواب لکھوا کر چھپوا دیا اس کے نسخے مٹیا برج میں بھی بھیجے تھے وہ بھی جواب بہت خوب لکھا گیا تھا۔ ناسخ کی اس حرکت سے مجھے بھی ملال ہوا تھا مٹیا برج میں وہ آئے اور انسخ ان کے شاگرد بھی ساتھ تھے میں نے کہا آپ نے ناسخ سے انسخ و ناسخ دو لفظ جو بنائے اسکی کہیں سند بھی ہے کہنے لگے انسخ

افعل التفضیل ہے میں نے کہا افعل بمعنی مفعول بھی تو ہوا کرتا ہے جیسے اشہر بمعنی مشہور ہے تو اس قیاس پر انسخ بمعنی منسوخ ہو سکتا ہے اور نساخ کا لفظ آپ نے کہیں دیکھا ہو تو اس کی سند چاہئے کہنے لگے مبالغہ ہے میں نے کہا ذلیل پیشوں کے لئے بھی یہی وزن آتا ہے جیسے حجام قصاب بقال بزاز صراف نجار خیاط ط اس کی سند کا بھی وعدہ کیا پھر مرزا جہاں قدر نے کچھ پڑھنے کی فرمایش کی غزل انہوں نے شروع کی اس میں بھی کئی غلطیاں تھیں ایک کا جواب نہ دے سکے ہر شعر پر یہی کہتے تھے کہ اسکی سند لکھ کر بھیج دوں گا۔ تحریر سرمہ کا لفظ بھی تھا۔

سید صالح خادم کربلا حضرت کے لئے عبا لے کر آئے تھے مالک الدولہ نے تاریخ کہی مادہ کا مصرع یہ ہے۔ع

پاک حلہ پئے اختر آیا۔ ۱۲۸۱ھ ہجری

ان سید صاحب نے خوب ہی دام فریب پھیلایا تھا بادشاہ سے کہا کہ امام حسینؑ نے حکم دیا کہ عبا لے جا کر واجد علی شاہ کو ہماری طرف سے دو بادشاہ لے وہ عبائے سیاہ سر پہ رکھ لی سب شاہزادوں کے پاس بھیجی کہ سر و چشم پر اُسے رکھیں سید صاحب کو بہت کچھ اس کا صلہ مل چکا تھا مگر چلتے چلتے انہوں نے اور چرکا لگایا عرض کی کہ ناصر الدین شاہ ایران کی طرف سے ایک جھاڑ کربلا میں روشن ہوا کرتا ہے میں چاہتا ہوں کہ حضور کی طرف سے بھی جھاڑ روشن ہوا کرے فوراً یہ استدعا مقبول ہو گئی جھاڑ کی قیمت اور بتیوں کے ماہانہ مخارج کے لئے حکم ہو گیا۔

تاریخ امام باڑہ جلیس الدولہ - ع

مظلوم کی ہے بارگاہ۔ ۱۲۹۰ھ ہجری۔

یہ مصرع معجز درج میں ہے۔ جلیس الدولہ میرزایان شیراز میں سے تھے عہد سلطنت میں آکر بادشاہ کے ملازم ہوے اور مرتے دم تک ان کی رفاقت میں رہے ان کے مرنے کے بعد ان کے فرزند اکبر حامد الدولہ بر تر کو ان کی خدمت عنایت ہوئی یہ شخص فارسی و اُردو دونوں میں اہل زبان تھے اور دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے کلکتہ سے مٹیا برج جہاز پر آرہے تھے کنارہ کے قریب پہنچ کر ایک دوسرے جہاز سے ٹکر ہوئی غریق رحمت ہو گئے۔ مرحوم بڑے پیراک تھے مگر انجن کے پھٹ جانے سے کچھ صدمہ پہنچا کہ اُبھر نہ سکے۔

تاریخ انتقال صاحب عالم مرزا ولیعہد - ع

کوکب شد زیر خاک نائم۔ ۱۲۹۱ھ ہجری

خلیج بنگال کے طوفان کی زحمتیں اُٹھا کر بادشاہ جب کلکتہ پہنچے تو فسخ عزم کیا اور انگلینڈ کا جانا موقوف رہا اُسوقت مرزا ولیعہد آمادہ ہوئے کہ آپ نہیں جاتے تو مجھے بھیجئے ان کے اس ارادہ سے بادشاہ بہت خوش ہوے مرزا سکندر حشمت اور جناب عالیہ بھی ساتھ چلنے پر آمادہ ہوئیں گو والدۂ ولی عہد نواب مخدرۂ عظمیٰ ناراض ہوئیں اور انہوں نے فہمائش کی کہ بادشاہ نہیں جاتے تو تمہارے جانے سے کیا فائدہ ہوگا مگر انہوں نے ایک نہ سنی انگلینڈ میں ان لوگوں کا پہنچنا ایک نیا واقعہ تھا اہل شہر نے ہجوم کیا اور دیکھنے کے مشتاق ہوئے ان کو سرکاری لوگوں کے سوا اور کسی سے ملنا منظور نہ تھا مگر مسٹر برڈ اور مسٹر برنڈن کی سفارش سے کہ یہ دونوں انگریز متوسلین دولت اودھ میں سے تھے انگلینڈ میں دونوں شاہزادوں نے دربار عام کیا حبشی خواجہ سرا صف بستہ پس پشت کھڑے ہوے تھے اور مسٹر برڈ ہر ایک شخص کے بر وقت تعارف خدمت ترجمانی ادا کرتے تھے اس دربار میں بڑے بڑے رئیس و عہدہ دار انگلینڈ کے آئے تھے جناب عالیہ سے ملنے کو بہت سی معزز انگریزنیں آئی تھیں

اور مسس برنڈن ترجمان تھیں۔ ملکہ معظمہ سے ایک ملاقات ہوئی تھی جس میں زحمت سفر کے سوا کچھ ذکر نہیں آنے پایا تھا کہ ہندوستان کے غدر کی خبریں آنے لگیں اور انگلینڈ کی ساری خلقت اسقدر ان لوگوں سے بیزار ہوگئی کہ وہاں ٹھہرنا مشکل ہوگیا۔ حکیم احسن الزماں نگینہ کے ایک طبیب اس قافلہ کے ساتھ تھے بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ مکان کے دروازے بند کئے بیٹھے رہتے تھے کہ ایسا نہو کہ ہندوستان کے غدر کا قصاص ہم سے لیں مایوس ہوکر یہ لوگ پیرس میں چلے آئے دس پندرہ دن کے عرصہ میں جناب عالیہ اور مرزا سکندر حشمت کا انتقال ہوگیا امپراطور فرانس نے مرزا ولی عہد سے ملنا چاہا کہ تعزیتہ ادا کریں اور ملکہ معظمہ سے ان کی سفارش کریں مگر ولی عہد نے یہ عذر کیا کہ دونوں سلطنتوں میں صفائی نہیں ہے اور ہم کو انگلینڈ کی سرکار سے توسل ہے آپ سے ملنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اور یہ ذکر میں نے سنا کہ جب یہ قافلہ لکھنؤ سے کلکتہ آرہا تھا تو رانی گنج سے ریل پر سوار ہوئے راہ میں فرانس ڈوانگہ ملا وہاں جب ریل ٹھہری تو ایک ہندو محرر نے مرزا ولی عہد کو یہ صلاح دی کہ یہیں اتر پڑیئے اور اپنے معاملات کو دولت فرانس کی وساطت سے طے کیجئے اس سے بہتر ذریعہ آپ کو نہیں ملے گا مگر انہوں نے یہی کہا کہ دولت فرانس سے پناہ لے کر انگریزوں کے قدیمی تعلقات کو قطع کرنا مناسب نہیں ہے۔

مرزا ولی عہد کا ایک دیوان انکی زندگی میں چھپ گیا تھا دوسرا دیوان بھی تیار تھا مگر انتقال انکا ہوگیا کلام بالکل صاف ہے ذرا تصنع و تکلف کو دخل نہیں ہے وطن کا رونا ہر غزل میں ہے انا للہ و انا الیہ راجعون۔

تاریخ غسل صحت جہاں پناہ

فلک جاہ واجد علی شاہ اختر   رہیں تا قیامت صحیح و سلامت
سدا ہفت اقلیم ہوں زیر فرماں   ملے تاج و تخت و لوائے حکومت
نہو پھر کبھی اختلال عناصر   رہے بد مزہ دشمنوں کی طبیعت
اُسے صحتِ حال کی فکر ہر دم   بطرز جدید ایک ہاتھ آئی صورت
حروف صحیحہ میں تاریخ نکلی   سپرد عدد علت و حرفِ علت
زحافات کو اس سبب سے نہ لایا   کہ ہو وزن سالم دلیل سلامت
لکھا اے خائف فکرِ صولت یہ مصرع   مبارک ہو سلطاں کو یہ جشنِ صحت
۱۲۹۲ھ

سلطان خانہ میں ایک امام باڑہ بیت البکا اور ایک مکان مجمع طیور بنوا رہے تھے کہ مزاج بادشاہ کا ناساز ہوگیا بیماری کو بہت طول ہوا انیس الدولہ و ذوالفقار الدولہ و دیانت الدولہ یہ تین شخص شب و روز حضرت کے تیماردار تھے ان لوگوں پر بادشاہ کو بڑا اعتماد تھا یوں مہینوں یاد نہیں فرماتے تھے مگر ذرا طبیعت بے مزہ ہوئی اور ان کو بلوا لیا پھر جب تک صحت نہو دم بھر کے لئے ان کا سرکنا پاس سے گوارا نہ تھا۔ بادشاہ کو صحت ہوگئی اور اس اثنا میں وہ دونوں مکان بھی تیار ہوگئے بیت البکا میں سادات ملازمین کی دعوت کی اور حسن عقیدت سے آفتابہ خود ہاتھ میں لیکر کھڑے ہوئے خود سب کے ہاتھ دھلائے۔

مجمع طیور عجب مقام تھا ایک مستطیل نہر کے کنارہ سلطان خانہ میں یہ مکان واقع تھا دونوں طرف آہنی تاروں کا جال تھا اس میں ہزارہا طائر جو آپس میں لڑتے نہیں چھٹے ہوئے تھے چھت کے کارنسوں میں صدہا خانے رکھے گئے تھے کہ آشیانہ بنا سکیں سنگ مرمر کا فرش سنگ مرمر کا مستطیل حوض اس میں غوطہ زن طائروں کے لئے مچھلیاں چھٹی ہوئی درختوں کے مانند اس خوبصورتی سے جابجا حوض کے کنارہ چنے ہوئے کہ گلدستہ



انڈین پریس الہ آباد

معلوم ہوتے تھے اُن وحشی طائروں کو پورا آزادی کا لطف حاصل تھا۔ اس میں ایک جھولا پڑا ہوا تھا بادشاہ جھولے پر آکر بیٹھ جاتے تھے اور پہروں ان طیور کی خوش فعلیاں دیکھا کرتے تھے اور انکی نغمہ سنجیاں سنا کرتے تھے اس مکان کا طول ڈیڑھ سَو قدم کے قریب تھا اور عرض بھی معمول سے کچھ زیادہ تھا بہت سے فراش جھاڑنے اور صاف کرنے کے لئے مقرر تھے۔ محل سے متصل تھا اس سبب سے ہم لوگوں کی رسائی وہاں تک نہ تھی سلطان خانہ کے تمام پھاٹکوں پر ترک سوارنیوں کے پہرے تھے۔ ایک فراش نے مجھ سے ذکر کیا کہ بادشاہ جھولے پر بیٹھے ہوئے تھے دیکھا کہ ایک بیا تنکے جمع کر رہا ہے اور ایک درخت میں آشیانہ بنانا چاہتا ہے ہم لوگوں سے ناراض ہوئے کہ یہاں تنکے کہاں سے آتے ہیں کہ یہ جھونجھ بنا رہا ہے تم لوگ صفائی کا اچھی طرح اہتمام نہیں کرتے وہ آشیانہ جو بیا بنا رہا تھا پھکوا دیا اور مقیش کے تار جا بجا بکھرا دیئے۔ بیے کو جب تنکے نہ ملے تو اُس نے تاروں کا آشیانہ بنا لیا اور بادشاہ بہت خوش ہوئے۔

تاریخ دیوان شمیم۔ ع

تاریخ تراوشِ شمیم است۔ ۱۲۹۶ھ

شمیم ایک شخص اہل کلکتہ میں منشی ہنر مرحوم کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اپنا دیوان چھپوایا اور نساخ والوں میں حافظ مرحبا ایک شخص تھے انہوں نے بھی اپنا دیوان نعت میں شائع کیا دونوں آدمیوں میں چشمک تھی انہوں نے اُن پر اعتراض کئے انہوں نے ان پر۔ شاعرانہ بحث ہوتے ہوتے مذہبی جھگڑے شروع ہوگئے مرحبا پیش نماز بھی تھے واعظ بھی تھے صحاح ستہ کے اردو ترجمے بھی دیکھ لیا کرتے تھے شمیم بیچارہ گو اہل سنت میں سے تھا مگر ان کتابوں سے بے خبر تھا جب تک شاعرانہ بحث رہی وہ جواب دیتا رہا ایک رسالہ شمشیر انتقام منشی ہنر صاحب کو دکھا کر شائع کیا اس پر حافظ صاحب نے بہت زہر اگلا ذو الفقار قاطع الکفار رسالہ کا نام رکھ کر چھپوا دیا منشی ہنر وہ رسالہ لئے ہوئے میرے پاس آئے اور یہ کہا کہ ان مذہبی مباحث کا جواب بھلا شمیم سے کیا ہو سکے گا آپ ذرا زحمت کیجئے۔ میں نے شمیم ہی سے اس کا جواب لکھوا دیا اور مولوی کبیر الدین احمد صاحب اُردو گائیڈ کے پاس بھجوا دیا کہ اسے دیکھ لیجئے کہ کہیں سخن سازی و غلط بیانی تو اس میں نہیں ہے وہ بڑے آزاد خیال شخص تھے اُنہوں نے اس کے چھاپنے کی اجازت دے دی وہ رسالہ چھپا الٰہی تیری پناہ شمیم کی جان کے ہزاروں دشمن ہو گئے۔ ہائیکورٹ کے وکیلوں نے ناخدا کی مسجد میں تمام علما کو جمع کیا ایشیاٹک سوسائٹی سے کتابیں منگوائی گئیں کہ اس رسالہ میں جہاں جہاں غلط بیانی ہے اسکی دادخواہی دادگاہ کلکتہ میں کریں گے اور شمیم کو کالے پانی بھجوا دیں گے۔ مگر نتیجہ اس کنکاش کا یہ ہوا کہ علما وکلا سے خفا ہو گئے اور وکلا سرگریباں ندامت مسجد سے نکلے۔ علما کی تاویلات کو تمام اہل مجلس نے ناپسند کیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ یہی فرقہ خواہ مخواہ برسر فساد تھا۔

علی حیدر طباطبائی

ندوۃ العلماء

ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں یہ بالکل ایک نئے قسم کی تحریک ہے، اور جب کبھی مسلمانوں کی علمی اور مذہبی تاریخ لکھی جائے گی تو ندوۃ العلما کا ایک مستقل اور نمایاں عنوان قائم کرنا ہوگا، وہ کیونکر قائم ہوا؟ کس نے قائم کیا؟ کس طرح رفتہ رفتہ اس نے مختلف دور طے کئے؟ ایک دلچسپ داستان ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ ملک کا بڑا حصہ اندرونی اسرار سے اب تک بے خبر ہے، اس لئے ہم کسی قدر تفصیل سے اس کے حالات لکھتے ہیں۔

کسی ملک میں جب کوئی انقلاب آتا ہے تو ہر صیغہ کا اعلیٰ طبقہ ہمیشہ ایک مدت تک انقلاب کے قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتا کیونکہ وہ اب تک ایک خاص درجہ اور رتبہ رکھتا تھا اور بظاہر اپنے شعبہ کا حکمراں ہوتا تھا، اس لئے جدید انقلاب کے قبول کرنے کو وہ گویا اپنے اقتدار کی شکست سمجھتا ہے، ہندوستان میں دور حکومت کے بدلنے نے جب نئی ضرورتیں پیدا کیں، تو کم درجہ کے لوگوں نے فوراً ان ضرورتوں کو محسوس کرلیا اور ان کے سامنے انہوں نے گردنیں جھکادیں، جس طرح کہ مغل امپائر کے زمانہ میں فارسی زبان اور اسلامی معاشرت سب سے پہلے کایستھوں نے سیکھی جو برہمن اور چھتری سے کم درجہ رکھتے تھے۔ راجپوتوں نے جاں نثاریاں کیں، خون بہائے۔ قرابت تک کی لیکن اپنی وضع قطع۔ طور۔ طریقہ۔ بول چال کو مطلق نہیں بدلا۔

انگریزی حکومت نے جب ملک میں انگریزی تعلیم پھیلائی تو ملک کا اعلیٰ طبقہ اس کی طرف بہت کم متوجہ ہوا یہاں تک کہ بنگال میں بھی اوّل اوّل برہمن اور اعلیٰ قومیں اس سے الگ رہیں مسلمانوں میں ایک مدت تک اس کا رواج نہ ہوسکا اور چونکہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم میں بڑا حصہ مذہبی تعلیم کا تھا اور اس کے علم بردار علما تھے اس لئے علما کے گروہ نے انگریزی تعلیم کے قبول کرنے کے بجائے، علانیہ اس کی مخالفت کی۔

لیکن زمانہ نہ صرف انگریزی تعلیم پھیلا تا بلکہ خیالات میں بھی سخت انقلاب پیدا کررہا تھا، اس بنا پر سخت ضرورت تھی کہ علما اپنے نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کرتے جو زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ہوتیں اور جدید خیالات کا مقابلہ کرسکتیں۔ لیکن انہوں نے اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں چاہا۔ ایک مدت تک یہ حالت رہی اور یہ مقدس گروہ زمانہ کے پرزور سیلاب کا بے فائدہ مقابلہ کرتا رہا آخر جب ضرورت حد سے زیادہ گذر گئی تو ایک انقلاب پیدا ہوا لیکن اس کی تحریک علما کی طرف سے نہیں بلکہ دنیا داروں کے طبقے سے شروع ہوئی۔

مولوی عبدالغفور ایک شخص اس زمانہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے جو بالآخر ریاست رامپور کے وزیر مقرر ہوگئے تھے، ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ عربی مدارس کا نصاب اصلاح کے قابل ہے اس لئے علما کی ایک انجمن قائم ہونی چاہئے جو نصاب اور دیگر امور کی اصلاح کرے، اس خیال کی بنا پر انہوں نے ایک مولوی صاحب کو جن کا نام مولوی مشتاق احمد تھا اس کام پر متعین کیا کہ وہ جلسہ دستاربندی مدرسہ فیض عام میں شریک ہوں اور وہاں چونکہ بہت سے علما کا مجمع ہوگا اس لئے ان سے مل کر اسکے

متعلق مشورہ کریں، ۱۳۱۰ھ میں جب فیض عام کا جلسہ ہوا تو مولوی صاحب موصوف شریک جلسہ ہوے اور علما کے سامنے یہ تجویز پیش کی سب نے نہایت پسند کی اور اسکی ضرورت پر دستخط کر دیئے، اس کے بعد ڈپٹی صاحب نے مولوی صاحب موصوف کو متعین کیا کہ ہندوستان کے تمام علما کی خدمت میں حاضر ہو کر اس تجویز کو ان سے منظور کرائیں اسکے ساتھ تمام مدارس عربیہ کی رپورٹ لکھ کر لائیں۔

سب سے پہلے مولوی صاحب موصوف، مولانا شبلی صاحب نعمانی کے پاس مشورہ کے لئے گئے، انہوں نے یہ رائے نہایت پسند کی اور ایک نقشہ بنا کر دیا کہ اس کے موافق مدرسوں کی رپورٹ مرتب کر کے لائیں، مولوی صاحب موصوف نے ہندوستان کے اکثر شہروں کا دورہ کیا یہاں تک کہ حرمین شریفین گئے، حضرت حاجی مولانا امداد اللہ صاحب نے بھی اس تجویز کو نہایت پسند کیا اور اس کاغذ پر جس میں ایسی مجلس کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی دستخط فرمائے۔

۱۸۹۲ء میں جب فیض عام کا جلسہ ہونے کو تھا تو مولانا مولوی محمد علی صاحب کانپوری جو اس تجویز کے حامی تھے، اُن کی طرف سے علما کے نام خطوط شایع ہوے کہ جلسہ میں تشریف لائیں تاکہ انجمن کی باقاعدہ بنیاد قائم کی جاوے۔

مولوی شبلی صاحب نعمانی اور مولوی عبد الحق صاحب دہلوی جلسہ سے کئی روز پہلے آئے اور مشورہ میں شریک رہے، جلسہ بڑی شوکت و شان سے منعقد ہوا اور علما کا اس قدر ہجوم ہوا کہ آج تک غالباً کسی موقع پر نہوا ہو گا۔ انجمن کے ابتدائی اور سرسری قواعد بنائے گئے، اور اس کا نام ندوۃ العلماء رکھا گیا، ندوہ کے دو اصلی مقصد قرار دیئے گئے، ایک یہ کہ موجودہ اور مروجہ نصاب تعلیم کی اصلاح کی جاوے، دوسرے یہ کہ علما میں باہم جو جھگڑے اور نزاعیں اور خانہ جنگیاں رہتی ہیں دور کی جائیں۔ جلسہ خیر و خوبی سے ختم ہوا لیکن مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کو ایک جزئی شکایت پیدا ہو گئی جو آگے چلکر ایک سخت مخالفت کے قالب میں نمودار ہوئی یہاں تک کہ مولوی صاحب موصوف نے ندوہ کی مخالفت میں قریباً ۳۸ رسالے لکھے اور ان کی مخالفت نے ملک کے ایک بڑے حصہ کو غلطی میں مبتلا کر دیا یہاں تک کہ بمبئی میں اب تک وہ زہر آلود خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔

مولانا محمد علی صاحب ندوہ کے ناظم یعنی سکرٹری قرار پائے، اور نہایت جد و جہد سے انہوں نے ندوہ کی ترقی کی تدبیریں شروع کیں اور حقیقت یہ ہے کہ انہی کو ندوہ کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ انکی تحریک سے نواب وقار الامرا وزیر اعظم حیدر آباد نے پچاس روپیہ ماہوار ندوہ کے لئے مقرر فرمائے اور پچاس خود مولوی صاحب موصوف کی ذات کے لئے، لیکن مولوی صاحب موصوف نے ایثار نفس سے وہ ماہوار بھی ندوہ کی طرف منتقل کر دی، مولانا موصوف کی اعانت کے لئے مولوی سید عبد الحی صاحب ان کے مددگار مقرر کئے گئے اور سچ یہ ہے کہ ندوہ کی بقا اور ترقی میں مولوی صاحب موصوف کا بہت بڑا حصہ شامل ہے، ان دونوں بزرگوں کے سوا، مولانا شاہ سلیمان صاحب، مولانا عبد الحق دہلوی، مولوی مسیح الزماں خاں صاحب کا نام ندوہ کے محسنین میں یادگار رہے گا۔

دوسرے سال ندوہ کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا جسکی مہمانداری نہایت عالی حوصلگی سے منشی اطہر علی صاحب مرحوم نے کی، مصارف کا تخمینہ تین ہزار تھا جو خود منشی صاحب مرحوم نے اپنی جیب سے ادا کیا، اس جلسہ میں بھی کثرت سے علما

شریک ہوئے اور مقاصد ندوہ پر تقریریں اور نظمیں ہوئیں حیدرآباد میں نواب وقار الامرا نے ریاست کی طرف سے ڈیلیگیٹ بھیجے اور کئی سال تک مولانا لطف اللہ صاحب کو جو عدالت العالیہ کے مفتی تھے ندوہ کی شرکت اور صدارت کی غرض سے بھیجتے رہے۔

دو تین سال تک بڑے زور شور سے جلسے ہوئے اور ہر گروہ و طبقہ کے لوگ کثرت سے شریک ہوئے، نئی روشنی والوں نے ندوہ کا خیر مقدم کیا چنانچہ سرسید نے اسکی تائید میں متعدد آرٹیکل لکھے، اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں جو علی گڈھ میں منعقد ہوا تھا، نواب محسن الملک نے ندوہ کے مقاصد کی تائید کا رزولیوشن پیش کیا، اور نہایت مفصل تقریر کی سید محمود صاحب نے رزولیوشن کی تائید کی، اور بالاتفاق پاس ہوا۔

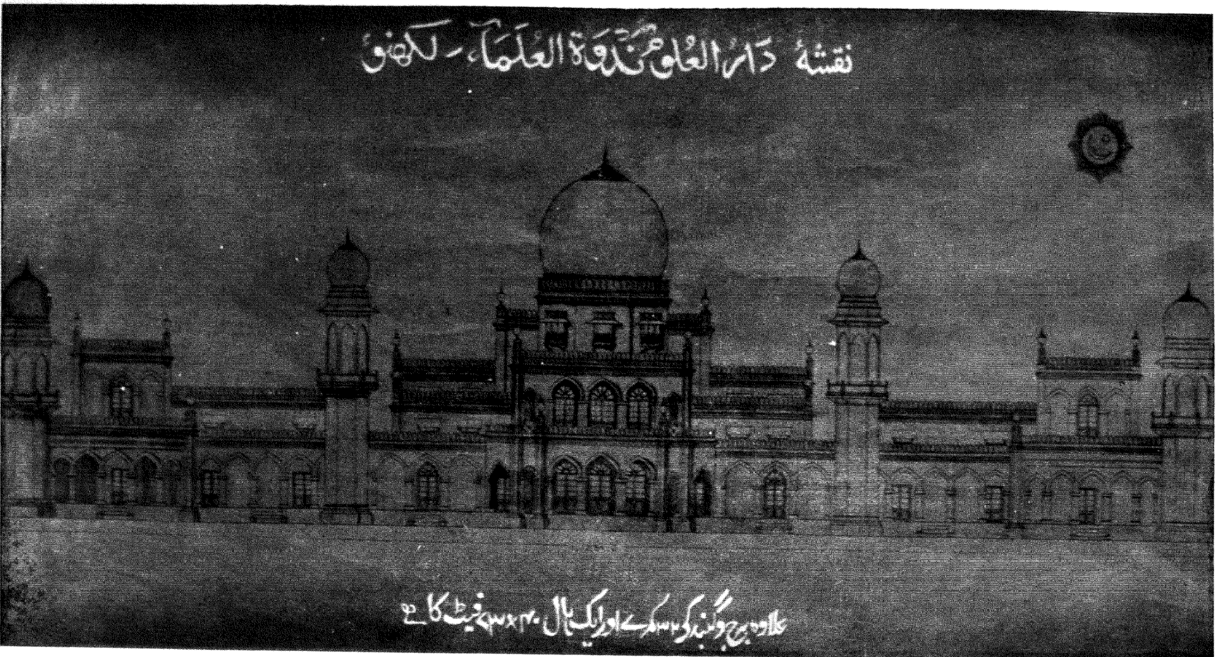
چونکہ ندوہ کا ایک بڑا مقصد طرز تعلیم کی اصلاح تھی اور ندوہ میں اس کے متعلق جو تجویز قرار پائی تھی، وہ اس لئے بیکار رہتی تھی کہ مدارس عربیہ کے مہتمم اور مدرس، نصاب کی تبدیلی پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ نظر آتا تھا کہ جس قسم کے علما موجودہ زمانہ کے لئے درکار ہیں وہ قدیم طرز تعلیم اور قدیم طرز تربیت سے تیار نہیں ہو سکتے، اس لئے مولانا شبلی صاحب نعمانی نے مولوی محمد علی صاحب ناظم ندوہ کو خط لکھا کہ ایک مدرسہ قائم کرنا چاہیئے، جس کا نصاب تعلیم اصلاح یافتہ ہو، اور جس میں خاص طریقہ سے تربیت دی جائے، مولوی شبلی صاحب نے ایک مسودہ بناکر مولوی محمد علی صاحب کے پاس بھیجا کہ اس کو تمام علما کے پاس بھیجا جائے، اور انکی رائیں حاصل کی جائیں، یہ مسودہ چھاپ کر شائع کیا گیا، اور قریباً تمام علماے ہندوستان نے اسکی تائید و تحسین کی، مولوی محمد علی صاحب نے علما کی تمام تحریریں ایک رسالہ کی شکل میں شائع کیں اور اس پر اتفاق ہوگیا کہ ایک مدرسہ دار العلوم کے نام سے قائم کیا جائے۔

شوال ۱۳۱۳ھ میں ندوہ کا جلسہ بریلی میں منعقد ہوا، اس جلسہ میں دار العلوم کا مسودہ مع آراء علما پیش ہوکر منظور ہوا، اور مولانا مفتی لطف اللہ صاحب نے جو جلسہ کے صدر انجمن تھے، اسکی منظوری کا اعلان کیا۔

۱۳۱۵ھ ۱۸۹۸ء میں بمقام کانپور یہ طے ہوا کہ بالفعل دار العلوم کا ابتدائی درجہ بمقام لکھنؤ کھول دیا جائے۔ جناب منشی اطہر علی صاحب مرحوم کی کوشش سے نو ہزار روپیہ پر ایک مکان خریدا گیا، یہ رقم جناب منشی احتشام علی صاحب نے بطور قرضہ کے عنایت کی (یہ قرضہ اب ادا کر دیا گیا) ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء میں دار العلوم کا ابتدائی درجہ کھولا گیا، اور رسم افتتاح میں مسٹر ہارڈی صاحب کمشنر اور مسٹر گرے صاحب ڈپٹی کمشنر شریک ہوئے۔

۱۸۹۹ء میں بمقام شاہجہانپور ندوہ کا جلسہ ہوا، اور دار العلوم کے لئے مولوی عبد الواحد خان صاحب نے ایک گاؤں وقف کیا، اسی جلسہ میں مولوی عبد الرافع خاں صاحب نے اپنا کتب خانہ جس میں تین ہزار کتابیں تھیں دار العلوم پر وقف کیں۔

ندوہ جسطرح ترقی کرتا جاتا تھا، اور جس طرح روز بروز اس کا اثر پھیلتا جاتا تھا، اس سے توقع ہوتی تھی کہ ایک دن وہ تمام ہندوستان کا مذہبی مرکز ہوجائے گا، لیکن دفعۃً اس کو ایک سخت صدمہ پہنچا، اس زمانہ میں مکڈانل صاحب لفٹنٹ گورنر تھے۔ بعض قوم فروشوں نے ان سے جاکر شکایت کی کہ ندوہ درحقیقت ایک پولیٹیکل تحریک ہے۔ مکڈانل صاحب سخت ناراض ہوئے اور پہلا کام جو انہوں نے کیا یہ تھا کہ منشی اطہر علی صاحب مرحوم



موجودہ عمارت اِس نقشہ سے بہت زیادہ ترقي کرگئي هے

سے ناراضی ظاہر کی، صوبہ کی گورنمنٹ کی ناراضی کا اثر دفعتہً ہر جگہ پھیل گیا، اور ندوہ کی رفتارِ ترقی بالکل بند ہوگئی۔ منشی اطہر علی صاحب مرحوم حیدرآباد چلے گئے، مولوی محمد علی صاحب حج کو تشریف لے گئے، مولوی شبلی صاحب نے ندوہ میں آکر رہنا چاہا لیکن معلوم ہوا کہ مکڈانل صاحب ان سے بھی بدظن ہیں اور ان کا رہنا اس وقت ندوہ میں مضر ہوگا، اس لئے وہ بھی اپنے وطن میں جا کر مقیم ہوے۔ ادھر مولوی احمد رضا خاں صاحب کے رسالے اور اشتہارات جو نہایت کثرت سے ندوہ کی مخالفت میں ہمیشہ شائع ہوتے رہتے تھے، انہوں نے بہت سے عوام کو برگشتہ کر دیا، اب ندوہ ایک معمولی مدرسہ رہ گیا اور سالانہ جلسے بند ہوگئے، سب سے اخیر جلسہ مدراس میں ۱۹۰۴ء میں منعقد ہوا، جس کے بعد کئی سال تک کوئی جلسہ نہ ہوسکا۔

مولوی شبلی صاحب نعمانی حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون ہوگئے تھے، ندوہ کے یہ حالات سنتے تھے اور نہایت افسوس کرتے تھے۔ بالآخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ندوہ میں چل کر قیام کرنا چاہیے اور اس کے متعلق ہر قسم کی کوشش کرنی چاہیے۔ حسن اتفاق یہ کہ مکڈانل صاحب کا زمانۂ حکومت ختم ہوگیا تھا اور وہ ولایت جا چکے تھے۔ غرض مولوی صاحب موصوف نے حیدرآباد سے لکھنؤ آکر قیام کیا۔ ان کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ گورنمنٹ سے ندوہ کے تعلقات صاف کئے جائیں، چنانچہ اس کے متعلق انہوں نے کوشش شروع کی، کئی برس کے بعد اس کوشش میں کامیابی ہوئی۔ موجودہ لفٹنٹ گورنر صاحب مسٹر ہیوٹ کو صحیح حالات سے اطلاع ہوئی اور انہوں نے ندوہ پر مہربانی ظاہر کی چنانچہ پانسو روپیہ ماہوار ایڈ مقرر ہوئی۔ گورنمنٹ سے تعلقات کے صاف ہونے کا تمام تر کریڈٹ جناب کرنل عبد المجید خاں صاحب کو حاصل ہے جو ریاست پٹیالہ کے فارن منسٹر ہیں۔

اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ ندوہ کی مالی حالت درست کی جائے، اور مولوی شبلی صاحب نے جب ندوہ میں آکر دار العلوم کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا تو ندوہ کی کل آمدنی مستقل سوا سو روپیہ ماہوار تھی، اور خرچ ۲۵۰ ماہانہ تھا، مولوی صاحب موصوف نے ملک سے خط و کتابت کی، بھوپال اور رامپور کا سفر کیا، سر آغا خاں صاحب کو ندوہ میں لائے۔ چنانچہ بھوپال سے ۲۵ اور جناب نواب صاحب رام پور اور سر آغا خاں صاحب نے پانچ پانچ سو سالانہ مقرر کیا، مولوی غلام محمد صاحب شملوی جو ندوہ کے سفیر ہیں ان کی کوشش سے رئیس بہاولپور کی دادی صاحبہ نے پچاس ہزار کی رقم دار العلوم کی تعمیر کے لئے عنایت کی۔ دار العلوم کے لئے کوئی معقول عمارت نہ تھی اسلئے اس کے متعلق کوشش شروع ہوئی، چنانچہ لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر نے ایک نہایت عمدہ اور خوش فضا ٹکڑا زمین کا عنایت فرمایا جو ۳۱ بیگہ پختہ ہے۔

دار العلوم کا نقشہ سید جعفر حسین صاحب نے طیار کیا، ۲۸ نومبر ۱۹۰۹ء کو دار العلوم کے سنگ بنیاد رکھنے کا جلسہ بڑے شوکت و شان سے منعقد ہوا اکثر روسا و علما اور حکام ضلع شریک ہوے۔

لفٹنٹ گورنر صاحب نے اپنے ہاتھ سے پتھر رکھا، اور ایک نہایت عمدہ تقریر کی۔ لکھنؤ کا قدیم دار العلوم فرنگی محل کا محلہ ہے، جہاں بڑے بڑے علما و فضلا پیدا ہوے، اور جن کا طریقۂ درس آج تک ہندوستان میں جاری ہے۔

اس محلہ کا نام فرنگی محل اس وجہ سے ہے کہ یہاں ایک انگریز تاجر رہتا تھا۔ لفٹنٹ گورنر صاحب نے ندوہ کے دارالعلم کی بنیاد رکھی، تو میر اکبر حسین صاحب نے یہ لطیفہ پیدا کیا، کہ اصل فرنگی محل یہ ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

رکھی بنائے ندوہ، ہز آنر نے آکے خود سچ پوچھئے اگر تو فرنگی محل یہ ہے

ندوہ کا کارنامہ | یہ ندوہ کی ایک مجمل تاریخ تھی، ندوہ نے اسلامی ضروریات کے متعلق جو نمایاں کام انجام دیئے انکی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) سب سے مقدم یہ کہ علما کے گروہ میں جو عام جمود تھا اس میں جنبش پیدا کی، علما زمانہ کی ضروریات سے بالکل ناواقف تھے، لیکن اب یہ عام خیال پیدا ہو گیا ہے کہ نصاب تعلیم میں بہت کچھ اضافہ اور اصلاح کی ضرورت ہے نصاب تعلیم کے علاوہ، اور معاملات کے متعلق علمار کے خیالات میں جو انقلاب پیدا ہوا، ندوہ ہی کا اثر ہے عجیب بات یہ ہے کہ ندوہ کا اثر مصر و شام تک پہنچا سید رشید رضا ایڈیٹر المنار جو مصر و شام کے مشہور رفارمر ہیں، انہوں نے ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی ہے، جس کا نام مدرستہ العلم والارشاد ہے، اس کی تمہید میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ یہ مدرسہ ہندوستان کے ندوۃ العلما کی تقلید ہے، دیوبند میں جو موتمر الانصار قائم ہوئی ہے، وہ درحقیقت ندوہ ہی کا اندرونی اثر ہے۔

(۲) ندوہ نے عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی بھی لازمی قرار دی۔ اس تجویز کے متعلق اگرچہ ابتدا بہت مخالفت کی گئی، یہاں تک کہ اس تجویز کے منظور ہو جانے کے بعد مدتوں تک اس پر عمل نہیں کیا جا سکا، لیکن رفتہ رفتہ کامیابی ہوئی، دو تین برس سے انگریزی اسٹاف مکمل ہو گیا ہے اور قطعی امید ہے کہ پانچ چھ برس میں ایسے علما طیار ہو سکیں گے جو عربی کے ساتھ انگریزی سے بھی کافی طور سے واقف ہوں گے، جس کا یہ نتیجہ ہو گا کہ وہ انگریزی میں مقاصد اسلام کی اشاعت کر سکیں گے، یورپ کی تصنیفات سے مستفید ہو سکیں گے، اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں پر اثر قائم کر سکیں گے۔

(۳) ندوہ نے طریقہ تعلیم میں بہت سی اصلاحیں کیں، قدیم فلسفہ و منطق کی بیکار کتابیں کم کر دیں۔ ادب اور تفسیر کو ترقی دی، اور ایک خاص درجۂ تکمیل کھولا، جسمیں طالب العلم دو برس تک صرف تفسیر یا ادب کی تکمیل کر سکتا ہے۔ ندوہ کے طلبہ عربی زباندانی میں جو مہارت رکھتے ہیں اور جس طرح عربی زبان میں تقریر و تحریر کر سکتے ہیں، ہندوستان کے کسی مدرسہ میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

(۴) ندوہ نے عربی کا ایک نہایت وسیع اور نایاب کتب خانہ مہیا کیا تاریخ اور ادب کی تمام نایاب کتابیں فراہم کی گئیں۔ مولوی شبلی صاحب نے اپنا کتب خانہ جو مدتوں کی کوشش سے جمع کیا گیا تھا ندوہ کو دیدیا نواب عماد الملک بلگرامی نے بھی اپنے کتب خانہ کا ایک بڑا حصہ ندوہ پر وقف کر دیا، اس کتب خانہ میں انگریزی کی بھی اکثر نایاب کتابیں ہیں۔

(۵) ندوہ نے چند اور تجویزیں منظور کیں جنکے متعلق کوشش جاری ہے ان میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی زبان میں، اس کام کو نواب عماد الملک بلگرامی انجام دے رہے ہیں چنانچہ پانچ پارہ کا ترجمہ انہوں نے چھپوا کر ندوہ میں بھیجدیا ہے۔

(۲) انگریزی مدرسوں میں مسلمانوں کے زمانہ حکومت

کی جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں اکثر غلط واقعات ہیں۔ ندوہ کے جلسہ سالانہ میں ایک رزولیوشن اس کے متعلق پاس ہوا، اور اس کے متعلق کوشش جاری ہے۔

(۳) وقف اولاد کا مسئلہ جو پریوی کونسل سے غلط فیصل ہوگیا، اسکی اصلاح کے متعلق ندوہ کی کوششیں بارور ہونے کے قریب ہیں۔

(۴) عربی زبان میں جو بہت سے نئے الفاظ داخل ہوگئے ہیں جنکی وجہ سے عربی اخبارات، ہمارے ملک کے علما سمجھ نہیں سکتے، اس کے لئے ندوہ ایک لغت طیار کرا رہا ہے۔ یہ لغت تیار ہوگیا ہے، اور نصف کے قریب چھپ چکا ہے۔ سید سلیمان صاحب پروفیسر ندوۃ العلما نے اس کام کو انجام دیا۔

لیکن اب تک جو کچھ ہوا ہے، سب ابتدائی باتیں ہیں جب تمام ہندوستان کے علما ندوہ کو علوم عربیہ اور مذہبی کاموں کا مرکز قرار دیں گے اسوقت ندوہ کے اصلی مقاصد کی تکمیل ہوسکیگی

غزل فارسی

(از تازہ افکار گوہربار جناب شمس العلما مولانا مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی دامت فیوضہم)

امشب ایں غلغلہ در کوچہ و بازار اُفتاد — کہ فلاں مے زد، و بیخود شد، وسرشار اُفتاد
سخن از صومعہ اہلِ ورع چند کنی — کہ مرا کار بآں چشم قدح خوار اُفتاد
بسکہ غارت گرِ حسنِ تو جہاں برہم زد — یوسف از خانہ بروں جست و بہ بازار اُفتاد
چہ عجب گر نگہِ مستِ تو اُفتد بر من — بادہ بیروں فتد از جام چو سرشار اُفتاد
شیوہٴ مہر ز خوباں، نتواں داشت طمع — کہ مرا کار بہ ایں طائفہ، بسیار اُفتاد
گرچہ باہیچ کسم جز تو سروکارے نیست — می نہ گویم کہ مرا با تو سروکار اُفتاد

محتسب از پئے دجمعے ز حریفاں بہ کمیں
شبلیا رندیِ پنہانِ تو دشوار اُفتاد

شبلی نعمانی

ہلال عید

تشبیب قصیدہ

کماں ہیں جنبشِ ابروے ساقی کے تماشائی ہلالِ عید وہ لیتا ہوا نکلا ہے انگڑائی
شفق میں ماہِ نو کب ہے یہ انگشتِ حنائی سے اشارہ کر رہا ہے میکشی کا چرخِ مینائی
ادھر ہیں میکشوں کو انتظارِ دورِ پیمانہ اُدھر ہے ساقیِ پیماں شکن محوِ خود آرائی
مہِ نو دیکھکر آئینہ دیکھے جائیگا کب تک ملا آنکھ اس طرف کو اک ذرا او مستِ رعنائی
نگاہِ مست جنکی مست کردیتی ہے عالم کو مبارک اُن خماری انکھڑیوں کو جام پیمائی
وہ آنکھیں جنکی گردش میکشوں کو دورِ ساغر ہے وہ آنکھیں جنکا نشہ کہہ رہا ہے ہمکو نیند آئی
وہ آنکھیں جن سے ہلچل پڑگئی اک دلکی بستی میں وہ آنکھیں فاش جن سے ہوگیا رازِ شکیبائی
وہ آنکھیں جو بھری محفل میں دلکو چھینے لیتی ہیں خدا جانے کہ ڈھائیں کیا قیامت وقتِ تنہائی
وہ آنکھیں جنکو آئینہ گدازی میں ہے مشاقی وہ آنکھیں کھینچ لیں جو قوتِ چشمِ تماشائی
وہ آنکھیں جنکی طنازی سے مژگاں دل پراگندہ وہ آنکھیں جنکی غمازی پہ ہے خود زلف لہرائی
وہ آنکھیں جو بباطن رحم کرتی ہیں غریبوں پر تصوّر جنکا عاشق کو انیسِ شامِ تنہائی
وہ آنکھیں آئینہ بھی دیکھکر جنکو ہے سکتے میں وہ آنکھیں جو کہ ہیں دلدادۂ طرزِ خود آرائی
وہ آنکھیں جنپہ ذکرِ ہجر سے وحشت برستی ہے وہ آنکھیں جنکو نامِ وصل لینے سے حیا آئی
وہ آنکھیں جنکو زخمی کے تڑپنے سے ہے دلچسپی وہ آنکھیں جو چبھوکے دلمیں نشتر ہوں تماشائی
وہ آنکھیں جنکے بیماروں کی مایوسی یہ کہتی ہے نہیں ایسے مرض میں دخل اعجازِ مسیحائی
وہ آنکھیں جو کہے دیتی ہیں خود ہنگامِ نظارہ نہ پوچھو حال اسکا جو ہمارا ہے تماشائی
وہ آنکھیں جنکو صرفہ اک نظر کا بار ہوتا ہے اگر ہو طالبِ دیدار کے ہونٹوں پہ جان آئی
وہ آنکھیں عشق کے مکتب میں جو سیلی لگاتی ہیں وہ آنکھیں جو ہیں عاشق کو سبق آموزِ رسوائی
وہ آنکھیں جنکو یہ دعویٰ الٹ دیں دفترِ عالم وہ آنکھیں جنسے ہے چکر میں عقلِ چرخِ مینائی
وہ آنکھیں گر جگا دیں رات کو چلتا ہوا جادو تو سحرِ سامری سو جان سے ہو انکا شیدائی
وہ آنکھیں دلربائی کے طریقوں کی جو موجد ہیں اشاروں میں جو زہرہ کو سکھا دیں طرزِ رعنائی

عزیز لکھنوی

فریادِ صنم

حلقۂ گیسوے پرپیچ کی الجھن ہے یہی دل تمہارا ہوسِ حرص کا مخزن ہے وہی
یہ محبت ہے تو کہتے ہیں عداوت کس کو طعن و تشنیع وہی۔ نالہ و شیون ہے وہی
کیوں نہیں آپ خلوص اور محبت کی ہیں جان دلمیں پنہاں ہے جو چہرے سے بھی روشن ہے وہی
کیا ضرورت کہ شبستان صنم کی ہو تلاش دل ہو گر صاف تو دلدار کا مسکن ہے وہی
بدلی آپ کی دکھلاتی ہے رنگ اور کے اور ورنہ یاں وہی نظر، رُخ وہی، چتون ہے وہی
تن بدن شمع کا جس شعلے نے ہی پھونک دیا دلِ پروانہ میں کچھ پرتو افگن ہے وہی
چاک جس جوشِ جنوں سے ہوا دامن گل کا دم کشِ نالۂ ہر بلبلِ گلشن ہے وہی
سرو کے پاؤں میں جو حلقۂ زنجیر ہے عشق باغ میں قمریوں کی زینتِ گردن ہے وہی
رات دن تو تمہیں غیر اور رقیبوں کی ہے دھن اور کہے جاتے ہو دلمیں بت پُرفن ہے وہی
حُسنِ یوسف کی طرح جو سرِ بازار بکے کہتے ہیں حُسنِ دل آرا وہی جوبن ہے وہی
حشر میں ہاتھ نہ اس تک کبھی پہنچے تیرا حور کا جو کہ مصلّے ہو یہ دامن ہے وہی
کام کا کب ہے نیاز ایسا کہ ہو جس پر ناز خاکساری میں بھی نخوت کی وہاں ٹھن ہے وہی
کیسے یار اپنا سمجھئے جو ہر اک سے لڑتا جو کسیکا ہو عدو اپنا بھی دشمن ہے وہی
بت چھٹے مرکے تو ہے حشر تلک حور کی دھن حالت ان بوالہوسوں کی پسِ مُردن ہے وہی
کوئی رسوا ہو کوئی خوار ہو کوئی بدنام اپنے مطلب کا اک ان لوگوں میں رٹن ہے وہی
گھر سے نکلو جو کہیں سایہ صفت ساتھ ہیں یہ رہو گھر میں تو بپا ڈیوڑھی پہ شیون ہے وہی
دیکھو جب شامتِ اعمال صفت پیش نظر گھر سے باہر بھی جو نکلو پس چلمن ہے وہی
عاشقی پیشہ ہیں اور قیس کے سجادہ نشیں شور انکا سرِ ہر کوچہ و برزن ہے وہی
دوست کے دوست کو دشمن ہی ہمیشہ سمجھے دلمیں وہ ہی حسد و رشک ہے ان بن ہے وہی
کوئی وارفتہ ہوا ان بوالہوسوں کا کیسے سینۂ دل کا تو دل ارماں کا نشیمن ہے وہی

ہاں خبردار تم ان بوالہوسوں سے بچنا
دل نہ دے ان کو صد آفات سے ایمن ہے وہی

کیفی دہلوی



شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی

انڈین پریس الہ آباد

نیرنگیِ زمانہ

ہیں زخمِ دل کے واسطے ساماں نئے نئے نشتر نئے نئے ہیں نمکداں نئے نئے
ہیں رنگہائے گنبدِ گرداں نئے نئے کیونکر نہ گل کھلائیں گلستاں نئے نئے
دنیا میں پائے جاتے ہیں انساں نئے نئے اور ہیں معاشرت کے بھی ساماں نئے نئے
کیوں ہو نہ نغمہ ہائے عنادل کی لے نئی اب گل نئے نئے ہیں گلستاں نئے نئے
اب قیس کو ہے اک نئی لیلیٰ کی جستجو کیوں طے کرے نہ دشت و بیاباں نئے نئے
پریو تمہارا قاف ہے اب کس شمار میں یورپ میں ہر طرف ہیں پرستاں نئے نئے
کس کو غرض دھرم سے کسے کام دین سے ہندو نئے نئے ہیں مسلماں نئے نئے
پڑھتے ہیں سب بجائے غزل کے بلینک ورس اب ہیں مشاعروں میں غزلخواں نئے نئے
اب آرہا ہے گلشنِ عالم میں انقلاب گاتی ہے نغمے بلبلِ بُستاں نئے نئے
ماں باپ کا ادب ہے نہ استاد کا لحاظ پڑھتے سبق ہیں طفلِ دبستاں نئے نئے
کیوں بیخ و بن سے اکھڑے نہ وضعِ قدیمِ شرق آتے ہیں سمتِ غرب سے طوفاں نئے نئے
معشوق طرزِ نو کی نہ کیوں ہمکو ہو تلاش ہیں ولولے نئے نئے ارماں نئے نئے
افشاں و سرمہ و مسی و پاں کا کام کیا آرائشوں کے اب تو ہیں عنواں نئے نئے
مطرب نیا ہے۔ یار نیا۔ مے بھی ہو نئی عیش و طرب کے ہیں سبھی ساماں نئے نئے
اب چشم و زلف و بلبل و گل سے ہے بحث کیا جولانیِ قلم کے ہیں میداں نئے نئے
اب تمسے کہنہ مشق کی رنجور قدر کیا
ہیں مرجعِ انام سخنداں نئے نئے

محمد یوسف جعفری رنجور

تصیح - افسوس ہے کہ گزشتہ نمبر میں جو غزل جناب عزیز لکھنوی کی درج ادیب ہوئی تھی، اُس کے مطلع کے دوسرے مصرعہ میں ایک لفظ غلط چھپ گیا ناظرین اُس مصرعہ کو اسطرح بنالیں - ع
آنے والے دَور بھی یوں ہی گزرتے جائیں گے

کلام مرزا ثاقب لکھنوی

خدا آباد رکھے ہمصفیرانِ گلستاں کو جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہم کو یاد کرتے ہیں
عدو صیاد و گلچیں کیوں ہو میرے نشیمن کے یہ تنکے بھی ہیں اس قابل جنہیں برباد کرتے ہیں
خود اُن کا حسن میری داد خواہی آنکے کرتا ہے وہ آئینہ لئے ہیں اور مجھکو یاد کرتے ہیں

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

کعبہ کدھر ہے شکر کا سجدہ ادا کروں اللہ آپ آئے ہیں میرے مکان پر
میری طرح ہے حال مرا اُنکا خیر خواہ عاشق ہے انکی نیند مری داستان پر
آزارِ عشق سے کہیں گھبرا نہ جائے دل آنے لگیں ہیں یاس کی باتیں زبان پر
قابو میں دل نہو تو غزل کیا کہے کوئی
زمانتیں عذاب ہیں ثاقب کی جان پر

صدائیں دیکے ہم نے ایک دنیا آزما دیکھی یہی سنتے چلے آئے بڑھو آگے یہاں کیا ہے
قفس مجھکو نشیمن ہو گیا خوفِ اسیری سے کوئی تنکا کھڑکتا ہے تو پہروں دل دھڑکتا ہے

مری داستانِ غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں کچھ اُنہی کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا
کوئی بات ہے جو دلمیں ترا تیر جم کے بیٹھا نہیں تو ذرا سی جنبش میں جگر کے پار ہوتا
وہ حکایتیں جوانی کی میں سن رہا ہوں دل سے جنہیں اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

تجھے ادو کی خاطر چھوڑ کے جاتا ہوں لیکن عبرت مرے بعد آنے والوں کو مرا قصہ سنا دینا
بھری تھیں سرد آہیں دوستوں نے مجھکو غش پاکے مناسب تھا تمہیں بھی اپنے دامن کی ہوا دینا
مرا دل محرمِ اسرارِ حسن و عشق تھا ثاقب
قرینِ مصلحت تھا مجھکو دیوانہ بنا دینا

میکدے میں ہیں سنبھالے ہوئے مے نوش مجھے — آج کیا پی ہے کہ آتا ہی نہیں ہوش مجھے
جان حاضر ہے لئے جاؤ امانت اپنی — پھر خدا جانے رہے یا نہ رہے ہوش مجھے

مخمس

کیا ہے عشق گر تو نے تو اے دل نام کر جانا — دمِ نظارہ جاں پر کھیلنا جی سے گذر جانا
ہو مشکل امتحانِ عشق میں پورا اتر جانا — یہ پروانہ ہے جسنے دیدہ بازی کا ہنر جانا
اسی کا کام ہے ذوقِ نظر میں جل کے مرجانا

ارادت میں اگر امید برآری نہو شامل — تو پھر شہرت رسائی کی رقیبوں میں بھی ہو باطل
ہماری راہ الفت میں اگر ہیں بندشیں حائل — ہمیں اس انجمن میں عزتِ ترک سے کیا حاصل
کہ جب جائز نہیں ہمکو جدھر وہ ہیں اُدھر جانا

انا الحق کی جہاں میں ہر طرف پوشیدہ تھی حکمت — سبق دیتی تھی اکو برہمِ دوئی تو ناستی قدرت
مجھے کثرت میں بھی آئی نظر جو ایک ہی صورت — رہا دنیا میں مین مستِ یکرنگیِ وحدت
نہ میں نے شام پہچانی نہ ہنگامِ سحر جانا

جیدیال سکسینہ

شیخ سعدی

یہ اندازِ نصیحت گستری، یہ نکتہ آموزی — مواعظ میں جگر سوزی، نصائح میں دل افروزی
ترے خوانِ ادب سے ہی جہاں کو بہرہ اندوزی — چراغِ محفلِ ہستی ہو اب تک تیری جانسوزی
پتنگے شمع پر ہیں تیری سرگرمِ تپش اب تک
جگر میں لذّتِ ذوقِ فنا کی ہے خلش اب تک

محیطِ قلزمِ ذخّار ہو طبعِ رواں تیری — دہن میں موجِ دریائے فصاحت ہو زباں تیری
نسیمِ خُلق ہے گلشن میں اب تک گلفشاں تیری — چمن پیرائے ہستی ہے بہارِ بے خزاں تیری
شگفتہ ہیں ترے گلہائے مضموں باغِ امکاں میں
ترانے تیرے لب پر بلبلوں کے ہیں گلستاں میں

ترے حصّہ میں جب نطقِ ازل کی چاشنی آئی — زباں کو قند بخشا لب کو اعجازِ مسیحائی
یہ اندازِ متیں تیرا، یہ تیری دانش آرائی — حلاوت کچھ تری باتوں میں ہے کچھ روح افزائی
عروجِ نشۂ معنی ہے تیری داستانوں میں
صدائے سازِ ہستی ہے ترے دلکش ترانوں میں

ادب آموز ہے تو وہ دبستانِ معانی کا — کہ سینہ تیرا گنجینہ ہے اسرارِ نہانی کا
عجب حیرت فزا عالم ہے تیری نکتہ دانی کا — مرقع کتنا سادہ ہے تری شیوہ بیانی کا
شرابِ صاف کا ہے جلوہ تیرے آبگینوں میں
کہ ہیں زہّاد و صوفی تیرے میخانہ نشینوں میں

نصائح ہیں وہ دلکش اے نصیحت آفریں تیرے — کہ ہیں نقشِ سویدا دل میں پندِ دلنشیں تیرے
چمکتے خاتمِ شہرت میں ہیں اب تک نگیں تیرے — فروغِ تاجِ اوجِ شعر ہیں دُرِّ ثمیں تیرے
چراغِ بزمِ دانش ہے تجلّیٔ بیاں تیری
شعاعیں چارسو عالم میں ہیں پرتو فشاں تیری

متاعِ جلوۂ دانش ہے، دکّانِ ادب تیری — جواہر کا خزینہ ہے مگر کانِ ادب تیری
چراغِ دہر ہے شمعِ شبستانِ ادب تیری — فروغِ نورِ بینش ہے، خوشا شانِ ادب تیری
ترانہ ہے نصیحت کا لبِ ہر مرغِ بُستاں پر
کہ اب تک نام تیرا ثبت ہے بابِ گلستاں پر

شاکر

پروانہ

آفریں اے ننھے سے کیڑے آفریں! — یہ ذرا سی جاں۔ یہ عشقِ آتشیں
بڑھ گیا فرہاد و مجنوں سے کہیں — تیرے مرنے کی ادا ہے دلنشیں
شکوۂ حسنِ تغافل کیش کیا؟ — جان دینے کے سوا درپیش کیا؟
شہپرِ ذوقِ فنا پر اُڑ چلا — سوزِ الفت کی ہوا پر اُڑ چلا

عشق کے اوجِ سما پر اڑ چلا / اڑ چلا راہِ وفا پر اُڑ چلا
گھر سے نکلا جستجوئے یار میں / تاکہ گم ہو جائے کوئے یار میں
وہ اڑا وہ آن پہنچا شمع پر / وہ جھلس کر رہ گئے نازک سے پر
ہو گیا افسانۂ غم مختصر / جل بجھا بے شکوۂ سوزِ جگر
حسن کے شعلہ سے لپٹا آن میں / جینے مرنے کو نہ لایا دھیان میں
اُف! یہ تیرا تھرتھرانا گردِ شمع / اضطرابِ عاشقانہ گردِ شمع
یہ ترا چکر لگانا گردِ شمع / ہے طوافِ مخلصانہ گردِ شمع
شام کو چھپ چھپ کے یہ آنا ترا / چپکے چپکے ہائے جل جانا ترا
بسکہ ہے دلدادۂ سوزِ وفا / اس لئے ہے بہرہ اندوزِ وفا
ظلمتِ شب تجھکو نورِ روزِ وفا / تیرا جلنا طلعت افروزِ وفا
یہ ترے ننھے سے پر تنکے سے بال / ہیں سراپا دفترِ شرحِ وصال
عشق پروانے کا ہے باقی ہوس / جسکو جلنے میں نہیں کچھ پیش و پس
بوالہوس لاکھوں ہیں یاں مثلِ مگس / ہیں وہ شہرِ عشق میں خاشاک و خس
ایسے عاشق ہر جگہ ہیں خیل خیل / عاشقی بدنام ہے جن کے طفیل
لے کر تجھکو آرزوئے عشق ہے / شانۂ سرمستِ بوئے عشق ہے
جانتا بھی ہے۔ جو خوئے عشق ہے؟ / مقتلِ عشاق کوئے عشق ہے
شمع پر پروانہ کو دیکھا نہیں / عشقبازی کھیل بچوں کا نہیں
دل میں پیدا ہمتِ پروانہ کر / ورنہ مرغِ شوق کا پروانہ کر
رازِ پنہانی کسی پر وا نہ کر / اپنی ہستی کی ذرا پروا نہ کر
دل کو تو پہلے جلا پھر آپ جل / عشق کا دعوے ہے تو چپ چاپ جل

تلوک چند محروم

رباعی انیس

اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے / ناداں تجھے فکر آب و دانے کی ہے
ہستی کے لئے ضرور اک دن ہے فنا / آنا تیرا دلیل جانے کی ہے

کمالِ حسن

وہ پری یوں چمنِ حسن میں ہے گرمِ خرام / جیسے ہو خوبیٔ منظر میں شبِ لیلی فام
چرخِ نیلی پہ کہیں جب نہ رہے ابر کا نام / موتیوں کی طرح چھٹکے ہوئے تارے ہوں تمام
نور میں سایہ میں جو حسن نہاں ہوتا ہے
اس کے چہرے سے اور آنکھوں سے عیاں ہوتا ہے

شکل سے ہے وہ خوش آیند نظارہ پیدا / روزِ روشن کو نہ یہ جلوہ خدا نے بخشا
سایہ و نور کم و بیش کہیں گر ہوتا / ساری اُس آن کو اک لحظہ میں برہم کرتا
اسکی ہر کاکلِ شکیں میں جو لہر آتی ہے
رخِ زیبا پہ جھلک جس کی نظر آتی ہے

کہتے ہیں اسکے خیالات یہ ہو کر یکدل / کیسی پاکیزہ ہے اور پیاری ہماری منزل

وہ دلآویز تبسم جو ہے عارض سے عیاں / رنگا رنگی وہ دکھاتی ہے جو ابر دیہ سماں
دلکش آواز میں آہستہ یہ کرتے ہیں بیاں / اے خوش آن وقت کہ در کارِ تو شد گذراں
ایک دل ہے کہ ہے عالم یہ محبت جسکی
اک طبیعت ہے کہ بے لوث ہے الفت جسکی

سُکھدیال

لشکرِ آسماں

چاندنی سے رات کا کیسا سہانا ہے سماں / آئیے دیکھیں زمیں سے آج سیرِ آسماں
ہو رہا ہے آسماں ہر سمت میدانِ پریڈ / فوج اختر سے سپہدارِ فلک آیا وہاں
جتنے تارے ہیں فلک پر وہ سپاہی لوگ ہیں / اور سب فوجی ہیں آفیسر جتنے ہیں سیارگاں
جسکو دیکھو وہ نظر آتا ہے بقعہ نور کا / پہنے ہیں اجرام فلکی جگمگاتی وردیاں
ہر پیادے نے لگائی ہے کرن پاپوش میں / زیب سر اُنکے ستارے دار ہیں سب ٹوپیاں

آنکھ ہو جاتی ہے خیرہ دیکھکر وہ آب و تاب — بادلے کے کام سے سب ہیں مرصع دریاں
گو نہیں اسوقت سورج پر نظام شمس ہے — تاب کس میں ہے کہ ہووے قاعدہ کوئی وہاں
سب پرا باندھے چلے جاتے ہیں پیہم کیطرف — قاعدہ سے فوج اختر اسطرف کو ہے رواں
پیشوا کی اپنے تارے کر رہے ہیں پیروی — آگے آگے چاند پیچھے فوج انجم ہے دواں
کیسا اُجلا اور روشن ہے یہ فوجی راستہ — جیسے سب یہ جا رہے ہیں وہ سڑک ہے کہکشاں
تاکہ نظم لشکر انجم نہووے بے قاعدہ — وسط میں ہے فوج کے دمدار تارہ کا نشاں
ہر طرف کو چل رہے ہیں چرخ پر تیر شہاب — ساتھ رہتا ہے کماندار فلک لیکر کماں

ان گھروں میں دنکو رہتی ہے کواکب کی سپاہ
لا مکن کی صورت یہ بارہ برج ہیں بارہ مکاں

حفظ الکریم حفیظ

تصورِ جاناں

اک ایسی بزم چاہتے ہیں ہمسے دلفگار — کوئی نہو جہاں یہ کہ ہو حال آشکار
دنیا کی فکر ہووے نہ عقبیٰ کی زینہار — اور محو ہوں اسی کی طرف اسکے جاں نثار
تنہائی بھی ہمیں ہے کچھ اسطرح کی پسند — شرمائے جسکو دیکھکے تنہائی مزار
واں پر کوئی مخل نہو جس سے حجاب ہو — پہلو میں داغ دل ہو کہ ہے اُسکی یادگار
جُز یاس و بیکسی نہ ہو کوئی شریک حال — دلکو کسی طرح کا نہو رنج و انتشار
دل میں رہے نہ دامن وحشت کی آرزو — اور ہو جدا نہ اپنے گریباں کا کوئی تار
فرقت کی ہو گھڑی نہ ہو ساعت وصال کی — دلپر بھی تھوڑی دیر کو ہو کاش اختیار
قمری کی طرح ہو نہ گلوگیر طوق عشق — نرگس کی طرح ہو نہ اِن آنکھوں کو انتظار
فصل خزاں نہو۔ نہ امید بہار ہو — کھٹکے نہ بلبلوں کی طرح دل میں نوک خار
مانند سرو باغ میں آزاد ہم رہیں — لالے کی طرح ہو نہ جگر اپنا داغدار
پروانے کی طرح سے نہ جلنا نصیب ہو — ہونا پڑے نہ شمع کے مانند اشکبار
بھولے سے بھی نہ شکوۂ جور و جفا کریں — جاری رہے زباں پہ فقط شکر کردگار
کچھ اور دُھن بندھی نہ ہو اسکے سوا ہمیں — دل ہم سے باتیں کرتا ہو ہم دلسے بار بار
تاکید ضبط ہو کہ بھرے غم سے دل مگر — آنسو رواں نہوں صفت ابر نو بہار
کچھ ضبط سے بھی کام محبت میں چاہئے — لب پر نہ آہ و نالہ رہے اپنے بار بار
لیکن کہاں نصیب ہمارے کہ ہو نصیب — تنہائی اپنے پاس فقط۔ اور خیال یار

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

ماہ عظیم آبادی

تازہ غزلیں

پنڈت بشن نراین صاحب در المتخلص بہ ابر لکھنوی

حضورِ داورِ محشر گناہگار آئے — ظہورِ عفو و کرم کے امیدوار آئے
جو چاہے جور خزاں ہوں یقین کہ بلبل — بہار آئے، پھر آئے ہزار بار آئے

× × × × × × × × × ×

کریم دیتا ہے گھر بیٹھے یوں فقیروں کو — چمن میں جسطرح دریا سے جوئبار آئے
نہ جانے مر رہی بلبل کس آشیانے میں — ہر اک شجر کے تلے جاکے ہم پکار آئے
ملا جواب نہ اپنے سوال کا اُن کو — درِ کریم پہ جاکر گدا پکار آئے
گدائے حسن کے حق میں یہ حکم صادر ہے — گھر اور دیکھے میرے گھر نہ بار بار آئے
ادب سے کہیو یہ اُس گل سے اے نسیم چمن — حضور دیں جو اجازت تو خاکسار آئے
الٰہی وہ بھی دن آئے کہ ہم سنیں مژدہ — چلو بُلانے کو ڈیوڑھی پہ چوبدار آئے
اُٹھا کے لے گئے تا گور دوش پر احباب — گئے وہ مست یہاں سے جو ہوشیار آئے
اسیر کنج قفس کو چمن سے کیا مطلب — مری بلا سے خزاں آئے یا بہار آئے
نگاہ لطف جو ہے آپ کی رقیبوں پر — اُسی نگاہ کے ہم بھی امیدوار آئے
ہیں جتنے لوگ جہانمیں زبانیں اُتنی ہیں — کسی کی بات کا کیا ہمکو اعتبار آئے
تھے بزم دہر میں ہم آبرش شعلۂ شمع — ہوا کی طرح گئے صورت شرار آئے

سیّد نظیر حسن صاحب نظیر

کسقدر اے زندگی نا آشنا جاتا ہوں میں
کس لئے آیا تھا آخر کیوں چلا جاتا ہوں میں

ساتھیوں کا قافلہ پیچھے ہی اے راہِ عدم
شکل آوازِ جرس آگے بڑھا جاتا ہوں میں

کر رہا ہوں قطع اس تیزی سے راہِ کوے دوست
آپ اپنے ہوش کی صورت اڑا جاتا ہوں میں

نزع میں یہ روح سے رو رو کے ارمانوں نے کہا
وائے قسمت تو تو چل نکلی رہا جاتا ہوں میں

بزمِ عالم میں سراپا جل رہا ہوں مثلِ شمع
سوزِ غم سے اشک بن بن کر بہا جاتا ہوں میں

ہو گئی میری ترقّی کا سبب افتادگی
شکلِ سایہ خاک پر گر گر بڑھا جاتا ہوں میں

جوش پر ہے عشق کا دریا سہارا کچھ نہیں
دست و بازو تھک چلے ہیں ڈوبتا جاتا ہوں میں

شام تک منزل پہ جب پہنچے تو سب ہیں ایکجا
ظاہرا رستے میں لوگوں سے جدا جاتا ہوں میں

جسکو کہتے ہیں ترقی عمر کی وہ ہے کمی
جسقدر بڑھتا ہوں اتنا ہی گھٹا جاتا ہوں میں

میں کسی کا بھی نہ تھا ممنوں کبھی اے ہمرہار
آج سر پر لے کے احسانِ قضا جاتا ہوں میں

سامنے جانے کا عادل کے جو آتا ہی خیال
شرمِ عصیاں کے پسینے میں نہا جاتا ہوں میں

کیا ترا نقصان کیوں درہم ہے اے دربانِ یار
دل بہت بے چین کرتا ہی تو آ جاتا ہوں میں

وہ نفس جو ضعف میں ہی رشکِ تارِ عنکبوت
اُسکی یہ قوت کہ سے کھنچا جاتا ہوں میں

نقش ہے دل پر کہ ہو شہرت جہاں میں اے نظیر
نامور ہونے کی کاوش میں مٹا جاتا ہوں میں

منشی عبد الخالق صاحب خلیق دہلوی

مری نظروں میں سرمہ ہو کے کوہِ طور رہتا ہی
کلیم اللہ ان آنکھوں میں خود وہ نور رہتا ہی

مئے خوش رنگ سے جسوقت تک معمور رہتا ہی
جبھی تک خوشنما ہر ساغرِ بلور رہتا ہی

مرے ہاں جب کبھی ہنگامِ شب دیجور رہتا ہے
تو نورِ روزِ روشن گھر سے پھر کافور رہتا ہی

جوانی میں ہر اک انساں خودی سے دور رہتا ہی
یہ جب تک نور رہتا ہی بہت مغرور رہتا ہی

امید و یاس میں دل کا عجب دستور رہتا ہی
کبھی مسرور رہتا ہی ۔ کبھی رنجور رہتا ہی

ہوس اکسیر کی گر ہو تو پہلے خاک ہو جائے
خودی جب تک نہیں کھوتا خدا سے دور رہتا ہی

تصوّر ہی نہیں جسکا وہ صورت پیش کیا آئے
جو دل سے دور رہتا ہی نظر سے دور رہتا ہی

ملیگا کچھ نہ کچھ ہم بھی گدا ہو نہیں ہیں اُس در کے
کہ جس در پر ہزاروں ہر دم سرِ فغفور رہتا ہی

قدم راہِ فنا میں پھونک کر اے خضر رکھیے گا
کہ اس رہ میں ہر اک کا شیشۂ دل چور رہتا ہی

غضب ہے قیس دیوانے سے اک لیلی تو کیا بلکہ
غبارِ ناقۂ لیلی بھی کوسوں دور رہتا ہی

جو تیری چشمِ میگوں دیکھنے والے ہیں اے ساقی
ہمیشہ بے پئے ہی اُنکا دل مسرور رہتا ہی

نہ آنے کا وہ شکوہ سنکے جھوٹ سچ یوں کہے
پرائے بس میں جو رہتا ہی وہ مجبور رہتا ہی

دمِ گلگشت اے ساقی گلوں کو دیکھتا ہے تو
ہماری تاک میں تو بس فقط انگور رہتا ہی

اُڑاتے ہیں مزہ وہ ہجر کی شب کیا خبر اُنکو
کس آفت میں مصیبت میں کوئی مہجور رہتا ہی

وہاں پیکِ تصوّر بھی پہنچ سکتا نہیں ہرگز
بہت ہی دور ہمسے وہ بتِ مغرور رہتا ہی

قفس میں ایک طوطا ہمنے گویا پال رکھا ہے
کہ دل کے زخم کا ہر دم ہرا انگور رہتا ہی

بھلا حق کہنے والے بھی کہیں خاموش رہتے ہیں
ہر اک سولی پہ دیکھو لب کشا منصور رہتا ہی

چراغِ داغِ الفت دل میں روشن ہی غنیمت ہے
اسی سے اس اندھیرے گھر میں ہر دم نور رہتا ہی

ریا کاری خدا کے گھر میں بھی اے حضرتِ زاہد
زباں پر نامِ حق ۔ دل میں خیالِ حور رہتا ہی

کسی بے کس کا رونے والا جب کوئی نہیں ہوتا
تو گریاں اُسپہ اُسکا دیدۂ ناسور رہتا ہی

خلیقِ خستہ کا احوال کیا دریافت کرتے ہو
وہ تم سے دور رہتا ہے ۔ بہت رنجور رہتا ہے

مولوی محمد مظہر الاسلام صاحب طالب میرٹھی

بہت جلتا ہے یہ میری فغاں سے
سمجھتا ہے مجھے بھی آسماں سے

ہوئے ہیں مجھ سے وہ کچھ بدگماں سے
یہ نوکِ خار نکلے گی زباں سے

مقابل ہونے کو جورِ بتاں سے
کوئی پتھر کا دل لائے کہاں سے

پریشاں کون تھا دردِ نہاں سے
نکل آئے وہ گھبرا کر مکاں سے

ق
ذرا پوچھو تو اتنا سارباں سے ۱
گیا ہے نجد کو شاید یہاں سے

بگولے آہ کے جو اُٹھ رہے ہیں ۲
کسے پالا پڑا ہے آسماں سے

نہ پوچھو تم یہ قرباں ہو گئے کیوں
بہت تنگ آئے تھے عمرِ رواں سے

مری خلوت بھی کیا خلوت ہی واللہ
فرشتے جھانکتے ہیں آسماں سے

حیا کیا ہوتی ہے ہم بھی تو دیکھیں اٹھا دیجیے یہ پردہ درمیاں سے
بڑھاپا چرخ کا تیری جوانی ہمیں کچھ کم نہیں تیر و کماں سے
تعشق سے مبرّا ہیں یہ واعظ انہیں نسبت ہی کیا باغِ جناں سے
خلافِ شانِ گل سوسن خبردار نہ نکلے بیجا کلمہ کچھ زباں سے

وہ خود کہتے ہیں دل دیکھا تھا ہم نے تو چوری کھل گئی طرزِ بیاں سے
کسی فرصت کے وقت آجانا اے موت ابھی مہلت نہیں یادِ بتاں سے
بہت ہی خیر گذری یہ بھی طالب
وہ درگذرے تمہارے امتحاں سے

ایڈیٹوریل

مولوی عزیز مرزا مرحوم افسوس ہے کہ ہندوستان کا ایک اور اہل قلم اور محب قوم شخص دنیا سے گزر گیا! مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے دو تین روز کی علالت کے بعد بعارضہ دردِ گردہ ۲۶ رفروری ۱۹۱۲ء کو دن کے ۱۱ بجے لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔

"مرحوم کا وطن پہاسو ضلع بلند شہر تھا۔ ان کی ولادت ۱۲۸۱ ہجری میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد وزیر بیگ صاحب نواب پہاسو کے ہاں منتظم تھے۔ انہوں نے ابتدا سے آخر تک علی گڑھ کالج میں تعلیم پائی اور ۱۳۰۵ ہجری میں بی اے کی سند حاصل کی زمانۂ تعلیم میں وہ اپنی ذہانت اور حسن تقریر کے سبب تمام طلبائے کالج میں ممتاز خیال کئے جاتے تھے۔ انگریزی زباں دانی اور تاریخ دانی میں انہوں نے انعامات حاصل کئے۔

"سر آسماں جاہ مرحوم کے عہد وزارت میں وہ حیدر آباد دکن میں بلائے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مولوی مشتاق حسین صاحب حیدر آباد کے نظم و نسق پر حاوی تھے۔ انہوں نے مرحوم کو سرکار عالی کے سلسلۂ ملازمت میں داخل کرایا ۱۳۰۶ ہجری میں وہ ہوم سکرٹری کے دوم مددگار مقرر ہوئے۔ ۱۳۱۰ ہجری میں مجلس وضع قوانین کے سکرٹری قرار پائے۔ ۱۳۱۲ھ میں جوڈیشل سکرٹری کے اول مددگار کر دیئے گئے۔ ۱۳۱۳ھ میں کوٹ آف وارڈس کے سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ قابل تعریف امر یہ تھا کہ انہوں نے یتیموں کے مال سے حق الخدمت لینا پسند نہیں کیا۔ ۱۳۱۵ھ میں وہ منصرم معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ کی خدمت پر مامور ہوئے ۱۳۱۹ھ میں وہ چند روز کے لئے تعلقہ داری بیڑ پر روانہ کئے گئے۔ مگر اس سے چار سال بعد ۱۳۲۳ھ میں وہ پھر حیدر آباد بلائے گئے اور رکن عدالت عالیہ کے مقرر ہوئے۔ آخر زمانۂ ملازمت میں وہ ہوم سکرٹری کے عہدہ پر ممتاز تھے۔ مگر ایک غلط سازش کی وجہ سے جس میں ان کے نام سے جھوٹی تحریر بنائی گئی تھی کہ وہ نظام مرحوم کو تخت سے جدا کرنے کے درپے ہیں وہ حیدر آباد سے علیحدہ کئے گئے تاہم قدیم خدمات کے لحاظ سے انکی تنخواہ کی نصف پنشن انکے لئے منظور کی گئی

"زمانۂ ملازمت حیدر آباد میں بڑے بڑے عہدہ داروں نے ان کی لیاقت اور قابلیت کو تسلیم کیا ہے اور انہوں نے ذمہ داری کی بہت سی خدمات کو نہایت عمدگی اور خوبی سے انجام دیا۔ کوئی سرکاری کمیٹی حیدر آباد میں ایسی نہیں تھی جس کے وہ ممبر نہ ہوے ہوں۔ آخر زمانۂ ملازمت میں انہوں نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ حیدر آباد میں مشرقی علوم کی ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ چنانچہ اسکی اسکیم تیار کرنے کے لئے شمس العلما مولانا شبلی حیدر آباد بلائے گئے تھے اسکیم تیار ہو چکی تھی اور سرکار نے بھی اسکو منظور کر لیا تھا۔ مگر افسوس کہ انکی علیحدگی کی وجہ سے یہ عمدہ اور مفید تجویز التوا میں آ گئی۔ اگر موجودہ نظام عالی مقام اس تجویز کو از سر نو زندہ کریں اور مجوزہ یونیورسٹی قائم کرنے کا حکم دیں تو نہایت مناسب ہے اور یہ اُن کے عہد حکومت کی عمدہ یادگار ہوگی۔ ایام ملازمت حیدر آباد میں مرحوم کی سب سے نمایاں خصلت یہ تھی کہ وہ لوگوں کی نفع رسانی میں دل سے کوشش کرتے تھے۔ دوست تو دوست کوئی دشمن بھی اس بات کا شاکی نہ تھا کہ انکی ذات سے کسی کو نقصان پہنچا ہے۔

"حیدر آباد سے واپس آنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں جبکہ "آل انڈیا مسلم لیگ"



کا اجلاس دہلی میں ہو رہا تھا وہ لیگ کے سکرٹری مقرر ہوئے۔ جب لکھنؤ میں لیگ کا دفتر قایم کیا گیا تو اُنہوں نے دفتر مذکور کو خاص طور پر وسعت دی۔ تعلیمی معاملات سے اُن کو خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی اور یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی اور سنڈیکیٹ کمیٹی علی گڑھ کالج کے ممبر تھے۔ ندوہ کے کاموں میں بھی وہ اکثر دلچسپی لیا کرتے تھے۔

"تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آخر دم تک وہ مضمون نگاری اور انشا پردازی میں مشغول رہے۔ بہت سے رسالوں میں اُن کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین کا مجموعہ ایڈیٹر رسالہ زمانہ کانپور کے اہتمام سے آجکل زیر طبع ہے اور اس کے ساتھ مرحوم کی سوانح عمری بھی شامل ہونے والی ہے۔ گلگشت فرنگ جو یورپ کا ایک دلچسپ سفرنامہ ہے اور جس میں نواب مہدی حسن مرحوم کے سفر کے حالات ہیں اُنہیں کا مرتب کیا ہوا ہے۔ سیرت محمود گاواں ایک اور کتاب ہے جسمیں انہوں نے تاریخی تحقیقات کی داد دی ہے۔ آخر میں اُن کے قلم سے "وکرم اروسی" کے نام سے سنسکرت کے ایک دلچسپ ڈراما کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے جسکے دیباچے میں انہوں نے مشرق اور مغرب کی ڈراما نویسی کا مقابلہ کیا ہے۔ اس کتاب سے ان کے پاکیزہ مذاق انشا پردازی کا اندازہ اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ رایل ایشیاٹک سوسائٹی نے ان کو اپنا ممبر بنایا تھا اور اس سبب سے وہ انگلستان کے علمی حلقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کو قدیم سِکّوں کے جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ مرحوم نے نادر سِکّوں کا ایک بڑا ذخیرہ بطور یادگار کے چھوڑا ہے۔ انجمن ترقی اُردو (جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ ہے) کے بھی وہ سکرٹری قرار پائے تھے مگر افسوس کہ انکو کام کرنے کی مہلت نہ ملی۔

"مرحوم کی یہ خصوصیت بھی قابل فخر تھی کہ وہ باوجود اعلیٰ انگریزی داں ہونے کے صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ ایام ملازمت میں جانماز عدالت میں ساتھ جاتی تھی۔ ایک دفعہ وہ کسی دوست کے ساتھ موٹر کار پر سوار جا رہے تھے کہ نماز کا وقت آگیا نماز کے لئے وہ اتنے بیتاب ہوئے کہ موٹر کار سے کودنے کا ارادہ کر دیا۔ خیر یہ ہوئی کہ موٹر کار فوراً ٹھہرا دی گئی اور انہوں نے اتر کر نماز ادا کی۔

"چھ صاحبزادے مرحوم سے یادگار ہیں جن میں سے مسٹر احمد مرزا حال ہی میں بیرسٹری پاس ہو کر ولایت سے آئے ہیں۔ ابو سعید مرزا ابھی ولایت میں ہیں اور عنقریب بیرسٹری کے امتحان سے فارغ ہو کر آنے والے ہیں۔ باقی چار صاحبزادے سجاد مرزا، باقر مرزا، عابد مرزا اور محمد مرزا جو کم سن ہیں ہندوستان ہی میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اگر مرحوم کی دیرینہ خدمات کے لحاظ سے حضور نظام عالیمقام اُن کے صاحبزادوں کے لئے وظائف مقرر فرمائیں تو یہ ایک نہایت مناسب تجویز ہوگی۔ علاوہ ان چھ صاحبزادوں کے ایک صاحبزادی بھی تھیں جنکی شادی ہو چکی تھی مگر افسوس ہے کہ انکا انتقال ہو چکا اور ان سے ایک لڑکی یادگار ہے۔ مرحوم کو نواسی سے خاص محبت تھی اور مرتے دم تک یہ محبت قایم رہی۔

"خداوند عالم سے ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اُن کے پس ماندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔" (مسلم گزٹ)

ہندوستان کی تعلیمی ترقی ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے مختلف صوبہ جات میں جو تعلیمی رفتار رہی ہے، اسکا اندازہ مندرجہ ذیل شمار و اعداد سے ہو سکتا ہے۔ اس سے واضح ہوگا کہ ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں ۴۹۰۰۸۴ لڑکے اور ۷۹۴۶۴۶۴ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں اور انکی تعلیم پر ۱۰۰۰۸۶۸ ، ۷ روپیہ صرف ہوئے جبکہ ۱۹۰۷ء کے اخراجات کی مقدار ۵۵۹۰۴۰۰۰ روپیہ تھی :-

صوبہ	تعداد پرائمری سکول	لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد	اخراجات ۱۹۱۰-۱۱ء روپیہ	اخراجات ۱۹۰۶-۰۷ء روپیہ
مدراس	۲۴۳۲۶	۱۲۱۵۷۲۵	۱۲۷۶۸۰۰۰	۹۷۶۴۰۰۰
بمبئی	۱۲۳۸۸	۸۶۸۵۳۵	۱۲۴۰۰۰۰۰	۱۰۶۴۳۰۰۰
بنگال خاص	۳۵۴۳۷	۱۵۱۸۲۳۹	۱۶۰۷۱۰۰۰	۱۱۶۷۳۰۰۰
مشرقی بنگال و آسام	۱۷۲۹۲	۹۴۴۲۱۳	۷۳۰۵۰۰۰	۵۱۲۴۰۰۰
اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ	۹۰۶۷	۶۴۵۷۸۷	۹۳۳۹۰۰۰	۷۴۹۰۰۰
پنجاب	۳۳۲۱	۲۴۶۹۴۰	۹۰۵۷۰۰۰	۵۱۹۷۰۰۰
برہما	۴۸۹۵	۴۲۹۹۹۲	۴۳۶۳۰۰۰	۳۴۸۷۰۰۰
صوبہ متوسطہ و برار	۳۰۹۴	۲۹۷۶۲۰	۳۰۸۵۰۰۰	۲۲۴۸۰۰۰
سرحدی صوبہ	۲۶۴	۳۱۸۹۱	۳۸۸۰۰۰	۲۳۸۰۰۰

اس نقشے پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ صوبہ بنگال کیا بلحاظ تعداد طلبا اور کیا بلحاظ اسکولوں کی تعداد کے سب سے بڑھکر ہے۔ گورنمنٹ بنگال نے تعلیم کے لئے خرچ بھی باقی سب گورنمنٹوں سے زیادہ کیا ہے۔ سرحدی صوبہ تعلیم میں سب سے پیچھے ہے لیکن بلحاظ رقبہ کے صوبجات متحدہ تعلیمی حالت میں سب سے پیچھے ہیں۔ افسوس!

افتتاح میڈیکل کالج، لکھنو | یہ فخر صرف صوبجات متحدہ ہی کو حاصل ہے کہ اس نے سب سے پیشتر اعلیٰ حضرت ملک معظم و حضور ملکہ معظمہ کے ورود مسعود کی ایسی یادگار قایم کی، جو واقعی شاہی شان کے شایاں ہے۔ میڈیکل کالج لکھنو جسکی رسم افتتاح ۲۶ جنوری ۱۹۱۲ء کو سرجان ہیوٹ صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر نے ادا فرمائی، نہ صرف بہترین میڈیکل کالج ہے بلکہ اسکا پلہ بعض یورپ کے درجہ اوّل کے کالجوں کے برابر ہے۔ اس سے سب فرقوں اور مذاہب کے لوگوں کو یکساں فائدہ پہنچے گا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کالج کے قائم کرنے کی تحریک حکامی ذرائع یا حکامی اثر سے نہیں ہوئی تھی بلکہ رعایا اور عام پبلک کی دلی خواہش اسکا باعث ہوئی تھی۔ اسکی عمارت کی خوبصورتی کی جسقدر تعریف کی جائے وہ کم ہے اندرونی حصہ عمارت بھی نہایت عمدہ ہے اور جملہ ضروریات کا انتظام جدید آلات سے کیا گیا ہے۔ ہز آنر نے جو تقریر ایڈرس کے جواب میں فرمائی اس کا مندرجہ ذیل حصہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ "اس کالج کے قائم کرنیوالوں کا سب سے بڑا ارمان یہ ہے کہ وہ گریجویٹ جو اس سے تعلیم پاکر باہر جائیں اور اسی پیشہ کو اختیار کریں وہ ہمیشہ اپنی کوششوں میں صرف روپیہ یا نام پیدا کرنے کی خواہش کے خیال سے نہ مصروف ہوں بلکہ انکا اصول انسانی ہمدردی اور مصیبت زدوں کے آرام و آسایش کے خیال پر مبنی ہونا چاہیئے"

ہم امید کرتے ہیں کہ اس کالج کے طلبا اس اعلیٰ اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھیں گے۔ یقین ہے کہ یہ کالج ان صوبجات کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

آل انڈیا اُردو کانفرنس | حال میں آل انڈیا اُردو کانفرنس کی رُوداد بابت سال ۱۹۱۱ء شائع ہوئی ہے۔ اس دو سال کے عرصہ میں کانفرنس نے کیا کیا؟ افسوس ہے کہ رُوداد سے اسکا صاف جواب نہیں ملتا۔ کانفرنس کے دو اجلاس بھی ہوے جن میں کافی سے زیادہ ریزولیوشن پاس ہوئے۔ لیکن اگر یہ دریافت کیا جائے کہ بانیان کانفرنس نے ان ریزولیوشنوں کے متعلق کس قدر عملی کام کیا تو اس کا جواب "خاموشی" سے ملے گا۔ یہ درست ہے کہ ابھی کانفرنس کی ابتدائی حالت ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر کب تک یہ عذر پیش ہوتا رہے گا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ امسال کانفرنس ضرور کچھ کام کر کے دکھائیگی۔ دو سال میں کانفرنس کی آمدنی للعہ ہوئی اور خرچ سالنہ۔ اسوقت کانفرنس کے ہاتھ میں صرف للعہ ہیں۔ بہی خواہان زبان اُردو کو اسطرف متوجہ ہونا چاہیئے کیونکہ یہ بھی درست ہے کہ جب تک کانفرنس کے ہاتھ میں کافی سرمایہ نہو گا اُسوقت تک کانفرنس کوئی خاص کام نہ کرسکے گی۔ جو لوگ زبان کی ترقی چاہتے ہیں اُنکو کانفرنس کی ممبری ضرور اختیار کرنی چاہیئے۔ عہ سالانہ فیس ممبری معمولی رقم ہے، مگر اسی سے کانفرنس کے بہت سے کام نکل سکیں گے۔ صلاے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

تصریح تصاویر

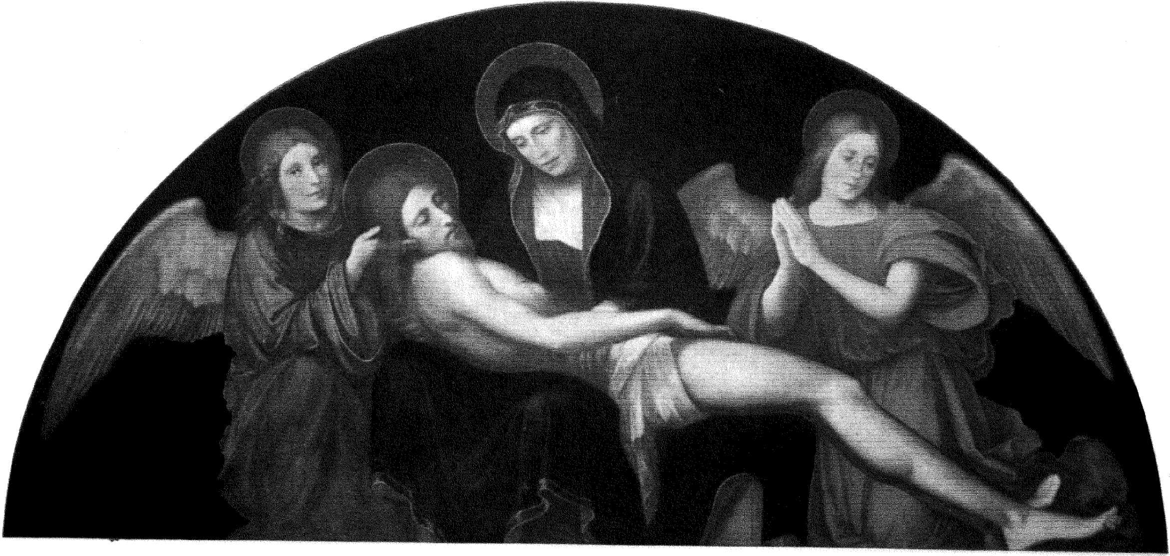
(۱) اس ماہ کی رنگین تصویر جو انڈین پریس کے ایک مصوّر کی صناعی کا نمونہ ہے، بالمیکی رامائن سے تعلق رکھتی ہے۔ رامچندرجی، سیتاجی، اور لکشمن جی پنچوٹی پر مقیم ہیں۔ کُٹی کے سامنے مرگ چھالے پر رامچندرجی براجمان ہیں، او پاس ہی سیتاجی بیٹھی ہیں۔ لکشمن جی نیچے بیٹھے ہیں۔ اس موقعہ پر راون کا بھیجا ہوا "مایا مرگ" پنچوٹی میں آیا جسکو دیکھتے ہی سیتاجی کا دل موہت (فریفتہ) ہوگیا۔ اور وہ رامچندرجی سے "مایا مرگ" کی طرف انگلی سے اشارہ کرکے، کہنے لگیں:-

सुनहु देव रघुवीर कृपाला, बाहि मृग कर अति सुन्दर छाला
सत्यसन्ध प्रभु वध कर एही, आनहु चर्म कहत बैदेही ॥

اس تصویر میں یہی منظر دکھایا گیا ہے۔

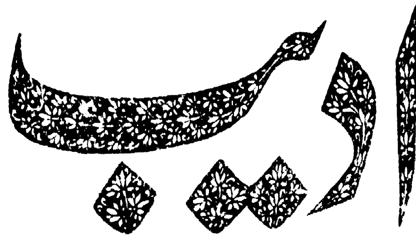
(۲) سید بندہ کاظم صاحب جاوید مولوی محمد جعفر صاحب اوج لکھنوی کے فرزند رشید ہیں ان کے والد ماجد لکھنو کے مشاہیر اساتذہ میں سے تھے، اور خاندان اجتہاد کے ایک رکن تھے جاوید صاحب بھی غزل گوئی اور مرثیہ گوئی میں نہایت امتیازی درجہ رکھتے ہیں اور لکھنو کے مشہور شعرا میں ہیں۔

(۳) لالہ ہنسراج بی اے جو پچیس برس تک دیانند اینگلو ویدک کالج لاہور کے آنریری پرنسپل



حضرت مسیح کی لاش

انڈین پریس الہ آباد



مایا یعنی تعینات

کسی چیز کے وجود یا عدم وجود کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ تینوں زمانوں ماضی، حال، مستقبل میں موجود یا معدوم ہے اور اسی کو اصطلاح میں موجود محض یا معدوم محض کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اسی کو ست (सत्) و است (असत्) کہتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کے بیچ میں ایک درمیانی حالت اور ہے یعنی کوئی چیز ایک وقت میں وجود رکھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے وقت معدوم۔ مثلاً کسی بازی گر نے ایک آم کا درخت اور آم کے پھل لگا کر ہمیں دکھائے مگر تھوڑی دیر کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں نہ آم کا درخت ہے اور نہ آم ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک چیز ہم کو ایک وقت میں وجود رکھتی ہوئی معلوم ہوئی اور دوسرے وقت میں وہی چیز ہم کو معدوم نظر آئی۔ یہ جو دھوکہ ہوا اُس کی کوئی اصلیت نہ تھی اور جو چیز اُس دھوکے سے پیدا کی گئی اس کی بھی واقعی کوئی ہستی نہ تھی مگر ہم کو وہ ضرور محسوس ہوئی اور اس لئے چاہے صرف ایک دو منٹ کے لئے کیوں نہ ہو ایک معنی میں اُسکی ہستی ضرور تھی۔ جس کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کی کوئی حقیقی ہستی ہے اور جسکی نسبت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اُسکی حقیقی ہستی نہیں ہے یعنی جو موجود محض بھی نہیں ہے اور معدوم محض بھی نہیں ہے۔ اسی کو زبان سنسکرت میں متھیا (मिथ्या) یعنی جھوٹا کہتے ہیں۔ مگر یہ ضرور واضح رہے کہ دھوکہ کسی شے میں جسکی کوئی حقیقی ہستی ہے ہوتا ہے کسی غیر موجود شے میں کبھی کوئی دھوکہ نہیں ہو سکتا ہے۔ رسّی میں ہی سانپ کا دھوکہ ہو سکتا ہے۔ بغیر رسّی کے موجود ہونے کے سانپ کا دھوکہ نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہی کہ کوئی حقیقی وجود رکھنے والی چیز ہوگی جسمیں

مغالطہ پیدا کر کے اُس بازی گر نے آم کا درخت ہمیں دکھایا تھا۔ اس دھوکہ کا نام سنسکرت میں مایا (माया) ہے اور جس اصلی چیز میں دھوکہ پیدا کر کے آم کا درخت نمود کیا گیا اسکو اُس مایا کا ادھشٹھان (अधिष्ठान) یعنی بود کہتے ہیں۔ یہ لفظ مایا کارن کاریہ یعنی علت و معلول دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یعنی خود دھوکہ اور دھوکے کے نتائج کے لئے۔ جس طرح کہ ایک بازی گر اپنے شعبدے سے کسی ایک شے کو جس کی اصلیت ہے ایک آم کا درخت جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے بنا کر دکھاتا ہے اُسی طرح ایک بہت بڑا بازی گر اپنے شعبدے سے اس نمود عالم کو جسکی فی الواقع کوئی ہستی نہیں ہے خود اپنے میں جس کی ہی ایک حقیقی ہستی ہے دکھا رہا ہے یا یوں کہو کہ اُس کے شعبدے یعنی مایا کے اثر سے ہم سب ایسے محو ہو رہے ہیں کہ ہم نے اصل حقیقت کو نہ پہچان کر کہ فی الواقع ایک ہی ذات مطلق ہے جس کی کوئی حقیقی ہستی ہے اپنے کو اور نیز عالم کو اُس سے الگ سمجھ لیا ہے اور نیز یہ کہ ہماری و نیز اس عالم کی کوئی جداگانہ حقیقی ہستی ہے۔ اسی کو سنسکرت میں وِورت واد (विवर्तवाद) کہتے ہیں یعنی کوئی چیز ہے تو کچھ اور سمجھ کچھ لی جاتی ہے اور جس سے ایسا نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کا نام ویدانت کی اصطلاح میں مایا ہے۔ ویدانت کے متعلق جو یہ عام خیال ہے کہ وہ سب کو خدا کہتا ہے مثلاً مٹی بھی خدا ہے اور پتھر بھی خدا ہے آدمی بھی خدا ہے اور جانور بھی خدا ہی بالکل صحیح نہیں ہے۔ اس سے پہلے کے مضمون میں ذکر کیا گیا ہے کہ تین طرح کے خیالات ہیں۔ ایک صرف فنومنا (Phenomena) یعنی نمود کے قائل ہیں ایک فنومنا اور نومنا (Noumena) یعنی نمود و بود دونوں کے یعنی جیسے فنومنا بہت ہیں ویسے ہی نومنا بھی بہت ہیں یا یوں کہو کہ ہر شے کی بود الگ الگ ہے اور ایک اور صرف ایک ہی نومنن (Noumenon) کے قائل ہیں جو تمام فنومنا کی ایک ہی بود ہے جب کہ دو پہلے خیالوں میں ان فنومنا کی اصلی حقیقت مانی گئی ہے اس تیسرے خیال میں صرف ایک نومنن کی اصل حقیقت ہے اور فنومنا ظاہری ہیں۔ ادویت ویدانت تیسرے خیال کا حامی ہے۔ اس خیال میں نومنن یعنی سب چیزوں کی بود ایک ہی ہے جو بود ایک ہی ذات مطلق ہے اس عقیدہ کو غلطی سے پنتھی ازم (Pantheism) یعنی ہمہ اوست کہا جاتا ہے۔ جرمنی کے حال کے فلاسفروں میں ہیگل (Hegel) کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا ہی خود بخود تغیر پذیر ہو کر عالم بن گیا ہے یعنی خدا علت العلل ہے اور عالم معلول۔ نہ اسطرح کہ علت اپنے معلول سے علیحدہ ہے بلکہ اسطرح کہ علت ہی معلول ہو جاتی ہے جیسے مٹی جو گھڑے کی علت ہے گھڑا بن جاتی ہے اور اس تغیر کا انتہائی درجہ انسان ہے جس شکل میں وہ اپنے کمال کو پہونچ جاتا ہے۔ یہ عقیدہ البتہ داخل پنتھی ازم (Pantheism) ہے مگر اس کی نسبت سب سے بڑا اعتراض جو عاید ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب خدا ہی متغیر ہو کر عالم بن جاتا ہے تو عالم میں جو کچھ خوبیاں اور نقائص ہیں وہ سب ضرور خدا ہی میں بالقوی موجود ہوں گے اور چونکہ وہ ناقص سے کامل ہوتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ کامل نہ رہا جیسا کہ تمامی مذاہب میں وہ مانا گیا ہے۔ ویدانت میں بھی ذات خدا یا ذات مطلق تمام صفات نیک و بد دونوں سے بالکل مبرا و پاک ہے اور وہ ہمیشہ ہی کامل ہے اُس میں کوئی نقص نہیں۔ اور اگر خدا کو دنیا کی فاعلی علت مانیں اور پھر اس کو تمام نیک

صفات کا مجموعہ بھی سمجھیں مثلاً اُس کو رحیم وکریم مانیں اور ساتھ ہی اس کو قادر مطلق بھی مانیں تو اُس کی نسبت یہ بڑا اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اسنے ایسی دنیا کو کیوں پیدا کیا جس میں مصائب ہی زیادہ پائے جاتے ہیں۔ تاکہ یہ اعتراضات خدا کی نسبت پیدا نہ ہوں مایا کی تھیوری (Theory) ویدانت میں مانی گئی ہے کیونکہ اس مایا سے ہی یہ عالم جس میں نیکی و بدی دونوں ہیں ذاتِ مطلق میں محسوس ہو رہا ہے ورنہ اسکی کوئی حقیقی ہستی نہیں۔ ذات مطلق میں نہ نیکی کا کوئی خیال ہو سکتا ہے اور نہ بدی کا اور نہ یہ اُس سے پیدا ہوتی ہیں اور اس لئے ضرور ہے کہ یہ بہ نتیجہ اگیان کے ہے کہ ہم نے کچھ کا کچھ سمجھ لیا ہے اور جہاں نیکی نہیں وہاں نیکی اور جہاں بدی نہیں وہاں بدی سمجھ لی ہے۔ اگرچہ نیکی و بدی کوئی دو علیحدہ علیحدہ شے نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ہیں اور فرق ہے تو صرف درجہ کا اور نہ کہ نوعیت کا اور یہ جو علیحدہ علیحدہ حالات میں علیحدہ علیحدہ محسوس ہوتی ہیں یہ محض بہ نتیجہ اگیان ہے۔

پرمارتھ (परमार्थ) سے یعنی از روے حقیقت حقیقی ہستی صرف ذات مطلق کی ہے اور کسی چیز کی حقیقی ہستی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ قبل از گیان جو یہ پرپنچ (प्रपंच) یعنی عالم شہادت ہمکو محسوس ہوتا ہے اس کی کوئی حقیقی ہستی نہیں ہے پھر اس عالم کی رچنا کیا ہے اور کیسے ہوئی ذات مطلق اسنگ (असंग) ہے اکریہ (अकाय) ہے نروکاری (निर्विकारी) ہے اور دیش کال (देशकाल) نمت (निमित्त) کے خیال سے بالکل پاک یعنی غیر حادث ہے اور فاعلیت اور مکان و زمان وعلل ومعلول کا خیال اُس میں نہیں ہے کیونکہ اگر ذات مطلق میں دیش کال نمت مانا جائے تو وہ بھی وکاری (विकारी) یعنی حادث ہو جائے گا۔ پس ایک ایسی ذات سے جو دیش کال نمت کے خیال سے بالکل پاک ہے ایک حقیقی وجود رکھنے والے عالم کی پیدائش جو حادث ہو اور جس کے پیدا کرنے میں دیش کال نمت تینوں کی ضرورت ہو مانی نہیں جا سکتی۔ جب خواب میں باپ سے بیٹے کا ایک تھوڑے سے عرصہ میں مثلاً ایک گھنٹہ کے اندر پیدا ہونا اور شاید انکا مر بھی جانا پرتیت یعنی محسوس ہوتا ہے تو اس میں کچھ عرصہ تو لگتا ہے یا بازی گر کو بھی آم کا درخت بنانے میں کچھ وقت لگتا ہے لیکن ذات مطلق میں دیش کال نمت کا جیسا کہ اوپر بیان ہوا نام و نشان نہیں اور پھر یہ پرپنچ (प्रपंच) کی رچنا ہوئی ہے۔ جو چیز بغیر دیش کال نمت کے سامان کے پیدا کی جاتی ہے اس کو مثل بازی گر کے آم کے درخت کے یا مثل خواب کی چیزوں کے متھیا (मिथ्या) یعنی جھوٹا کہتے ہیں اور اس لئے اس عالم شہادت کو بھی اس معنی میں جھوٹا کہا گیا ہے کیونکہ اسکی بھی رچنا بغیر دیش کال نمت کے ہوئی ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح خواب میں جھوٹے باپ سے بیٹے کے پیدا ہونے اور اس کے مرنے میں کئی برسیں گزرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اگرچہ فی الواقع ایک ہی گھنٹہ گزرا ہے اسی طرح اگرچہ ذات مطلق میں زمانہ کا خیال مطلق نہیں ہو تاہم بے شمار کلپوں کے اس جھوٹے پرپنچ کی رچنا گویا ہو جاتی ہو اور جسطرح خواب کی حالت میں جھوٹے دیش کال نمت پرتیت ہوتے ہیں اسیطرح باوجود اس کے کہ ذات مطلق میں دیش کال نمت کا خیال بالکل نہیں ہو جھوٹے دیش کال نمت کے ساتھ یہ پرپنچ یعنی عالم محسوس ہوتا ہو۔ دیش کال نمت کی کوئی حقیقی ہستی نہیں مانی جا سکتی کہ حقیقی ہستی

صرف اُسی چیز کی سمجھی جاتی ہے جو موجود بالذات ہو غیر متغیر ہو اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہو یہ حقیقت صرف ذات مطلق کی ہے۔ زمانہ یعنی وقت کا تعلق خیالات یا واقعات سے ہے دو خیالات یا دو واقعات کے درمیانی وقفہ کو وقت کہتے ہیں۔ بغیر خیالات کے تغیر کے وقت کا خیال نہیں ہو سکتا جب کبھی کوئی شخص ایک ہی خیال میں مستغرق رہتا ہے تو اس کو وقت بالکل نہیں معلوم ہوتا گویا کئی گھنٹے ایک منٹ کے برابر گزرے اور جب کسی شخص کا دل منتشر ہے اور وہ منٹ منٹ پر خیالات کو بدل رہا ہے تو اس وقت اس کو ایک ایک منٹ ایک ایک گھنٹہ کے برابر معلوم ہوتا ہے۔ شب وصل یا شب ہجر کی جو بندشیں شعرا باندھتے ہیں اُنہیں سے اس کا قیاس خوب کیا جا سکتا ہے۔ غرضکہ وقت کا تعلق خیالات سے ہے۔ اسی طرح دیش یعنی مکان کا خیال دو شے کے درمیانی فاصلہ پر سے ہوتا ہے جب کبھی مکان کا خیال کیا جائے گا تو ضرور ہے کہ کوئی دو شے لی جائیں جنکے درمیانی فاصلہ کو خیال میں لایا جائے۔ نمت (निमित्त) یعنی علل و معلول کا خیال بھی دو شے کے باہمی تعلقات پر منحصر ہے اگر ایک علت ہے تو دوسری معلول۔ غرض ان تینوں خیالات میں سے کوئی خیال ایسا نہیں ہے جسکا خیال بغیر تعلق دیگر خیالات یا اشیا کے پیدا ہو یعنی یہ موجود بالذات نہیں ہیں اور اس لئے انکی کوئی حقیقی ہستی نہیں کہی جا سکتی لیکن چونکہ ہمکو انکی ہستی محسوس ہوتی ہے اس لئے ہم ان کو غیر موجود بھی نہیں کہہ سکتے پس یہ متھیا (मिथ्या) یعنی جھوٹے ہیں۔ اب ایک سمندر کی مثال لیجئے۔ اس سمندر میں لہریں اُٹھ رہی ہیں ہر لہر سمندر ہی ہے لیکن لہر کی شکل میں آکر وہ سمندر سے جُدا معلوم ہوتی ہے۔ لہر اسکا نام ہے اور اسکی ایک خاص شکل ہے۔ اور ان دونوں نے یہ فرق پیدا کر دیا ہے۔ لیکن کیا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ لہر سمندر سے فی الحقیقت جدا ہے۔ ہرگز نہیں۔ جب لہر کا خیال آئے گا تو سمندر کا خیال بھی ساتھ ہی ساتھ آئے گا۔ جب لہر غائب ہو جاتی ہے تو جو شکل نظر آتی تھی صرف وہ غائب ہو جاتی ہے لیکن وہ لہر تھی ضرور اور اُس کی ایک شکل نظر آتی تھی۔ جب ایک وقت میں ایک شے محسوس ہوتی ہے اور دوسرے وقت میں نہیں تو اُس کو مایا کہتے ہیں۔ ذات مطلق تو سمندر ہے اور ہم سب اور یہ کل عالم یہ لہریں ہیں اور فرق جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف اُن اشکال کی وجہ سے ہے جو ان لہروں نے اختیار کئے ہیں۔ اگر یہ اشکال مٹ گئے تو پھر لہریں باقی نہ رہیں اور پھر جیسا کا تیسا وہ سمندر سمندر ہی ہے۔ اسی طرح جب اگیان کے مٹ جانے سے جیو نام مٹ گیا تو پھر وہ ذات مطلق ہی ہے جو وہ در اصل ہے۔

چونکہ یہ عالم قبل از گیان ہمیں برابر محسوس ہوتا ہے اس لئے اس کی ہستی کو ہمیں ماننا پڑے گا اور اس لئے ہم اس کو معدوم محض نہیں کہہ سکتے۔ یہ جو عام خیال ہے کہ ویدانت میں عالم معدوم مانا گیا ہے بالکل غلط ہے مگر اس کو جھوٹا اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ حالت اگیان میں یہ محسوس ہوتا ہے اور حالت گیان میں نہیں اور جس چیز کی ہستی ایک وقت میں تو معلوم ہو اور دوسرے وقت میں نہیں اُس کو جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں ذکر کیا گیا ہے جھوٹا کہتے ہیں۔ مگر صحیح معنی میں عالم کی یہ جھوٹی پیدائش بھی نہیں ہے بلکہ ذات مطلق میں یہ محض ایک آروپن (आरोपण) ہے جو اودیا (अविद्या) نے کھڑا کر دیا ہے۔ لفظ آروپن کے معنی



لارڈ طامس گبسن کارمائکل بارٹ۔ جی، سی، آئی، ای۔ کے، سی، ایم، جی۔ اول گورنر صوبۂ بنگال

انڈین پریس الہ آباد

کسی ایک چیز میں کسی ایسی دوسری چیز کا وہم یا بھرم ہو جاتا ہے جو وہ فی الواقع نہیں ہے جیسے رسّی میں سانپ یا ڈنڈے وغیرہ کا وہم ہو جانا۔ اس آروین کی کوئی ابتدا نہیں کہی جا سکتی اسکو ازلی ہی ماننا پڑے گا لیکن جس کو اصل چیز کا گیان ہوگیا ہے اور جس نے اس آروین کو جھوٹا سمجھ لیا ہے اُس کے لئے اس کی انتہا ہے۔ عالم کی ہستی کے متعلق جو یہ تین خیالات ہیں کہ یا تو یہ عالم کسی بیرونی علت فاعلی کا نتیجہ ہے یا خود موجود ہے یا خود پیدا شدہ ہے ان تینوں خیالات کی پوری پوری تردید ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) نے قوی دلایل سے کی ہے۔ پس اس معنی میں بھی عالم کو جھوٹا ہی سمجھنا چاہیئے۔

غرض کہ مایا وادیوں (**मायावादियों**) کی یہ عجیب وغریب تلقین ہے جس کو سنکر بعض لوگ حیرت و استعجاب میں پڑکر یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ کیا ہڈی مانس و چمڑے کا یہ جیتا جاگتا پتلا جھوٹا ہے۔ یہ سنگ و خشت و چونے کی دیوار صرف بھرم اور وہم ہی ہے۔ شاید ان میں سے کوئی احمق اس امر کا امتحان کرنے کے لئے بھی کہ کیا یہ اینٹ و چونے کی دیوار واقعی جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے دھوکے کی ٹٹّی ہے اپنے سر کو اُس سے ٹکراتا ہے اور جب اس کو چوٹ لگتی ہے تو چوٹ کو محسوس کرکے یہ کہتا ہے کہ یہ دیوار سچّی ہے جھوٹی نہیں یا وہ اپنے جسم میں ایک کانٹا یہ دیکھنے کے لئے چبھاتا ہے کہ اگر جسم کی واقعی کوئی ہستی نہوگی تو اس میں کانٹے کے چُبھنے سے درد محسوس نہو گا اور جب درد محسوس ہوتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ نہیں یہ جسم بھی سچّا ہے۔ غرض کہ اُس نے اپنے کو تو سچّا اور اپنے جسم اور دیوار اور کانٹے کو جھوٹا سمجھکر امتحان کرنا چاہا تھا اور اس بات کو بھول گیا تھا کہ وہ خود بھی اور وہ دیوار اور وہ کانٹا سب جھوٹے ہیں اور جو چوٹ یا درد محسوس ہوا وہ بھی جھوٹا ہے۔ اب ایک مثال لیجئے کسی کو خواب میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ ایک جہاز پر سوار ہے اور وہ جہاز تلاطم میں پڑکر قریب ہے کہ پاش پاش ہو جائے۔ دریا میں ڈوب جانے کا جو خوف اس کو ہوتا ہے اُس سے وہ تھرتھرانے لگتا ہے اور یہ خوف برابر طاری رہتا ہے جب تک کہ وہ نہ جاگے۔ ظاہر ہے کہ اس خواب میں وہ جہاز دریا و تلاطم و نیز اپنے کو جو جہاز پر بیٹھا ہے سچّا سمجھ رہا ہے اگرچہ وہ سب جھوٹے ہیں اور جو خوف اس کو ڈوبنے کا ہو رہا ہے اس کو بھی وہ سچّا سمجھ رہا ہے اور اس کو وہ برابر سچّا ہی سمجھتا رہے گا اور تھرتھراتا رہے گا جب تک کہ وہ نہ جاگے۔ اسی طرح یہ عالم بھی بطور ایک خواب کے ہے جس طرح حالت خواب میں تم خواب کی چیزوں کو سچّی سمجھتے ہو اور ان سے ڈرتے یا خوش ہوتے رہتے ہو جب تک کہ تم نہ جاگو اسی طرح جب تک کہ عالم کے اس بڑے خواب سے تم نہ جاگوگے یعنی یہ کہ جب تک معرفتِ حق تمکو نہ ہوگی تب تک تم اس عالم کی تمام چیزوں کو سچّا ہی سمجھوگے اور یہ چیزیں تمہارے لئے اور ہر کسی کے لئے جسکو معرفتِ حق نہیں ہوئی ہے سچی ہی ہیں جھوٹی نہیں۔ چونکہ یہ عالم بے بنیاد نہیں ہے بلکہ اسکی بود ایک حقیقی ہستی ہے جسمیں وہ محسوس ہو رہا ہے اس لئے ویدانت میں عالم کی ہستی سے قطعاً انکار نہیں ہے اور اس کا انکار ہے تو صرف حالت گیان میں جب کہ اُس حقیقی ہستی کا علم ہو جاتا ہے۔

مایا کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسکی کوئی ابتدا ہے کیونکہ اگر اسکی ابتدا مانی جائے تو اس کا کسی سے پیدا ہونا

لازم آئے گا عالم سے اس کی پیدایش اس لئے مانی نہیں جا سکتی کہ خود عالم اسی مایا کا نتیجہ ہے اور جیو اور ایشور سے بھی اس کی پیدایش اس لئے نہیں ہو سکتی کہ جیو اور ایشور کا یہ امتیاز صرف اسی مایا کے کارن ہے ورنہ دونوں ایک ہی ہیں - رہا شدّہ برہمہ (शुद्ध ब्रह्म) یا چیتن اس سے اگر اسکی پیدایش مانی جائے تو ظاہر ہے کہ جب مایا حادث ہے تو کوئی حادث شے ایک غیر حادث شے سے پیدا نہیں ہو سکتی ورنہ وہ بھی حادث ہی ہو گا - پھر شدّہ برہمہ کی تعریف یہ ہو کہ وہ اکریہ (अक्रय) ہے یعنی فاعلیت کے خیال سے بالکل پاک ہے اس لئے کسی شے کا اُس سے پیدا ہونا ممکن نہیں ہے - اس پر سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ مایا کو ازلی ماننے سے وحدت الوجود کے خیال میں فرق آتا ہے کیونکہ اوّل تو مایا گو ازلی ہو مگر ابدی اس لئے نہیں کہ گیان یعنی عرفان سے وہ کالعدم ہو جاتی ہے دوم اسکا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے یعنی یہ کہ تینوں زمانوں ماضی حال مستقبل میں اس کی ہستی قائم نہیں رہتی ہے - پرلے (प्रलय) یعنی قیامت میں جب تمام اشیا جو اس مایا کے نتائج ہیں اس مایا میں لے (लय) یعنی فنا ہو جاتے ہیں تب اس کا نام پردھان ہے اور جب یہ اشیا مایا سے نکل کر پھر ظاہر ہوتے ہیں یعنی پھر جب سرشٹی ہوتی ہے تب اس کا نام پرکرتی (प्रकृति) ہے - جیسے مکان و زمان و علت و معلول کے سامان کے بغیر کسی شے کی پیدایش کو جو بات ناممکن ہے شعبدہ کہتے ہیں اسی طرح وہ جو شدھ برہمہ ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں اور جس میں کسی خواہش وغیرہ کا ہونا امکان سے خارج ہے اس میں دنیا وغیرہ کے پیدا کرنے کی خواہش کو پیدا کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اس لئے اس کا نام مایا ہے اور اصل سُروپ کو پہچاننے میں حائل ہوتی ہے اس لئے اس کا نام اگیان ہے اور چونکہ برہمہ ودیا سے اس کا ناش ہوتا ہے اس لئے اس کا نام اودیا ہے اور چونکہ سوتنتر (स्वतंत्र) یعنی خود مختار نہیں ہے بلکہ چیتن (चेतन) کے آشرت یعنی تابع ہے اس لئے اس کا نام شکتی (शक्ति) ہے غرض کہ یہ مختلف نام ایک ہی چیز کے ہیں -

مگر حقیقت امر یہ ہے کہ مایا کی تعریف وہ شخص کیا کر سکتا ہے جو خود ہی مایا کے اندر ہے یعنی مقید ہے اور مطلق کیا ہے اس سے واقف نہیں - خود سری شنکر اچارج کا یہ کہنا ہے کہ مایا (माया) یا اگیان کیا ہے اور کیوں ہے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اگیان موجود ہے اور ویدانت کا مقصد یہی ہے کہ وہ ودیا (विद्या) یعنی عرفان سے مٹایا جائے تاکہ یہ ثابت ہو کہ فی الحقیقت اگیان کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے کیونکہ جس کو ہم حقیقت رکھنے والی شے کہیں گے وہ کبھی نہیں مٹ سکتی - جس طرح مایا کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا اسی طرح خود ذات مطلق کی بھی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی ہے - شرتی میں جو کچھ تعریف ذات مطلق کی کی گئی ہے وہ صرف یہی ہے کہ نیتی نیتی (नेतिनेति) یعنی یہ نہیں یہ نہیں - غرض کہ صرف انوبھو گیان (अनुभव ज्ञान) سے یعنی علم الیقین سے ہی یہ جانا جا سکتا ہے کہ ذاتِ مطلق کیا ہے مایا کیا ہے اور جس کو ایسا گیان ہوا ہے وہ اس کو زبان پر نہیں لا سکتا یا الفاظ میں نہیں ظاہر کر سکتا ہے - جب حالت صم و بکم کی ہی ہے تو پھر ذاتِ مطلق یا مایا کی نسبت کچھ لکھنا محض بکواس ہی نہیں تو پھر کیا ہے -

البتہ عام فہم الفاظ میں جو تعریف مایا کی کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے۔ جس کی ایک حالت نہ ہو بلکہ کبھی کچھ اور کبھی کچھ یا جس میں متضاد باتیں پائی جائیں اور جس میں ہمیشہ تغیر ہوتا رہتا ہو اُسی کا نام مایا ہے۔ مثلاً ہربرٹ اسپنسر نے اپنی کتاب فرسٹ پرنسپلس (FIRST PRINCIPLES) میں جہاں اَن نوایبل (Unknowable) کا ذکر کیا ہے وہاں یہ لکھا ہے کہ فرض کرلو کہ ایک شخص ایک جہاز پر جو مشرق سے مغرب کو جا رہا ہے جنوب سے شمال کی طرف کو چل رہا ہے۔ یہ شخص اپنی اصل حرکت سے جنوب سے شمال کو ہی جا رہا ہے مگر جہاز کی حرکت سے وہ مشرق سے مغرب کو جا رہا ہے اور زمین کی حرکت سے وہ مغرب سے مشرق کی طرف کو رواں ہے۔ مطلق معنی میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس شخص کی حرکت فی الحقیقت کس جانب ہے۔ بہ لحاظ جہاز اُس کی حرکت جانب شمال ہے بہ لحاظ آس پاس کی خلا کے اُس کی حرکت جانب مغرب ہے اور بہ لحاظ خلاے سماوی اُسکی حرکت جانب مشرق ہے۔ اسیطرح جب کسی دو بادشاہوں میں جنگ ہوتی ہے اور ایک کو فتح اور دوسرے کو شکست تو جسکی فتح ہوتی ہے اسکے یہاں شادیانے بجتے ہیں اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کیسی اچھی ہے۔ کیسی خوشی کی جگہ ہے۔ مگر جس کو شکست نصیب ہوتی ہے بلکہ جو قید بھی ہو جاتا ہے وہ دنیا کو مصائب و آلام کی جگہ سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا کیسی مصیبت کی جگہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگ کا واقعہ ایک ہی ہے مگر یہ واقعہ ایک کے لئے کامیابی کا باعث اور دوسرے کے لئے مایوسی و حرمان و مصیبت کا پیدا کرنے والا ہے۔ غرض کہ دنیا فی الحقیقت کیسی ہے یا وہ واقعہ فی الحقیقت کیسا ہے نہیں کہا جاسکتا۔ جن کے لئے یہ دنیا ہری بھری ہے وہ اس کو عیش و عشرت کی جگہ سمجھتے ہیں اور اگر ان کے سامنے کوئی کسی کے دُکھ کی کہانی کہتا ہے تو وہ اسکو بالکل غلط سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا اس کو خشکہ و پلاؤ بھی کھانے کو نہیں ملتا ہے اور جو لوگ مصائب و آلام میں گرفتار ہیں وہ دنیا کو مصیبت کی جگہ ہی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں سکھ ہے ہی نہیں۔ اب دنیا کو کیا کہنا چاہئے سُکھ کی جگہ یا دکھ کی جگہ غرض کہ اسکی نسبت ایک بات نہیں کہی جاسکتی اسی کا نام مایا ہے۔

انگلستان میں بیواؤں کا نکاح ثانی ہوتا ہے جس سے ناکتخدا یا لڑکیوں یا عورتوں کو یہ شکایت ہے کہ ان کو خاوند نہیں ملتے ہیں اور اس لئے یہ انکے لئے بہت بڑی مصیبت ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں بیواؤں کا نکاح ثانی نہیں ہوتا ہے جس سے ان کی زندگی مصیبت میں کٹتی ہے۔ اگر انگلستان میں ناکتخدا عورتوں کے لئے خاوند پیدا کرنے کی غرض سے کوئی تدابیر کئے جائیں تو اسی مناسبت میں بیوائیں بغیر خاوند کے رہ جاتی ہیں اور اُن کے لئے مصیبت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اگر ہندوستان میں بیواؤں کی شادی کا رواج دیا جائے تو ناکتخدا لڑکیاں اسی قدر تعداد میں بغیر شادی کے رہ جائیں گی جس سے ان کے لئے مصیبت کا ایک ذریعہ پیدا ہوجائے گا۔ بہرحال اگر ایک جگہ مصیبت کو دور کرنے کی فکر کی جاتی ہے تو دوسری جگہ وہی مصیبت پیدا ہوجاتی ہے اگر ایک کے لئے کوئی ذریعہ خوشی و شادکامی کا پیدا کیا جاتا ہے تو دوسری جگہ وہی ذریعہ ناکامی اور مصیبت کا ہوجاتا ہے۔ وہ ذریعہ فی الحقیقت کیا ہے؟ خوشی کا ذریعہ ہے یا مصیبت کا یہ نہیں کہا جاسکتا اور اسی لئے اس کا نام مایا ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ دنیا کی تمام اشیا فانی ہیں ایک نہ ایک دن یہ سب فنا ہونے والی ہیں۔ بادشاہ امیر وغریب نیک و بد صالح و گناہ گار سب کو ایک دن مرنا ہے۔ پھر ہر کسی کو جان ایسی پیاری ہے کہ وہ باوجود اس کے کہ ہزاروں تکالیف و مصائب میں گرفتار ہے اور شاید ہاتھ پاؤں سے بھی لنجا ہے اور آنکھوں سے معذور مرنا نہیں چاہتا یہ مایا نہیں ہے تو کیا ہے۔

یہاں ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ نارد مُن نے ایک مرتبہ بھگوان سری کرشن سے سوال کیا کہ بھگوان مایا کس کو کہتے ہیں مجھے سمجھائیے۔ بھگوان نے فرمایا کہ آؤ میرے ساتھ چلو میں تمہیں بتاؤں گا کہ مایا کیا ہے۔ دونوں ایک ریگستان میں پہنچے جہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ بھگوان نے نارد سے کہا کہ مجھے سخت پیاس لگی ہے تم کہیں سے پانی پینے کو لاؤ۔ چنانچہ ناردجی ایک گاؤں میں گئے جو وہاں سے کچھ فاصلہ پر تھا اور ایک مکان پر جاکر دستک دی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک نہایت خوبصورت دوشیزہ لڑکی اس گھر سے نکلی۔ اس کی صورت کو دیکھکر وہ اسقدر فریفتہ ہوگئے کہ بجائے اس کے کہ وہ اس سے پانی مانگتے جس کے لئے وہ آئے تھے وہ طرح طرح کے خیالات میں پڑگئے اور ان کو گویا ایسا معلوم ہوا کہ انہوں نے اس لڑکی کے والدین سے شادی کا پیام دیا ہے اور اس سے شادی بھی ہوگئی ہے اور اس لڑکی سے انکو بچے بھی پیدا ہوئے ہیں گویا وہ ایک نہایت خوشی وخرمی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس طرح گویا بارہ سال گزر گئے ہیں۔ تیرھویں سال میں ایک بہت بڑی طغیانی آئی جس کی وجہ سے اس گاؤں کے تمام مکانات اور لوگ بہہ گئے سب کے ساتھ یہ بھی بہے۔ انہوں نے اپنی زوجہ کو ایک ہاتھ سے اور ایک بچے کو دوسرے ہاتھ سے پکڑا اور دوسرے کو اپنے کاندھے پر چڑھالیا اور اس طرح گویا پانی سے نکلنے کی کوشش کی۔ ایک ریلا پانی کا ایسا آیا کہ وہ ایک بچے کو بہا لے گیا اور دوسرے بچے کا بھی ہاتھ چھوٹ گیا اور اس بچے کو بچانے کی کوشش میں زوجہ کا ہاتھ بھی چھوٹ گیا اور وہ بھی بہ گئی اور یہ بہ کر کنارے لگے اور جورو بچوں کی یاد کرکے زار زار رو رہے ہیں۔ اتنے میں کسی نے آکر پیچھے سے انکو تھپ تھپایا اور اس پر وہ ہوش میں آکر اور پلٹ کر دیکھتے کیا ہیں کہ بھگوان کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ آدھ گھنٹہ ہوگیا اور اب تک تم پانی نہیں لائے۔ نارد نے کہا کہ واہ آپ کیا کہتے ہیں میرے خیال میں تو بارہ برس گزر گئے ہیں اور آپ آدھ ہی گھنٹہ کہتے ہیں۔ بھگوان نے کہا کہ بس تمکو اس آدھ گھنٹے میں اسکا تجربہ ہوا کہ میری مایا کیا ہے۔

درگا پاٹھ کے آغاز میں بھی یہ قصہ بیان ہوا ہے کہ کوئی بنیا تھا جس کو اسکی بیوی اور بچوں نے گھر سے نکالدیا تھا یہ شخص مصیبت کا مارا دربدر پھرتا ہوا آخر ایک ریاضت کیش رشی کے پاس پہنچا اور اس سے کہتا کیا ہے کہ مجھے میری بیوی اور میرے بچوں نے گھر سے باہر نکالدیا ہے اور میں نہایت ہی تکلیف اور مصیبت میں مبتلا ہوں مگر اس پر بھی بیوی اور بچوں کی محبت مجھے نہیں چھوڑتی ہے میں ان کی محبت اور یاد میں بے قرار ہوتا ہوں۔ رشی نے کہا کہ یہ مایا ہے جس نے تم پر اثر کیا ہے اور پھر اُس رشی نے مہامایا (महामाया) کے کرشموں کو بیان کرنا شروع کیا جو دُرگا پاٹھ میں درج ہیں۔ اسی مہامایا کو شاعروں نے وجود دے کر مہا کالی اور گوری وغیرہ کے ناموں اور دیوں سے ملقب کیا ہے مگر اس کے دو خاص روپ یہ ہیں۔ ایک اودّیا (अविद्या) اور دوسرا ودّیا (विद्या) اودّیا روپ سے یہ مہامایا جیوؤں کو سنسار میں پھنساتی ہے

اور و دیا ۔ ویسے وہ شانتی (शान्ति) پیدا کرکے سنسار سے چھڑاتی ہے۔
سوامی وویکا نند نے مایا کی اور تعریفوں میں ایک تعریف یہ بھی کی ہے۔ پانی کا ایک چشمہ ہے جو اپنے قدرتی میلان سے بہتا ہوا کبھی نشیب میں گر کر بھنور بن جاتا ہے اور اس بھنور میں کچھ دیر چکر کھا کر اس میں سے باہر نکلتا ہے اور پھر وہی اپنی اصلی آزاد حالت میں بغیر مزاحمت کے آگے کو بہتا ہے۔ جیو کی حالت بھی ٹھیک مثل اسی چشمہ کے ہے وہ بھنور میں پھنس جاتا ہے یعنی دیش کال نمت کے اندر آ جاتا ہے اور وہاں کچھ عرصہ تک چکر کھایا کرتا ہے اور یہ چلاّتا رہتا ہے کہ میرا بیٹا میرا بھائی میرا باپ وغیرہ وغیرہ اور بالآخر اُس میں سے نکلتا ہے اور اپنی اصلی آزادی کو پھر حاصل کرتا ہے۔ مایا کیا ہے مکتی کیا ہے یہ بات سوامی وویکا نند کی اس مثال سے بخوبی واضح ہوتی ہے ہم اُس بہتے ہوئے چشمے کی مانند ہیں مثل اُس آزاد چشمے کے ہیں جو بلا رکاوٹ بہتا چلا جاتا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ ہماری جو یہ اصلی حالت ہے کہ ہم ہمیشہ آزاد ہیں برابر قائم رہتی ہے۔ تمثیل میں البتہ ہم نے یہ کہا ہے کہ چشمہ اس بھنور میں چکر کھاتا رہتا ہے جب تک کہ وہ اس میں سے نہ نکلے لیکن جب تک وہ اُس بھنور میں ہے اُس نے ضرور اپنی آزادی کو کھو دیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اُس کی آزادی کی خاصیت جاتی رہتی ہے کیونکہ اگر اُسکی آزادی کی خاصیت جاتی رہی ہوتی تو پھر وہ آزادی کے ساتھ دوبارہ نہ بہ سکتا۔ اسی طرح جیو کا حال ہے یہ نہیں ہے کہ جیو کی آزادی کی خاصیت جاتی رہتی ہے وہ تو ہمیشہ ہی آزاد ہے اگرچہ وہ دیش کال نمت کے بھنور میں وہ پھنسا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ کہنا کہ آتما کسی بھنور یعنی بندھن میں فی الحقیقت پھنسا ہوا ہے داخل کفر ہے وہ جو ایک آتما ہے وہ کئی شکلوں میں جو فی الحقیقت اُسکی شکلیں نہیں ہیں ظاہر ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور اسی کا نام مایا ہے۔ دنیا کے دھندوں میں پھنسے ہوئے رہنے کی حالت میں بھی بعض اوقات ہمکو اصلی حالت کی یاد آ جاتی ہے اور ہم اس کو جاننے کی خواہش کرتے ہیں شاید کوئی مہاتما آکر ہم کو یاد دلاتا ہے کہ ہم فی الحقیقت آزاد ہیں مقید نہیں اور جو ہم ان قیدوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ ہمارے لئے شایاں نہیں ہے اس پر ہمکو یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم نیک کام کریں تو شاید اس مایا کی قید سے چھوٹ جائیں گے لیکن یہ خیال خام ہے ہم ہزار نیک کام کیوں نہ کریں مایا ہم کو نہ چھوڑے گی ہاں البتہ بجائے اِسکے کہ ہم بُرے کام کرتے اور لوہے کی زنجیروں سے باندھے جاتے ان نیک کاموں کے کرنے کی صورت میں سنہری زنجیروں سے باندھے جائیں گے مگر زنجیر آخر زنجیر ہی ہے چاہے سونے کی ہو چاہے لوہے کی، قید دونوں صورتوں میں ہے۔ پس اگر نیک کام کرنے کی جزا میں سورگ یعنی بہشت یا شاید اندراسن بھی ملجائے مگر اسکی بھی انتہا ہے کیونکہ مایا کے قوانین وہاں بھی عمل پذیر ہیں۔ اس پر ہم کو یہ خیال ہوتا ہے کہ برہمہ لوک کو جائیں تو شاید ہم مایا کے ان بندھنوں سے چھوٹ جائیں گے مگر یہ بھی خیال خام ہے۔ ہمیں یہ الہام غیبی ہوتا ہے کہ تیرا ہی ہاتھ ہے جو رسّی کو تھامے ہوئے ہے جو تجھے کھینچے لئے جاتی ہے۔ ہم ہمیشہ سے یہ خیال کرتے آئے ہیں کہ ہم دیہہ ہیں (देह) یعنی جسم ہیں اور اس لئے اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہم دیہہ ہی ہیں اگر ہم صدق دل سے یہ سوچنے لگیں کہ ہم دیہہ نہیں ہیں ہم آنند سروپ ہیں تو جو عذاب و ثواب کا بوجھ

ہم کو دبا رہا ہے۔ وہ بتدریج جاتا رہے گا جہاں تک ہم سے تعلق ہے کوئی نمود باقی نہ رہے گی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ آتما اپنے تمام جلال کے ساتھ چمکیگا بھنور سے نکلنے یعنی مایا کے بندھنوں کے کٹ جانے کے یہی معنی ہیں اور اسی کا نام مکتی ہے۔

پربھولال

تکوین (۲)

(۴) ہندو فلاسفروں کے قیاسات | اب یہاں نامی ہندو فلاسفروں کے خیالات دربارۂ تکوین درج کرنا مناسب ہے۔ چھ فرقہ ہندو فلاسفروں کے مشہور ہیں اور ان میں مشہور ترین سانکھ اور ویدانت ہیں اور ان دونوں کے خیالات اپنشدکاروں کے بہت مشابہ ہیں۔ نیائے والوں نے آفرینش عالم کی بابت کوئی خیال ظاہر نہیں کیا ہے۔ مگر ویشنک شاستر والے نے سالمات کو مبدا ء عالم قرار دیا ہے۔ اول الذکر میں مابعد الطبیعیات اور علم مناظرہ سے بحث ہے اور موخر الذکر میں علوم طبیعیہ سے۔ نویں کانڈ میں عدم وجود سے بحث ہے۔ جو وجود اور ارتقا سے پیشتر ہوتا ہے۔ تمام بحث اصول موضوعہ کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ دوسرے سوتر اول ادھیا اور ۹ شلوک میں یوں لکھا ہے "صفت و موصوف کا خاصۂ عام یہ ہے کہ ان سے ایک ہی قسم کی اشیا پیدا ہوتی ہیں" پھر ایک اور جگہ لکھا ہے "اصول قدیم واجب الوجود اور بے علت ہے۔ اسکا معلول اس کے وجود پر دال ہے" "یہ کہنا کہ سالمات حادث ہیں جہالت ہے" "حادث میں قدیم نہیں۔ قدیم میں قدیم پایا جاتا ہے سالماتی پھیلاؤ قدیم ہے" مگر کناد نے ذرّوں کی قدامت ثابت کرنے کی تکلیف نہیں کی۔ بلکہ انکا وجود فرض کرلیتا ہے۔ اس فرقہ کے عالموں کا طریقۂ استدلال یہ ہے "جو شے قائم اور بے علت ہے وہ قدیم ہے۔ جس شے کا علم ہمیں ہوتا ہے اُسے ہم قدیم نہیں کہتے۔ حادث سے قدیم لاحق آتا ہے۔ علل آخری ہمارے علم سے بعید ہیں۔ اسواسطے ہم انھیں قدیم ماننے کو مجبور ہوجاتے ہیں"[1] گویا کناد کے خیال میں دنیا کی ابتدا ذرّوں سے ہوئی۔ جو قائم بالذات اور قدیم ہیں۔ انکے اندر اور چیزوں کو ترکیب دینے کی قوت پائی جاتی ہے۔ یہ ذرّے برہم کی جگہ ہیں۔ اور وہ ذرّہ کے نام سے پکارا جاسکتا ہے۔ مگر برہم قادر علی الاطلاق روحانی اور وحدہ لاشریک ہے۔ جس سے دنیا پیدا ہوتی ہے۔ ذرّے بے شمار مادّی ہستیاں ہیں۔ ویشنک شاستر کی رو سے چار قسم کے ذرّے ہوتے ہیں۔ خاکی۔ آبی۔ ہوائی اور آتشی۔ اسے دوسرے لفظوں میں عناصر اربعہ سمجھنا چاہئے۔ ذرّوں کے اتحاد سے جو بیشمار موجودات عالم وجود میں آتی ہیں انپر خالق کی قدرت علی الاطلاق کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ ہی انکی داخلی قوت اُنکے اختلاط کی موجب ہوتی ہے۔ مگر ایک خارجی اثر سے وہ ایک دوسرے سے ربط پکڑتے ہیں۔

سانکھ کا فلسفہ | اب ہم سانکھ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ جس کا

---

[1] "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس" جلد دوم صفحہ ۲۰

تصوّر تکوین اپنشدوں سے بہت کچھ ملتا ہے۔ اُس کے اصول کے مطابق صرف محسوسات حق اور اصل ہیں اور اس عالم مرئی کی بابت سانکھ فلسفہ والے یہ کہتے ہیں "پرکرتی کے سبب سے دنیا پیدا ہوئی"۔ یعنی پرکرتی اصول اولیہ اور مبدار عالم ہے۔ رچرڈ گاربے کہتا ہے "مادہ ابتدائی کو پانی سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ بالواسطہ پانی پرکرتی سے نکلتا ہے۔ اور دیگر لطیف عناصر بھی اسی سے برآمد ہوتے ہیں۔ اسوجہ سے پانی کو پرکرتی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے"۔ اس فلسفہ کی رو سے یہ بھی مانا جاتا ہے کہ عالم متغیر ہے۔ ایک طرف اشیا، وجود میں آتی ہیں اور دوسری طرف مٹتی جاتی ہیں گویا کون وفساد کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ اور ان تبدلات کا مرکز ومصدر پرکرتی ہے، جس سے چیزیں بنتی ہیں اور بگڑنے کے بعد اسی میں جا ملتی ہیں۔ پرکرتی "اویکت" یعنی جو نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ اور اپنی اصل حالت پر قائم رہتی ہے۔ اسے عالم مادّی کا پردھان کارن (علت العلل) قرار دیا گیا ہے۔ موجودات پرکرتی ہی سے نکلتی ہیں۔ مگر پرش (روح) اس سے جدا ہے سانکھ سوتر (اوّل ادھیا ۶۱ شلوک) میں پرکرتی کی ماہئیت کی بابت لکھا ہے "یہ ستوہ۔ رجس۔ تمس۔ کے اجزائے ترکیبی کا توازن ہے"۔ پرکرتی کے تین گن (خواص ۹) ہیں۔ سانکھ کار ۱۱۔ ادھیائے میں لکھا ہے "جو پیدا ہوتا ہے۔ اس میں تین اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ غیر روحانی۔ صوری۔ عام سبے عقل اور پیدا کرنے والے "پردھان" یعنی پرکرتی اسی قسم کی ہے"۔ پس ظاہر ہوا کہ پرکرتی اور اس سے جو کچھ بنا ہے۔ تین اجزائے ترکیبی رکھتی ہے۔ اول ستوہ۔ (روشنی۔ خوشی۔ اور نیکی) رجس (غم۔ غصہ۔ دکھ) تمس (تاریکی۔ عدم حس۔ اور برائی) دونوں علت اولیہ (پرکرتی) اور معلول (عالم غیر روحانی اور حس اور عقل سے معرا ہیں۔ ان میں اور چیزیں بنانے کا خاصہ ہے کیونکہ مادۂ عالم سے دنیا ظہور میں آتی ہے۔ اور پھر اس کے اندر نئے نئے وجود اس کے سبب سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ مادّہ (پرکرتی) قدیم ہے۔ نہ اس کا آغاز ہے اور نہ انتہا ہے۔

"جڑ کی جڑ نہیں ہوتی اس واسطے (برہمانڈ) بے جڑ ہے۔ اگر سلسلۂ اسباب ونتائج کا کھوج لگاتے چلے جاؤ تو آخر کار ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جس سے آگے بڑھنا دشوار ہوتا ہے۔ اگر موجودات کی جڑ کی بابت پوچھو تو صرف ایک نام بتانا پڑتا ہے۔ اور یہ پرکرتی ہے۔ پرش اور پرکرتی قدیم ہیں جیسا اوپر کی تقریر سے عیاں[ل] ہوتا ہے"۔ عالم کا مبدا یا جڑ پرکرتی ٹھہری۔ جسے مول پرکرتی کے نام سے پکارا جاتا ہے اور دراصل یہی ہیولی یعنی مادۂ عالم ہے۔ اس کی کوئی علت نہیں ہے اس کا کوئی مخرج نہیں ہے۔ اس واسطے اسے امول مول یعنی بے مخرج اور بے علت سمجھا جاتا ہے۔

ارتقار عالم یعنی پرکرتی کے عمل کے باب میں یہ لکھا ہے "گو وہ عقل سے خالی ہے مگر اس کا عمل جاری رہتا ہے۔ جیسے دودھ کا" (سانکھ سوتر اول ادھیا ۵۹ شلوک) جیسے دودھ سے ملائی۔ دہی۔ چھاچھ وغیرہ بنتی ہے۔ اسی طرح پرکرتی سے عالم کے اندر بے شمار موجودات پیدا ہوتی ہیں۔

الغرض سانکھ کے فلسفہ میں دو وجود قدیم مانے جاتے ہیں ایک پرش (روح) اور دوسری پرکرتی یعنی مادّہ عالم۔ اور انہی دونوں کا سب ظہورہ ہے۔

ویدانتی خیال | برعکس اصول سانکھ کے اہل ویدانت وحدت الوجود

لہ سانکھ سوتر۔ اول ادھیا ۶۷ - ۶۹ شلوک - ماخوذ از "ہندو اور مسیحی طریقہ نجات" صفحہ ۲۱۸-۲۲۰-۲۲۱

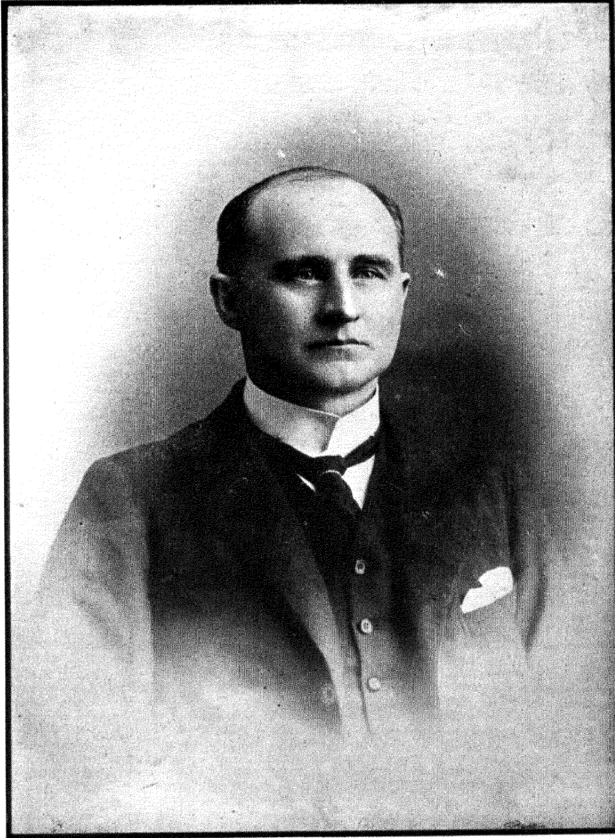
کے قائل اور حامی ہیں۔ ویدوں اور اپنشدوں میں سرشٹی (دنیا) کے متعلق جو کچھ لکھا ہوا ہے۔ وہ اسے جوں کا توں مان لیتے ہیں اور وحدت الوجود کا مسئلہ قائم کرتے ہیں۔ مگر اپنے اصول کے مطابق وہ خود کو ایک بڑی مشکل میں الجھاتے ہیں جو برہم اور اودیا کے وجود کے مسئلہ سے لاحق ہوتی ہے۔ جیسے کہ اہل سانکھ پرش اور پرکرتی کے جھگڑے میں اُلجھ جاتے ہیں۔ ویدانتی مسئلہ کی رو سے دنیا اور مافیہا صرف مایا یعنی دھوکہ اور سراب ہے۔ دنیا کی آفرینش کا مقصد اس فلسفہ کی رو سے صرف "ایشور کی لیلا ہے"۔ یعنی خدا نے تفریح طبع سے دنیا پیدا کی ہے مگر برہدارانیشد (اول کانڈ۔ چوتھا ادھیا ۱-۳ شلوک) میں خواہش (کام) کو آفرینش عالم کا محرک قرار دیا گیا ہے جو برہم کے اندر پیدا ہوئی تھی۔ مبدا عالم کیا ہے؟ "جنمادیہ سیہ تیا" یعنی "برہم وہ ہے جس سے دنیا کی ابتدا ہوئی" خدا عالم کا مخرج و علت ہے۔ اسی سے نکلا۔ اسی میں قائم ہے۔ بگڑنے کے بعد پھر اسی میں جا ملے گا۔ واضح ہو ہندو فلاسفر دو علتوں میں خاص امتیاز کرتے ہیں۔ ایک۔ اپادان کارن یعنی علت مادی۔ اور دوسری نمت کارن۔ یعنی علت فاعلی۔ مثلاً گھڑا ہے مٹی اسکا اپادان کارن اور کمہار نمت کارن ہے۔ بقول شنکراچاریہ اور اہل ویدانت برہم دنیا کی علت مادی اور علت فاعلی ہے۔ آخر الذکر صورت میں وہ ایشور کہلاتا ہے۔ مگر وہ اس اعتراض کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیتا ہے" پاک۔ روحانی برہم جب علت مادی ہو تو اس سے کیوں ناپاک، مادی، اور گوناگوں بُری دنیا منتج ہو؟" شنکر "مایا واد"[۵] کے مسئلہ سے اسے حل کرنا چاہتا ہے یعنی یہ کہ

برہمانڈ میں برہم کے ماسوا اور سب دھوکہ ہے۔ اور آتم بودھ میں شنکر کے اس مسئلہ کی تشریح یوں کی گئی ہے :"خدائے جل جلالہٗ سے تمام عالموں کی ابتدا ہوئی ہے۔ وہ اسی میں قائم ہیں۔ اسی سے انکا وجود ہے اور اخیر میں اسی میں غائب ہو جائیں گے۔ جیسے بلبلے پانی سے پیدا ہوتے ہیں اور پھر اسی میں معدوم ہو جاتے ہیں (اسی طرح عالم بھی جناب باری سے نکلتے اور پھر اسی میں چھپ جائیں گے) یہ برہمانڈ آتما ہے۔ آتما سے جدا اور کچھ نہیں ہے۔ جیسے گھڑے مٹی سے بنتے ہیں۔ اسیطرح عقلمند سب اشیا کو اپنے اندر دیکھتا اور پاتا ہے۔" ان دونوں شلوکوں میں پرمیشور۔ برہم کا وجود علت مادی ہے "عالموں کی ابتدا اس سے ہوئی ہے"۔ وہ مادۂ عالم (اکھل دھارا) بھی ہے پانی کے بلبلے۔ اور مٹی کے گھڑے۔ اس تعلیم کو واضح کرتے ہیں۔ وہ مٹی کے ہیں۔ وہ مٹی ہیں۔ اور اخیر میں وہ مٹی بن جائیں گے۔ لیکن اگر "ایکو برہم" کے مظاہر کو جو مختلف ہستیوں میں نمایاں ہیں دھوکہ یعنی مایا مانا جاتا ہے تو یہ زیادہ معقول ہوگا کہ دنیا کا مخرج اور مبدا اودیا (جہل) قرار دی جائے۔

ویدانت میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے۔ آیا آفرینش کے وقت برہم کے پاس کوئی اوزار اور مصالح بھی تھا۔ جیسے کمہار کے پاس چاک مٹی وغیرہ ہوتے ہیں شنکراچاریہ کہتا ہے۔ آفرینش ایسی ہے جیسے : دودھ کی بالائی۔ یعنی جیسے دودھ سے بالائی اتر آتی ہے اسی طرح برہم سے دنیا پیدا ہوئی۔ جسکے یہ معنی ہیں۔ کہ آفرینش برہم کی ذات کا ایک خاصہ ہے شنکراچاریہ

---

۵ ڈاکٹر پال ڈائے سن کا "فلسفۂ ویدانت" ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳۹۔ آپ نے اپنے "اصول مابعد الطبیعیات" کے آخر میں بطور ضمیمہ ویدانت پر ایک فصل ایزاد کی ہے اسے پڑھنا چاہیئے۔ آپ سنسکرت کے نامور جرمن عالم ہیں ۵ ماخوذ از "ہند۔ و مسیحی طریقۂ نجات" صفحہ ۲۳۵



عالیجناب سر آرچ ڈیل ارل کے' سی' آئی' ای - چیف کمشنر صوبۂ آسام

انڈین پریس الہ آباد

اس سے ہر قسم کے قوا، منسوب کرتا ہے۔ جس سے وہ دنیا پیدا کرتا ہے مگر اس ہستی خالص میں قوتیں کہاں سے آئیں؟ یہاں اودیا۔ مایا کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ شنکراچاریہ کے خیال کی رو سے "مایا ایشور کے اختیار میں ہے۔" وہ برہم کے ساتھ قدیم (پراگو ستھا) ہے۔" اس کے (مایا) بغیر خدا کا عمل آفرینش ناممکن الوقوع ہے۔ جس خالق میں توانائیاں اس کا وجود لعید از فہم ہے۔ یہ قوتِ تخمی جو خدائے ذو الجلال میں موجود رہتی ہے۔ اور مخفی (اویکت) ہے۔ اپنی ماہیت میں اودیا ہے۔ اور نہایت گہری میٹھی نیند ہے، جسے مایا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جسمیں گمراہ روحیں مبتلا ہیں۔ وہ اب تک اپنی اصلیت سے آگاہ نہیں ہیں (یعنی یہ کہ برہم اور ہم ایک ہی ہیں)" اسطرح مایا موجودات کی تخمی قوت ہے۔ اور اصل میں اودیا ہے جو برہم کے ساتھ قدیم ہے۔ مگر علم کل اور عقل کل ہستی کے ساتھ اودیا کس طرح لازم رہ سکتی ہے؟ اس کا وجود جناب باری کے پاک ہمہ داں اور حق وجود کے نقیض ہے۔ جس سے ویدانتی مسئلہ وحدت الوجود کا نقص کمال عیاں ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہند و فلاسفروں کے خیالات قدرے وسعت کے ساتھ دئیے جاتے تاکہ ناظرین جنکی توجہ اس طرف مائل نہیں ہوئی ہے ہند و نظام فلسفہ کے بنیادی اصول سے آگاہ ہو جاتے۔ مگر اسے کسی اور مضمون کے لئے اُٹھائے رکھتے ہیں۔ شائقین کو خود انگریزی۔ اُردو۔ اور ہندی کے ترجموں سے کام لینا چاہیے اگر وہ سنسکرت سے ناواقف ہوں۔ یہ مطالعہ خاص دلچسپی لئے ہوئے ہے۔ ہند و فلسفہ کے مطالعہ سے استدلال اور مشاہدۂ فطرت کو خاص تحریک و تقویت پہنچتی ہے، جو کسی اور نظام فلسفہ کے مطالعہ سے ممکن الحصول نہیں۔ ویدانت کے دلایل بہت پیچیدہ اور عقل کو پریشان کرنے والے ہیں۔ ہمنے صرف اصل مسائل اور تعلیمات پیش کرنے میں اکتفا کی ہے اور تنقید و تنازع سے احتراز کیا ہے۔ جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔

۵۔ دھرم شاستر اور پران۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ دھرم شاستر (منو) اور پران تکوین کی بابت کیا کہتے ہیں۔ منو مہاراج کہتے ہیں:۔ ابتدا میں ایسی ظلمت تھی کہ اسے بیان کرنا دشوار ہے۔ پھر خدائے ذو الجلال نے اصول اولیہ اور ابتدائی عناصر وغیرہ مع پانی پیدا کئے۔ پانی میں بیج رکھا جس سے ہزار سورجوں کی چمک رکھنے والا سنہرا انڈا پیدا ہوا۔ اسکے اندر سے جگت پتا یعنی برہم آپ پیدا ہوا۔ وہ ایک برہم[1] سال تک اس کے اندر ساکت اور مجہول پڑا رہا۔ پھر اسنے خیال کی قوت سے اس انڈے کو پھاڑ ڈالا۔ اس کا اوپر کا حصہ آسمان (آکاش) اور نچلا حصہ زمین (دھرتی) قرار پایا۔ اور ان دونوں کے درمیان ہوا رکھی گئی۔ اسی وقت سے اس نے عالم بالا کے اجرام (خطے) اور پانی کے ظرف بنائے اور جن بھوت بھی پیدا کئے۔ اور ہر ایک شے کا ایک نام

---

[1] ۔ ہندوؤں کے حساب کے مطابق نہ تو دنیا کا آغاز ہے اور نہ انتہا۔ جیسے رات دن کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ اسی طرح دنیا کا انجام نہیں۔ چار ارب بتیس کروڑ سالوں کا ایک برہم دن ہوتا ہے۔ جب دن ہوتا ہے تو سب چیزیں ہست ہوتی ہیں۔ اب دن ہے۔ پر جب رات آتی ہے تو دنیا و ما فیہا تحس نحس ہو جاتی ہیں ہر طرف تاریکی اور خاموشی چھا جاتی ہے۔ برہم رات بھی چار ارب بتیس کروڑ سالوں کی ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ قائم رہتا ہے۔ اب اندازہ ہو سکتا ہے کہ "برہم سال" کتنی مدت کا ہوتا ہے۔

مقرر کیا۔ اور سب کی ہستی کا مقصد قرار اور ایک ایک فرض سپرد کیا علاوہ برین آگ سے اُسنے ہوا کو پیدا کیا اور سورج سے اسنے تین انادی (قدیم) وید رگ - یجر - شام پیدا کئے - اسنے زمان بھی خلق کیا اور اُسکے حصّے مقرر کئے - اسیطرح تپسیا - زبان - خواہش - غصہ - غم اور خوشی بھی پیدا کی - اس نے بنی آدم کی ترقی کے واسطے برہمن کشتری - ویش - اور شودر اپنے مُنھ - بازو - ران اور پاؤں سے علے الترتیب پیدا کئے - پھر اپنے کو تقسیم کرکے نر و ناری بنائے - ناری سے وراج (منو؟) پیدا کیا اور بھی دس رشی پیدا کئے - پھر اور سات رشی پیدا کئے گئے - پھر ہر قسم کے مخلوقات معرض وجود میں[1] آئے "

کورم پران میں یوں آیا ہے :-

"جس وقت سب چیزیں برباد ہوئیں - تو مین نار این شیش ناگ کی پیٹھ پر سو رہا تھا - جو پانیوں پر تیرتا پھرتا تھا - میری مرضی اور کرپا سے برہما جگت پتا (پدر عالم) مع چار منھ کے پیدا ہوا پھر برہما نے اپنے دل سے سناک - سنانندن - سناتن سنت کمار وغیرہ پیدا کئے - مگر یہ گیان دھیان میں لگ گئے اور سنسارک کی ریتی سے دور رہے - اس سے برہما کو رنج ہوا - مگر اس کا باپ وشنو آیا جسنے اسے تسلّی دی اور اسکے حسب ہدایت تپ کرنے لگا - مگر بیسود - اسپر برہما بہت جھنجھلایا آنکھوں سے آنسو نکل آئے - آنکھیں پونچھیں - تو مہادیو پیدا ہوا - برہمانے اسے جاندار پیدا کرنے کی ہدایت کی " اور شاستروں میں کالی مبدا ء عالم قرار دی گئی ہے "وہ بحیثیت قوت اولیہ مین تخم ہوں - اور تخم کی قوت کے اعتبار سے مین شیو ہوں - اور شیو کی طاقت کے سبب سے مین وشنو ہوں اور وشنو کی حیثیت سے برہمانڈ ہوں[2] -

ایک اور شاستر میں لکھا ہے - کالی نے بحیثیت عورت تین انڈے پیدا کئے جس سے برہما - وشنو اور مہیش پیدا ہوئے ایک اور جگہ لکھا ہے - مادھ اور کیٹب کی ہڈیوں سے زمین پیدا ہوئی تھی - ہمارے موجودہ مقصد کے واسطے یہی کافی ہے - ورنہ ان متضاد اور مختلف خیالات اور روایات سے ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے -

۶ - بودھوں کے خیالات | ابھیدھرم یعنی بودھ لوگوں کے فلسفہ میں عالم کے مبدا اور علت العلل کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے - مگر دو امور مسلمہ ہیں (۱) عالم مرئی یعنی محسوسات (۲) موجودات - یعنی ذی روح وجود جو اس عالم کے اندر رہتے ہیں - یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہر شے سلسلہ اسباب و نتائج کے تابع ہے - اور ہر جگہ تغیّر نظر آتا ہے یعنی وہ "العالم متغیر" کے بھی قائل ہیں - گو بعض مسائل اور مسلّمات بودھوں کے زمانہ حال کے سائنس سے مطابقت کھاتے ہیں - مگر بیشتر باتیں اُس زمانہ کے معتقدات سے ہیں، جو اس مذہب کی ابتدا اور اشاعت کے وقت ملک میں رائج تھے - عالم اور ما فیہا کے بارہ میں جو خیالات اس مت کے مقلدوں میں مروج ہیں - انکا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے :-

خلا میں بے شمار عالم ہیں - جو تین تین کے جوڑوں میں ہیں - انکے وسط میں ایک بہت ہی بڑا پہاڑ ہے جبکا نام مہامیرو ہے - اس کے اردگرد چٹانوں کے سات طبقے ہیں - اور ان کی بلندی بے انتہا ہے - بیرونی طبقہ چار بر اعظم میں منقسم ہے - ایک کا حصہ جمبو دیپ ہے جسمیں ہم رہتے

[1] "دین حق کی تحقیق" انگریزی ترجمہ صفحہ ۱۹ ملاحظہ ہو - [2] ایضاً صفحہ ۲۰ -

ہیں۔اور مہامیرو کی چوٹیوں سے اوپر اور چٹانی طبقات سے بالکل اوپر چڑھ کر جو بیس آسمان ہیں ان کے اور زیر زمین کے نیچے آٹھ عظیم دوزخ ہیں یہ آسمان اور دوزخ عالم مرئی کے اجزا ہیں۔جو بھی دیگر اشیا کی طرح سلسلۂ اسباب و نتائج کے تابع ہیں اور جو جاندار ان کے اندر رہتے ہیں۔ وہ آواگون (ولادت ثانی انحطاط مرگ) کے ماتحت ہیں۔ مہامیرو۔اور بیرونی چٹانی سرکل کے درمیان آفتاب و ماہتاب اور ستارے خلا میں گردش کرتے ہیں۔جب وہ چٹانوں کے اول حلقہ کے پیچھے سے گزر جاتے ہیں۔تو جمبو دیپ والوں کو وہ غروب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دنیا عالم بالا کی دنیاؤں کی طرح پانی آگ اور طوفان سے برباد ہو جاتی ہے۔ہستیوں کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔جو نروان کو پہنچ جاتی ہیں وہ کم ہو جاتی ہیں۔جب ایک آدمی مرجاتا ہے تو کسی دوسری جگہ دوسری صورت میں پیدا ہو جاتا ہے علم کے بارہ میں بودھ فلسفہ یہ ہے:۔علم تجربہ اور استخراج سے حاصل ہوتا ہے۔ہارڈی کہتا ہے۔مالنکہ نے بدھ دیوجی سے پوچھا۔ دنیا قدیم ہے۔یا۔حادث؟۔ تو اس نے ہاں نہیں۔اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

۷۔جینیوں کے خیالات | جین مت والوں نے اپنا فلسفہ مادّہ کے نہایت پرانے خیالات کی بنا پر قائم کیا۔اور اسے عہد بعہد ترقی دے کر معقولیت کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ اس کے اصول کے مطابق مادّہ قدیم ہے۔ اجزائے لاتجزی کی تخفیف اور ایزاد کے بغیر اس کا حجم گھٹ بڑھ سکتا ہے۔اس میں یہ خاصیت ہے کہ جو صورت چاہتا ہے اختیار کر لیتا ہے۔اور اس کے خواص میں بھی تغیر ہو سکتا ہے۔بہت سے اجسام ملکر ایک واحد وجود بن سکتے ہیں اور ایک جسم کئی وجودوں میں منقسم ہو سکتا ہے۔

جینی عقیدہ کے مطابق ارواح اور خلا کے ماسوا باقی تمام موجودات مادّہ سے ترکیب پذیر ہوتی ہیں۔مادّہ چاہے جس صورت میں ہو۔مگر وہ پرمانوؤں سے بنتا ہے۔ ہر ذرہ ظرف کا ایک نقطہ گھیرتا ہے۔ مادّہ یا تو ستھول (کثیف) حالت میں ہوتا ہے۔یا سوکھشم (لطیف) لطیف حالت میں بیشمار ذرّے ایک ذرّہ کثیف کے برابر ظرف گھیرتے ہیں۔سالمات باعتبار اپنی ہیولائی حالت کے قدیم ہیں۔ہر ذرّہ میں ایک قسم کا ذائقہ۔رنگ۔بو اور دو قسم کا لمس ہوتا ہے۔مگر یہ خواص مستقل نہیں ہیں بلکہ بدلتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔دو یا زیادہ ذرّے ایک دوسرے سے متحد ہو کر سکندھ یعنی مجموعہ جات کی صورت اختیار کرتے ہیں۔اور اجسام بناتے ہیں۔ذرّے خاص خاص صورتیں اختیار کرتے ہیں۔اور مختلف گروہوں میں بدل جاتے ہیں۔ہر ایک جسم اور شے ایک خاص قسم کے ذرّوں کے مجموعہ سے بنتی ہے۔ذرّہ کے اندر ایسی قوت خود بخود پیدا ہو سکتی ہے۔جس کی بدولت وہ عالم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک منٹ میں پہنچ جاتا ہے۔

قصہ کوتاہ جینی خیال کے مطابق دنیا مادّہ سے پیدا

سلے ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا بریٹانکہ جلد چہارم ملاحظہ ہو مضمون "بدھ ازم" سلے منقول از "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد دوم صفحہ ۱۹۹ مطبوعہ ایڈنبرا دسمبر ۱۹۰۹ء۔

ہوئی ہے۔ جس کے لئے کسی غیر ہستی کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ بلکہ ذرّے اپنی حرکت سے آپ سے آپ ایک دوسرے سے اختلاط اور ترکیب پکڑتے اور موجودات کو معرض وجود میں لانے کے موجب ہوتے رہتے ہیں۔ یہ خیال مادّیین کے خیال سے بہت مشابہ ہے۔

(۳) ایرانیوں کے خیالات | ژند آوستہ میں جو کیفیت دنیا کی آفرینش کی بابت موجود ہے۔ وہ ایک حد تک بائبل کے ابتدائی بیان سے مطابقت کھاتی ہے۔ دو امور میں وہ متفق اللفظ ہیں۔ (۱) آفرینش کا ایک فوق العادت دیوتا کے ارادہ کے فعل سے سرزد ہونا۔ (۲) جہانِ آفریدہ خالق کی حکمت و قدرت کی صنعت کا کامل نمونہ تھی۔ ایرانیوں کی دینی کتاب میں مذکور ہے۔ کہ دنیا نیستی سے ہست ہوئی۔ مگر یہودی بیان کے مطابق بالواسطہ یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شروع میں مادہ موجود تھا جسے ترتیب دے کر خدا نے اجرام فلکی اور دنیا بنائی آوستہ کے بیان کی رو سے عمل آفرینش اہرمزد (یزدان) خالق واحد کی قدرت سے ہوا۔ مگر ایک دوسرے بیان کی رو سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ ایک روح بد اور ایک روح نیک ابتدا میں تھی۔ جن کے عمل مشترکہ سے دنیا وجود پذیر ہوئی۔ دارا اور زرق سیص کے زمانہ کی معتبر شہادت موجود ہے جس کے مطابق آفرینش کا عمل اہرمزد سے منسوب ہوتا ہے۔ نقش رستم سے خط میخی کا ایک کتبہ برآمد ہوا ہے۔ اس میں اہرمزد کو "دیوتاؤں کا عظیم الشان خدا جسنے زمین و آسمان اور نیز انسان پیدا کئے" کہکر پکارا گیا ہے۔ الوند۔ وان۔ پرسی پولس کے شاہی کتبوں[۱] میں بھی اسی قسم کے فقرے پائے جاتے ہیں۔

(۴) اہل چین کے خیالات | چینیوں کے ہاں جو خیالات تکوین کی بابت مروج ہیں۔ وہ سوال و جواب کی صورت میں ہیں۔ جو کسی آدمی نے کنفوشش سے پوچھکر حاصل کئے تھے۔ "تاریخ عالم" "مطبوعہ "ٹائمز" لندن کی اوّل جلد کے دیباچہ میں مسٹر میکلاتھی کے ترجمہ سے حسب ذیل درج ہے:۔ "زمین و آسمان کی ابتدا سے پیشتر دو چیزیں پانی اور آگ تھیں۔ پانی میں جو چیزیں مخلوط تھیں ان کے تہ نشیں ہو جانے سے زمین پیدا ہوئی۔ اگر کسی بلند چوٹی پر چڑھکر ارد گرد دیکھو تو پہاڑوں کے سلسلے سمندر کی لہروں کی مانند نظر آئیں گے۔ بعینہٖ اسیطرح ابتدا میں پانی بھی لہریں مارتا پھرتا تھا۔ میں نہیں جانتا وہ کس زمانہ میں منجمد ہوا۔ پہلے رقیق تھا۔ پھر آہستہ آہستہ منجمد ہو گیا۔ یہ اس ریت کی طرح تھا جو لہروں کے ساتھ کنارہ پر چڑھ آتی ہے۔ پانی کے اندر جو اجزا خارجی تھے وہ جمع ہو کر زمین بن گئے۔ آگ کا خالص ترین حصہ ہوا۔ رعد بجلی۔ آفتاب اور سیارے بن گیا۔ زمین کے عالم وجود میں آنے کی مدت کے متعلق بجواب ایک سوال بیان کیا۔ ابتداء عالم سے آج تک دس ہزار برس نہیں گزرے ہیں۔ میں نہیں جانتا اس سے پہلے کیا تھا۔ اور کس صورت میں تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے قبل موجودہ زمین و آسمان کی سی کیفیت تھی۔ زمین و آسمان برباد نہیں ہوں گے۔ لیکن جب بنی آدم اپنی اصل حالت سے گر جائیں گے تو پھر انتشار اور برہمی پیدا ہو جائے گی۔ انسان اور موجودات

---

[۱] "انسائیکلوپیڈیا برٹانکہ" جلد نمبر ۲ صفحہ ۴۴۷ اور نیز "تاریخ عالم" کی جلد اول کا دیباچہ ملاحظہ ہو۔

معدوم ہوجائیں گی۔ اس کے بعد عالم از سرِ نو پیدا ہوگا۔ مادہ عالم کے انتشار کے دفعیہ سے پہلے ہلکی تاریک ہوا تھی۔ جب وہ جدا کی گئی، تو مرکز زمین میں ایک شگاف واقع ہوگیا۔ شاؤ کا ہنگ تسی کی رائے میں (۱۲۹۶۰۰) سالوں کا ایک کلپ ہوتا ہے۔ اس زمانہ سے پیشتر ایک شگاف واقع ہوا جس سے دنیا ظہور پذیر ہوئی۔ حرکت و سکون اور نور و ظلمات کی کبھی ابتدا نہیں ہوئی تھی .... الخ" ہمارے مطلب کے واسطے اسی قدر کافی ہے۔ ہم لمبے جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتے۔

(ط) یہودیوں کے خیالات | یہاں اختصار کے ساتھ یہودیوں کے خیالات دیئے جاتے ہیں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے خیالات انہی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ اس واسطے انکے جداگانہ تذکرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ بہت عام ہیں۔ پڑھے لکھے واقف ہیں۔ دیگر اقوام کے خیالات سے ناظرین بہت کم واقف ہیں۔ اس واسطے وہ تمام و کمال دیئے جاتے ہیں۔ موسوی بیان یہ ہے:-

ابتدا میں خدا نے آسمان کو اور زمین کو پیدا کیا۔ اور زمین ویران اور سنسان تھی۔ اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔ اور خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔ اور خدا نے کہا کہ اجالا ہو اور اجالا ہوگیا۔ اور خدا نے اجالے کو دیکھا۔ کہ اچھا ہے۔ اور خدا نے اجالے کو اندھیرے سے جدا کیا۔ اور خدا نے اجالے کو دن کہا۔ اور اندھیرے کو رات کہا۔ سو شام اور صبح پہلا دن ہوا۔ اور خدا نے کہا۔ کہ پانیوں کے بیچ فضا ہو۔ اور پانیوں کو پانیوں سے جدا کرے۔ تب خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانیوں کو فضا کے اوپر کے پانیوں سے جدا کیا۔ اور ایسا ہی ہوگیا۔ اور خدا نے فضا کو آسمان کہا۔ سو شام اور صبح دوسرا دن ہوا۔ اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کے پانی ایک جگہ جمع ہوں، کہ خشکی نظر آوے۔ اور ایسا ہی ہوگیا۔ اور خدا نے خشکی کو زمین کہا۔ اور جمع ہوئے پانیوں کو سمندر کہا۔ اور خدا نے دیکھا۔ کہ اچھا ہے۔ اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور نباتات کو جو بیج رکھتیں اور میوہ دار درختوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق پھلتے جو زمین پر آپ میں بیج رکھتے ہیں۔ اگاوے۔ اور ایسا ہی ہوا" (۱: ۱-۱۲) پانی سے رینگنے والے جانور پیدا کئے گئے پرندے زمین پر آسمان کی فضا میں اڑنے کے لئے بنائے گئے۔ کیڑے مکوڑے۔ اور دیگر جانور ہر قسم کے خدا کی قدرت سے بنے۔

"تب خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بنائیں۔ اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا نر و ناری ان کو پیدا کیا" ہوا کے پرندے زمین کے چرندے اور سب قسم کے جانداروں اور چیزوں کی سرداری ان کے حوالہ کی گئی۔ توریت کی پہلی کتاب "پیدائش" کی اول دو فصلوں میں آفرینش عالم کا مفصل ذکر موجود ہے۔ علاوہ ازیں سلیمان کی کتاب الموسوم بہ "امثال" میں یوں لکھا ہے " خداوند نے دانائی سے زمین کی بنیاد ڈالی۔ اور عقلمندی سے آسمان آراستہ کیا۔ اس کی دانش سے گہرائیاں پھوٹ نکلیں اور آسمان سے اسکی بوندیں ٹپکیں" (۳ فصل ۱۹-۲۰- آیات)

(ع) یونانیوں اور رومیوں کے خیالات | ہندوؤں کی طرح یونانیوں کے ہاں بھی ایک سے زیادہ قسم کے خیالات رائج تھے۔ اول روایات یا میتھالوجیکل خیالات۔ دوسرے جمہوری

خیالات یعنی معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے خیالات تیسرے طبقہ میں فلاسفہ کے خیالات ہیں۔ ہم انہی کے اندراج پر اکتفا کرتے ہیں۔ روایات میں آفرینش دیوتاؤں سے منسوب کی گئی ہے۔ دوسرے طبقہ میں شعرا اور مصنفین ہیں۔ ہومر کہتا ہے۔ دنیا سمندر کے درمیان سے برآمد ہوئی تھی۔ مگر سیاداس کہتا ہے۔ شروع میں ظلمت اور اندھیر نگری تھی۔ اس سے عالم اور موجودات وجود میں آئیں۔ رومیوں نے تمام علوم و فنون یونانیوں سے اخذ کئے تھے۔ رومی حکما یونانی فلاسفروں کے شاگرد تھے۔ اس واسطے ان دونوں کے خیالات ایک ہی جگہ دئے جاتے ہیں۔ یونانی اور رومی تصانیف میں آفرینش عالم کے متعلق بہت سے تفصیلی خیالات موجود ہیں۔ جنھیں اگر درج کیا جائے تو ایک عمدہ کتاب تیار ہو جائے۔ مگر یہاں ان کے درج کرنے کی گنجایش نہیں ہے۔ اس واسطے اختصار اور اجمال پر کفایت کرنا پڑتی ہے۔

ڈیوڈورس کہتا ہے:۔

دنیا اور انسان کی آفرینش کی بابت معتبر مورخوں اور طبیعات کے ماہروں کے درمیان دو قسم کے خیالات ہیں۔ ایک گروہ حکما کا یہ کہتا ہے۔ کہ دنیا کی ابتدا کبھی نہیں ہوئی، اور اس کی انتہا کبھی نہیں ہوگی۔ بنی آدم قدیم سے ہیں۔ انکی پیدائش کبھی واقع نہیں ہوئی۔ دوسرا فریق علماء کا یہ کہتا ہے کہ ایک زمانہ میں دنیا پیدا ہوئی تھی۔ اور ایک وقت آئے گا جب سب کچھ برباد ہو جائے گا اور دنیا ناپید ہو جائے گی۔ ابتدا میں موجودات خلط ملط تھیں۔ ارض و سما ایک عظیم الشان بے ڈول ڈھیر کی صورت میں تھے۔ انکی صورت میں کوئی امتیاز نہو سکتا تھا۔ مگر جب جسم دار جاندار ظہور پذیر ہوئے تو زمین موجودہ شکل میں نمایاں ہوئی۔ اسوقت ہوا ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ اس کے آتشی اجزا بلندی کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ کیونکہ وہ لطیف تھے۔ جس سے آفتاب ستارے اور سیارے اور دیگر اجرام فلکی بنے۔ کثیف اجزام رطوبت کے باعث منجمد ہو گئے۔ اور کثافت کے سبب سے نیچے اتر آئے جہاں وہ ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ مرطوب و مکدر حصہ مادّہ کا سمندر بنا۔ جب زمین کا بیرونی چھلکا سوکھ گیا اور بہت سے مقامات کی رطوبت حرارتِ آفتاب سے خارج ہو گئی تو جاندار پیدا ہوئے۔ جیسا دلدلوں اور تالابوں کی حالت سے ظاہر ہے۔ جنھیں گرمی زیادہ پہونچی وہ ہلکے ہونے کے سبب سے اوپر کو اڑ گئے۔ اور ہوا کے پرندے بنے۔ جن کے اجسام میں مادّہ کثیف کثرت سے تھا وہ رینگنے والوں کے زمرہ میں داخل ہوئے۔ جن کے اندر آبی عنصر غالب تھا جیسے مچھلیاں وہ سمندروں اور جھیلوں میں جا رہے۔ باقی جاندار کرۂ ارض کو آباد کرنے کے لئے بنائے گئے۔[1]

جے۔ آر۔ راے

---

[1] ماخوذ از "تاریخ عالم" جلد اول ملاحظہ ہو دیباچہ۔

ابن رشد (۲)

ابن رشد کے مخالفین نے اگرچہ اس عالی پایہ حکیم کی نیک نامی کو نقصان پہنچانے کی بہتیری کوشش کی انواع و اقسام کے من گھڑت افسانے اس کے خلاف مشہور کئے، اور یہاں تک کہ اس کے کافر، بیدین، دہریہ، زندیق، ملحد اور دجال ثابت کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ باوجود ان تمام کوششوں کے جو نہ صرف ان لوگوں کی طرف سے عمل میں آئیں جو اس کی ترقی کو رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ اکثر علما جو مذہبی عقائد کے اختلاف کی بنا پر ابن رشد کے مخالف تھے اور ازمنۂ متوسطہ کے یوروپین عیسائی جو ابن رشد کے فلسفیانہ خیالات سے اپنی اُس زمانہ کی حالت کے باعث سخت متنفر تھے ابن رشد کو بدنام کرنے اور اس کی جانب مختلف اتہامات منسوب کرنے میں بالکل ہم آہنگ تھے ابن رشد کے اخلاق و عادات کے متعلق کسی قسم کی نکتہ چینی کا موقعہ نہ مل سکا۔ ابن رشد کے عادات و خصائل کی تعریف میں تقریباً تمام اُس کے سوانح نویس رطب اللسان ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ۔ الانصاری۔ لیون آفریکن وغیرہ مشہور مصنفوں نے بڑے ہی شد و مد کے ساتھ ابن رشد کے محاسن کی تعریف و توصیف کی ہے۔ حقیقت میں ابن رشد غیر معمولی خوبیوں کا آدمی تھا۔ اس کے اندرونی حالات بہت سبق آموز ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے باطن کو بالکل ارسطو کے نمونہ پر آراستہ کرنے کی کوشش کی تھی جس میں اسے پوری کامیابی ہوئی۔ اس کے حالات زندگی پڑھنے سے اِس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ قدیم حکمائے یونان کے ساتھ اس کی طبیعت کو بے انتہا مناسبت تھی۔ ابن رشد کے اکثر خصائل نامی گرامی حکمائے یونان کی خصوصیات میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ صبر و تحمل۔ استقلال و ثابت قدمی۔ عفو و مروت۔ عالی ہمتی۔ سیر چشمی۔ فراخ دلی۔ فیاضی اور جود و سخا کا غیر معمولی مادّہ اس کی طبیعت میں موجود تھا۔ علم اور اہل علم کی قدردانی اور عالموں کی ہر ممکن طرح سے مدد کرنے میں کبھی دریغ نہ کرنا تو اس کا خاصہ تھا۔ صداقت وحق پسندی کا وہ حیرت ناک طریقہ سے دلدادہ تھا مطالعہ اور کتب بینی کا وہ اس درجہ شایق تھا کہ جس کی انتہا نہیں اِس کے بغیر اُسے چین نہ آتا تھا اور مطالعہ اس کے لئے بمنزلہ لازمۂ زندگی کے ہو گیا تھا۔ ایام طفولیت ہی سے وہ راتوں کو مطالعہ کرنے کا نہایت سختی کے ساتھ پابند تھا۔ ابن العبار کا بیان ہے کہ ابن رشد نے صرف دو مرتبہ اپنی ساری زندگی میں اپنے مقررہ شبانہ مطالعہ میں ناغہ کیا ہے۔ ایک اپنی شادی کے موقعہ پر اور ایک اپنے باپ کی وفات کے وقت۔ ان دو موقعوں کے سوا اس نے کبھی خواہ کیسا ہی وہ مجبور کیوں نہ ہوا ہو اپنی عادت منقطع نہ ہونے دی۔ اسکی علمی تشنگی بہت تعجب انگیز تھی۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتا تھا کہ ساری دنیا کی معلومات پر اسے عبور حاصل ہو اور انسانی علوم کی کوئی بات اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہنے پائے۔

اسی غیر معمولی شوق اور اس کے حاصل کرنے کی اسی جان توڑ محنت و کوشش کا نتیجہ تھا جو ابن رشد مذہب - قانون - طب - ریاضی - فلسفہ - طبعیات اور ہئیت وغیرہ علوم کا مالک اور ایسا مالک تھا کہ آج تک علمی دنیا اس کے بے نظیر کارناموں سے محوِ حیرت ہے - ابن رشد کی ذات نہ صرف اپنی قوم اور اپنے ملک ہی کے لئے باعث فخر ہے بلکہ اس عالی پایہ شخص کا شمار دنیا کے اُن چند برگزیدہ نفوس میں ہے، جن پر دنیا کی مختلف قومیں اور بنی نوع انسان کے تمام افراد بجا طور پر یکساں فخر و ناز کرتے ہیں - اس نے اپنی زندگی ساری دنیا کی خدمت میں صرف کی اور اس لئے بلا تفریق ملت ہر انسان اس کے احسانات کا مرہون اور اس کی عظمت کرنے پر مجبور ہے - ابن رشد اندلس میں پیدا ہوا تھا اور اس کی رگوں میں عربی خون جوش زن تھا - لیکن وہ ساری دنیا کو اپنا وطن اور تمام انسانوں کو اپنی علمی دولت کا حصہ دار سمجھتا تھا - وہ نہ صرف مقدس اور فیاض مذہب اسلام کا پیرو ہونے کے باعث کسی قسم کا تعصب یا طرفداری یا امتیاز برتنے سے بالکل معذور تھا بلکہ وہ اپنی عالی حوصلہ اور اولو العزم طبیعت سے بھی مجبور تھا کہ اپنے بے نظیر علم و حکمت کی سب پر یکساں فیض پاشی کرے - اس کے قلم سے کوئی تصنیف محض اسکی قوم یا اس کے وطن کی بے جا طرفداری میں نہیں نکلی - اسکی علمی کوششیں کسی خاص فرقہ یا کسی خاص ملت یا کسی خاص ملک کے لئے مخصوص نہ تھیں - جیسا کہ اس پایہ کے حکماء کا قاعدہ ہے وہ تمام عالم کو اپنی معلومات کا یکساں حصہ دار سمجھتا تھا - یہی وجہ تھی کہ اس کی قوم اور اس کے ملک کے سوا غیر اقوام اور غیر ممالک نے اس کے علم و فضل اور اسکی تصانیف کو اپنا مال اور بلکہ اپنی میراث سمجھنے میں پس و پیش نہ کیا - یورپ میں بہت جلد ابن رشد کی اتنی وقعت قائم ہوگئی کہ ارسطو کے بعد بس اسی کا درجہ تسلیم ہونے لگا - سائنس اور فلسفہ کا تو وہ امام مانا جاتا تھا - بڑے بڑے حکماء اسکے سامنے بے حقیقت سمجھے جاتے تھے - کئی صدی تک یورپ کے خیالات پر ابن رشد ہی کی حکومت تھی - کم از کم چار سو برس تک تو یورپ بھر میں ابن رشد کی تصانیف ہی کے چرچے تھے -

ابن رشد کی شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہے جس کا ترجمہ عبرانی یا لاطینی زبان میں نہ کیا گیا ہو - ابن رشد نے اپنی تمام کتابیں عربی زبان میں لکھیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس وقت بمشکل گنتی کی چند اس کی تصانیف عربی میں مل سکتی ہیں - اس کی جتنی کچھ تصانیف اس وقت دنیا میں باقی ہیں وہ سب ترجمے کے ذریعے سے باقی ہیں - اصل عربی کتابوں کے اس وقت موجود نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان کا بہت بڑا حصہ زوال غرناطہ کے بعد ۱۴۹۲ء میں گارڈنل زیمی نیز کے زیر اہتمام اسّی (۸۰) ہزار عربی کتابوں کے ساتھ آگ کی نذر کر دیا گیا - اس لئے ان کے تراجم تو بدستور باقی رہ گئے اور اصل کتابیں نایاب ہوگئیں - یورپ میں اس وقت صرف دو کتب خانوں میں بہ ہزار دقت عربی کی چند کتابیں فراہم ہو سکی ہیں - ایک تو میڈرڈ کے اسکیوریل (Escurial) میں اور دوسرے فلارنس کے لارنٹائن (Lawrentine) میں - مگر ان کتابوں کے عبرانی اور لاطینی ترجموں کی کمی نہیں ہے - یورپ کے تمام کتب خانے ان تراجم سے بھرے پڑے ہیں - پیرس کے امپیریل بائبلیاتھیک



مہاراجہ دشرتھہ کا یگیہ

انڈین پریس الہ آباد

(Imperial Bibliotheque) میں کوئی پچاس قلمی نسخے مختلف عبرانی تراجم کے ایسے موجود ہیں جو بہت قابل قدر ہیں۔ ڈائسنا میں چالیس سے زیادہ اس قسم کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ یورپ کے کتب خانوں میں عبرانی زبان کی قلمی کتابوں کے جو نایاب ذخیرے ہیں ان میں بائبل کے سوا ابن رشد کی تصانیف کے تراجم سے زیادہ کسی کی تعداد نہیں ہے۔ لاطینی ترجموں کی کثرت کا بھی یہی حال ہے۔ یہ صرف قلمی نسخوں کا ذکر ہوا جو اُس زمانہ کی یادگار ہیں جبکہ چھاپے کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا۔ پندرھویں صدی کے وسط سے جبکہ کتابیں چھپنی شروع ہوگئیں ابن رشد کے تراجم بھی زیور طبع سے آراستہ ہونے شروع ہوئے اور اب ان مطبوعہ تراجم کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ یورپ کے تمام مختلف شہروں نے اپنے اپنے طور پر اُن تراجم کو جن کی وہ دل سے قدر کرتے تھے بکثرت چھاپنا شروع کیا اور وینس۔ پاڈوا۔ بولونا۔ روما۔ پیویا۔ اسٹراسبرگ۔ نیپلس۔ جنیوا وغیرہ کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں سے متعدد دفعہ مختلف طرز سے ان تراجم کو شائع نہ کیا گیا ہو۔ غرض تیرھویں صدی سے ابن رشد کی کتابیں ترجمہ ہونی شروع ہوئیں۔ پندرھویں صدی کے نصف تک صرف ان کے قلمی نسخے ہی جیسا کہ اس زمانہ کا قاعدہ تھا کام دیتے رہے۔ اس کے بعد سے مطبعوں نے ان کی اشاعت میں آسانی پیدا کردی اور سترھویں صدی عیسوی تک ان کی اشاعت انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ابن رشد کی تصانیف کو یورپ میں اس قدر قبولیت عام حاصل ہوگئی تھی کہ اس زمانہ میں ارسطو کی تصانیف بھی ابن رشد کی شرحوں کے بغیر شائع نہیں کی جاتی تھیں۔ اہل یورپ پر ان کا اس درجہ اثر تھا کہ وہ ان کو ارسطو کی کتابوں کا ضروری جزو تصور کرتے تھے اور ان کے بغیر ارسطو کی ساری کتابیں ناقص خیال کی جاتی تھیں۔ چنانچہ سنہ۱۴۷۲ء و سنہ۱۴۷۳ء وغیرہ میں جو مختلف اور متعدد اڈیشن ارسطو کی تصانیف کے بمقام پاڈوا شائع کئے گئے تو ان سب میں ابن رشد کی ساری شرحوں کے پورے لاطینی ترجمے بھی شامل تھے۔ اسی طرح سنہ۱۴۸۳ء و سنہ۱۴۸۴ء میں جب ارسطو کی تمام تصانیف کا مجموعہ تین جلدوں میں بمقام وینس شائع ہوا تو اس میں بھی ابن رشد کی تمام شرحیں موجود تھیں۔ سنہ۱۴۸۹ء میں برنارڈ نیو دی ٹریڈنیو نے خاص اہتمام سے ارسطو کی تصانیف کا ایک دوسرا مجموعہ کئی جلدوں میں شائع کیا۔ اس میں بھی ابن رشد کی شرحوں کا پورا ترجمہ شامل تھا۔ اس کے بعد تو یہ عام قاعدہ ہوگیا تھا کہ ابن رشد کی شرح کے بغیر ارسطو کی کوئی کتاب شائع ہی نہ ہو۔ ابن رشد کی تصانیف کی مقبولیت اور اس کے ساتھ اہل یورپ کی گرویدگی کا کسی قدر اندازہ ا منۂ متوسطہ کے اس مشہور مقولہ سے ہوسکتا ہے کہ

> حقائق عالم کا بہترین شارح ارسطو اور ارسطو کا بہترین شارح ابن رشد ہے۔

غرض اس طرح ابن رشد کی کتابوں نے اہل یورپ کو اپنا گرویدہ بنا کر ایسے وقت جب کہ ان پر وحشت وجہالت برس رہی تھی۔ عقلی ظلمت اور علمی تاریکی چھائی ہوئی تھی علوم و فنون کا ان میں پتہ بھی نہ تھا فلسفہ کی روشنی پھیلائی اور ان کو علوم عقلیہ سے مذاق آشنا کیا۔ ابن رشد کی تصانیف نے جس طرح اہل یورپ کی سبق آموزی کی اور اہل یورپ پر جو زبردست اثر ڈالا اس کا یوروپین مصنفین کو نہایت ممنونیت کے ساتھ اقرار ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر لی بان نے اپنی مشہور

معروف کتاب "تمدن عرب" میں اس کا اشارہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

> وہ عرب فلسفی جس کی تصنیفات کا اثر یورپ پر بہت کچھ پڑا ہے مشہور ابن رشد ہے۔ عموماً ابن رشد کو محض ارسطو کا شارح خیال کرتے ہیں لیکن میری رائے میں یہ شارح بعض اوقات اپنے استاد پر فوق لے گیا ہے اور بہت سے مسائل مختلفہ میں اسکی رائے بہ مدارج ارسطو سے بہتر ہے

رینان نے لکھا ہے کہ "سنٹ ٹامس کو اس کا سارا فلسفہ ابن رشد سے ملا"

ایک طرف تو ابن رشد کے ساتھ اہل یورپ کی گرویدگی کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف یورپ کا مذہبی فرقہ اس کی تصانیف کے اثر کو زائل کرنے میں اپنی انتہائی قوت صرف کر رہا تھا۔ پادری لوگ اس ڈر سے کہ ابن رشد کی فلسفیانہ کتابیں اہل یورپ کی آنکھیں کھول دیتی ہیں اور پادریوں کے ناجائز تسلط سے ان کو نجات دلاتی ہیں انواع واقسام کی کوششیں کرتے اور نفرت انگیز خیالات پھیلاتے تھے۔ ان کی ان کوششوں کا اندازہ ڈانٹے کی زندۂ جاوید نظم "انفرنو" اور ازمنۂ متوسطہ کے سربرآوردہ مصوروں کی بنائی ہوئی مشہور تصویروں سے بخوبی ہوتا ہے۔ ان سب میں یہ بتایا گیا ہے کہ ابن رشد جہنم کے سخت ترین حصہ میں انتہا درجہ کے عذاب میں مبتلا ہے اور اپنی بے دینی والحاد کی سزا پا رہا ہے۔ اس کی ساری تصانیف اس کے بازو منتشر حالت میں پڑی ہوئی ہیں۔ وہ بہت ہی بری طرح اوندھے منہ زمین پر پڑا ہوا ہے اور بڑے بڑے مہیب سانپ اس کو ہر طرف سے لپٹے ہوئے ہیں اور بار بار ڈستے جاتے ہیں۔ بعض تصاویر میں ابن رشد تنہا بتایا گیا ہے اور بعض میں ہومر، ورجل، سقراط، فلاطون اور ارسطو وغیرہ کے ساتھ مبتلائے عذاب دکھلایا گیا ہے۔ یہ سب لوگ بھی ابن رشد کی طرح اپنی اعلیٰ تصانیف، بےنظیر خیالات اور لازوال علمی احسانات کے باعث جہنمی خیال کئے جاتے تھے اور ان کو اس درجہ بے دین کافر اور گناہ گار سمجھا جاتا تھا کہ بعض تصویروں میں دجال کو بھی ان کے ساتھ شریک کیا گیا ہے۔ فرانسسکو ٹرینی۔ ٹیڈس گاڈی۔ انڈریا آرکاگنا وغیرہ مشہور ومعروف مصوروں نے اپنی اپنی اس قسم کی تصویروں میں صناعی کے کمال بتائے ہیں۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ باوجود اتنی کوششوں کے ابن رشد کی تصانیف کی اشاعت وپسندیدگی میں کوئی فرق نہ آنے پایا بلکہ اہل یورپ کی گرویدگی بڑھتی ہی گئی۔ چنانچہ چار صدیوں سے زیادہ عرصہ تک مسلسل طور پر اہل یورپ کے خیالات اور تصورات ابن رشد ہی کے زیر اثر تھے اور ان کے دماغوں اور ان کے دلوں پر ابن رشد ہی کی حکومت تھی۔ اتنی بڑی مدت تک بمشکل کسی اور فلسفی کو ایسی انتہا درجہ کی مقبولیت اور یہ بات نصیب ہوئی ہوگی۔

ابن رشد کی تصانیف میں سب سے زیادہ اسکی شرحیں مشہور ہیں۔ ان شرحوں کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) شروح المطول (۲) شروح المتوسط (۳) شروح الوجیز۔

یا (۱) شروح بسیطہ (۲) شروح غیر بسیطہ (۳) لمخصات۔

شروح بسیطہ یا مطول تو وہ شرحیں ہیں جن میں ابن رشد نے ارسطو کے ایک ایک فقرہ پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ دوسرے مشہور فلسفیوں کے اقوال بھی موقع بموقع نقل کئے ہیں اور ان کی بڑے ہی شرح وبسط کے ساتھ

تنقید کی ہے۔ اس قسم کی شرحوں میں ارسطو کی کتابوں کے متن کا ہر ہر فقرہ لفظ "قال" کے ساتھ درج کرکے اس کی شرح کی گئی ہے۔ شروح غیر بسیطہ یا متوسط وہ شرحیں ہیں جن میں ارسطو کی اصل کتابوں کے متن کا مختصر اقتباس درج کرکے اس کی توضیح کی گئی ہے اور جن میں بہت زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ملخصات میں ارسطو کے متن کا کوئی فقرہ نقل کرنے کے بغیر عام طور پر اس کی کتابوں کے مختلف مسائل و نکات پر بحث کی گئی ہے۔

ابن رشد کی تمام کتابوں کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں لیکن میڈرڈ کی اسکوریل لائبریری میں ایک عربی قلمی کتاب ہے جس کا نشان ۸۷۹ ہے۔ اس کتاب میں ابن سینا، فارابی اور ابن رشد کی تصانیف کی تعداد درج ہے اور ابن رشد کی معلوم شدہ کتابوں کو ۷۸ تک شمار کیا گیا ہے۔ ابن رشد کی یہ ۷۸ کتابیں مختلف مضامین پر ہیں۔ ان کی تفصیلی فہرست رینان نے بھی اپنی کتاب "ابن رشد اور اس کا مذہب" میں نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد کی کتابوں کی تفصیل یہ ہے:۔

فلسفہ	۲۸
مذہب	۵
قانون	۸
ہیئت	۴
قواعد	۲
طب	۲۶
مختلف	۵
جملہ	۷۸

ابن رشد کے فلسفہ اور اس کی تصانیف کے متعلق تفصیلی بحث کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے لیکن دو ایک مسائل کے متعلق ابن رشد کے خیالات اور اس کی رائے کے چند مختصر نمونے اس جگہ درج کرنا امید ہے کہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

انسان کی حریت کے متعلق ابن رشد کا خیال ہے کہ انسان نہ تو کلی طور پر مختار ہے اور نہ کامل طور پر مقید ہے۔ اس کی حریت نفس ناطقہ کی جہت سے کامل ہے اور اس پر کوئی قید نہیں لیکن امور حادثہ کی جہت سے وہ محدود ہے۔ ہمارے افعال کے خاص اسباب تو خود ہم میں موجود ہیں مگر ان کے خارجی اسباب ہماری قدرت کے باہر ہیں۔ پس جو چیز ہم کو اپنی جانب مائل کرتی ہے وہ ہمارے اختیار سے باہر ہے اور اس کا یہ فعل قانون قدرت یا رب العالمین کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں انسان بعض مقامات پر اپنے اعمال میں مجبور کہا گیا ہے اور بعض جگہ اپنے افعال و اعمال میں خود مختار اور آزاد مطلق بیان کیا گیا ہے۔

ابن رشد ارسطو کی طرح عالم کے قدیم اور مادّہ کے ازلی ہونے کا قائل ہے اور اس نے اپنی اکثر تصانیف میں اس مسئلہ پر مختلف طریقوں سے بہت مشرح اور مفصل بحث کی ہے۔

عقبیٰ کے متعلق ابن رشد کہتا ہے:۔

منجملہ ان خطرناک کہانیوں کے اس کو بھی شمار کرنا چاہئے کہ آدمی نیک کام محض اس وجہ سے کرتا ہے کہ اسکو آگے چلکر اس کی جزا ملے۔ اس قول کے مطابق نیک چلنی فی الواقع خود کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ انسان لذت جسمانی

کو محض اس وجہ سے چھوڑ تا ہے کہ اسے اس کا چند در چند معاوضہ ملے۔ عرب اپنے کو موت کے منہ میں اس لئے ڈال دیتا ہے کہ اس سے بڑی مصیبت سے بچ جائے۔ یہودی دوسرے کا مال اس لئے نہیں لیتا کہ اسے اسکا دونا مل جائے۔ یہ کہانیاں مخلوق میں اور علی الخصوص بچوں میں غلط خیالات پیدا کرتی ہیں جن سے فی الواقع کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں بہتیرے ایسے اشخاص کو جانتا ہوں جو ان کہانیوں کو نہیں مانتے مگر نیک چلنی میں ہرگز ان سے کم نہیں ہیں جو ان کے معتقد ہیں۔

پیروں اور مشایخوں کے وجود کو دنیا کے لئے ابن رشد جس درجہ غیر فائدہ مند تصوّر کرتا تھا اُس کے اِس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ

ظالم وہ شخص ہے جو عامّہ خلائق کے لئے نہیں بلکہ اپنی ذات کے لئے حکومت کرتا ہے اور ظالموں سے بدترین گروہ مشایخوں کا ہے۔

عورتوں کے متعلق ابن رشد کی رائے ہے کہ

مردوں اور عورتوں میں جو اختلاف ہے وہ اصلیت اور فطرت کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ حالات کے لحاظ سے ہے۔ عورتوں کی فطرت مردوں کی فطرت سے مشابہ ہے مگر ان کی موجودہ حالت مردوں کی حالت سے ادنےٰ درجہ کی ہے۔ بلاشبہ عورتیں مردوں کے سب کام انجام دے سکتی ہیں اور کبھی کبھی بعض کاموں مثلاً موسیقی وغیرہ میں ان سے سبقت بھی لے جاتی ہیں۔ مگر ہماری موجودہ تمدنی حالت کا اقتضا یہ ہے کہ ہم عورتوں کی پوشیدہ اندرونی قوتوں کا خیال نہیں کرتے اور ان کو ظہور میں لانے کی ہمکو پرواہ نہیں ہے موجودہ حالت کے لحاظ سے ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ وہ بچے جننے اور بچے پالنے اور گھر کے کام انجام دینے کے لئے پیدا ہوئی ہیں اور کسی کام کے لئے نہیں۔ عورتوں کی اس غلامانہ اور ذلیل حالت نے ان کی اندرونی قوتوں کو پامال اور فنا کر دیا ہے حالانکہ وہ بڑے بڑے کام مردوں کی طرح بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔ انکی زندگی ہمارے نزدیک گھاس پھونس کی زندگی سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ وہ مردوں پر بار ہیں اور انکی نظروں میں حقیر ہیں۔ ہمارے شہروں میں جو افلاس عالمگیر ہے اس کا سبب یہی ہے کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے اور ان کو عام طور پر حصول معاش سے محروم کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ اپنی روزی مردوں کی طرح ہر قسم کا کام انجام دے کر بخوبی پیدا کر سکتی ہیں۔

یہ عجیب وغریب بات ہے کہ ابن رشد نے اکثر مسائل پر سات آٹھ سو برس پہلے جو خیالات ظاہر کئے تھے وہ آج بھی باوجود اس ترقی کے ویسے ہی محکم اور ناقابل تغیّر ہیں خصوصاً بعض امور میں اس نے جو رائے دی ہے وہ بالکل وہی ہے جو اتنی صدیوں کے بعد مل۔ ہربرٹ اسپنسر۔ ڈاروِن۔ ارنسٹ ہیکل اور سیموئل لینگ نے سالہاسال کے غور و خوض کے بعد قائم کی۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ابن رشد صرف اپنے زمانہ ہی کا فلاسفر نہیں تھا بلکہ کارکنان قضا وقدر نے اسے وہ غیر معمولی دل و دماغ۔ وہ بے نظیر بلند خیالی اور وہ عدیم المثال عالی نظری مرحمت فرمائی تھی جس سے

کام لے کر وہ اپنے تئیں دماغی ترقی کی اُس بلندی پر پہنچا سکا جسکی سطح آٹھ سو برس کی ترقیات کے بعد بھی نیچی نہ ہونے پائی بلکہ بالا ہی رہی۔

یہی ہیں وہ برگزیدہ نفوس جن کی بدولت مسلمان بجا طور پر یہ کہنے کے مستحق ہوے کہ

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا

کیا برطرف پردہ چشمِ جہاں سے
جگا یا زمانہ کو خوابِ گراں سے

وہ لقمان و سقراط کے دُر مکنوں وہ اسرار بقراط و درسِ فلاطوں
ارسطو کی تعلیم سولن کے قانوں پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں
یہیں آکے مہرِ سکوت ان کی ٹوٹی
اسی باغِ رعنا سے بو اُن کی پھوٹی

سیّد خورشید علی

ہندو فنِ حکمت

(ماخوذ از "ہندو سوپیریارٹی" مصنفہ پنڈت ہربلاس سارڈا)

ہندو قوم نے دیگر علوم مثل ہیأت، ریاضی اور صرف و نحو کی طرح فنِ طبابت کو بھی درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اُن میں قوت مشاہدہ بہت زبردست تھی۔ استقلال، ریاضت شاقہ، اور غور و خوض میں وہ بے عدیل تھے۔ اِن قابلیتوں نے ہندوستان جیسے مُلک میں جہاں انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں، اُنھیں علم حکمت کی تحقیق و تدقیق اور نشو و نما میں ایک خاص حیثیت دے رکھی تھی۔ مگر سنسکرت لٹریچر کے ایک بڑے حصہ کے تلف ہوجانے کے باعث ہندوؤں کے طبی کمال کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ فلسفہ اور ادب میں اب تک زمانہ قدیم کی تصانیف موجود ہیں۔ مگر فنِ حکمت چونکہ عملی سائنس ہے، اور مختلف اسباب نے عرصہ دراز سے اسکو گمنامی میں پڑا رہنے دیا اس لئے اس فن کی بے شمار تصانیف زائل ہوگئیں۔ تاہم جو چند کتب اب تک موجود ہیں وہ بھی اُس ترقی کا پتہ دیتی ہیں جس سے زمانہ حال کی ترقیاں سبقت لے جانے کا دعویٰ نہیں کرسکتیں۔ انکے مطالعہ سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ دیگر علوم کی طرح یہ علم بھی ہندوؤں کے دماغ سے پیدا ہوا۔ اور دنیا کی دیگر قومیں اس لحاظ سے بھی ہماری ممنونِ منت ہیں۔

لارڈ ایمپتھل نے جو چند سال گزرے صوبۂ مدراس کے گورنر تھے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا:-

اب ہم پر یہ حقیقت کھلنے لگی ہے کہ ہندو شاستروں میں بھی قوانین صحت موجود ہیں، جو زمانۂ حال کے قوانین کی طرح پختہ اصولوں پر مبنی ہیں اور ہندو قوم کا شیرازہ بند مَنو، حفظانِ صحت کے اصول و قواعد کا بہت بڑا عالم تھا۔

پروفیسر ولسن فرماتے ہیں۔

زمانہ قدیم کے ہندوؤں نے علم حکمت اور جرّاحی میں بہت دستگاہ حاصل کی تھی۔ اور یہ ایک قدرتی بات تھی۔ کیونکہ انکی طبعی فراست و ذکاوت اور صبر آمیز محویت نے ان کی قوت مشاہدہ کو بہت تیز کر دیا تھا، اور اُن کے ملک کی وسعت اور زرخیزی نے انکے مطالعہ اور تحقیقات کے لئے گوناگوں اسباب مہیا کر دیئے تھے۔ وہ تشخیص امراض اور علامات کی تمیز، بہت صحت کے ساتھ کرتے تھے۔ اور ان کا طبّی مبلغ علم بہت وسیع تھا۔

ہندوستان کا مشہور انگریز مورّخ سر ولیم ہنٹر لکھتا ہے۔

ہندوؤں نے فن حکمت کی پوری وسعت کا احاطہ کر لیا تھا۔ انکی قدیم تصانیف میں اجسام کی ترکیب، اعضا، اعصاب، رگ و ریشے، اور شرائین کا تحقیق کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔

ہندو ادویات میں بیشمار اجزا شامل ہیں جو موالید ثلاثہ کے ہر ایک رکن سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اور جنمیں سے اکثر ادویات اب یورپین اطبّا بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ اُن تصانیف میں مرکبات تیار کرنے کے بہت جدت آمیز طریقے بتلائے گئے ہیں اور خوراک اور مقدار کے متعلق جامع ہدایتیں کی گئی ہیں۔

دھنونتری ہندوؤں کے فن طبابت کا آفتاب تھا۔ اُس نے اپنے شاگرد سشرت کو اس فن کی تعلیم دی۔ چرک کہتا ہے کہ مجھے اگنویس رشی نے یہ فن سکھایا۔ سشرت اور چرک یہ دونوں ہندو حکمت کی زندہ جاوید تصانیف ہیں جو اپنے مصنفین کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں نے ممکن ہے فن ادویہ میں دسترس بہم پہنچایا ہو۔ مگر فنِ جرّاحی یورپین ڈاکٹروں کا حصّہ ہے مگر ذیل کے اقتباسات سے واضح ہو جائے گا کہ جرّاحی اور تشریح بدنی میں بھی ہندوؤں نے وہ قدرت حاصل کی تھی جو موجودہ فنِ جرّاحی کے لئے حقارت نہیں بلکہ رشک کا باعث ہے۔

مسٹر ویبر رقمطراز ہیں۔

فنِ جراحی میں بھی ہندوؤں نے مہارت تامہ حاصل کر لی تھی۔ اس صیغہ میں یورپین جرّاح اور ڈاکٹر اس زمانہ میں بھی اُنسے کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ اور فی الواقع انہوں نے ناک اور کان بنانے کا ڈھنگ ہندوؤں ہی سے سیکھا ہے۔

مشہور انگریزی مورّخ الفنسٹن لکھتا ہے:-

ہندوؤں کا فن جراحی اتنا ہی مکمل ہے جتنا کہ اُن کا فن طب۔

مسز مینگ جو سنسکرت لٹریچر سے کامل واقفیت رکھتی ہیں فرماتی ہیں "ہندوؤں کے آلات جراحی بہت تیز اور باریک ہوتے تھے۔ حتٰےکہ وہ بال کو طولاً چیر سکتے تھے"۔

ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر فرماتے ہیں:-

ہندو فنِ جرّاحی میں حسن عمل اور جدّت دونوں باتیں موجود تھیں۔ وہ بلا خون ضائع کئے ہوئے اعضا کی قطع برید کر سکتے تھے۔ معدہ اور فم معدہ میں نشتر لگا سکتے تھے۔ بواسیر کو دور کر سکتے تھے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑ سکتے تھے اور جسم سے خارجی مادّات کو نکالنے میں ہوشیار تھے۔ جرّاحی کا ایک خاص صیغہ ناک اور کان کے لئے وقف تھا۔ وہ بدنما، بھدّے کان اور ناک کی اصلاح کرتے تھے اور بسا اوقات نئی ناک اور نئے کان

بنا دیتے تھے جو یوروپین جرّاحوں نے اب ان سے سیکھا ہے۔شقیقہ کا علاج آجکل ابرو کے اوپر کی پانچویں رگ کو کاٹکر کیا جاتا ہے۔قدیم ہندوؤں نے بھی اس ترکیب کا ذکر کیا ہے۔ وہ جرّاحی کے آلات بنانے میں بہت صفائی سے کام لیتے تھے۔ اور طلبا کو جرّاحی کا عملی تجربہ کرانے کے لئے موم کو میز پر پھیلاکر، یا نباتات کے ریشوں سے، یا مردہ جانوروں کے جسم سے کام لیا جاتا تھا۔ہندو جرّاح فنِ دایہ گری کے اُستاد تھے۔اور نہایت پیچیدہ اور نازک عملیات کو سرانجام دیتے تھے۔جانوروں کے علاج میں انہوں نے بڑی ترقی حاصل کی تھی۔اور ہاتھی گھوڑے وغیرہ جانوروں کے علاج کے متعلق ابتک تصانیف موجود ہیں۔

لارڈ ایمپتھل فرماتے ہیں۔

یہ شاید عام طور پر معلوم نہیں ہے کہ علم طبابت نے ہندوستان ہی میں جنم لیا۔بیشک یہ فخر ہندوستان کو حاصل ہے۔یہ علم اول یہاں سے عرب پہنچا، اور عرب سے یورپ میں داخل ہوا۔سترھویں صدی کے آخر تک یوروپین اطبا اس فن کو عرب کے طبی تصانیف سے حاصل کرتے تھے۔مگر عرب کے حکما نے ہزاروں برس پہلے یہ فن ہندوستان کے مشہور حکما مثلاً دھنونتری، چرک اور سُشرت کے تصانیف سے حاصل کیا تھا۔یہ ایک عجیب بات ہے کہ دنیا کی ترقی کا مرکز مشرق سے مغرب کی سمت چلا۔اور ایسا غائب ہوا کہ مشرق میں اپنے وجود سابقہ کے نشانات تک نہ باقی رکھے۔

سر ولیم ہنٹر لکھتے ہیں۔

عربی فنِ علاج سنسکرت تصانیف کے تراجم پر قائم کیا گیا ہے جو خلفاء بغداد کے زمانہ میں کئے گئے۔یورپ کے حکما سترھویں صدی کے آخر تک عربی حکمت کے دست نگر رہے۔اور ابو سینا اور ابو سرابی کے تصانیف میں چرک کا نام بار بار واقع ہوتا ہے

ممکن ہے اشتباہ پیدا ہو کہ اہل عرب اپنے فن حکمت کے لئے ہندوؤں کے ممنون نہیں۔ذیل کی تاریخی شہادتوں سے غالباً یہ شک رفع ہو جائے گا۔

خلیفہ المنصور نے سنہ ۷۵۳ء اور سنہ ۷۷۴ء کے درمیان دمشق کو چھوڑ کر بغداد کو اپنا مستقر بنایا۔اُس نے سنسکرت کے طبّی اور علمی تصانیف کے ترجمے کرائے۔جن میں ایک نسخہ زہر کے متعلق شنک (یعنی چرک) کا لکھا ہوا، اور ایک کتاب حکمت کی سُشرود (یعنی سُشرت) کی لکھی ہوئی موجود ہیں۔

مسٹر رائل اپنی کتاب "ہندوؤں کا قدیم فن حکمت" میں لکھتے ہیں "ابو سرابی نے جو عرب کا مشہور حکیم تھا چرک کا ذکر کیا ہے۔ اور اُسے اس فن میں سند مانا ہے۔"

ابو رازی نے جو ابو سرابی سے فنِ حکمت میں سبقت لے گیا تھا، اور المنصور کے دربار کا ایک رُکن تھا دو موقعوں پر ہندو چرک کو اپنے بیانات کی تائید میں بطور سند کے پیش کیا ہے۔

شیخ الرئیس بو علی سینا حکما عرب کا سرتاج تھا جونکوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے سُشرت کی بتلائی ہوئی چھ قسموں کا اعادہ کیا ہے۔حتےٰ کہ نام بھی وہی رکھ دیئے ہیں۔

میکس مولر صاحب لکھتے ہیں "فیروز شاہ نے نگر کوٹ

فتح کرنے کے بعد سنسکرت طبی تصانیف کو ایاز الدین خالد سے عربی میں ترجمہ کرایا۔"

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد سلطنت میں اہل عرب ہندو ادویات کو صرف استعمال ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہندو حکما بغداد میں مدعو کئے جاتے تھے اور دربار شاہی میں اعزاز کی جگہ پاتے تھے۔ ابو عصیبہ بیان کرتا ہے کہ منکا ایک ہندو تھا جو فن طب میں ماہر اور سنسکرت زبان کا عالم تھا۔ وہ ہندوستان سے عراق آیا۔ خلیفہ ہارون رشید کو ایک مرض سے نجات دی۔ 'زہر' کے متعلق چرک کی ایک کتاب کو فارسی میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانہ میں اور کئی ہندو حکیموں کے بغداد میں رہنے کا ذکر کیا گیا ہے۔"

ہندو کیمسٹری کا عالم مورخ لکھتا ہے "رس رتن سمچے ہندو فن حکمت اور ادویات کی ایک جامع تصنیف ہے۔ اس کے مضامین کی عالمانہ ترتیب، اور حسن اسلوب پر کسی زمانہ حال کی تصنیف کو بھی فخر ہو سکتا ہے۔"

ناگ ارجن بودھ زمانہ کا ایک بڑا مشہور علم کیمیا کا ماہر ہو گزرا ہے۔ اس صنف میں اس نے ایک بیش قدر تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک ایسا مرکب تیار کیا تھا جس کے استعمال سے انسان کئی صدیوں تک زندہ رہ سکتا تھا عمر کا دل و دماغ اور جسم پر کچھ اثر نہ ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر رائے فرماتے ہیں "ہم نے جو شہادتیں پیش کی ہیں ان سے اس امر کے متعلق کوئی شک نہیں باقی رہ سکتا کہ پارہ کو بطور دوا کے استعمال کرنے کی خصوصیت حاصل کرنے میں ہندو مقدم تھے۔ معدنیات کا اندرونی استعمال انہیں کی ذات سے عام ہوا۔ اور وہ اس لحاظ سے موجد کہلائے جانیکا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ چرک اور سشرت نے معدنیات کے فوائد خوب دل کھول کر بیان کئے ہیں"

یونان میں پلائنی کے زمانہ تک پارہ کا استعمال غیر معلوم تھا۔ پلائنی نے خود پارہ کو زہر بتلایا ہے۔ معدنیات میں معالجانہ خصوصیات کی تحقیق، اور ان کا استعمال ہندو کمال فن کی زبردست دلیل ہے۔

مورخ الفنسٹن لکھتا ہے "ہندو وہ پہلی قوم تھے جنہوں نے معدنیات کا اندرونی استعمال ایجاد کیا۔ وہ لوگ صرف پارہ ہی نہیں، بلکہ بعض حالتوں میں سنکھیا بھی تجویز کیا کرتے تھے۔ انکی کتابوں میں ۱۲۷ آلات جراحی کے نام دئے گئے ہیں:"

مسز اینی بی سنٹ نے جنوری ۱۹۰۶ء میں بمقام کلکتہ اپنی ایک تقریر میں فرمایا۔

> طبی اور کیمیائی علوم میں تم لوگوں نے (یعنی ہندوؤں نے) بہت ترقی کی تھی۔ علم شفا میں تم نے اور بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ہندوستانی ادویات، خواہ وہ یونانی ہوں یا مصری، مغرب کے فن حکمت پر فضیلت رکھتی ہیں۔

ہندو فن حکمت کی داد جس کشادہ دلی سے لارڈ ایمپتھل نے دی ہے اس کا یہاں اعادہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

> اسلامی فتوحات کے ساتھ علم حکمت کا بہت کچھ حصہ ہندوستان میں واپس آیا جو صدیوں پہلے اس ملک سے نکل چکا تھا۔ اب انگریز لوگ اس علم کا اور بھی زیادہ حصہ واپس لا رہے ہیں۔ جب ہم آب رسانی کی تجویزیں کرتے ہیں، جب ہم شفاخانے قائم کرتے ہیں، اور طبی مدارس کھولتے ہیں، جب ہم پلیگ کے انسداد کے لئے قوانین بناتے ہیں اور جب ہم صحت عامہ کی نگرانی رکھنے کے لئے حکام کو تاکید کرتے



رام چندر جی اور سورپ نکھا

انڈین پریس الہ آباد

ہیں تو ہم کوئی نئی کوئی انوکھی بات نہیں کرتے۔ ہم صرف وہی کرتے ہیں جو ہزاروں برس پہلے کیا جاتا تھا۔ اور جسے اب بجز مورخ، اور ماہرین آثار قدیمہ کے اور سب لوگ فراموش کر بیٹھے ہیں۔

چیچک کے ٹیکا لگانے کا رواج یورپ میں ڈاکٹر جنر نے ڈالا۔ وہ اس کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ ٹیکا لگانے کا رواج ہندوستان میں ہزارہا برس پہلے معلوم تھا۔ ہندو حکمت کے خدا دھنونتری نے صاف الفاظ میں لکھا ہے۔

گائے کے تھن پر کی پھنسیوں کا مواد ایک نشتر کے نوک پر لے لو۔ اور اس نشتر کو کندھے اور کہنی کے درمیان بازو میں چبھا دو۔ یہاں تک کہ خون نکل آئے۔ تب اس مواد کے خون میں ملنے سے چیچک کا بخار آجائے گا۔

یہ اگر چیچک کا ٹیکا نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی طرح اور کتنی ہی علمی اور عملی حقیقتیں جنہیں اہل یورپ اپنا ایجاد سمجھے بیٹھے ہیں فی الواقع بازیافت ہیں۔

لارڈ ممدوح نے اپنی اسی تقریر میں آگے چلکر فرمایا۔

میں یہاں ایک تازہ تحقیقات کا تذکرہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا اور وہ یہ ہے کہ طاعون کے زمانہ میں مکان کو خالی کردینا اور کیمیائی طریق سے اس کی صفائی کرانا ان ہدایتوں سے مطلق مختلف نہیں ہے جو ہندو شاستروں میں کی گئی ہیں۔

نواب رائے

غزل فارسی

(از تازہ افکار گوہر بار علامۂ عصر شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی دامت فیوضہم)

رفتیم و گرفتیم عیار مہ کنعاں　　حاشا کہ بہ خمیازۂ ذوق نظرے نیست
بے کار تر از او نہ بود در ہمہ عالم　　آں دست کہ در حلقۂ طوق کمرے نیست
با نالہ خوش افتاد مرا، ور نہ تو دانی　　کز نالہ و زاریم امید اثرے نیست
نہ ذوق نگاہے و نہ ہنگامۂ عشقے　　اے وائے بہ شہرے کہ در و فتنہ گرے نیست

قربان دہان و لب آں شوخ کہ فرمود
شبلی "غلط است ایں کہ مرا با تو سرے نیست"

شبلی

خواجہ حیدر علی آتش (۲)

منشی اشرف علی اشرف نے آتش کی تاریخ وفات خوب لکھی تھی جسکا مادہ "بمرد شاہ سخن" ہے۔ خواجہ محمد علی جوش کو بزرگ اور نامور باپ کے مرنے کا بہت کچھ صدمہ ہوا اور صحبت مشاعرہ میں جانا موقوف کردیا۔ ابھی دو برس نہ گزرے تھے کہ یہ ہیضہ میں دفعتہً مبتلا ہوئے اور دو دن میں تمام ہو گئے۔ رشک مرحوم نے ان کے انتقال کی تاریخ لکھی ہے

کجائی تو خواجہ محمد علی — زہیضہ گمر رفتی افسوس حیف
دلت آتشِ داغ بابا بسوخت — چہ بریاں جگر رفتی افسوس حیف
پے خدمتِ خواجہ حیدر علی — ز دنیا بدر رفتی افسوس حیف
چنیں گفت تاریخ فوتِ تو رشک — بنزد پدر رفتی افسوس حیف

شیخ محمد جان شاد پیرو میر مرحوم فرماتے تھے کہ آتش کو ہم لوگ بمقتضائے محبت "خوجی" کہتے تھے۔ انکی شاعری میں آمد کا بہت حصہ ہوتا تھا۔ جو کچھ کہتے تھے بے ساختہ کہتے تھے۔ ہر وقت شعر کی دُھن میں محو رہتے تھے۔ امیروں سے بطمع دنیا نہ ملتے تھے۔ غریبوں سے بے رخی نہ کرتے تھے۔ بانکے تھے اور بانکوں سے ملنا پسند کرتے تھے۔ بہادروں کے کارنامے شوق سے سنتے تھے۔

آتش کے برابر کے شاعروں میں اسوقت شیخ امام بخش ناسخ کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے لیکن اس وقت کے اور شاعر بھی ان سے برابری کا دعویٰ رکھتے تھے، گو زمانہ نے ان کو شہرت نہ دی۔ ان سب میں زیادہ خصوصیت سے (۱) نواب عاشور علی خان عاشور کا نام لیا جاتا ہے جو شاعر گر مشہور تھے اور مصحفی کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے؛ نواب طالب علی خاں بہادر عیشی تھے جو فارسی اردو دونوں میں قادر الکلام تھے؛ سید حسن عسکری عرف میر کلو عرش خلف میر تقی میر؛ نواب مرزا محمد تقی خاں بہادر ہوس خلف نواب مرزا علی خاں بہادر دہلوی؛ میر تقی ترقی؛ میاں مخمور؛ میاں مسرور؛ میاں دلگیر وغیرہ لیکن آتش کی خوش گوئی اور لطافت زبان کا سب لوہا مانے ہوئے تھے اور ان کے سامنے منہ نہیں کھول سکتے تھے۔

آتش کا دیوان انہیں کی زندگی میں مرتب ہو کر چھپ چکا تھا۔ یہ غلط ہے کہ ان کا کلام تلف ہو گیا۔ ہمارے پاس دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۲۶۰ھ علوی پریس کا موجود ہے جس میں لکھا ہے۔

اگرچہ سابقاً روبروے مصنف زیب طبع یافتہ بود حالا باردیگر بسعی موفور و کوشش مشکور غزلیات بقیہ را در دیوان دوم اضافہ نمود و مع قطعات وفات مصنف ترتیب دادہ بتاریخ پانزدہم جمادی الاولی سنہ ۱۲۶۰ھ حلیہ اختتام پذیرفت

آتش کی شاعری نے زبان میں فصاحت اور سلاست کا عمدہ نمونہ دکھایا ہے۔ سلک نظم میں بحر فصاحت کے موتی پروئے ہیں۔

شاہی زمانے میں بانکوں کی قدر تھی اور بہادری کے

(۱) اس مضمون کا اول حصہ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء کے ادیب میں شائع ہوا ہے۔

کارنامے عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ لکھنؤ کے نازک مزاج تنزیب کے کرتوں پر تلوار کھانے میں مشہور تھے مگر بات اُٹھانا دشوار تھی۔ ہتھیار بندی کا عام رواج تھا۔ اچھے تلوار یئے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آتش بھی بانکپن اور آزاد خیالی کا جوہر ساتھ لائے تھے طبیعت جنگ جو اور شوریدہ سر تھی۔ فصاحت اور بلاغت کا ملکہ فطرتی تھا۔ بظاہر ایک فرمانروا کے محکوم تھے لیکن قانون کی نرم پالیسی نے ہر ایک کو خود مختار اور آزاد بنا رکھا تھا۔

عرب کے شاعروں کی طرح جو حالت پیش آتی تھی اور خیالات پیدا ہوتے تھے ان کو اصلیت اور جوش و خروش کے ساتھ ادا کر دیتے تھے۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں بانکپن اور آزادی جانبازی شجاعت کے مضامین عمدہ پہلو سے ادا ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آتش صرف ایک فنی شاعر تھے نہ کسی کی مدح میں کبھی قصیدہ لکھا نہ تخت نشینی کی تاریخ کہی نہ مثنوی نہ رباعی نہ قطعہ نہ سلام نہ مرثیہ۔ مگر غزل گوئی کے بادشاہ تھے پُرانی غزل گوئی کا رنگ بدل دیا۔ اداے مطلب میں نمایاں ترقی کی جو انکے کلام سے ظاہر ہے:۔

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

حباب آسا (حباب کی طرح) میں دم بھرتا ہوں (بار بار ذکر کرتا ہوں) تیری آشنائی کا (تیری محبّت کا) نہایت غم ہے (بہت غم ہے) اس قطرے کو دریا کی جدائی کا۔ (اس قطرے کو دریا سے جدا ہونے کا)۔

لطف زبان تو یہ ہے کہ "دم بھرتا ہوں" ایک ایسا فصیح اور جامع محاورہ ہے جس کے بہت سے معنی ہیں۔ دم بھرنا کے لغوی معنی سانس اندر کھینچنے کے ہیں۔ حباب کے لئے دم بھرنے کا لفظ بہت پر لطف آیا ہے کہ اس میں بھی جب ہوا بھر جاتی ہے تو پھول جاتا ہے اور دم بھرنے کے معنی دعوی محبت کرنے کے بھی ہیں جو شاعر کا مقصود ہے۔ آشنائی کے معنی محبت کے ہیں لیکن آشنا پیراک کو کہتے ہیں اس رعایت سے محبت کی جگہ آشنائی کا استعمال اچھا معلوم ہوتا ہے۔ معنوی خوبیاں یہ ہیں کہ ہمہ اوست کے مسئلہ کو اس زبردست شاعر نے دو مصرعوں میں طے کر دیا ہے۔ اپنی ذات کو قطرہ بنایا ہے، اور خدا کو دریا قرار دے کر مسئلہ وحدت کو حل کیا۔ آسا کا لفظ غلط تو نہیں ہے لیکن آج کل اسکا استعمال بہت کم ہے۔ اب اُردو زبان سے فارسی اور عربی کے دقیق الفاظ نکلتے جاتے ہیں آجکل حباب کی طرح اور حباب کے مانند بولتے ہیں۔ یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ شاعر نے ضرورت شعری سے مجبور ہو کر اس کا استعمال کیا ہے طرح اور مانند کا لفظ اس مصرع میں فصیح پہلو سے آنا مشکل تھا۔

تعلق روح سے مجکو جسد کا ناگوارا ہے
زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

اس شعر میں یہ نصیحت کی ہے کہ محبت کرو تو اس کو نبھاؤ ناپائدار دوستی اچھی نہیں ہے جو اگلی وضعداریوں کے خلاف تھی۔

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

حسن پری ہمارے معشوق (معشوق حقیقی) کا ایک جلوۂ مستانہ ہے جو اس کا دیوانہ ہے وہی ہشیار ہے۔ مصرعہ اولے میں ہمہ ازوست کے مسئلے کو حل کیا ہے یعنی حسن پری بھی اسی کے جلوۂ مستانہ میں سے ہے دیوانہ (شیدا) جو اسکا

شیدا ہے وہی ہشیار ہے۔ یہاں مراد ہے اہل اللہ سے۔ لفظی خوبیاں تو یہ ہیں کہ حسن پری اور جلوۂ مستانہ سے کوئی اچھا لفظ نہیں ملسکتا اور ہشیار اور دیوانے کی رعایت ہے۔ معنوی خوبیاں یہ ہیں کہ تصوف کے ایک وسیع مسئلے کو مثال میں سمجھا دیا۔ لیکن عیب یہ ہے کہ اس میں (کہ) زائد اور ضرورت شعر کے لحاظ سے آیا ہے اور چھوٹی سی تعقید بھی ہے یعنی مستانہ اس کا ہے جانانہ اس کا ہے چاہئے تھا ؎

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اس کا

گل عدم سے ہستی میں ہمہ تن گوش آتے ہیں۔ نالۂ بلبل نہیں ہے اسی معشوق حقیقی کا نسانہ ہے۔ گل کو گوش سے بہت نفیس اور نازک تشبیہہ دی ہے جو استادی کا اظہار کر رہی ہے ؎

شکرانۂ ساقیِ ازل کرتا ہے آتش
لبریزئے شوق سے پیمانہ ہے اس کا

آتش ساقیِ ازل کا شکرانہ کرتا ہے کہ اس کا پیمانۂ شوق سے لبریز ہے یعنی مست مئے شوق رہتا ہے۔ مقطع نہایت صاف اور فصیح ہے ؎

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

اس شعر کی بے ساختہ آمد قابل دید ہے۔

ہنر سے نیاریوں کے حال یہ ظاہر ہوا ہم کو
مقدر میں جو دولت ہو تو زر ہو خاک سے پیدا

اس شعر میں سب سے زیادہ یہ خوبی ہے کہ اس میں اس زمانے کے تمدن کا حال معلوم ہوگیا۔ نیاریئے ایک پیشہ ور غریب لوگ ہیں جو سنار کے یہاں کی خاک کوڑہ بننے والوں کے کارخانے کی خاک اور برسات میں نالے مہری کے کنکر پتھر لے کر کونڈے میں رکھکر پانی میں چھانتے ہیں۔ اس میں سے کچھ چاندی سونا جو ان کے مقدر میں ہوتا ہے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی ان کا پیشہ ہے ؎

کیا ہے اپنے غنچہ سے دہن میں تونے جو اس کو
شمیم گل ہوئی ہے ریشۂ مسواک سے پیدا

کیا ہے (پھیرا ہے) اپنے غنچہ سے دہن میں تونے جو اسے پھیرا ہے تو ریشۂ مسواک سے شمیم گل پیدا ہوئی ہے۔ یا گل کی خوشبو آنے لگی ہے۔ اول تو اس میں ایک نازک محاورہ ہے کرنا (پھیرنا) کے معنی پر۔ ریشۂ مسواک سے شمیم گل کا پیدا کرنا کتنی نازک بات ہے۔ دوسرے مسواک کرنے کے طریقے کو کس خوبی سے بتایا ہے جس میں ہندوستان کے طرز معاشرت کا بیان کرنا منظور تھا۔ یہ باتیں سوا سے شعرائے عرب کے عجم کے کلام میں بھی نہیں پائی جاتیں۔

زلف کے حلقے میں اُلجھا سبزہ گوشِ یار کا
ہوگیا سنگ زمرد خال چشم مار کا

زلف کے حلقے میں (خم زلف میں) سبزہ (آویزۂ سبز) جو کان کی بالی میں پہنا جاتا ہے یا بندوں میں پڑا ہوتا ہے سنگ زمرد ایک قیمتی جواہر ہے چشم مار (حلقۂ زلف) سے مراد ہے۔ گوش یار کا سبزہ خم زلف میں الجھ گیا سنگ زمرد خال چشم مار ہوگیا کتنی نازک تشبیہہ ہے اور کس قدر بلند پروازی کی ہے۔

پھول جو ہے اپنے گلشن کا سپر کا پھول ہے
ہر شجر اس باغ میں لاتا ہے پھل تلوار کا

شاعر نے اپنی بہادری اور بانکپن کا کس نفیس پیرائے میں

بیان کیا ہے جس سے لوگوں کو اسکی طبیعت کا اندازہ ہوگیا۔

تواضع دشمنِ جاں کی زیادہ قتل کرتی ہے
خم شمشیر معشوقوں کا نہوڑانا ہے گردن کا

نہوڑانا (جھکانا) جو جان کے دشمن ہیں انکی زیادہ تواضع بھی قاتل ہے معشوقوں کا گردن جھکا لینا شمشیر کا جھکنا ہے جو بغیر قتل کئے نہیں اٹھتی۔ مراد یہ ہے کہ معشوقوں کا ناز بھی آفت ڈھاتا ہے یہ صائب کے اس شعر کا جواب ہے ؎

بر تواضع ہاے دشمن تکیہ کردن ابلہی است پاے بوس سیل از پا افگند دیوار را

کیا عمدہ مثال ہے۔ پھر اس فصاحت سے ادا کیا ہے جس نے انکو اپنے معاصرین میں ممتاز بنا دیا۔

ادب تا چند اے دست ہوس قاتل کے دامن کا
سنبھل سکتا نہیں اب دوش سے بوجھ اپنی گردن کا

بندش کی صفائی قابل دید ہے۔

کوا اپنا آگے مردانِ خدا کے چل نہیں سکتا
کفِ داؤد میں یکساں ہے عالم موم و آہن کا

اسی شاعری نے انکو صائب بنا رکھا تھا۔

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

کتنی پاکیزہ بندش ہے۔

شاہراہِ ہستیِ موہوم میں وہ چال چل
اپنی آنکھوں کو بچھادیں دوست دشمن زیر پا

شاہراہ ہستیِ موہوم میں (دنیا میں) وہ چال چل (وہ طرز اختیار کر) دوست دشمن اپنی آنکھیں زیر پا بچھادیں (بے انتہا عزت کریں) اس مضمون کو شاعر نے کسی قدر تعقید کے ساتھ نظم کیا ہے لیکن تخئیل بہت پاکیزہ ہے۔ اور نصیحت کی نصیحت۔ آتش نے بہ تقلید شعرائے عجم اخلاقی بہت سے شعر لکھے ہیں جنمیں عفت شجاعت ہمت استقلال توکل استغنا کا بیان نہایت شوخ پیرائے میں ہے۔

ملک الموت نے پیری میں کرم فرمایا
کشت پختہ ہوئی آتش کہ محصل دوڑا

شاہی میں زمینداروں سے سرکاری تحصیل یوں لی جاتی تھی۔ جسوقت کھیتی تیار ہوتی تھی عامل کی طرف سے تحصیلدار آتا تھا اور پیداوار کا چہارم حصہ حق سرکار لیا جاتا تھا۔ اسی سبب سے اس زمانہ کے زمیندار خوش حال تھے۔ خواجہ صاحب نے اسی رسم کا بیان اپنے مقطع میں کیا ہے کہ ملک الموت نے پیری میں قدم رنجہ کیا۔ جب کشت پک گئی (ضعیفی آئی) تو محصل (چوتھائی بٹانے والا یعنی ملک الموت دوڑا۔ دنیا کی بے ثباتی کا بیان کس اچھے پہلو سے کیا ہے۔

ہمیشہ شام سے ہمسائے مر رہے آتش
ہمارا نالۂ دل گوش کو فسانہ ہوا

ہمسائے (پڑوسی) مر رہے (سو رہے) ہمیشہ شام سے پڑوسی سو رہتے ہیں ہمارا نالۂ دل انکے کانوں کو فسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگلے زمانہ میں امرا نواب زادے نیند آنے کے لئے داستان گو قصہ خواں نوکر رکھتے تھے رات کو یہ بستر استراحت پر دراز ہوئے اور اس نے دوزانو ادب سے بیٹھکر دل آویز داستان شروع کی۔ رئیس کو اس کے سرور میں نیند آگئی۔ داستان گو رخصت ہوگیا۔ ہر ایک رئیس و امیر کے یہاں ایک داستان گو ضرور نوکر ہوتا تھا۔ آتش نے اسی طرز معاشرت کا بیان کیا ہے۔

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

منھ چڑھانا (ٹیڑھا منھ کرنا) اک معشوقانہ ادا ہے صاحب معشوق

سے مراد ہے زبان بگڑی تو بگڑی (زبان خراب ہوئی تو ہوئی) خبر لیجئے دہن بگڑا یعنی مُنھ ٹیڑھا ہو گیا۔ اس شعر کے محاورے اور زبان قابل دید ہے لیجئے ذرا دبکڑا آیا ہے جو اب متروک ہے۔

ایذا جو ہوا اس خال و گیسو سے تعجب ہے
وہ افعئی بے دنداں بے نیش یہ عقرب تھا

اللہ وغنی اس جدت تشبیہ کو دیکھئے۔ گیسو کو افعی تو سب نے کہا ہے مگر افعی بے دنداں آتش کا حصہ تھا۔ کیسی نازک تشبیہ دی ہے اور خال کو عقرب بے نیش کہنا بھی نئی تشبیہ ہے۔ نازک خیالی کی حد کر دی۔

اللہ رے ہمارا تکلف شبِ وصال	روغن کے بدلے عطر جلایا گلاب کا
صیاد نے تسلّیِ بلبل کے واسطے	کنج قفس میں حوض بھرا ہے گلاب کا

ان شعروں سے طبیعت کی نفاست کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

لالہ رو کہکر لگاتے ہیں گل انداموں کو داغ
روز محشر شاعروں کا پوست کھینچا جائیگا

داغ لگانا (عیب لگانا) پوست کھینچنا عہد سلف کی ایک سخت سزا۔ بادشاہ نہایت سنگین مجرم کی کھال کھنچوا کر بھس بھروا کر شارع عام پر رکھ دیتا تھا کہ اور لوگوں کو عبرت ہو۔ لیکن یہاں شاعر نے مذاق طبیعت سے ایک سنگین سزا کا بیان کر کے تمدن سلف دکھایا ہے:

سامنے آئینہ رکھتے تو غش آ جاتا
تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا

کتنا صاف شعر ہے۔

گلزارِ لطف و خلق شگفتہ رہے مدام
اس باغ کی بہار الہٰی خزاں نہ ہو

یہ بھی اخلاقیہ اشعار کا ایک نمونہ ہے۔

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

داتا رندانِ بادہ نوش کے محاورے میں خدا کو کہتے ہیں اور کبھی سخی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

گور میں بھاگ اہل دنیا سے	خلوت اس انجمن سے بہتر ہے

گور کو خلوت سے اور دنیا کو انجمن سے کیا اچھی نسبت دی ہے۔

طور جس برق تجلا نے کیا خاک سیاہ
تیرے آتش کدۂ حسن کی چنگاری ہے

کسقدر بلند پروازی کی ہے۔

لاش پر لاش نکلتی ہے ترے کوچے سے
کیا تماشا ہے کہ پھر بھیڑ نہیں چھٹتی ہے

تیری گلی سے لاش پر لاش نکلتی ہے کیا تماشا ہے (کیا طلسمات ہے) کہ پھر بھیڑ نہیں چھٹتی۔ کوئے یار میں عاشقوں کی کثرت کو کتنے اچھے پیرائے میں دکھایا ہے مگر ردیف ذرا اٹھتی ہوئی نہیں ہے۔

گل ہر اک ساغر بکف بلبل ہر اک نغمہ طراز
سیرِ باغ آتش مجھے ایمائے نادنوش ہے

ہر ایک پھول ساغر بکف ہے (یہ مشابہت ہے شکل گل سے) بلبل گا رہی ہے باغ کی سیر گویا اشارہ ہے بادہ نوشی کا۔

تری ابروے پیوستہ کا عالم میں فسانہ ہے
کسی استاد شاعر کی یہ بیتِ عاشقانہ ہے

ابروے پیوستہ کو بیت عاشقانہ سے تشبیہ دی ہے۔

پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

پیام بر کے استعمال میں حال کے شعرانے بہت غلطی کی ہو کہ اسکو نامہ بر کے معنی پر بھی باندھ گئے ہیں بپیام بر کے معنی زبانی پیام لے جانے والا۔ مطلب یہ ہے کہ اچھا ہو اکہ پیام بر نہ ملا غیر کی زبان سے اظہار مطلب کیا کرتے ہ؟

نامرد آسماں سے گوارا ہے کسکو جنگ
آتش سپر کو چیرئیے تلوار توڑ ئیے

اس قسم کی مفاخرت عرب کی شاعری میں تو بہت کچھ ہے اُردو کی شاعری میں صرف آتش کے کلام میں ملتی ہے جسمیں شاعر نے اپنی بہادری کا جوش وخروش سے اقرار کیا ہے یعنی آسمان نامرد ہے اس لئے کہ دور سے ظلم کرتا ہے سامنے نہیں آتا پھر اس سے مقابلہ کرنا کیا بہتر ہے۔ سپر اور تلوار کو توڑ کر پھینک دیجئے اس لئے کہ بانکے بانکوں سے لڑتے ہیں۔

کوہِ غم ٹوٹنے پر آہ ہے یاں کفر فی
ٹھیس سے کاسۂ چینی کو فغاں کرنے دو

کوہ غم ٹوٹنے پر (غم کا پہاڑ گرنے پر) آہ ہے یاں کفر فی (آہ کرنا ہمارے لئے ہلکا پن ہے) ٹھیس (ٹھوکر) سے کاسۂ چینی کو (چینی کے پیالے کو) فغاں کرنے دو (چیخنے دو)۔ لفظی خوبیاں تو یہ ہیں کوہ غم ٹوٹنا فصیح محاورہ ہے (ٹھیس) ایک جامع لفظ ہے جس کے معنی دو چیزوں کا باہم ٹکرانا ہیں۔ ٹھوکر لگ جانا چھو جانا۔ معنوی خوبیاں یہ ہیں کہ عاشق اپنے استقلال کا بیان کرتا ہے کہ اگر کوہ غم بھی ٹوٹ پڑے تو ہم آہ کرنا حرام جانتے ہیں یہ چینی کے پیالے ہیں جو ذرا سی ٹھوکر سے چیخ اٹھتے ہیں۔ عیب یہ ہے کہ یاں اب متروک ہوگیا ہے۔ اس کی جگہ (یہاں) بولتے ہیں اسی کو فصیح جانتے ہیں۔

غرض آتش کے کلام میں تشبیہات کی لطافت، استعارات کی نزاکت، رنگ رنگ کے خیالات، تصوف کی جھلک، ہمت، توکل، استغنا کے عمدہ مضامین، فلسفہ، معاشرت، اور خانگی زندگی کی خصوصیات، زمانہ کی رفتار، گفتار، نشست برخاست، وضع قطع، بود و ماند کے طریقے، زندگی کی ضرورتیں، جذبات انسانی، مناظر قدرت، صحرا، جنگل، سبزہ زار، آب رواں، شجاعت، جانبازی کی جیتی جاگتی صورتیں نظر آتی ہیں جنکا مقابلہ کرنے میں ان کے معاصرین عاجز تھے۔ اس دعوی کے ثبوت میں ہم ان کے بعض منتخب اشعار پیش کرتے ہیں:۔

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے   موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں ہمکو   کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

محبت کا تری بندا ہر اک کو اے صنم پایا   برابر گردن شاہ و گدا کو ہم نے خم پایا

سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں   غنیمت جان جو آرام تونے کوئی دم پایا

شام سے ڈھونڈا کیا زنجیر پھانسی کے لئے   صبح تک سایہ نے خیال گیسوے پیچاں کیا

مری آنکھوں کے آگے آئیگا کیا جوش میں دریا   ہمیشہ صورت ساحل ہے یاں آغوش میں دریا

جب سے شیطان کا احوال سنا ہے میں نے   پائے بت پر بھی ارادہ ہے جبیں سائی کا

اے فلک کچھ تو اثر حسن عمل میں ہوتا   شیشہ اک روز تو قاضی کی بغل میں ہوتا

عرش کی سیر ریاضت نے مجھے دکھلائی   دخل مزدور ہے سلطاں کے محل میں ہوتا

نہ سنی یار نے اک بات سخن سازوں کی   رہ گئے کھول کے منہ مفسدہ پرداز اپنا

یاد آتی ہیں ادائیں جو تری اے محبوب   بھول جاتے ہیں حسینان جہاں ناز اپنا

خبر اول و آخر نہیں مطلق آتش
نہ تو انجام ہے معلوم نہ آغاز اپنا

پھول جو ہوا ہے گلشن کا سپر کا پھول ہے   ہر شجر اس باغ میں لاتا ہے پھل تلوار کا

اے صنم عاشق سے رو پوشی نہیں لازم تجھے   پردہ موسیٰ سے نہیں اللہ کو دیدار کا

ادب تا چند اے دست ہوس قاتل کے دامن کا   سنبھل سکتا نہیں اب دوش سے بوجھ اپنی گردن کا

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر ۔ دل سے دشمن کی عداوت کا گلا جاتا رہا
عالم منطق مصور ہو تری تصویر کا ۔ منھ کتابی قطبی ہے خط حاشیہ ہی میر کا
برہنہ آیا تھا یاں عدم سے برہنہ یاں سے چلا عدم کو
نہ بوے کافور مین نے سونگھی نہ داغ مجکو لگا کفن کا
خراب مٹی نہو کسی کی کوئی نہ مردود دوستاں ہو
جدا ہوا شاخ سے جو پتا غبار خاطر ہوا چمن کا
شیریں کے شیفتہ ہوے پرویز و کوہکن ۔ شاعر ہوں مین یہ کہتا ہوں مضمون لڑ گیا
آتش نہ پوچھ حال تو مجھ دردمند کا
سینے میں داغ، داغ میں ناسور پڑ گیا
یہ دل لگانے میں مین نے مزا اٹھایا ہی ۔ ملا نہ دوست تو دشمن سے اتحاد کیا
سبزہ بالاے ذقن دشمن ہی خلق اللہ کا ۔ رہرووں کی موت ہی خس پوش ہونا چاہ کا
نہ رلا مجکو تو اے دوریِ کوے محبوب ۔ راہ میں ظلم مسافر کو ہے باراں ہونا
ماتم دریادلاں شادی تنک ظرفونکی ہی ۔ گریۂ مینا ہے باعث خندہاے جام کا
سنتا ہوں تختہ پھولا ہی نرگس کا باغمیں ۔ آنکھیں لڑائے جو ارادہ ہی جنگ کا
آدمی کو موت کے آنے کی لازم ہی خوشی ۔ عید ہی جس روز چھٹکارا ہوا محبوس کا
دانت ہلتے ہیں ہوے ہیں موے سر سارے سفید
گور ہنستی ہے سمجھکر مجکو شایاں مرگ کا
زعم میں اپنے یہ نافہم جو استاد ہیں سب ۔ معترض ہوجئے تو قابل ایراد ہیں سب

قاتل اپنا جو کرے گنج شہیداں آباد ۔ دہن زخم کہیں خانۂ احساں آباد
منکر ہیں ذات صانع عالم کے دہریئے ۔ نافہموں کا عمل ہے فقط لا الہ پر
مرے صنم کا کسی کو مکاں نہیں معلوم ۔ خدا کا نام سنا ہی نشاں نہیں معلوم
رفیق حال برے وقت میں نہیں کوئی ۔ شریک جنگ میں شمشیر کا نیام نہیں
صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی ۔ سا کھو جلا ہی کیا کیا پھولا جو ڈھاک بن میں
ممکن نہیں ہی دوسرا تجھ سا ہزار میں ۔ ہوتا ہے اک بہشت کا دانہ انار میں
شرف بخشا گہر کو صرف کرکے تو نے زیور میں ۔ نگیں کو نام نے تیرے بٹھایا خانۂ زر میں
محبت سے بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو ۔ جھکاتی ہی ہماری عاجزی سرکش کی گردنکو
کام ہمت سے جوانمرد اگر لیتا ہے ۔ سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے
بے اعتبار نقش و نگارِ زمانہ ہے ۔ اک رنگ پر ہوا نہیں رہتی ہے باغ کی
خدا کی یاد جوانی میں غافلو کر لو ۔ وگرنہ وقت فضیلت تمام ہوتا ہے
حسن وہ شے ہے کہ پتھر میں بھی کرتا ہی اثر ۔ چشم عاشق کی طرح آئینے حیراں ہوگئے
تم فاتحہ بھی پڑھ چکے ہم دفن بھی ہوے ۔ بس خاک میں ملا چکے چلئے سدھاریئے
خوب روئے حال پر اپنے وطن کا سنکے حال ۔ کوئی غربت میں جو آنکلا ہمارے شہر سے
بیوفائی کا اگر عیب نہوتا تم میں ۔ اے بتو سجدہ خدا کو نہ مسلمان کرتے
باغ جہاں میں گل کی قناعت ہی جائے رشک
عمرِ دو روزہ ایک قبا میں تمام کی

عشرت لکھنوی

آئینہ عبرت

اس کتاب کو بنگالہ کی ایک معزز تعلیم یافتہ خاتون، جناب اختر بانو سہروردیہ بیگم صاحبہ نے کسی انگریزی کتاب سے ترجمہ کرکے شائع فرمایا ہے۔

چونکہ یہ کتاب کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہوچکی ہے اس لئے وہ ہماری پوری توجہ کی مستحق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طبقۂ نسواں میں جناب اختر بانو بیگم صاحبہ ایک نام برآوردہ اور قابل قدر اہل قلم ہیں۔ آپ کا انداز بیان نہایت سُلجھا ہوا اور موثر ہوا کرتا ہے۔ جن واقعات اور جذبات



جارج میڈیکل کالج - لکھنؤ

انڈین پریس الہ آباد

کو بیان فرماتی ہیں اس کی سچی تصویر کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ لیکن زبان کے لحاظ سے، مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ جابجا روزمرّہ اور محاورات کی ایسی مکروہ غلطیاں ہیں کہ زبان اُردو کی فصاحت اُن کی تاب نہیں لاسکتی ہے۔ بیگم صاحبہ بنگالہ کے ایک معزز خاندان سے علاقہ رکھتی ہیں اور آپ کی مادری زبان غالباً بنگلہ ہے لیکن اردو انشا پردازی میں پھر بھی ایسی مہارت بہم پہنچائی ہے کہ اچھی خاصی اُردو لکھ لیتی ہیں۔ آپ نے "آئینۂ عبرت" کے علاوہ اور بھی کتابیں لکھی ہیں جن میں کوکب دری، تعلیم النسا، سلکِ مروارید، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ "آئینۂ عبرت" کو میں نے نہایت دلچسپی سے پڑھا ہے اور اس کے ہر پہلو پر گہری نگاہ ڈالی ہے۔ قبل اسکے کہ میں اس کتاب کی نسبت اپنی راے ظاہر کروں، بیگم صاحبہ کی اس جدید اشاعت پر دل سے مبارکباد کہتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ آپ کی پرزور تحریریں تعلیم نسواں میں بکارآمد ثابت ہوں گی، اور ہمارے ملک کی پڑھی لکھی ہوئی عورتوں کو تصنیف وتالیف کی طرف توجہ دلانے میں چراغ ہدایت کا کام دیں گی۔

قابل مولفہ نے اپنی کتاب کا نام نہایت خوش اسلوب اور پرمعنی رکھا ہے جس سے پورے مضمون کا خلاصہ اور اسکے دردانگیز رُوداد کی تصویر دکھائی دے جاتی ہے۔ اس کتاب میں بیگم صاحبہ نے ایک نادار شریف بی بی کی پُردرد داستان کو بیان فرمایا ہے جس کا محض خلاصہ میں ناظرین کی دلچسپی کے لئے اس جگہ درج کرتا ہوں اور نوبت بہ نوبت میں اس سبق آموز کہانی کے نتائج کی طرف توجہ دلاؤں گا اور اپنی راے کو لکھتا جاؤں گا۔

داستان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ لندن میں کوئی کنواری لڑکی جس کا سن تقریباً ۱۹ سال کا تھا اپنے ماں باپ کے گھر خوش زندگی بسر کرتی تھی۔ اس لڑکی کا نام جین تھا۔ اتفاق سے ایک تازہ وارد نوجوان نے جو کسی تعلیم گاہ میں مدرس تھا۔ لندن کے دستور کے مطابق جین کے گھر شرکت میں رہنا چاہا۔ اس نوجوان کا خاندانی نام ہالیبرٹن تھا جو ایک نامبرآوردہ واعظ کا لڑکا تھا۔ ماں باپ کے مرجانے کے بعد وہ اپنے ماموں کے ساتھ رہتا تھا جو ایک بہت بڑا کارخانہ دار تھا۔ دولت تو خدا نے دی تھی لیکن اولاد نہ تھی۔ سوائے اس نوجوان کے جس کا ذکر یہاں ہُوا اور ایک بھتیجی تھی جس کا نام جولیا تھا۔ کوئی دوسرا وارث نہیں تھا۔ ماموں نے اس لڑکے کو ہرچند چاہا کہ وہ کارخانے میں کام کرے اور تجارت کا کام سیکھے لیکن اس نوجوان کے دل میں اعلیٰ درجے کی تعلیم کا دھن سمایا ہوا تھا، اس نے دنیا کی دولت اور ثروت کی مطلق پروا نہ کی اور کارخانہ میں کام کرنے سے انکار کردیا۔ آخر کار ماموں نے خفا ہوکر اس کو اپنے گھر سے نکالدیا اور اس طرح وہ نوجوان لندن آیا جہاں کسی تعلیم گاہ میں معلمی اختیار کرلی۔ جین جس کا ذکر اوپر ہوچکے، ایک نہایت تعلیم یافتہ، حلیم، فرماں بردار، خوش رو، اور سگھڑ لڑکی تھی۔ اس کا باپ بھی ایک مذہبی عالم تھا۔ اس نے اپنی لڑکی کو مذہب کی پوری تعلیم دی تھی اور خدا کی باتوں کو اچھی طرح بتایا تھا۔ غرض تازہ وارد نوجوان نے جب جین کے گھر شرکت میں رہنے کی درخواست کی اور اس معاملہ کو طے کرنے کے لئے اس کے گھر آیا تو نظر لڑتے ہی ایک کو دوسرے کی ادا بھاگئی ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کرگئی

غرض شدہ شدہ محبت زیادہ بڑھی اور پورے ایک سال

کے بعد اسی نوجوان نے جین سے شادی کرنے کی درخواست کی۔ پہلے تو لڑکی کے ماں باپ کو کچھ تامل سا ہوا لیکن آخر کو ان دونوں کا نکاح ٹھہرا اور شادی ہو گئی۔ جین نے کچھ زمانے تک اپنے ماں باپ کے گھر آرام سے زندگی بسر کی لیکن جب اس کے باپ نے قضا کیا تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک دوسرے مکان میں اُٹھ آئی اور اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کو ساتھ لائی۔ شوہر نے، جس کے اخراجات اب زیادہ ہو چلے تھے، کافی روپیہ پیدا کرنے کی فکر میں جان توڑ کر محنت شروع کی۔ کئی جگہ وہ لڑکوں کو اُن کے گھر جاکر درس دیا کرتا اور اس طرح صبح سے شام تک نہایت سخت محنت میں بسر ہوا کرتی۔ غرض اس ذریعے سے وفادار، جفاکش، شوہر سال میں دو ہزار پونڈ سے زائد پیدا کرتا تھا، اور لائق، نیک، سلیقہ شعار بیوی کے حسن انتظام سے گھر بہشت کا ایک نمونہ بنا ہوا تھا۔ جین جو اس وقت تک تین لڑکے اور ایک لڑکی کی ماں ہو چکی تھی، دن رات اپنے شوہر کی اطاعت، فرماں برداری اور اس کے آرام و آسایش کی فکر میں سرگرم رہا کرتی اور شوہر اپنی پیاری بیوی کی الفت اور محبت میں سرشار تھا۔ غرض اس طرح دونوں میاں بیوی کی زندگی آسودہ حال اور خوش گذرتی تھی اور تھوڑے زمانہ تک خوب چہل پہل رہی لیکن دنیا میں ایک طرح سے کسی کی بسر نہیں ہوئی زمانہ تفرقہ پرداز نے اپنا ڈراونا روپ دکھایا اور رنج و الم کی گھڑی کو آنا تھا آ گئی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ جب شوہر باہر سے آیا تو یکایک غش کر گیا بیوی نہایت متردد ہوئی جب شوہر کو ہوش آیا تو اس نے بہت کچھ دلاسا دیا لیکن دل ہی دل میں سوچا کیا کہ اگر وہ اسی حالت میں مر گیا تو اس کے اہل و عیال کا کیا حال ہوگا۔ رات کو نہایت بے چین رہا۔ صبح کو اٹھ کر وہ ایک بیمہ لینے والی جماعت کے دفتر میں گیا اور اپنی زندگی کا بیمہ لکھوانا چاہا۔ ڈاکٹر نے ملاحظہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کو دق شروع ہو گئی ہے اور اسوجہ سے بیمہ لینے سے قطعی انکار کر دیا۔ آخر کہاں تک؟ دن رات کی محنت جان پر بن آئی اور علالت میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ غرض ڈاکٹروں کی رائے سے غریب شوہر کو ترک ملازمت کرکے تبدیل آب و ہوا کے لئے لندن چھوڑنا پڑا۔ گھر کے کل سامان و اسباب کو نیلام کر دیا۔ اور بیوی بچوں کو لے کر دوسرے مقام پر چلا آیا۔ یہاں کی آب و ہوا نہایت پُرفضا تھی۔ مریض نے اس جگہ کو اس لئے انتخاب کیا تھا کہ وہاں اس کی ماموں زاد بہن جولیا ایک خوش حال ٹرنی سے بیاہی ہوئی تھی۔ اگرچہ مریض کو جولیا سے کسی طرح کے سلوک کی امید نہ تھی لیکن پھر بھی خون نے اسی طرف کوشش کی۔ دوسری وجہ یہاں آنے کی یہ ہوئی کہ وہاں کے لوگوں کو قدیم زبانوں کے سیکھنے کا ازحد شوق تھا اس لئے مریض کو یہ خیال ہوا کہ جب بعد کل چندے طبیعت ایک ذرا ٹھہر جائے گی، تو وہ درس کا کام شروع کریگا اور روزگار اچھا چلے گا۔ ذریعہ آمدنی تو بند ہو ہی چکا تھا بیوی نے جسوقت لندن کو خیرباد کہا تو اسکے پاس اسباب وغیرہ نیلام کرنے کے بعد اٹھانوے سو روپے موجود تھے بس کل اتنی کائنات تھی جس میں غریب بیوی کو کل کام کرنا تھا۔ شوہر کی مہلک علالت، پردیس کا واسطہ، ناداری کا عالم، ایسی باتیں نہ تھیں جو دل پر اپنا اثر نہ ڈالتیں غریب بیوی کی آنکھوں میں دنیا سیاہ نظر آتی تھی لیکن تیوری پر بل نہیں آتا تھا۔ نئی جگہ پر پہنچ کر بیوی نے ایک چھوٹا سا خوش قطع مکان کرایہ پر لیا اور خانہ داری کے کل ضروری اسباب خرید کرا کیلے تین چار روز میں مکان کو سجا کر ٹھیک کر لیا۔ بعد اس کے وہ شوہر کے علاج میں مصروف ہوئی۔ لیکن جب آقدیر پھر جاتی ہے تو کوئی

تدبیر کارگر نہیں ہوتی ہزار فکر اور محنت سے کام لیا اور اپنی جان لڑادی لیکن شوہر کو نہ اچھا ہونا تھا نہ اچھا ہوا - دو ماہ کے بعد شوہر نے عالم بیکسی و مسافرت میں یکایک قضا کیا - شوہر کی اچانک جانکاہ موت نے بیوی پر ایک بجلی گرادی اور وہ یک بیک ہر طرح کی آفت و بلا میں گرفتار ہو گئی - اس وقت اس کے پاس تین یا چار روپیہ سے زیادہ نہیں تھا ناداری کی یہ حالت، گھر میں شوہر کی لاش پڑی ہوئی، پرایا دیار، کوئی مونس نہ غمگسار، کیا کرتی کیا نہ کرتی! فرط گریہ سے دل ڈوب گیا اور شوہر کی لاش پر روتے روتے بُرا حال کر دیا - چھوٹے چھوٹے بچوں کی دل دکھانے والی فریاد سے قیامت برپا تھی - لیکن کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا - آفت زدہ بیوی جب شوہر کو دل کھول کر رو چکی تو اس نے ایک پڑوس کی عورت کی صلاح سے مرحوم شوہر کی گھڑی کو فروخت کر کے جنازہ اٹھانے کا سامان کیا بعد اس کے اُس نے اپنے ننھے بچوں کو بلا کر پیار کیا اور ان سے مدد کی طالب ہوئی سب نے یک زبان ہو کر وعدہ کیا کہ وہ اپنی دکھیا ماں کی مدد کو تیار رہیں - پھر ماں نے اپنا مفہوم سمجھایا اور کہا کہ وہ اور کسی طرح کی مدد کی ان سے طالب نہیں ہے صرف یہ چاہتی ہے کہ وہ کسی بات پر ضد نہ کریں اور نان و نمک جو کچھ مل جائے خوشی سے کھا لیا کریں سب نے خوشی سے منظور کر لیا - اور کیوں نہیں کرتے - یہ بچے وہ تھے جنکی اُٹھان مرحوم باپ نے نہایت اچھے اصول پر قائم کی تھی اور تمام اچھی باتوں کو ذہن نشین کرا دیا تھا - یہاں تو یہ حادثہ گذرا اب جولیا کی شقاوت کا حال سنئے - آفت زدہ جین اپنے شوہر کی زندگی میں ایک روز اپنی نند جولیا سے مل آئی تھی جس کی وجہ سے اس کو ان لوگوں کے یہاں آنے کا حال معلوم تھا - اب وہ ان لوگوں کو یہاں سے نکالدینے پر آمادہ ہو گئی - اس کا شوہر مالک مکان کا، جس کو غریب جین نے کرایہ پر لیا تھا، قانونی مشیر تھا - اس نے سرکاری پیادول کو بھیجدیا کہ وہ جا کر چھ ماہ کا چڑھا ہوا کرایہ کھڑے کھڑے وصول کر لیں اور اگر کرایہ نہ وصول ہو تو مکان خالی کرا لیں جین جو فاقوں سے زندگی بسر کرتی تھی اسقدر روپیہ ایک مرتبہ کہاں سے دیتی - پہلے تو بہت منت اور التجا کی اور جب قابو نہ چلا تو زار زار رونے لگی - مالک مکان کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے فوراً پیادوں کو اُٹھوا دیا اور جین سے کہدیا کہ جب جی چاہے کرایہ ادا کرنا کوئی طالب نہیں ہو گا -

جولیا ایک نہایت بدمزاج مغرور اور خودنما عورت تھی اپنے مرحوم بھائی کی بیوہ کے ساتھ جو کچھ اس نے بُرا سلوک کیا اسکی وجہ یہ تھی کہ اس کے چچا نے مرتے مرتے یہ وصیت کی تھی کہ جو کچھ دولت اور مال و زر اس کا ہے اس میں نصف اسکے غریب الوطن بھانجے کا حصّہ ہے جس کو اس نے رنجیدہ ہو کر گھر سے نکال دیا تھا اس لئے جسوقت جولیا کو یہ خبر ملی کہ اس کا ماموں زاد بھائی بیمار ہو کر اس مقام پر آیا ہے اسی وقت سے اسکو سوچ تھا کہ وہ کس طرح سے ان لوگوں کو وہاں سے نکال دے - خیر بھائی نے تو قضا کیا لیکن اُسکی بیوہ گرفتار بلا جین اور اس کے چھوٹے ننھے بچے وہاں موجود تھے - اس لئے جولیا اور اُس کے شوہر کو برابر یہ ڈر لگا تھا کہ ایسا نہو ان کو اُس وصیت کا راز کسیطرح معلوم ہو جائے اور وہ اپنا حصّہ لینے کو آمادہ ہو جائیں آفت رسیدہ جین کو جب کرایہ کی ادائگی کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا تو اُس نے اس مکان کا آدھا حصہ کرایہ پر لگا دیا - سوزن کاری اور دستانہ بنانے کو اپنا ذریعہ معاش قرار دیا اور ننھوں کے پلے بچلا

کو سوکھی روٹیاں کھلا کھلا کر اپنے بُرے دن کاٹنے لگی۔ مگر افسوس مصیبت جب آتی ہے تو تنہا نہیں آتی، دکھیا جینی پر ایک اور تازہ آفت آنے والی تھی، وہ آگئی۔ اسکی ننھی لڑکی، جس کو وہ بہت پیار کرتی تھی، بیمار ہوئی۔ اس معصوم بچی کا نام جینی تھا تھوڑے دنوں تک تو کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ جینی بخار میں سرشار پڑی رہا کرتی تھی۔ لیکن جب بیماری زیادہ بڑھی تو ننھی جینی سوکھکر محض چرم واستخوان رہ گئی تو ماں کو اسکی خبر ہوئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو معلوم ہوا کہ دق ہوگئی اور اب وہ کچھ دنوں کی مہمان ہے۔ اس خبر کو سنکر ماں کا دل بھر آیا اور خوب روئی۔ بعد اسکے اس نے ایک ننھی سی جان کو بقاے روح کا اہم مسئلہ اس خوبی سے ذہن نشین کرایا کہ معصوم کے دل پر نقش ہوگیا۔ جینی کی ہمجولی لڑکیاں جب اسکی بیمار پرسی کو آتیں تو جینی موت کی باتوں کو ان سے خوش ہو کر بیان کرتی اور یہ کہتی کہ "اماں جان نے کہا ہے کہ میں بہت جلد اس دنیا کو چھوڑنے والی ہوں"

آخر وہ معصوم بچی مرگئی۔

اس دردانگیز روداد کو جس کا خلاصہ اوپر بیان ہوا قابل مولفہ نے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کا دل بھر آتا ہے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ یہ تو انداز بیان کی خوبی ہے۔ لیکن جب یہ خیال کیجئے کہ یہ ترجمہ ہے تو مولفہ کی لیاقت اور دل سوزی پر بے ساختہ منھ سے داد نکلتی ہے۔ جو لوگ ترجمہ کے مشکلات سے واقف ہیں، ان کو یہ بات معلوم ہے کہ اصل کتاب کی خوبیوں کو ترجمہ میں قائم رکھنا کس قدر دشوار ہے۔ اس دشوار گذار راہ کو بیگم صاحبہ نے نہایت خوبی سے طے کیا ہے۔ ناموں کا اگر خیال نہ کیا جائے تو کہیں بھی پتہ نہیں چلتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے، بالکل اصل مضمون کا لطف آتا ہے۔ دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ یہ افسوسناک داستان ایک بکار آمد اور نتیجہ خیز کہانی ہے۔ اس کو پڑھکر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رنج و مصائب غربت اور مفلسی کے عالم میں ایک شریف بی بی آپ اپنی حمایت کیونکر کرسکتی ہے۔ اس سے ہمت، قناعت، صبر اور استقلال کا ایسا اچھا سبق حاصل ہوتا ہے کہ کبھی بھی بھول نہیں سکتا۔

(باقی آئندہ) **سید راحت حسین** بی اے۔ بی ال

توصیفِ ادیب

یوں تو دنیا میں نکلتے ہیں رسالے بیشمار — پر نہیں تجھسا رسالہ اے ادیبِ دُر نثار
غنچۂ امید دل تجھ سے شگفتہ ہوگیا — تیری خوبی پر ہیں قرباں نقد دل سو ہزار
جگمگی نیرنگیوں کی تیری اس گلشن میں دھوم — ملک کے ہیں عالم و فاضل ترے مضموں نگار
تیرے مضمونوں کی شوخی گل کھلاتی ہے عجیب — تیری تصویروں سے گویا ہر ورق ہے لالہ زار
حضرتِ شیدا کا دادا کرتے ہیں جب سے اپنا فرض — ہے اشاعت میں ترقی بڑھ گئے مضموں نگار
حضرتِ شوکت کے مضموں کیا کہوں صلِّ علیٰ — آرکی تنقید پر قربان دل اور جان نثار
تیرے حق میں ضبط کی حق سے یہی ہر التجا
صفحۂ دنیا پہ تیرا نقش رکھے یادگار

جگل کشور ضبط منلوی



میر بادشاہ علی صاحب بقا خلف میر صبا لکھنوی (کرسی پر)

انڈین پریس الہ آباد

طلسمِ حُسن

مضطرب رکھتا ہی کیوں ہردم دلِ محزوں مجھے — اے ادیبِ عشق سکھلا دے کوئی افسوں مجھے

جوش کیوں آیا ہوا ہے سیل آبِ اشک میں — کیا ڈبونا چاہتے ہیں دیدۂ پُرخوں مجھے

عشق نے آفت بپا کردی ہی جی کو چھیڑ کر — حسن نے کسکی دکھا دی صورتِ موزوں مجھے

جلوہ پیرائی کسی کی آتشِ صد رنگ ہے — سوزِ ہر دل کا نظر آیا ہی گوناگوں مجھے

کھینچتی ہے دل مرا اللہ اکبر کی صدا — چھیڑتا ہے برہمن کا نالۂ موزوں مجھے

لیلیٔ محمل نشیں ہو اپنے ناقہ پر سوار — اور نظر آتے ہیں ہر جانب کئی مجنوں مجھے

آتشِ گل نے جلایا آشیانِ عندلیب — برق خرمن سوز ہی ہر عارضِ گلگوں مجھے

کیا طلسمِ حُسن نے تسخیر کر رکھے ہیں دل — باندھ رکھا ہی اسی نے کچھ کم و افزوں مجھے

چھیڑتے ہیں خود وہ آکر ہر دلِ آگاہ کو
یہ وہ رتبہ ہے جو حاصل تھا کلیم اللہ کو

وے نمودِ حسن ہاں تیرا ہی سودائی ہوں میں — تیری اس محفل میں محوِ محفل آرائی ہوں میں

کس قیامت کی تماشا خیز تھی صبحِ الست — اب تلک مصروفِ ذوقِ دیدِ رعنائی ہوں میں

ہوگئی آخر کو معنی خیز خاموشی مری — رازدارِ رمزِ خاموشی و گویائی ہوں میں

علم گویا ہی کہ ہوں میں ہمنوا تیرے لئے — عقل کہتی ہی کہ ساری دو دنیا کی تنہائی ہوں میں

ہرطرف مجھکو نظر آتا ہے حسنِ روئے یار — سامنے جاناں کے محوِ جبہ فرسائی ہوں میں

دل مرا تڑپا دیا ہے حسنِ عشق انگیز نے
آگ سینہ میں لگا دی عشقِ آفت خیز نے

اے طلسمِ حسن تو نے کیا ہی دکھلا یا ہوا — دیکھئے جس دل کو ملتا ہے وہ بل کھایا ہوا

رند بھی گھولے ہوئے ہیں زہر جامِ صاف میں — شیخ بھی ملتا ہے جب ہم کو تو گھبرایا ہوا

حسنِ صوری پر مٹے جاتے ہیں کیوں ابنائے قوم — گنجِ اخلاق و خرد ہے سب نے ٹھکرایا ہوا

کسطرح بھولے ہیں یہ حسنِ مقدس کی ادا — گتھ گیا کیونکر وہ رشتہ تھا جو سلجھایا ہوا

کیا کہیں کسکو کہیں دکھتا ہی جی کیونکر کہیں — راز یہ یاروں سے ہے سو بار سمجھایا ہوا

بر درِ میخانہ رفتن کارِ یک رنگاں بود
خود فروشاں را بکوئے میفروشاں راہ نیست

ذوقِ صادق ہو تو یہ سارا جہاں میخانہ ہی — ساقیِ دانا ہے تو خود دل ترا پیمانہ ہے

بزمِ مے ہے یہ جہاں کہدو یہ ہر ہشیار کو — بڑھکے خود ساغر اُٹھانا شیوۂ رندانہ ہے

حق نے بخشا ہے تجھے اک نور اپنے نور سے — بندِ جسم میں ہر ادائے جلوۂ جانانہ ہے

حق ہی یہ تیرا کہ تو خود اس کو اٹھ کر دیکھ لے — دیکھنا کیا بلکہ تو خود ہی وہی مستانہ ہے

آپ ہے تو پیرا پنا آپ اپنا رہنما — سب طرح کی دولتوں سے پُر ترا کاشانہ ہی

پی مۓ گلرنگ زاہد چھوڑ ذکرِ حور و خلد — وہ تو رندانِ خرد پرور کا اک افسانہ ہی

دیکھ لینا جلوۂ جاناں کا جنت ہے یہی
اس طلسمِ حسن میں پھنسنے کی غایت ہے یہی

خلد خود رکھی ہوئی ہے ہر دلِ بیدار میں — پھنس رہا ہے شیخ تجری تحت فی الانہار میں

سچ اگر پوچھو تو اک ناموس اکبر ہی ضمیر — ہوش کی شانیں ہیں مضمر اسکے ہر اطوار میں

کوئی ہو سکتا نہیں منکر خدا کی ذات کا — نور ہی اسکا نہاں ہر کافر و دیندار میں

ہی غرض اخلاق سے مذہب کی غایت ہی یہ — کچھ نہیں رکھا ہوا ایماں بحث اور تکرار میں

ہائے مخلوقِ خدا کیوں لڑ رہی ہی ہر جگہ؟ — پڑ گئی ہے آہ وہ کس عادتِ بیکار میں

وہ خداوند جہاں مہر و محبت کا ہے نور — ہے وہ ظاہر اتفاق و عشق کے اطوار میں

اے زمینِ ہند آخر کب تلک یہ تفرقے — کیا یہی تھا رام چندر جی کی ہر گفتار میں

کیا ہوا ہی اے مسلمانو! تمہارا اتحاد — تمکو سکھلایا گیا تھا جو کہ ہر کردار میں

بغض و بے مہری تمہاری گردشِ ایام ہی
ایسے آغازوں کا عالم میں یہی انجام ہی

از ہانگ کانگ (چین) — قاضی حمید الدین احمد حمید

کلامِ اکبر

دو تیتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں — اِک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں

بھونی خوش رنگ چست نازک پیاری — پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری

پھرتی ہی کہ برق کی طبیعت کا اُبھار — تیزی ہی کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

جو فاصلہ کرلیا ہے باہم قائم   وہ بھی ہے بلا زیادت و کم قائم
گو تابعِ جوشِ برق پرواز ہیں   دونوں کے خطوطِ طیر متوازی ہیں
کیونکر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے   اللہ اللہ کیا ہنرمندی ہے
ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں   فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں
کس بزم سے ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں   پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں

اس سمت اگر خیالِ انساں بڑھ جائے
دامانِ نظر پہ رنگِ عرفاں چڑھ جائے

کیسے وعدے تھے یہ اُس دن کے سرِ راہ جناب   آپ سے پھر نہ ملاقات ہوئی واہ جناب
ابھی تنخواہ تک نہیں پہنچی مری تنخواہ جناب   آپ مجھکو نہ کہا کیجئے للہ جناب
دوٹ بازی کے سوا رکھا ہی کیا ہے آمیں   ممبری کے لئے کرتے ہیں عبث آہ جناب
میرے اشعار پہ کرتے ہیں بہت واہ جناب   نہیں کرتے مگر افزایش تنخواہ جناب

بنتے جاتے ہیں غبارا وہ نئی روشنی کے
ہو ہی جائیں گے ثریا حشم و ماہ جناب

تاروں بھری رات

صدقے اعجازِ کلاہِ قدرت کے   کھل گئے پھول باغِ حکمت کے
رات گویا سوادِ خامہ تھی   مجرموں کا سیاہ نامہ تھی
اُسکو رونق دی ماہ پاروں سے   بخت چمکایا اُس کا تاروں سے
چشمِ عالم میں لاجواب کیا   نجمِ قسمت کو ماہتاب کیا
اُسپہ ہر دم خدا کی رحمت ہے   اس کا آغوش مہدِ عشرت ہے
گلشنِ عیش کی بہار اُس سے   بیقرار دل کو ہے قرار اُس سے
بیکسوں کی ہے مونس و غمخوار   پردہ داری میں دامنِ ستار
غمزدوں کو وہ راہ دیتی ہے   رہزنوں کو پناہ دیتی ہے
خیر اُس کی سبھی مناتے ہیں   تارے مشعل اسے دکھاتے ہیں
جانفزائی میں ہے دمِ عیسےٰ   اُسکے دامن کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
دل سے رنج و الم نکالتی ہے   تن بیجاں میں جان ڈالتی ہے
راحتیں یاں دلوں کو ملتی ہیں   کلیاں دامن میں اُسکے کھلتی ہیں
مہ جبینوں کو چاہ اُس کی ہے   تا سرِ چرخ راہ اُس کی ہے
ہیں ہواخواہ اُس کے شاہدِ گل   اور ہمدم ہے گیسوئے سنبل
اُسمیں آرامِ جاں ودیعت ہے   اُسپہ دار و مدارِ عشرت ہے
اُس کا قامت مواد کا ہے شجر   اُس کا دامن مسرتوں کا گھر
اس کی رفتار بھی ہے حیرت زا   ہر قدم پر ہجوم تاروں کا
کلیاں ہنستی ہیں صحنِ گلشن میں   حسرتیں لوٹتی ہیں دامن میں
غل ہے ہر سو بہار آئی ہے   مونسِ بیقرار آئی ہے
سیل وارفتہ اُس فضا پہ ہے   لوٹ اس کی ادا ادا پہ ہے
بحر بھی داد جوش دیتا ہے   لبِ ساحل کو چوم لیتا ہے
اس میں خو بو ہے ماہ پاروں کی   چلتی ہے چھاؤں میں وہ تاروں کی
چہلیں کرتی ہے آبشاروں سے   انس اُسکو ہے بیقراروں سے
دم میں انکو نکھار دیتی ہے   اُن کی قسمت سنوار دیتی ہے

یوں ہے ظلمت کدہ میں اُسکی ذات
جیسے ظلمات میں ہے آبِ حیات

معین الدین سلام

توصیفِ علم

فدا ہے تو بہارِ فکر کیا باغِ معانی پر   چمن آرائی مضموں ہے اوجِ لامکانی پر
کمر بستہ کھڑی ہے آج سوسن تر زبانی پر   جھکی ہے بلبل وارستہ بھی شیوا بیانی پر
نہالان چمن ہیں بیخودانہ جھومتے کیسے   سماں مرغانِ گلشن کی ہے کیا طب اللسانی پر

کمربستہ ہوئے ہیں چھوڑکر سب سرو آزادی کھڑے ہیں پا بگل کیا قمریوں کی حمدخوانی پر
بہار آئی ہوئی ہے آج کیا باغِ دبستاں میں کہ طعنہ زن ہے ہر اک طفل سرو بوستانی پر
ہویدا ہے مسرت پر مسرت کا سماں کیسا عیاں ہے کیا وفورِ شادمانی شادمانی پر
یہ دربارِ شہنشاہی علم و حکمت و فن ہے کھڑے دارا و اسکندر ہیں جسکی پاسبانی پر
گدا و قیصر و فغفور کا یاں ایک رتبہ ہے مزیت ہے سخن رانی کو یاں صاحبقرانی پر
خزانے علم و فن کے یہ عطایاں سے ہوئے سبکو یہیں سے فوقیت سب کو ملی تاجِ کیانی پر
اسی یونان نے پوشیدہ حکمت منکشف کردی یہیں سے وقفیت سب کو ملی رازِ نہانی پر
وسی جا وہ بھرے بابل کی یہ اک سحر کاری ہے حکومت کر رہے ہیں آج ہم جو آگ پانی پر
اسی سے دستگہ پوری ہے ہر شے کے بنانے میں اسی سے دسترس پورا ہے آلاتِ دُخانی پر
طلسمِ علم کا ہی یہ بھی اک ادنےٰ کرشمہ ہے کہ یوں گلگشت حاصل ہے فضائے آسمانی پر
اسی اک سامری فن کے وہ نامی نام لیوا ہیں تصرف ہے یہ جنکا روز و شب برق یمانی پر
بدولت علم کے تابع کیا انسان نے سب کو توانا تر ہوا یہ اس سے ہی اس ناتوانی پر
اسی سے فلسفہ حکمت اسی سے صنعت و حرفت اسی سے علم سبکو کاشتکاری باغبانی پر
پتہ اس سے لگا سب کو طبیعی اور الٰہی کا نشان گمشدہ حق اس سے ملا اس بے نشانی پر
کتبہائے سماوی کے مطالب کون پا سکتا عبور ہوتا نہ عرفانِ خدائے انس و جانی پر
اسی سے سبکو ہے معلوم فرضِ منصبی اپنا اسی سے درک ہے وجہ عطائے زندگانی پر
نہ ہوتی خادمانِ علم کی گر دستگیری کچھ تو واقف کون ہوتا قصہ ہائے باستانی پر
بدون علم مجنوں کا جنوں مشہور کب ہوتا خبر پاتا کوئی فرہاد کی اس تیشہ رانی پر
کہاں حسان ثابت فخر کرتے مدح گوئی پر کہاں سحبان وائل ناز کرتا نکتہ دانی پر
نکوکاروں میں اسکے ہی تو ہے اک حاتم طائی اسی کا دست شفقت ہے سرِ نوشیروانی پر
اسی سرکار سے تمغائے شہرت گر نہ ملجاتا تو کوئی کان بھی دھرتا نہ رستم کی کہانی پر
اسی سے یوسف مصری کا چرچا ہے زمانے میں اسی سے رنگ بیزی ہوگئی بہزاد مانی پر
ہوئے ہیں بیکن و بسمارک اس سے قابل شہرت کلمبس لائق تحسیں اسی کی جانفشانی پر
ہوا مشہور اقلیدس بھی گر اشکال علمی سے ہوا ممتاز جالینوس اسکی قدردانی پر
اسی سے سرخرو لعلِ بدخشانی ہے دنیا میں اسی سے آبیاری ہے حسامِ اصفہانی پر
اسی سے جام جم کا دور دورا بزم عالم میں اسی کے لطف کا جھونکا درفشِ کاویانی پر
یہی سے جوہر آئینۂ اسکندری گویا یہی تو نوح کی کشتی کے آیا بادبانی پر
اسی نے پست سبکو کر دیا معجز بیانی سے اسی نے پالیا قابو ہر اک جادو ترانی پر
ہمیشہ مال و دولت پر رہی اسکی حکومت ہے ہمیشہ یہ رہا حاوی شکوہِ خاندانی پر
لڑکپن کو اسی کے ہی نہ آنے نے ڈبو رکھا بڑھاپے کو دی اکثر فتح اسنے ہی جوانی پر
ہے بحرِ علم سے سرسبز ایجادات کی کھیتی اسی دریا کی موجوں سے طبیعت ہے روانی پر
رذائل پر تنبہ کس طرح بے علم حاصل ہو نظر ہو کس طرح کذب و فریب و بدگمانی پر
ہو تحصیلِ فضائل پر وقوف انسان کو کیونکر توجہ کیسے ہو آدابِ خوردی و کلانی پر
عدالت اور کرم پر کس طرح انسان مائل ہو ہو کیسے مستعد مخلوق کی راحت رسانی پر
اسی سے منہمک ہوتا نہیں انساں نواہی میں اسی سے مبتہج ہوتا نہیں لذاتِ فانی پر
اسی سے ملتی ہے گویا بقائے سرمدی سب کو اسی سے رغبتِ انساں سرورِ جاودانی پر
ہو کیونکر علم ہر شے کی کماہی حقیقت کا تخیل جائے کس طرح مبادی اور مبانی پر
امانت علم کی قسمت سے انکو گر نہ حاصل ہو تو اہلِ علم نازاں کس طرح ہوں کامرانی پر
سطفر ایک عالم علم کی ادنےٰ عنایت سے مفتخر اک جہاں ہے آج اسکی مہربانی پر

فرشتوں پر بشر کو لاابالی ہے شرف اس سے
نہ کیوں پھر رشک کرتا نقش اول نقش ثانی پر

فضل ستار لاابالی

بسنت کی بہار اور میخوار

بیا رسا قیا ساغر کہ آئی فصلِ بہار پلادے پھول کہ ہے آج پھول میں گلزار
وہ پھول دے کہ ہو جسمیں رنگ و بوئے خمار چڑھے وہ کچے گھڑے کی کہ جس کا ہو نہ اتار
نہیں یہ پھولوں سے رنگین سا قیا اشجار کھڑی ہے رنگ میں ڈوبی ہوئی عروسِ بہار
بسنت سے ہے نیا رنگ و روپ گلشن کا بہار پر ہے عروسانِ گلستاں کا نکھار
درختِ لالہ میں ساقی نہیں گلِ لالہ لئے ہے پھول پیالے میں کوئی بادہ خوار

وہ فرطِ ساز طرب ہے کہ کوک اُٹھی کوئل! — وہ جوشِ گل ہو کہ ہے نغمہ سنج آج ہزار!
اثر ہے موجۂ مے کا ہوا کے جھونکوں میں — ہمارے ہوش اڑا لے گئی ہوائے بہار
بسنت آ لینے سرتے کونپلیں پھوٹیں — امنگ پر ہیں چمن میں ہرے ہرے اشجار
ہر اک درخت رنگیلا جوان ہے گلپوش — تمام باغ میں چھایا ہوا ہے رنگ بہار
خزاں کا ہوش نہیں انکو موسم گل میں — سب اپنے رنگ میں ہیں مست باغ کے شہکار
چمن میں آج تو ہم رنگ رلیاں کرلیں — کہ چار دن کا ہے ساقی یہ رنگ باغ و بہار
شراب سرخ کا جم جائے رنگ گلشن میں — دو آتشہ کی ہو محفل میں گرمیٔ بازار
ڈبو کے رنگ میں مستوں کا غم غلط کر دے — لگا دے کشتیٔ مے میکشوں کا بیڑا پار
چمن میں پھولوں کی خوشبو سے مست ہیں میکش — چلی ہے ابکے عجب رنگ کی نسیم بہار
ہم آج پھول میں رنگتے ہیں اپنے دامن کو — کہ پھول پتوں سے رنگیں ہیں دامنِ اشجار
ڈبو دے رنگ میں دیکر ہمیں شراب سرخ — کہ رنگ میں ہیں شرابور ساقیا گلزار
وہ جام دے کہ جو رکھتا ہو نشۂ سرخوش — خوشی میں آکے اُچھالیں کلاہ سب میخوار
مدام ہاتھ میں اپنے ہو گردنِ مینا — ہمیشہ آنکھیں رہیں چشمِ جامِ مے سے چار
پلادے ساقیا اس طرح بادہ سرجوش — کہ دل سے میرے نکل جائے کلفتوں کا بخار
چمن میں بیٹھے ہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے — شراب خوار بطِ مے کا کھیلتے ہیں شکار
نہ آنے پائے کبھی ہوش اپنی محفل میں — ہماری بزم میں بدمست سب رہیں ہشیار
چمن میں ساقی و مطرب بھی ہو نیاں گائیں — کہ رنگ کھیلنے آئے ہیں آج بادہ خوار
جو جام رکھتا ہے بھر کر شراب سے ساقی — تو اپنی آنکھوں میں پی جاتے ہیں اسے میخوار
سبو اُٹھاتا ہے دیدیکے اُنکے ہاتھ میں ہاتھ — نشے میں گرتے ہیں جو لڑکھڑا کے بادہ خوار

شراب پیتے ہیں کھکر فشردۂ انگور
حفیظ آڑ میں ٹٹی کی کھیلتے ہیں شکار

حفظ الکریم حفیظ

رباعی

مہتاب میں مہر میں جھلک تیری ہے — شمشاد میں سرو میں لچک تیری ہے
ہے نافۂ مشک کا تو ہی نافِ کشا — غنچہ ہو کہ پھول ہو مہک تیری ہے

حمید میرٹھی

ماتمِ عزیز

کیوں پڑگئی ہے پھیکی شادابیٔ گلستاں — افسردگی کا عالم ہر سو ہے کیوں نمایاں
کانوں میں چہچہے کی آتی نہیں صدائیں — خاموش ہوگئی ہے کیوں بلبل غزلخواں
غنچہ ہے دل گرفتہ گلشن میں آج کیسا — کیوں شق ہے گل کا سینہ اور چاک ہے گریباں
چھائی ہے کس کے غم میں یہ سرو پر اُداسی — سنبل کے بال کس کے ماتم میں ہیں پریشاں
سبزے سے گھٹ گئی کیوں اُٹھنے کی تاب و طاقت — کیوں ڈبڈبا رہی ہے نرگس کی چشم حیراں
لائی صبا یہ کیسی وحشت بھری خبر ہے — کیا اُٹھ گیا جہاں سے اس باغ کا نگہباں
لو کھل گیا نہ آخر، نامِ عزیز مرزا — اُن کے ہی سوگ کا ہے گلشن میں آج ساماں
اے مرگ ناگہانی! دستِ جفا سے تو نے — لوٹا ہے آہ کیسا رونق بھرا گلستاں
تم سے عزیز مرزا! کیا کیا تھیں آرزوئیں — اک ذات سے تمہاری تھے دل میں لاکھ ارماں
اب لیگ پر نہ چھائے کیوں رنج و غم کی ظلمت — تم ہی اس انجمن کی اک شمع تھے فروزاں
اب یاس کا ہے جنگل اور قوم کا بھٹکنا — وحشت کا ہاتھ ہوگا اور قوم کا گریباں
لو دیکھ جاؤ آکر، یہ قوم کا ہے نقشہ — قسمت پہ اپنی خنداں، حالت پہ اپنی گریاں

غم کا **شہیر** اپنے محرم نہیں ہے کوئی
کس کو سنائیں جاکر اپنا یہ دردِ پنہاں

شہیر فتحپوری

تازہ غزلیں

ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی

الٰہی نالۂ بلبل کی دے تاثیر شیون میں — دمِ گلگشت دلکو تھام لیں وہ صحنِ گلشن میں
اثر ہوتا جو اپنے نالہ و فریاد و شیون میں — لگا دی ہوتی بلبل نے کبھی کی آگ گلشن میں
بسر کرتے ہیں بلبل رات دن فریاد و شیون میں — مچی رہتی ہے یوں آٹھوں پہر اک دھوم گلشن میں
طنابِ عشق کھینچی خدمتِ شیخ و برہمن میں — بشکل سبحہ و زنار ہے اک اک کی گردن میں



بابو رابندر ناتھ ٹیگور

انڈین پریس الہ آباد

خدا جوئی ہو زاہد میں خدا سازی برہمن میں ہیں دو رشتے تعلق کے پڑے دونوں کی گردن میں
بھلائی کیا ہو زاہد میں بُرائی کیا برہمن میں جو رشتہ دوش پر اسکے ہو وہ ہو اسکی گردن میں
ادائیں جانستانی کی ہیں کیا کیا اسکی چتون میں جوانی میں قیامت ہوگی جب آفت ہو بچپن میں
بتانِ سنگدل کے دلمیں کیوں نالے نہ چبھ جاتے یہ وہ ناوک ہیں جو برما کریں دیوارِ آہن میں
نصیحت مانعِ دیدار شوقِ دل خلاف اُس کے کہے جاتا ہو یہ ہے فرق رہبر اور رہزن میں
دلِ عشاق سے وہ واسطہ ہو تیری آنکھوں کا تعلق جسطرح کا ہو قدیمی برق و خرمن میں
گوارا کس سے ہو سر دردیِ الفت حسینوں کی بھلی چنگی پھنسائے کون اپنی جان الجھن میں
حریر و بوریا کو دیکھتی ہے ایک صورت سے ہوا کرتی نہیں عزت کسی کی چشمِ سوزن میں
ہوائیں باندھتے پھرتے ہو تم یوسف لقائی کی لگالیتی تھی کوئی کھونٹ بھی تو اپنے دامن میں
تمہارے ظاہر و باطن سے واقف ہو گئی دنیا مرے دل میں رہا کرتے ہو تم یا چشمِ دشمن میں
سیہ آہو کا بھی دیدہ ہے پھر کون اسپہ مرتا ہے لگاتے کیا ہو سرمہ کے سوا تم چشمِ پُرفن میں
نہ ہوتے اشک مژگاں میں تو تم کو دیکھ بھی سکتی مری پتلی تھی چلمن اور وہ بھی بھیگی چلمن میں
وہ ہنس ہنس کر مزے لیتے رہے فریاد و زاری کے اثر اُلٹا خدا نے دیدیا ہے میرے شیون میں
نرکھ محروم مجھکو جلوۂ دیدار سے یارب پڑا ہوں ڈیرے ڈالے مد توں سے دشتِ ایمن میں
یہ کہہ کہکر جگایا باغباں کو عندلیبوں نے نہالِ گل کا سرمایہ گیا گلچیں کے دامن میں
گریباں چاک کر نا بات کیا تھی پنجۂ وحشت کوئی تارِ نفس باقی نہ رہنے پائے گردن میں
نہ کہتے تھے کہ بالآخر یہ وحشت رنگ لائے گی حمائل دستِ لیلے ہوگئے مجنوں کی گردن میں
نگاہِ ناز کے بسمل ہیں اہلِ انجمن سارے چھپا ہے فتنۂ محشر تمہاری چشمِ پُرفن میں
گدائے میکدہ ہوں اور تکلف کی نہیں عادت کبھی پیتا ہوں خود وہ پیتا ہوں گر مٹی کے برتن میں
تری زلفوں میں دل الجھا تھا اب وہ خود الجھتی ہیں اک الجھن اور پیدا ہوگئی ہے دل کی الجھن میں
صدا دیتا ہوں ہر در پر کہ ہے کوئی سخی ایسا بھرے تاثیر کے ٹکڑے مرے کشکول شیون میں
الٰہی خیر ہو پھر کوئی نیا گل کھلنے والا ہے اشارے ہو رہے ہیں تیر زن آنکھوں کی چتون میں

کہاں سے لائے عالی شان ایوانِ خیرازین تکیہ
گزر سائل کیا کرتا ہے درویشانہ مسکن میں

پنڈت برج نرائن صاحب چکبست لکھنوی

شجر سکتے میں ہیں خاموش ہیں بلبل نشیمن میں سدھارا قافلہ پھولوں کا سناٹا ہے گلشن میں
گراں تھی دھوپ اور شبنم بھی جن پودوں کو گلشن میں تری قدرت سے وہ پھولے پھلے صحرا کے دامن میں
دلِ دیوانہ گرمِ سیر ہے صحرا و گلشن میں پڑے ہیں دست و پا جکڑے ہوئے زنجیرِ آہن میں
ہوائے تازہ دلکو خود بخود بے چین کرتی ہے قفس میں کہہ گیا کوئی بہار آئی ہے گلشن میں
مٹا نا تھا اسے بھی جذبۂ شوقِ فنا تجھکو نشانِ قبرِ مجنوں داغ ہے صحرا کے دامن میں
زمانہ میں نہیں اہلِ ہنر کا قدرداں باقی نہیں تو سیکڑوں موتی ہیں اس دریا کے دامن میں
یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زنار کا پھندا اسیری لازمی ہے مذہبِ شیخ و برہمن میں
جنہیں سینچا تھا خونِ دل سے اگلے باغبانوں نے ترستے اب ہیں پانی کو وہ پودے میرے گلشن میں
دکھایا معجزہ حسنِ بشر کا دستِ قدرت نے بھری تاثیرِ تصویرِ گلی کے رنگ و روغن میں
شہیدِ یاس ہوں رسوا ہوں ناکامی کے ہاتھوں سے جگر کا چاک بڑھکر آگیا ہے میرے دامن میں
جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر کہ جیسے عکسِ گل رہتا ہے آبِ جوئے گلشن میں
شرابِ حسن کو کچھ اور ہی تاثیر دیتا ہے جوانی کی نمو سے بے خبر ہونا لڑکپن میں
شباب آیا ہے پیدا رنگ ہے رخسارِ نازک سے فروغِ حسن کہتا ہے سحر ہوتی ہے گلشن میں
نہیں ہوتا ہے محتاجِ نمائش فیض شبنم کا اندھیری رات میں موتی لٹا جاتی ہے گلشن میں
متاعِ دردِ دل اک دولتِ بیدار ہے مجھکو دُرِ شہوار ہیں اشکِ محبت میرے دامن میں
نہ بتلائی کسی نے بھی حقیقت رازِ ہستی کی بتوں سے جاکے سر پھوڑا بہت دیر و حرم میں
پُرانی کاوشیں دیر و حرم کی مٹتی جاتی ہیں نئی تہذیب کے جھگڑے ہیں اب شیخ و برہمن میں
اڑا کرتے گی بادِ خزاں اس سال اسکو بھی رہا تھا ایک برگِ زرد باقی میرے گلشن میں

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

وصالِ دوست مضمر ہے فراقِ روح و تن میں شہیدانِ وفا سوتے ہیں کس راحت سے مدفن میں
وہی یہ پھول ہیں جنکو ابھی دیکھا تھا گلشن میں مگر کچھ اور ہی شے ہوگئے اب تیرے دامن میں

یہ دنیا نقش پائے کارواں ہو کر نہ رہ جائے — اثر بھرنے کو ہم بھرتے تو ہیں فریاد و شیون میں
دکھا دیتا ہے چشم عام کو تصویر اخلاقی — ہمارا بے تکلف بیٹھ جانا بزم دشمن میں
نظر آتے ہیں خالی دونوں پہلو دفعتہً ہم کو — ارے او جانے والے کیا لئے جاتا ہے دامن میں
جہاں تک جینے والو روشنی دنیا کی دیکھو گے — اندھیرا اتنا ہی محسوس ہوگا جا کے مدفن میں
نگارستان دلکا اک نیا عالم بنا دونگا — ذرا ہونے دو مجھکو کامیابی ضبط شیون میں
جنون عشق نے رسم تمیز عہد باطل کی — جوانی میں بھی ہم ہیں ویسے ہی جیسے تھے بچپن میں
کہاں تک روئے گا او رونے والے نام لے لیکر — جواب آئے کہاں سے کون اب بیٹھا ہے مدفن میں
زمانے کے تغیر سے خدا معلوم اب کیا ہو — کہاں اگلی سی وہ آب ہوا وادیِ ایمن میں
مخالف یا موافق دونوں سنکر چونک اٹھتے ہیں — یہ کیسا درد ہے آواز ناقوس برہمن میں
بڑھانا زور حشر انگیز اس رہرو کی ٹھوکر کا — خدایا جسنے ہمکو راحت دی ہے مدفن میں
کہاں تک اشتیاق بسمل و خنجر کوئی حد قاتل — برنگ روح تنگ آیا لہو رگہائے گردن میں
محبت کا صلہ اور اس سے بڑھکر ہو نہیں سکتا — وہ دل سے کر سمجھتے ہیں کہ اب سب کچھ ہے دامن میں
مری ہستی کی دو باتوں میں شرح مختصر یہ ہے — نگاہ دوست میں زندہ ہوں مردہ چشم دشمن میں
جوانی آتے ہی دلسے مرے اللہ ری نفرت — وہی تم ہو کہ آئینہ لئے پھرتے تھے بچپن میں
زہے سعی وفا اب حشر جو کچھ ہو خدا جانے — تری تقدیر لکھ لکھ کر حمائل کی ہے گردن میں

سمجھکر حکم فطرت صبر ہی کرتے رہے محشر
وگرنہ سخت تکلیفیں ہوئی ہیں روح سے تن میں

رباعیات

اس عالم فتنہ زا سے روپوش ہوا — جاں تیغ کے قبر سے ہم آغوش ہوا
تسکین جگر نے، دل نے راحت پائی — تن خانہ بدوشی سے سبکدوش ہوا

احباب کے ظلم سے ہوا دل ٹکڑے — کب تک رہے اے خدا مرا دل ٹکڑے
جاں جن پہ فدا تھی دشمن جاں نکلے — دل کے ٹکڑوں نے کر دیا دل ٹکڑے

زیبائش و تزئیں پہ نظر ہوتی ہے — آخر کی بھی فکر بیخبر! ہوتی ہے
یہ موے سیہ سپید ہونگے اک دن — امجد! ہر شام کی سحر ہوتی ہے

احمد حسین امجد

ایڈیٹوریل

رپورٹ صوبجات متحدہ | حال میں صوبجات متحدہ و آگرہ کی سرکاری رپورٹ بابتہ سنہ ۱۹۱۰ء شائع ہوئی ہے۔ اس پہ سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ سال زیر رپورٹ میں علمی تصانیف میں روز افزوں ترقی جاری رہی یعنی تعداد اشاعت ۱۹۸۸ سے ۲۱۴۵ پر پہنچ گئی۔ حامیان اردو کو خوش ہونا چاہئے کہ خاص طور سے کثرت اشاعت اردو تالیفات و تصنیفات میں ہوئی جسکی زیادتی اشاعت کا اوسط ۲۵ فیصدی رہا۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں ہندی کتب کی اشاعت غیر معمولی طور پر نمایاں اور کثرت تعداد میں ہوئی تھی مگر تعجب ہے کہ اس مرتبہ ہندی کتب کی تعداد بہت کم رہی اسی طرح بنگالی کتب میں بھی ۴۰ فیصدی کی کمی محسوس کی گئی ہے۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں مذہبی کتابیں بہت لکھی گئیں جنکی تعداد ۱۰۹۸ پر پہنچتی ہے۔ فلسفہ مذہب کے متعلق سب سے دلچسپ کتاب الدین والقوم ہے جس کے مصنف آنریبل جسٹس سید کرامت حسین صاحب ہیں۔ اسمیں خدائے برتر کا وجود، اسکی وحدانیت، اور قیاس و کلیہ ارتقا نہایت معرکہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ دوسری قابل ذکر کتاب فطرۃ الاسلام ہے جس کے مصنف نواب سید علی حسن خاں صاحب ہیں۔ اس میں عقل اور حکمت کو معیار حقانیت قرار دے کر اسلام کو مذہب حق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تاریخی کتابوں کے زمرہ میں پروفیسر رام دیو کی "تاریخ ہند" جلد اول (ہندی) کا ذکر ہو سکتا ہے۔ اسکی زبان صاف ہے اور عمدہ اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مولف میں تنقید و تحقیق کا مادہ نہیں جس کے باعث یہ عظیم الشان تالیف بے قدر و قیمت ہو گئی ہے۔ اگر تاریخی حیثیت سے دیکھا جائے تو تاریخ اودھ اور تاریخ ابن خلدون کے اجزا قابل قدر ہیں۔

قانونی کتابیں بھی کافی تعداد میں شائع ہوئی ہیں جنمیں سے بعض نہایت قابل قدر ہیں۔

نظم میں بھی تالیفات و تصنیفات بہت ہوئی جنہیں زیادہ تعداد مذہبی منظوم کتابوں کی ہے۔ ناول اور افسانہ کے متعلق کوئی خاص اور نئی بات نہیں۔ غیر زبان کے تراجم کثرت سے شائع کئے گئے تاہم بعض اچھے ناول اور افسانے بھی شائع ہوئے۔

سالِ زیر رپورٹ کی عام کتابی اور علمی حالت پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ، فلسفہ، مذہب، اور دنیائے نظم میں تو چند کام کی کتابیں نکلی ہیں، مگر سخت افسوس کا مقام ہے کہ سائنس کے متعلق کوئی اچھی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ گویا مذاق علمی اور رفعت دماغی کا معیار بہت پست رہا۔

اخبارات کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ اردو میں ۸۲، ہندی میں ۵۶، اور انگریزی میں ۱۴ اخبارات و رسائل شائع ہوئے۔ جدید اخبارات و رسائل میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:-

انگریزی	(۱) ویدک میگزین (۲) مسلم ریویو
اردو	(۱) ادیب الہ آباد (۲) القاسم دیوبند
ہندی	(۱) مریادا (۲) کام دھینو (۳) گورو کل سماچار

ادیب اور مریادا کی خاص طور پر تعریف کی گئی ہے چنانچہ ادیب کے متعلق یہ الفاظ ہیں:

" A well-written, illustrated magazine of considerable literary merit "

چونکہ قانون مطابع کی ضابطہ بندی سے تین اخبارات (سوراجیہ، کرم یوگی، ہند و پردیپ) کو بند ہونا پڑا اس وجہ سے اخبارات کا لب و لہجہ ترقی پذیر رہا۔ تاہم مذہبی مسائل کے متعلق انکا لب و لہجہ نہایت تلخ اور ترش رہا اور مختلف دھڑا بندیوں کے تایم مقام اخبارات نے اپنے مخالفین پر نہایت زہریلے حملے کئے اور بالآخر تین اخبارات سے ضمانت طلب کی گئی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ دو پرچوں کی زندگی، ضمانت داخل نہ کرنے کے باعث، ختم ہوگئی۔ نکتہ چینی کے لحاظ سے ایک گونہ اصلاح اور ترقی کے آثار پائے گئے۔ البتہ حقیقت حال اور معقول معلومات کا پلہ نیچا رہا۔

گورنمنٹ کی رائے میں سال زیر رپورٹ میں بمقابلہ ۱۹۰۹ء کے علمی ماحصل زیادہ رہا۔ خصوصاً مذہبی تصنیف و تالیف میں کثرت رہی، گو تعداد کی زیادتی سے صفات و محاسن میں کوئی نمایاں فروغ نظر نہیں آیا۔ معدودے چند تاریخی اور قانونی کتب کے سوا کوئی اور کام کی چیز نہیں دیکھی گئی۔ دونوں مذہبی فریق کے اخبارات کا لب و لہجہ امور مذہبی کے متعلق نہایت متعصبانہ رہا، مگر امور سیاسیات پر نرم۔ اگرچہ کئی ایڈیٹروں سے ضمانت طلب کی گئی مگر مقدمہ صرف ایک ہی اخبار پر چلایا گیا۔

مطبوعات پنجاب صوبہ پنجاب کی سرکاری رپورٹ (بابتہ ۱۹۱۱ء) بھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے ۱۴۰۸ نئی کتابیں مختلف زبانوں میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۱۰ء کے مطبوعات کی تعداد ۱۱۹۱ تھی، گویا ۲۱۷ کی زیادتی ہوئی۔ اردو کتب ۴۹۷ کی تعداد میں شائع ہوئیں اور ہندی ۸۲۔ اخبارات و رسائل کی تعداد ۲۴۷ تھی۔ یعنی اردو ۱۷۸، انگریزی ۳۸، گورمکھی ۱۹، ہندی ۹، باقی اخبار و رسائل مشترکہ زبانوں میں شائع ہوتے رہے۔

دونوں صوبوں کی رپورٹ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اردو سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔

پچاس لاکھ روپئے کی تقسیم پچاس لاکھ روپئے کے گرانقدر علمی عطیہ میں سے، جس کا اعلان حضور شہنشاہ معظم نے دربار تاجپوشی کے موقع پر کیا تھا، تیس لاکھ روپیہ لڑکوں کی ابتدائی تعلیم پر، پانچ لاکھ تعلیم نسواں پر، پانچ لاکھ ہوسٹلوں پر، دو لاکھ صنعتی تعلیم پر، اور تین لاکھ یورپین مدارس پر صرف کیا جائے گا۔ بقیہ پانچ لاکھ روپئے کی تقسیم بعد میں عمل میں آئے گی، اور صوبہ وار تقسیم کا اعلان بھی بعد میں ہوگا۔

بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ موجودہ نصاب تعلیم کی موجودگی میں ابتدائی تعلیم اور تعلیم نسواں پر اس قدر رقم صرف کرنا زیادہ مفید ثابت نہ ہوگا بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے ابتدائی تعلیم اور

تعلیم نسواں کے نصاب کو درست کیا جاسے اور پھر مزید عطیات سے اس تعلیم کی آبیاری کی جائے۔

اِس وقت ملک کی سب سے بڑی ضرورت صنعتی و زراعتی تعلیم ہے، اور اس لحاظ سے صنعتی تعلیم کے لئے دو لاکھ روپیہ بہت تھوڑا ہے۔ ممکن ہے کہ اگر لوکل گورنمنٹیں توجہ دلائیں تو بقیہ پانچ لاکھ میں سے کچھ اور رقم اس مد کے لئے منظور کی جائے۔

صوبجات متحدہ کے اسکولوں کی شرح فیس | گزشتہ سال ماہ مارچ میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی تاکہ وہ ان صوبجات کے اسکولوں کی فیس کے بارے میں رپورٹ پیش کرے۔ کمیٹی نے جو رپورٹ گورنمنٹ میں پیش کی ہے وہ منظور ہوگئی ہے۔ اسکا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) بیشتر امدادی اسکولوں میں سرکاری اسکولوں کے مقابلہ میں تین چوتھائی فیس لازمی تھی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو وہ اسکول یونیورسٹی میں شامل نہ ہوسکتے تھے اور نہ اُن کو سرکاری امداد مل سکتی تھی۔ اب یہ قاعدہ توڑ دیا گیا ہے۔ اب امدادی اسکولوں کو اختیار ہے کہ وہ اگر چاہیں تو اس سے کم فیس لے سکتے ہیں۔

(۲) سرکاری اسکولوں کی فیس میں اضافہ کیا جائے گا۔ اسکی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ ان میں تعلیم اچھی ہوتی ہے اور دوسرے خرچ بھی نسبتہً زیادہ پڑتا ہے۔ جو لوگ زیادہ فیس نہ دے سکیں وہ اپنے بچوں کو امدادی اسکولوں میں داخل کریں۔

(۳) اب تک یہ قاعدہ تھا کہ طلبائے جماعت کی تعداد کی مناسبت سے مفت یا نصف فیس پر طلبا تعلیم پاتے تھے مگر اب اس کا احاطہ وسیع کردیا گیا ہے۔ اب اسکول کے تمام طلبا کی تعداد کی مناسبت سے مفت یا رعایتی تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد ہوا کرے گی۔ نیز ہر سرکاری اسکول میں چھ وظائف بڑھائے گئے ہیں۔

(۴) اب تک یہ قاعدہ تھا کہ اگر تین یا تین سے زیادہ بھائی ایک ہی اسکول میں تعلیم پاتے ہوں تو بڑے بھائی کی پوری فیس اور باقی بھائیوں کی نصف فیس لی جاتی تھی۔ اب یہ رعایت خاندان کے دلی کی قلیل آمدنی ہونے پر خاندان کے تمام لڑکوں سے کی جائے گی۔ پچاس روپیہ سے کم تنخواہ پانے والے مدرس اپنے لڑکوں اور نیز اپنے متعلقین کو نصف فیس پر اسکول میں داخل کراسکیں گے۔ جو طالب علم امتحان میں فیل ہوگا وہ دوسرے سال دوگنی فیس دیکر تعلیم پاسکے گا۔

یقین ہے کہ ان تبدیلیوں کے باعث حصول تعلیم میں بہت کچھ سہولت ہوگی۔

کرامت فنڈ | یقینہً یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ ہمارے صوبہ کے روشن خیال اور ہمدرد قوم اور ہائیکورٹ کے نامور جج مولانا سید کرامت حسین صاحب بالقابہ نے تعلیم نسواں کی حقیقی ضرورت سے متاثر ہوکر، یعنی بلا کسی خارجی تحریک کے، ایک لاکھ اسّی ہزار کا گرانقدر عطیہ تعلیم نسواں کی ترقی کے لئے وقف کیا ہے۔ اس عطیہ کا نام "کرامت فنڈ" ہوگا اور تاحیات وہ خود اس کے متولی رہیں گے، بعدہٗ قوم اسکی مالک و مختار ہوگی۔

فی الحقیقت ایسے وقت میں جبکہ تعلیم نسواں ہماری ترقی کا جزو لاینفک قرار دے دی گئی ہو، اس بیش بہا عطیہ سے مولانا ممدوح نے اس تحریک میں نئی روح پھونک دی ہے اور آیندہ نسلیں کسی طرح ان کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتیں۔ یوں تو وہ عرصہ سے اس تحریک کے حامی ہیں، بلکہ الہ آباد کا کراستھویٹ گرلز ہائی اسکول بھی آپ ہی کی فیاضیوں، کوششوں، اور محنتوں کا نتیجہ ہے، مگر اس عطیہ سے انہوں نے سچی فیاضی اور بے لوث خیرات کی ایک صحیح نظیر قائم کی ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ خدا ایسے مخلص معطی اور بے ریا فیاض کو مدت تک سلامت باکرامت رکھے۔ آمین۔



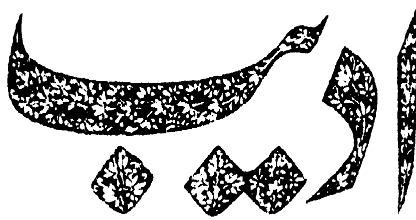
آنریبل سید جسٹس کرامت حسین صاحب

انڈین پریس الہ آباد



پیری و مریدی

انڈین پریس الہ آباد



علم الاخلاق[1]

تمہید

تجربہ کے کسی خاص حصّہ کا فلسفہ، اُن علاقہائے نسبت کے انکشاف کا نام ہے، جو اُس کے مخصوص علل و معلولات کے درمیان وجود گزیں ہوتے ہیں۔ علاقۂ نسبت کے دریافت ہوجانے سے یہ بات حاصل ہوجاتی ہے کہ جب ہم وہی اسباب مجتمع دیکھتے ہیں جو ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، تو ہم صحیح صحیح قیاس کرسکتے ہیں کہ نتیجہ کیا ہوگا؛ اور اسی طرح نتیجہ مشاہدہ کرنے کے بعد، ہم صحیح صحیح پیشین گوئی کرسکتے ہیں کہ اُسکے اسباب کیا ہیں یا کیا تھے۔

بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ ان علاقہائے نسبت کے معلوم ہوجانے کے بعد، ہم اُن اُصول کو بخوبی مدوّن کرسکتے ہیں جو تجربہ کے اُس خاص حصّہ کی ہر ممکن تبدیلی پر دائرو سائر ہوتے ہیں۔

یہ اُصول جب ایک ایسی منتظم شکل اختیار کرلیتے ہیں جس سے انسان فائدہ اُٹھاسکے، تجربہ کے اُس خاص حصّہ کا علم (Science) کہلاتے ہیں۔ علم الطبیعات (Physics) مثلاً، نام ہے تجربہ کے ایک خاص حصّہ کے اُن اُصول کی تدوین کا، جو کہ مظاہر (Phenomena) طبیعات پر مستولی ہیں۔

ان مظاہر کا مطالعہ، اُنکے تواتر و توالی کا مشاہدہ، اور اُن اُصول کا استقرار، جو تجربہ کے اُس خاص حصّہ کی ہر ممکن تبدیلی پر حاوی ہیں، اور پھر اُن اُصول کی تدوین؛ یہ سب درجات ہیں علم الطبیعات کے۔

تجربہ کے مختلف حصّوں سے بحث کرنے والے کل علوم کے قوانین کا مقابلہ، اور ایسے اُصول کی تحقیق و تدوین جو ان علوم مختلف کے قوانین کو محصور کرلیں، علم مابعد الطبیعات (Metaphysics) کا موضوع ہے۔ یعنی علم مابعد الطبیعات، تجربہ سے بہیئت مجموعی بحث کرتا ہے۔

علوم کے اقسام

موجودہ علوم کی، بہ لحاظ اپنے مباحث کی نوعیت کے تین قسمیں ہیں:-

۱۔ علوم اثباتیہ (Positive Sciences)

۲۔ علوم عملیہ (Practical Sciences)

۳۔ علوم مقصدیہ (Normative Sciences)

۱- علوم اثباتیہ، تجربہ کے کسی خاص حصہ کے مظاہر کو، صرف مرتب کرتے ہیں - وہ بس اس امر کے بتلا دینے پر قانع ہیں کہ مختلف اشیا کن صورتوں میں پائے جاتے ہیں، اور مختلف واقعات کن حالتوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں -

علوم اثباتیہ کو ان امور سے کچھ تعلق نہیں کہ کسی مقصد زندگی کا فلسفہ کیا ہے، اور کوئی مقصد زندگی کن ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے - مثال کے طور پر علوم اثباتیہ کی ایک مختصر فہرست ذیل میں تحریر کی جاتی ہے -

(۱) علم النباتات (Botany)
(۲) علم الحیوانات (Zoology)
(۳) علم الحیات (Biology)
(۴) علم تشریح (Anatomy)
(۵) علم طبقات الارض (Geology)
(۶) علم جغرافیہ (Geography)
(۷) علم الطبیعات (Physics)
(۸) علم الکیمیا (Chemistry) - وغیرہ وغیرہ

۲- علوم عملیہ کا موضوع، ان ذرائع کی تحقیق و ترتیب ہے جو کسی خاص مقصد زندگی کے حاصل کرنے کے لئے از بس ضروری ہیں

مذکورۂ ذیل علوم، علوم عملیہ کی امثال ہیں -

(۱) علم طب (Medicine)
(۲) علم خطابیات (Rhetoric)
(۳) علم العمارت (Architecture)

۳- علوم مقصدیہ وہ علوم ہیں جو کسی خاص مقصد زندگی کا فلسفہ دریافت کرتے ہیں - ان علوم کا موضوع، ہمیشہ ایسے نصب العین کی جستجو اور تدوین ہے، جسکو پیش نظر رکھکر، ہم تجربہ کے ایک خاص حصہ کے مظاہر کی قیمت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے ہیں -

علوم مقصدیہ کی مثالیں حسب ذیل ہیں -

(۱) علم المنطق (Logic)
(۲) علم الحسن (Esthetics)
(۳) علم الاخلاق (Ethics)

ہم ذیل میں علوم مقصدیہ کی انواع کی مختصر تعریف کئے دیتے ہیں تاکہ علوم مقصدیہ کی ماہیت بخوبی ذہن نشین ہو جائے -

(۱) علم المنطق، ایک ایسا نصب العین، مدون کرتا ہے، جسکو پیش نظر رکھتے ہوے، ہم صحیح استدلال اور مغالطہ (Fallacy) میں تمیز کر سکتے ہیں

(۲) علم الحسن، ایک ایسا نصب العین مدون کرتا ہے، جسکو پیش نظر رکھتے ہوے، ہم ایک حسین شے کو بدصورت شے سے ممتاز کر سکتے ہیں -

(۳) علم الاخلاق، ایک ایسا نصب العین مدون کرتا ہے، جس کو پیش نظر رکھتے ہوے، ہم نیک اور بد افعال میں امتیاز کر سکتے ہیں -

موجودہ علمائے علم الاخلاق نے[۱] متفقہ طور پر علم الاخلاق کو عام مقصدیہ کے تحت میں رکھا ہے - مگر بعض متقدمین کے نزدیک

---

[۱] موجودہ علمائے علم الاخلاق کی جماعت کے قابل الذکر عالم میور ہیڈ اور میکینزی ہیں - ڈاکٹر جان میور ہیڈ فلسفۂ اخلاق اور فلسفۂ ذہنی کا برنگھام یونیورسٹی میں پروفیسر ہے - اس نے علم الاخلاق پر ایک رسالہ موسوم بہ "عناصر اخلاق" لکھا ہے - ڈاکٹر جان میکینزی، ساؤت ویلس اور مان ماوتھ شائر کے یونیورسٹی کالج میں منطق اور فلسفہ کا پروفیسر ہے - آخر الذکر، ٹرنٹی کالج کیمبرج کا فیلو رہچکا ہے - اسکی مستقل تصنیفات حسب ذیل ہیں :-

(۱) مقدمۂ علم المعاشرت ("Introduction to Social Philosophy")
(۲) خاکۂ مابعد الطبیعات ("Outlines of Metaphysics")
(۳) رسالۂ علم الاخلاق ("A Manual of Ethics")

علم الاخلاق، علم اتباعی ہے، اور بعض کے خیال میں علم عملی اور بعض کے نزدیک اس علم میں دونوں علوم کے خصائص موجود ہیں۔ ان عالموں کے دعاوی اور دلائل کی تفصیل اپنے موقعہ پر آگے آئیگی، بالفعل چونکہ ہمارے موجودہ خیالات تقریباً تمام تر ماخوذ ہیں اس علم کی جدید تحقیقات کے مواد سے، لہذا اہم علم مقصدیہ کو، علم الاخلاق کا جنس قریب مانکر، علم الاخلاق کی منطقی تعریف اسطرح کرسکتے ہیں کہ

علم الاخلاق، انسانی سیرت و کردار سے بحث کرنے والا علم مقصدیہ ہے۔

انسانی سیرت و کردار کی ماہیت، اُن دونوں کے درمیان کی حد فاصل، اور اُن کا باہمی تعلق اور ربط۔ یہ سب امور مفصل طور پر آگے بتلائے جائیں گے۔

علم الاخلاق، اور دیگر عُلوم

مختلف علوم کا موازنہ کرنے سے دیکھا گیا ہے، کہ اُن میں باہمدیگر ایک طرح کی مجانست اور مشابہت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے: کیونکہ کل موجودہ علوم ایک ہی "کُل" کے مختلف اجزا سے بحث کرتے ہیں: یعنی ہر علم کا موضوع انفرادی حیثیت سے، "وہ تجربہ" ہی کے کسی نہ کسی صنف کے مظاہر ہیں۔ چنانچہ

علم الاخلاق اور علم السیاست — علم الاخلاق، اور علم السیاست (Politics) کے ڈانڈے اسقدر ملے ہوئے ہیں کہ قدما بشدت تشابہ کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے تمیز نہیں کرسکتے۔ افلاطون اور ارسطو تک، اول الذکر کو کوئی مستقل علم نہیں تصور کرتے، بلکہ اُسکو آخر الذکر پر منحصر اور اسکا ایک جزو خیال کرتے ہیں۔ ارسطو کے نزدیک، انسان کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ "ایک سیاسی حیوان" ہے۔ افلاطون، بجائے ایک فرد واحد کے اوصاف حسنہ مقرر کرنیکے پہلے ایک اچھی حکومت کے اوصاف متعین کرتا ہے اور بعد ازاں محاسن حکومت سے، شخصی اور انفرادی مکارم اخلاق، انتزاع کرتا ہے۔ رسالہ جمہوریت (Republic) کا بحث ہی یہ ہے کہ "ایک اعلیٰ پایہ کی حکومت کے کیا اوصاف ہونا چاہئیں"۔ چنانچہ افلاطون کے زمانہ میں، اُس کے استقرا (Induction) کے بموجب، ایک اعلیٰ حکومت میں، حسب ذیل صفات لازمی تھے:۔

(۱) دانائی،

(۲) ہمت،

(۳) اعتدال،

(۴) انصاف،

ان صفاتِ سلطنت سے، اُس نے قیاس کیا، کہ ایک عمدہ اور نیک آدمی کے لئے بھی یہی صفات لازمی ہیں۔

ہیگل[۵] جو فلسفہ جدید کا ایک سربرآوردہ اور ممتاز فلاسفر ہے، علم الاخلاق کو ایک جُداگانہ اور مستقل علم نہیں خیال کرتا، بلکہ اُسکو ایک ضمنی مسئلہ سمجھتا ہے اور اپنے رسالہ "فلسفہ حق" (Philosophy of Right) میں ضمناً اور سرسری طور پر مسائل علم الاخلاق بیان کرجاتا ہے۔

درحقیقت، علم الاخلاق، علم السیاست، کی طرح ایک مستقل علم ہے۔ اور اسکا اصل موضوع، علم السیاست کے موضوع سے جُدا ہے، گوکہ اُنکے درمیان خط فارق بہت باریک ہے۔ قبل اسکے کہ ہم ان علوم کا امتیاز بتلائیں، علم السیاست کی مندرجہ ذیل تعریف ذہن نشین کرلینا چاہیئے:۔

---

[۵] جرمنی کا ایک مشہور و معروف فلاسفر، ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوا، اور ۱۸۳۱ء میں مرگیا۔ جو صاحب ہیگل کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، اُنکو چاہیئے کہ اُسکی کتاب "فلسفہ تاریخ" سے ابتدا کریں، یہ کتاب بمقابلہ اس فلاسفر کی دیگر تصنیفات کے زیادہ سہل ہے، موضوع بھی دلچسپ ہے، اور اسمیں ہیگل کے نظام فلسفہ کے جستہ جستہ مسائل سب آگئے ہیں۔

علم السیاست، علم اثباتی اور علم مقصدی کا ایک ایسا مرکب علم ہے، جو ہیئت اجتماعیہ (Society) کے تمدن کا فلسفہ بتانے کے ساتھ ساتھ، ایک اعلیٰ حکومت کا نمونہ پیش کرتا ہے، تاکہ موجودہ ہیئت اجتماعیہ اُس کے مطابق متشکل ہو۔

ایک ظاہری فرق تو یہی ہے کہ علم السیاست میں علم اثباتی اور علم مقصدی، دونوں کی شان پائی جاتی ہے، درآنحالیکہ علم الاخلاق خالص علم مقصدی ہے۔ دوسرا فرق جو نسبتاً زیادہ دقیق اور اصل ممیز ہے یہ ہے کہ

علم الاخلاق کا موضوع سیرت و کردار انسانی ہے، اور علم السیاست کا موضوع وہ مظاہر ہیں جنمیں افعال حمیدہ جلوہ نما ہوتے ہیں۔ مثلاً خاندان، مدرسہ، حرفت وغیرہ وغیرہ۔

یہ تفریق، میور ہیڈ کی زبان سے قابل سننے کے ہے۔

دونوں علوم کا تعلق سیرت و کردار انسانی سے ہے، دونوں علوم، انسانی بہبودی کو پیش نظر رکھتے ہوئے، سیرت و کردار سے بحث کرتے ہیں، اور اُن کو فیصلۂ اخلاقی کا محکوم قرار دیتے ہیں۔ دونوں علوم اُن کو (سیرت و کردار کو) ایسے قوانین کے ماتحت تصور کرتے ہیں، جنمیں عقاب و انعام مضمر ہیں (یعنی جنکے اتباع یا عدم اتباع کے نتائج، علی الترتیب، انعام و عقاب ہوتے ہیں)، (مگر) فرق یہ ہے کہ جہاں علم الاخلاق کا کام، سیرت و کردار کی محض بحیثیت محکوم فیصلہ اخلاقی، تحلیل سے ہے، [یعنی، دکردار کی صحت اور عدم صحت (بتانا ہے)] وہاں علم السیاست کا فعل یہ ہے کہ اُن خارجی صور اور تعینات (Institutions) کی تحلیل کرے جو اُن میدانوں کا خاکہ پیش کرتے ہیں جنمیں اعمال نیک ظہور پذیر ہوتے ہیں، مثلاً خاندان، مکتب، گرجا، حرفہ وغیرہ۔ لہذا کہا جا سکتا ہے کہ علم الاخلاق مقدم ہے علم السیاست پر۔ ہم صرف اُسی حالت میں اپنے افعال کے مخصوص خارجی لوازمات کا مسئلہ طے کرنے کی امید کر سکتے ہیں، جبکہ ہمکو اعمال حسنہ کی ماہیت کا صحیح صحیح تصور ہو جائے۔ سیاسی تعینات کی تنقید کی عمارت، حیات انسانی کی تنقید کی داغ بیل پر اُٹھانا چاہیئے اور حیات انسانی کی تنقید کی بھی خصوصاً وہ صورت جسمیں وہ ایک اعلیٰ قانون یا دستور العمل کی تابع ہوتی ہے، یعنی علم الاخلاق پر۔ [۱]

علم الاخلاق اور علم الاقتصاد	

علم السیاست کی طرح، علم الاقتصاد (Political Economy) میں بھی، علم اثباتی اور علم مقصدی، دونوں علوم کے خصائص پائے جاتے ہیں۔ اس حد تک، علم الاقتصاد، علم اثباتی ہے، کہ وہ تجارتی زندگی کے واقعات ترتیب دیتا ہے، مگر اس کے آگے جب وہ ایسا مطمح نظر مقرر کرتا ہے جسکی طرف تجارتی زندگی کے کل واقعات کا رُخ ہونا چاہیئے، وہ علم اثباتی کے دائرہ سے نکلکر علم مقصدی کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ علم الاخلاق خالص علم مقصدی ہے، لہذا طرز بحث کے لحاظ سے تو (جہانتک آخر الذکر خصوصیت کا تعلق ہے) دونوں علوم باہمدیگر مشابہ ہیں لیکن اپنے اپنے مخصوص موضوعات کے لحاظ سے فرق یہ ہے کہ علم الاخلاق، حیات انسانی کے مقصد اعلیٰ سے بحث کرتا ہے، اور علم الاقتصاد اُن اشیاء سے بحث کرتا ہے جو مختلف ضروریات زندگی پوری کرتی ہیں۔ مثلاً غذا، لباس، مکان، چند اقتصادی اشیاء ہیں اور چند ضروریات انسانی یا مقاصد

---

[۱] "Elements of Ethics" مصنفہ ڈاکٹر جان۔ ایچ میور ہیڈ۔ یہ اقتباس ظاہراً جس قدر سنلق ہے، حقیقتاً اُسیقدر دقیق بھی ہے۔ خطوط ہلالی ( ) میں جو عبارت ہے وہ جا بجا توضیع کے لئے ہمنے اضافہ کی ہے۔

زندگی کو پورا کرتے ہیں مثلاً قیامِ حیات، ترقی حیات، حفظِ نفس، حریت، امن چین، تہذیب وغیرہ، مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ ضروریات ہماری حقیقی ضروریات ہیں اور کیا یہ مقاصد قابل اسکے ہیں کہ انکے حاصل کرنے میں ہم جد وجہد کریں؟ ان سوالات کا جواب علم الاخلاق دے سکتا ہے: اگر یہ مقاصد معیارِ اخلاق پر کسکر کھرے اتریں، تو انکے حصول میں کوشش بلیغ کرنا چاہیئے- اور اشیاء متذکرہ کو اختیار کرنا چاہیئے؛ اور اگر یہ مقاصد، حیاتِ انسانی کے مقصد اعلیٰ کے درمیانی کڑیاں نہیں ہیں، بلکہ اس مقصد اعلیٰ تک پہونچنے میں سنگِ راہ ہوتے ہیں، تو انکے حاصل کرنے میں کاوش کرنا سخت بیوقوفی ہے۔[51] نکتہ یہ ہے کہ علم الاقتصاد کے کل علمی قضایا، علم الاخلاق پر مبنی ہیں، اسی نکتہ کو ارسطو نے، تعمیم کے ساتھ کیا خوب کہا ہے-

> ہمارا ہر فعل[52]، حقیقت میں، منطق کی ایک شکل (Syllogism) ہوتا ہے، جسکا مقدمہ کبریٰ علم الاخلاق مہیا کرتا ہے مقدمہ صغریٰ اُس فعل کا وجود ذہنی ہوتا ہے، اور نتیجہ اُس فعل کا وجود خارجی یعنی اُس فعل کو کرنا-[53]

علم الاخلاق، علم المنطق اور علم الحسن

یہ تینوں علوم متحد النوع ہیں یعنی ایک ہی جنس (علم مقصدی) کے مختلف انواع ہیں- بلحاظ طرز موضوع کے جو ان میں باہدیگر مجانست ہے ظاہر ہے- فرق نفس موضوعات میں ہے- میدان، ہر اک کا جداگانہ ہے، یا باختلاف الفاظ وہ اشیاء بالکل مختلف ہیں جنکا اندازہ، ان علوم کے دریافت کردہ اسٹینڈارڈ یا معیار سے کیا جاتا ہے- اور اسی وجہ سے ہر اک کے اسٹینڈرڈ کی نوعیت بھی مختلف ہے: علم الاخلاق ہمارے افعال کے لئے ایک دستورالعمل مہیا کرتا ہے، علم المنطق ہمارے استدلالات کے لئے ایک میزان مقرر کرتا ہے، اور علم الحسن، ہمارے لئے معیارِ حسن دریافت کرتا ہے-

علم الاخلاق اور علم الحیات

مسئلہ ارتقا (Evolution) کے حلقہ بگوش فلاسفروں کا متفقانہ فیصلہ ہے کہ علم الاخلاق کے قضایا کلیتاً مبنی ہیں علم الحیات کے نتائج پر- چنانچہ ہربرٹ اسپنسر اور اُس کے ہم خیال فلاسفروں کے نزدیک معیار اخلاق ہی یہ ہے کہ جو افعال ترقی حیات میں مدومعین ہوتے ہیں وہ اچھے ہیں برخلاف انکے جو ترقی حیات کو روکتے ہیں اور انحطاط انگیز ہیں، وہ برے ہیں- اس قدر تو تقریباً سب کو مسلم ہے، کہ حاسۂ اخلاقی (Moral Consciousness) کی تدریجی ترقی کا مطالعہ مسئلہ علم الاخلاق پر ایک تیز روشنی ڈالتا ہے، مگر

> بمقابلہ علم الحیات کے، اس قسم کے مطالعہ کا، علم النفس (Psychology) سے قریب تر تعلق ہے-[54]

اسکی تفصیل اپنے مناسب جگہ پر آگے آئیگی، لہذا یہاں ہم قلم انداز کرتے ہیں-

علم الاخلاق اور علم النفس

علم الاخلاق کا موضوع، کردارِ انسانی ہے، کردار انسانی عبارت ہے افعالِ بالارادہ کے مجموعہ سے، اور ہر فعل بالارادہ معلول ہوتا ہے، جذبات، خواہشات،

---

[51] ماخذ، رسالہ علم الاخلاق ("Manual of Ethics") مصنفہ ڈاکٹر میکنزی- صـ۲۱ وصـ۳۲

[52] "فعل" سے مراد یہاں کل وہ مدارج ہیں، جو کسی فعل کے اختیار کرتے وقت ذہن کو طے کرنا پڑتی ہیں، ان مدارج میں اُس فعل کو پسند کرنا، اور پھر اُس فعل کو کرنا بھی شامل ہے

[53] ارسطو کی عبارت بجنسہ یہ نہیں ہے، ہمنے اُسکے مفہوم کو اختصار کے ساتھ اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے-

[54] ماخذ، میکنزی صـ۲۷ و۱۶

اور قوت ارادی کا، ان مظاہر (یعنی جذبات، خواہشات وغیرہ) میں سے ہر ایک کے قوانین اور اصول کی تدوین، موضوع ہے علم النفس کا، لہٰذا علم الاخلاق کے اصول موضوعہ حقیقت میں، علم النفس کے متعلق نتائج ہیں۔ اس طرح پر علم الاخلاق عصر جدید میں علم النفس سے وہی نسبت رکھتا ہے، جو عصر قدیم میں اسکو علم السیاست سے تھی۔ یعنی متقدمین، علم الاخلاق کو علم السیاست پر منحصر خیال کرتے تھے، متاخرین[۵۱] اسکو علم النفس پر مبنی خیال کرتے ہیں۔

علم الاخلاق اور مابعد الطبیعات | علم الاخلاق کو مابعد الطبیعات سے وہی نسبت ہے جو جزو کو کل سے ہے۔ بعض فلاسفر مثل مدقق کینٹ[۵۲]، ہیگل، بریڈلی[۵۳] وغیرہ کے علم الاخلاق کے مسائل کو مابعد الطبیعات کے رنگ میں حل کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمارے نزدیک اسقدر دور جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کینٹین اسکول کی مغز کاویاں کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق معلوم ہوتی ہیں۔ کینٹ کے نظام الاخلاق کا مفصل ذکر مع اسکی تنقید کے آگے آئیگا۔

ظفر

---

۵۱ میور ہیڈ و میکنزی، دونوں بالکل کینٹ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں چونکہ یہ دونوں فلاسفر بریڈلی کے خوشہ چین ہیں اور بریڈلی بڑا کینٹ پرست ہے

۵۲ کینٹ ۱۷۲۴ء میں تولد ہوا اور ۱۸۰۴ء میں فوت ہوا۔ جرمنی کا ایک مشہور و معروف فلاسفر ہے۔ موجودہ علمی دنیا پر جسقدر کینٹ کا اثر ہے کسی دوسرے فلاسفر کا نہیں۔ اس شخص کو بجائے محقق کے مدقق کہنا زیادہ صحیح ہے۔ اسلئے کہ محقق تو کہتے ہی بات کو دلیل سے ثابت کرتا ہے، مدقق دلیل کو دلیل سے ثابت کرتا ۔ اور اس طرح پر ایک مجرد محض (purely abstract) نظام فلسفہ (System of Philosophy) جس طرح کہ کینٹ نے ڈالی کینٹ ایسا پابند وقت تھا کہ لوگ اس سے اپنی گھڑیاں ملایا کرتے تھے۔

۵۳ بریڈلی انگلستان کا ایک فلاسفر ہے۔ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوا۔ کینٹ کے خاص زندہ شاگردوں میں سے ہے۔

حیرت انگیز جدید علمی انکشافات

سائنس کے فائدے

مکالے کا نام ہندوستان میں زبان زد خاص و عام ہے اس کی قابلیتوں کا سب کو اعتراف ہے۔ مکالے سائنس داں نہیں تھا لیکن سائنس کا جادو اس پر چل گیا تھا۔ سائنس نے بنی نوع انسان کو حق پرستی اور حق جوئی کے صلہ میں جو انعامات عطا کئے ہیں اور جو فوائد ہم کو اپنی روزمرّہ کی زندگی میں علمی تحقیقات کی بدولت حاصل ہیں ان کو مکالے نے نہایت خوبی کے ساتھ مجملاً یوں بیان کیا ہے:۔

سائنس نے زندگی لمبی کردی ہے۔ تکلیف کو گھٹا دیا ہے۔ بیماریوں کی بیخکنی کردی ہے۔ زمین کی پیداوار بڑھادی ہے۔ ملاحوں کی زندگی کو خطرہ سے محفوظ کردیا ہے۔ سپاہیوں کے لئے نئے نئے بازو بنا دئے ہیں۔ بجلی کو مطیع و منقاد بنا لیا ہے۔ رات کی تاریکی کو دن کے اجالے سے زیادہ روشن بنا دیا ہے۔ آنکھ کی دُور بینی کو وسعت بخشی ہے۔ انسانی طاقتوں کو لاانتہا ترقی دی ہے۔

رفتار تیز کر دی ہے۔ فاصلہ کم کر دیا ہے۔ میل ملاپ آسان کر دیا ہے اور حضرت انسان کو سمندر کی تہ اور ہوا کی بلندی کی سیر کرادی ہے۔ یہ سائنس کے اولین فوائد میں سے چند ایک ہیں۔ ہزاروں فائدوں سے انسان ابھی متمتع نہیں ہوا۔ سائنس کا قانون ترقی کرتا ہے۔ جو باتیں کل ہماری آنکھوں سے مخفی تھیں آج ہمارے پیش نظر ہیں اور آیندہ وہی ہماری تحقیق کی ابتدا ہونگی۔

جو امور اس مختصر اقتباس میں بیان کئے گئے ہیں انہیں سے ہر ایک بجائے خود ایک علیحدہ کتاب چاہتا ہے۔ علم دوست اصحاب جو زمانہ سے پیچھے نہیں ہیں خود اس اجمال کی تشریح کر سکیں گے اور کسی غلط فہمی میں نہیں پڑینگے۔ اگر سائنس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی بدولت زندگی لمبی ہو گئی ہے تو یہ چنداں حیرت انگیز نہیں ہے۔ زندگی لمبی ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ فی الحقیقت انسانی عمر میں زیادتی کرنے کے لئے سائنس نے کوئی کیمیائی نسخہ دریافت کر لیا ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ سائنس کے طفیل ہم اپنی تھوڑی سی عمر میں بہت سے کام کر سکتے ہیں جو صدیوں زندہ رہ کر بھی سرانجام نہیں دے سکتے تھے۔ علیٰ ہذا القیاس باقی فقرات بھی سمجھنے کے قابل ہیں۔ صرف مکالے ہی سائنس کے محاسن میں اتنے جوش سے رطب اللسان نہیں ہوا بلکہ ہر کہ و مہ سائنس کی فضیلت کا معترف ہے۔

نکل کے معدنی کاغذ

سائنس کے تمام کارنامے اپنی اپنی جگہ مفید ہیں۔ بعض ان میں سے اتنے ادق اور باریک ہیں کہ معمولی انسان نہ تو انہیں سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ہم اُن سے، دوسروں کی محنت اور عقل کے وسیلہ سے، بغیر سمجھے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ بھاپ اور حرارت کے خواص سے سب آشنا ہیں لیکن ہم بہت کم دخانی انجنوں کے پُرزوں اور طریق عمل سے آگاہ ہونگے گو ریل گاڑی سے سب کوئی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اسی طرح ایک صدی کے قریب زمانہ گذرا ہے جب ایک انگریز (ڈیوی) نے برقی رَو کے ذریعہ سے کیمیائی مرکبات پھاڑ کر انکے عناصر علیحدہ علیحدہ کرنے کا طریقہ دنیا کو بتایا تھا۔ اُسکے بعد فیراڈے نے اس عمل کے قوانین دریافت کئے اور آہستہ آہستہ اس عمل میں ترقی ہوتی گئی۔ یہانتک کہ ڈیوی کے اُس ایک تجربہ سے بڑھتے بڑھتے ہمارے معلومات اس قدر ترقی کر گئے ہیں کہ بہت سے کارخانے برقی رَو کی مدد سے گلٹ کر کرکے لکھو کہا روپیہ کما رہے ہیں۔ لیکن حال ہی میں امریکہ کے ماہر سائنس داں ایڈیسن نے جو علمی فائدہ اُن اُصولوں سے حاصل کیا ہے وہ نہایت حیرت انگیز ہے۔

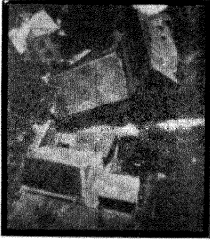
ایڈیسن نے نہایت باریک دھات کے کاغذ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ جو خاص دھات اُسے کاغذ بنانے کے لئے تجربات کی بناء پر زیادہ مفید ثابت ہوئی ہے نکل (Nickel) ہے یہ وہی ہلکی دھات ہے جس کی اکنّی ہندوستان میں رائج ہیں۔ ایڈیسن کا دعویٰ ہے کہ یہ کاغذ ہر حیثیت سے معمولی مروجہ کاغذوں سے فایق، زیادہ مضبوط، زیادہ دیرپا اور کہیں زیادہ خوشنما اور سستا ہے۔ اور ان سب خوبیوں پر طرہ یہ ہے کہ ہلکا اور نہایت باریک ہے۔ کیڑا اس کو نہیں لگ سکیگا اور اسکی کتابیں کاغذ کی معمولی کتابوں سے زیادہ لوچ دار ہونگی اور شکن پڑنے سے پھٹنے کا اندیشہ بھی کم ہوگا۔ اس کے بنانے کا طریق عمل لکھنے میں تو نہایت آسانی کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ نکل کے کسی کیمیائی مرکب کو تحلیل کرکے اس میں ایک خاص قوت کی برقی رَو گذاری جاتی ہے اور نکل کی باریک تہ جو ورق سالبہ

کیتھوڈ = Cathode یا نیگٹو پلیٹ = Negative plate جسکے ذریعہ سے برقی رَو نکل والے برتن سے باہر نکلتی ہے) پر ایک ثانیہ کے بہت قلیل حصہ میں جم جاتی ہے نکل کا کاغذ بنجاتی ہے۔ لیکن عملاً یہ بات ایڈیسن کو کثیر التعداد ناکامیاب تجربوں کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ نکل کا کونسا مرکب سب سے زیادہ مناسب اور سستا ہے؟ اس کو کونسی چیزیں اور کتنی مقداریں حل کرنا چاہیئے تاکہ عمدہ ترین نتائج حاصل ہوں؟ برقی رَو کس قوت کی ہونی چاہیئے؟ نکل کی تہ جمانے کے لئے ورق سالبہ کی کیا شکل ہونی چاہیئے؟ یہ اور اور بہت سے اسی قسم کے سوالات جو عملیات سے متعلق ہیں تمام مسئلے کی جان ہیں۔ لیکن جس وقت ہماری غرض صرف نکل کے کاغذ سے فائدہ اخذ کرنا ہوتی ہے ہمیں ان سوالات سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ اگر یہ نکل کا کاغذ تجارتی طور پر کامیاب ثابت ہوا تو عام خریداروں کو بھی بازار سے قیمتاً دستیاب ہوسکیگا۔

ایڈیسن کا بیان ہے کہ نکل کا وہ کاغذ جسکی دبازت ایک انچ کا بیسں ہزارواں حصہ ہو چھپائی وغیرہ کے لئے بالکل موزوں ہے۔ اس حساب سے ایسی کتاب جس میں بیس ہزار صفحے ہوں صرف ایک انچ موٹی ہوگی۔ یہ امر اس قدر سنسنی خیز ہے کہ معمولی آدمی جو سائنس کے دیگر عجائبات سے کماحقہ آگاہ نہیں ہیں نہایت مشکل کے ساتھ اسے صحیح ماننے کے لئے تیار ہونگے۔ اتنا باریک نکل کا کاغذ ایڈیسن کے بیان کے مطابق معمولی باریک کاغذوں سے جو آجکل مروج ہیں کہیں زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوگا۔ ایڈیسن کے دل و دماغ کی حالت جس وقت کہ وہ اس حیرت انگیز نتیجہ پر کامیابی سے پہنچا ہوگا مطالعہ کرنے کے قابل ہوگی! اس نے نہایت شاندار طریقہ سے اپنی خوشی کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ یہ ایجاد دنیا کے کاروباری آدمیوں کے لئے حد درجہ کی راحت و آرام کا موجب ہوگی۔ ایک بیرسٹر یا وکیل اپنی قانون کی کتابوں کی ساری لائبریری اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈالکر کچہری میں جاسکیگا طالب علم بڑی بڑی ڈکشنریوں کی زحمت سے نجات پائینگے۔ تمام دنیا کے علمی خزانے ایک معمولی حیثیت کی لائبریری میں جمع ہوسکیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس کاغذ کے لئے خاص قسم کی سیاہی بنانے کی ضرورت ہوگی گو معمولی چھاپہ کی سیاہی بھی اسکے لئے کافی عمدہ ہے۔

کبوتر اور فوٹوگرافی

جرمنی میں ایک فوٹوگرافر نے دنیا کے لئے ایک اور حیرت انگیز تجربہ میں کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اس کا ذکر کریں فوٹوگرافی کے متعلق چند الفاظ بطور تمہید کے بیان کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ فوٹوگرافی روشنی کے ذریعہ سے تصویر کھینچنے کے عمل کا نام ہے۔ اگر آپ ایک تاریک کمرہ میں ایک سوراخ میں سے سورج کی روشنی اندر آنے دیں تو بیرونی اشیا کی الٹی تصویریں سوراخ سے سامنے کی دیوار پر پڑینگی۔ اگر اس سوراخ کے نزدیک ایک اور سوراخ نکالدیا جائے تو ہر ایک چیز کی دو الٹی تصویریں دیوار پر پڑینگی اور اگر بہت سے سوراخ ساتھ ساتھ نکالے جائیں تو اتنی ہی اُلٹی تصویریں ہر ایک چیز کی حاصل ہونگی۔ سامنے کی دیوار پر روشنی کی مقدار زیادہ ہوگی لیکن تصویریں علحدہ علحدہ پہچانی نہیں جاسکینگی اس لئے کہ مختلف تصویریں ایک دوسرے کے اوپر آگئی ہونگی جب بہت سے سوراخ ساتھ ساتھ تھوڑی سی جگہ میں نکالے جائینگے تو ایک بڑا سوراخ بن جائیگا جس میں سے روشنی تو زیادہ آئیگی لیکن تصویریں دُھندلی پڑجائیں گی۔ اس نقص کو رفع کرنے کے لئے اگر اس بڑے سوراخ میں ایک محدب شیشہ



(الف) کبوتر کی کھینچی ہوئی تصویر کا **پیمانہ**



کیمرا لگانے کا طریقہ



(ب) اُسی تصویر کو ذرا بڑا کرکے دکھایا ہے



یہہ کبوتر تصویر اُتارنے کی غرض سے اُڑنے کو تیار ہے

کبوتر اور فوٹو گرافی

انڈین پریس الہٰ آباد

لگا دیا جائے تو ایک روشن اور صاف اُلٹی تصویر سامنے کی دیوار پر پڑیگی۔یہی اُصول فوٹوگرافی کی جان ہیں۔کیمرا لکڑی کا ایک صندوق ہوتا ہے جس کا اندرونی حصہ سیاہی سے رنگا ہوتا ہے اور جس میں صرف ایک سوراخ ہوتا ہے اس سوراخ میں محدب شیشہ لگا ہوتا ہے۔محدب شیشہ کے مقابل شیشہ کی ایک پلیٹ رکھی ہوتی ہے جس پر ایسے کیمیائی مرکبات لگے ہوتے ہیں کہ وہ روشنی کے اثر سے سیاہ ہو جاتے ہیں۔محدب شیشہ کے سامنے ایک پردہ ہوتا ہے جس کو فوٹوگرافر اپنے ہاتھ سے ہٹاتا ہے اور جس منظر کو کیمرا کی آنکھ دیکھ رہی ہوتی ہے وہی منظر سامنے کی پلیٹ پر اُلٹا ثبت ہو جاتا ہے۔

جرمنی کے فوٹوگرافر نے جن تجارب میں کامیابی حاصل کی ہے ان کا ماحصل یہ ہے کہ اس نے کبوتروں کو فوٹوگرافر بنا دیا ہے۔اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک طرف تو ایک ایسا کیمرا بنایا ہے جس میں محدب شیشہ کے سامنے کا پردہ اوقات معینہ پر اس کے آگے سے خود بخود ایک خاص عرصہ کے لئے ہٹ جاتا ہے اور جو چیزیں کیمرا کی آنکھ کے سامنے ہوتی ہیں ان کی تصویر پلیٹ پر ثبت ہو جاتی ہے وہ کیمرا اتنا ہلکا اور چھوٹا ہے کہ ایک کبوتر کے سامنے بازوؤں کے ساتھ باندھا جا سکتا ہے۔اسکے بعد سب سے ضروری مسئلہ کبوتروں کا سدھانا ہے تاکہ ایک معلوم اور یکساں رفتار کے ساتھ اُڑیں اور جس طرف ان کو اُڑایا جائے اُدھر ہی جائیں اِدھر اُدھر گھومنا شروع نہ کر دیں۔اس کی تفصیل کے لئے تو ایک دفتر درکار ہے مگر خلاصہ یہ ہے کہ اس طریقہ سے سدھائے ہوئے کبوتروں کی مدد سے لڑائی کے موقعہ پر بہت مدد مل سکتی ہے۔دشمن کے قلعوں کے اندرونی حصوں کی تصاویر حاصل ہو سکتی ہیں۔یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ یہ تصویریں خواہ مخواہ بہت چھوٹی ہونگی لیکن اگر ان کو بڑا کر لیا جائے تو ہر ایک چیز کی شناخت آسانی سے ہو سکتی ہے۔فوٹوگرافر موصوف نے یہ تجارب محض اپنے علمی مذاق کی مدد سے کئے ہیں۔فی الحال وہ اپنے خاص کیمرا کی مدد سے یہ امر دریافت کر سکتا ہے کہ اس کے کبوتر کن کن مقامات پر اُڑتے رہے ہیں۔ارباب بصیرت اس معاملہ پر مزید غور کریں اور اس حیرت انگیز انکشاف کے علمی پہلوؤں پر نظر دوڑائیں۔یوروپ والے اپنے تفریح کے سامان میں بھی مفید مطلب باتیں نکال لیتے ہیں۔لیکن ہم ہیں کہ ہمارے علمی مشاغل سے بھی آجتک کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

ایک پہیہ کی ریل گاڑی

ایک عرصہ سے بجلی کے فوائد ثابت ہو چکے ہیں۔کھانا اسکی مدد سے پک سکتا ہے۔نوکر کا کام یہ دے سکتی ہے۔بستر یہ بچھا دیگی۔دروازے یہ بند کریگی۔کھانا یہ چن سکتی ہے اور یہ سب کام محض خیالی ہی نہیں ہیں بلکہ یوروپ اور امریکہ میں کئی صدہا گھر ایسے ہیں جن میں بجلی کی مدد سے سارے کام کئے جاتے ہیں۔ٹریموے تو بجلی سے چلتی ہیں عنقریب ریل گاڑیاں بھی اسکی مدد سے چلا کرینگی۔ایک پہیہ والی ریل کا انحصار تو بجلی کی قوت ہی پر ہے۔ایک پہیہ کی ریل کا اصول یہ ہے کہ گھومتی ہوئی اشیاء اپنا مرکز ثقل قایم رکھتی ہیں۔آپ نے بچوں کو دیکھا ہو گا کس مزے سے لٹو گھماتے ہیں؟ اگر لٹو ساکن ہو جائے تو زمین پر گر پڑتا ہے لیکن گھومتے ہوئے نہ صرف بغیر ہمارے مستقل طور پر کھڑا رہتا ہے بلکہ حرکت بھی کر سکتا ہے۔برینن نے جو ایک پہیہ کی ریل گاڑی کا موجد ہے اسی لٹو کی مثال سے حضرتِ انسان کے لئے ایک پہیہ والی گاڑی چلائی ہے۔گاڑی کے پہیوں میں بڑے بڑے لٹو بجلی کی طاقت سے گھومتے رہتے ہیں اور بجلی کی طاقت سے گاڑی بھی حرکت

کرتی جاتی ہو۔ جب تک لٹو گھومتے ہیں گاڑی کے گرنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا۔

بجلی کی مدد سے اوجھل اشیاء کو دیکھنا۔

بجلی کی روشنی سے سب واقف ہیں۔ ٹیلیفون جس کے ذریعے آواز ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائی جاتی ہے بجلی کی مدد سے کام کرتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے انسان گھر بیٹھے لکچر اور اسپیچیں سُن سکتا ہے بلکہ دوسرے شہر کے آدمیوں سے بات چیت بھی کر سکتا ہے۔ تین سال کا عرصہ ہوا ایک سائنس داں کو یہ انوکھا خیال پیدا ہوا کہ جس طرح ہم اپنے کمرہ میں بیٹھے ہوئے دُور دُور کی باتیں سن سکتے ہیں کیا اسی طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اپنی کرسی پر بیٹھے بٹھائے اپنے غائب دوستوں کی شکل دیکھ سکیں۔ کوشش کرتے کرتے آخر اُسے کامیابی حاصل ہوئی۔ ب وہ بجلی کی مدد سے تھوڑے فاصلہ پر (جو ایک دو میل سے زیادہ نہ ہو) چھوٹی چھوٹی تصویریں دیکھ سکتا ہے اور اسی طرح ہم بھی کسی غائب دوست کا چہرہ اپنے کمرہ میں بیٹھے ہوئے بجلی کی مدد سے دیکھ سکیں گے میں ایک امر واقعہ کو بیان کر رہا ہوں۔ ابھی ان باتوں کا ہندوستان میں چرچہ نہیں ہوا لیکن جن ممالک میں لوگوں کو تحصیل علم کا شوق ہے وہاں ان باتوں کی طرف دن بدن زیادہ توجہ منعطف ہو رہی ہے۔ یہ کہنا نہایت مشکل ہے کہ یہ انکشافات عوام کی دسترس میں کب آئیں۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ جہاں کہیں برقی پیغام رسانی کے لئے تاریں لگی ہیں وہاں یہ سب باتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ چونکہ اس مسئلہ کو ذہن نشین کرانے کے لئے بہت سی ابتدائی باتوں کا سمجھانا لازمی ہے میں نے عمداً اس مسئلہ کا فلسفہ سمجھانے سے چشم پوشی کی ہے اور نتائج کے اظہار محض پر اکتفا کیا ہے۔ دُوربیں صرف ان دُور کی چیزوں کو دکھا سکتی ہے جن کے اور ہمارے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اوجھل اشیاء کو ہم دوربیں کی مدد سے نہیں دیکھ سکتے۔ مگر مذکورہ ایجاد کا مطلب یہ ہے کہ ہم گھر بیٹھے دوسرے گھروں کی چیزیں باوجود رکاوٹوں کے دیکھ سکتے ہیں۔

فاصلہ سے دل کی حرکت کا امتحان کرنے کا برقی آلہ

بجلی کے عجائبات کی فہرست بہت لمبی ہے اور اس کی ترقی اتنی سریع الرفتار ہے کہ اس کا پیچھا کرنا کچھ آسان بات نہیں ہے۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ بجلی بہت سے امراض کے لئے نہایت مفید ہے۔ بجلی کا غسل تو اب گئے گذرے ہندوستان میں بھی عام ہے۔ لیکن حال ہی میں جو فائدہ ایک ڈاکٹر نے بجلی سے حاصل کیا ہے وہ اتنا اہم ہے کہ ہم اس کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ نے انگریزی ڈاکٹروں کو دیکھا ہوگا کہ دل کی حرکت ایک خاص قسم کا آلہ لگا کر دریافت کرتے ہیں جسے اصطلاح میں سٹیتھسکوپ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے بجلی کی مدد سے ایک ایسا سٹیتھسکوپ ایجاد کیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ دور دراز کے مریضوں کی دلی حرکت کا معائنہ کر کے مرض کی تشخیص کر لیتا ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ دل کی دھیمی سی آواز کوسوں کے فاصلہ پر ڈاکٹر صاحب کے کان میں چلی جاتی ہے اور ایسی صفائی سے سُنائی دیتی ہے گویا مریض ڈاکٹر صاحب کے قریب ہی لیٹا ہوا ہے۔ اس ایجاد میں کوئی نیا اُصول نہیں دریافت کیا گیا۔ صرف ٹیلیفون اور سٹیتھسکوپ کے باہمی تناسب میں سے ایک نہایت ہی مفید چیز انسان کے قبضہ میں آگئی ہے۔ اگر کوئی چیز اس ایجاد میں قابل تعریف ہے تو وہ ڈاکٹر کا اصلی خیال ہے جو ٹیلیفون اور سٹیتھسکوپ کے باہم ملانے کا محرک ہوا۔ ہم نے علمی اخباروں میں پڑھا ہے کہ سو میل سے زیادہ فاصلہ پر سے تجربات میں کامیابی ہوئی ہے۔ اگر یہ ایجاد پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو مہذب ممالک میں جہاں برقی پیغام رسانی کے لئے تاریں شہر بہ شہر اور

خانہ بجانہ لگی ہوتی ہیں لایق ڈاکٹر اپنے مکان میں بیٹھکر دور کے غریب مریضوں کا علاج مفت کرسکیں گے۔

باتیں کرنے والی متحرک تصویریں

اسی طرح بجلی کی مدد سے اڈیسن نے حیات نما یعنی بائی اسکوپ (Bioscope) کی متحرک تصویروں میں جو کمی آواز کی تھی وہ پوری کردی ہے۔ اُس نے بائی اسکوپ اور آوازنگار فونو گراف (Phonograph) کو ایک مناسب طریقہ سے ملالیا ہے اور اب تھوڑے عرصہ کے بعد نہ صرف آپ دور و دراز کے واقعات ہو بہو جس طرح کہ وہ وقوع پذیر ہوتے ہیں بائی اسکوپ کے تھیٹر میں دیکھ سکیں گے بلکہ ان واقعات کے ساتھ جو آوازیں شامل ہیں وہ بھی اسی طریقہ سے آپ کے کانوں میں پڑینگی۔ ہم اس اجمال کی تفصیل نہایت آسانی کے ساتھ سادہ الفاظ میں کرسکتے ہیں۔ کیمرا کا اصول آپ نے سمجھ لیا ہے۔ اگر ایک چھوٹی سی پلیٹ کے بجائے ایک بہت بڑی اور لمبی پلیٹ جو لوچ دار ہونے کی وجہ سے کسی گول چیز پر لپٹی ہو (اصطلاح میں اسے فلم [Film] کہتے ہیں) کسی طریقہ سے کیمرا کے اندر داخل کی جائے اور بجائے ایک دفعہ تھوڑی دیر کے لئے محدب شیشہ کے آگے کا پردہ ہٹانے کے کئی لمحوں تک وہ پردہ ہٹا رہے اور اس اثنا میں کوئی چیز کیمرا کے سامنے مختلف حرکات کرتی رہے اور فلم بھی آہستہ آہستہ ایک معین تیزی کے ساتھ کھولی جائے تو اس چیز کی بہت سی تصاویر فلم کے مختلف حصوں پر ثبت ہوجائیں گی فی الاصل یہ تصاویر ایک دوسرے سے بالکل علحدہ ہونگی مثلاً فرض کیجئے کہ کیمرا کے سامنے ایک آدمی کھڑا ہو کر لکچر دے رہا ہے ایک ثانیہ میں اس کا ہاتھ کئی دفعہ ہلتا ہے ہونٹ مختلف شکلیں اختیار کرتے ہیں اور تمام جسم الفاظ کی مناسبت کے ساتھ ہلتا جلتا ہے

اب اگر ان تصاویر کو صحیح بناکر میجک لانٹرن کے سامنے رکھا جائے اور ایک ایک تصویر آہستہ آہستہ روشنی کے راستہ میں لائی جائے تو ہمکو علحدہ علحدہ تصاویر سامنے کے سفید پردہ پر نظر آئیں گی لیکن اگر مختلف تصاویر پے درپے ایک خاص تیزی کے ساتھ روشنی کے راستہ میں لائی جائیں تو بجائے علحدہ علحدہ تصاویر دکھائی دینے کے پردہ پر ہمیں لکچرار صاحب ہو بہو لکچر دیتے ہوئے منہ سے بولتے ہوئے ہاتھوں کو اوپر نیچے کرتے ہوئے دکھائی دینگے۔ اس کی وجہ ہماری آنکھ کی کمزوری ہے۔ بچے عام طور پر شرارتاً یا کھیل کے لئے لکڑی کے ایک ٹکڑے کو ایک طرف سے آگ لگا کر اپنی آنکھ کے سامنے گھماتے ہیں اور متعجب ہوتے ہیں کہ روشنی کا ایک دائرہ کس طرح بن جاتا ہے۔ اگر گھمانے کی رفتار آہستہ ہو تو ہم کو لکڑی کی نوک مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر دکھائی دیگی لیکن ایک خاص تیزی کے ساتھ گھمانے پر آنکھ اس کا پیچھا کرنے سے عاجز آجاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور کا ایک حلقہ حرکت میں ہے۔ بات یہ ہے کہ بیرونی اثرات کو آنکھ کے رٹینا (Retina) اور نورانی رگ (Optical Nerve) کے ذریعہ دماغ تک پہنچنے اور وہاں محسوس ہونے کے لئے ایک خاص وقفہ چاہیئے۔ اس طرح اگر ایک ثانیہ میں بیس سے زیادہ اثرات دماغ میں آنکھ کے راستہ سے پہنچیں تو مختلف اثرات کی حس ایک دوسرے سے ملجاتی ہے اور سب ملکر ایک بڑا اثر محسوس ہوتے ہیں۔ بائی اسکوپ فلم کی ماہیت اور طریق عمل مختصراً یہی ہے گو اس کے متعلق اور بہت سے امور ضروری ہیں لیکن ایک ابتدائی تشریح میں ان کا حذف کرنا ذکر کرنے سے افضل ہے۔ اب آپ خیال فرمایئے کہ جہاں کیمرا کی مدد سے لکچرار کی تصاویر لی جارہی ہیں وہیں اُس کی آواز کے

(فونوگراف کے لئے) ریکارڈ بھرے جا رہے ہیں۔ کہنے کو تو یہ بات آسان معلوم ہوتی ہے لیکن اصلی مشکل جو تامل کے بعد معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جس تیزی کے ساتھ تھا ویر لیجا رہی ہوں اسی تیزی کے ساتھ آواز کی تصویر بھی اتاری جانی چاہیئے تاکہ جس وقت پردہ پر لکچرار اپنا بازو زور سے نیچے لا رہا ہو اور کسی ضروری معاملہ کے متعلق تاکید اور جوش سے تقریر کر رہا ہو اس وقت گراموفون سے ہنسی کی آواز نہ آئے۔ یہ دقت نہ صرف تصویریں لینے اور ریکارڈ بھرنے کے وقت محسوس ہوتی ہے بلکہ تصویروں کو پردہ پر ڈالنے اور گراموفون بجانے کے وقت بھی محسوس ہوتی ہے۔ ہاتھ سے یہ کام کرنا نہایت مشکل ہے اس واسطے کہ انسانی ہاتھ یکساں تیزی کے ساتھ زیادہ دیر کے لئے کوئی کام نہیں کرسکتا۔ اس مشکل کا حل ایڈیسن کے خداداد ذہن رسا نے بجلی کی طاقت پر پورا اقتدار حاصل کرنے کے بعد کر لیا ہے۔ خاص قسم کے موٹر کی مدد سے فلم اور ریکارڈ بنائے جاتے ہیں اور پھر تماشہ کے وقت اسی کی مدد سے دکھائے جاتے ہیں۔ اس معنی خیز ایجاد کی اہمیت پر شاعر نہایت دلچسپ نظمیں لکھ سکتے ہیں اور آیندہ کے بعد میں اُن کا خیال جتنی دُور بھی جائے حقیقت کے خلاف نہ ہوگا۔

سونا سمندر کے پانی سے نکالنا

امریکہ کے ایک کیمسٹ (عالم کیمسٹری) نے ایک اور مژدہ حال ہی میں شایع کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے سمندر کے پانی سے سونا نکالنے کی ایک ایسی آسان ترکیب دریافت کی ہے جس سے سونا دنیا میں نہایت ارزاں ہو جائیگا اور کام کرنیوالوں کو بھی کثیر نفع ہوگا۔ سمندر کے بیس کروڑ حصہ پانی میں ایک حصہ سونا ہوتا ہے جب ہم اس سونے کی قلیل مقدار پر اور سمندر کے پانی کی کثرت پر خیال کرتے ہیں تو طبیعت میں ایک قسم کی مایوسی پیدا ہوتی ہے اور پہلا خیال یہی ہوتا ہے کہ سمندر کے پانی میں سے سونا نکالنا سودمند نہیں ہوسکتا بلکہ جتنی محنت اور زحمت تھوڑا سا سونا نکالنے میں صرف ہوگی اتنی محنت سے اور بہت سے مفید کام ہوسکیں گے ہم ان یاس آمیز خیالات کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ جس سائنس داں کی یہ دریافت ہے اس کا دعویٰ ہے کہ سمندر کے پانی میں سے سونا نکالنا ہزار فیصدی روزانہ منافع کا کام ہے۔ یا یوں کہو کہ اگر سو روپیہ صرف کیا جائے تو ہر روز ہزار روپیہ نفع حاصل ہوگا۔ ہاں یہ بات ضروری ہے کہ شروع میں بہت سا روپیہ مشینوں وغیرہ میں صرف کرنا پڑیگا اور جب کام چل نکلیگا تب کہیں فائدہ کی صورت نظر آئیگی۔ کیمسٹ موصوف نے فی الحال دنیا کو صرف اس بات سے مطلع کیا ہے کہ اس کام کے لئے ساحل سمندر کے نزدیک بڑے بڑے تالاب بنانے پڑینگے جنمیں پمپوں کی مدد سے سمندر کا پانی بھرا جائیگا۔ تالابوں کی تہ پر بعض خاص کیمیائی مرکبات ڈالے جائیں گے جن کے اثر سے سونا سمندر کے پانی سے علحدہ ہوکر تہ میں بیٹھ جائیگا۔ تالابوں میں سے پانی نکالنے کے لئے بھی زبردست پمپ (آلات مخراج الماء) لگائے جائیں گے اور اس طرح تقریباً سوا سات لاکھ روپیہ شروع میں خرچ کرنے سے ساڑھے تین کروڑ روپیہ سالانہ کا سونا دستیاب ہوسکتا ہے۔ ہمارے پاس تالابوں کے حجم پمپوں کی طاقت اور کیمیائی مرکبات وغیرہ کے خواص کے متعلق مکمل اعداد و شمار موجود ہیں لیکن ناظرین کو ان سے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ عنقریب کیمسٹ موصوف امریکہ کے سائنس دانوں کی سوسائٹی میں اپنے طریقہ کو پیش کرینگے اور اس کے بعد شاید عملی طور پر یہ کارروائی شروع ہو۔ بہرحال اگر یہ بات سچ ہے کہ سمندر کے پانی سے اتنی سہولت کے ساتھ ہم اتنا سونا نکال سکتے ہیں تو سونے کے



پنڈت بشن نرائن در، متخلص بہ ابر، بیرسٹر ایٹ لا، لکھنؤ
پریسیڈنٹ انڈین نیشنل کانگرس سنہ ۱۹۱۱ع

انڈین پریس الہ آباد

زیورات بنانے والوں کو سونے کی خرید میں ذرا توقف کرنا چاہئے ایسا نہو کہ سونا بہت سستا ہوجائے اور زیورات کی قیمت گھٹ جائے

انسانی پتنگیں

ہندوستان میں پتنگ بازی کا بہت چرچا ہے۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب، سب اپنا عزیز وقت اور محنت سے کمایا ہوا روپیہ اس تفریح میں ایک فضول طریقہ پر ضایع کرتے ہیں کم ازکم ہمارے کانوں میں پتنگ بازی کے خلاف ہزاروں شکایتیں پہنچی ہیں۔ لیکن ہم نے ہندوستان میں کسی کو پتنگ سے کوئی فائدہ حاصل کرتے نہیں دیکھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ دُور کی چیزوں کو دیکھنے سے انسانی آنکھ کوتاہ بینی یعنی مائی اوپیا (Myopia) کا شکار نہیں ہوتی لیکن ہم تو پتنگ بازی سے یہ فائدہ بھی حاصل نہیں کرتے۔ سو سال سے زیادہ گذرے ہیں جب فرنکلن نے امریکہ میں اپنے ریشمی رومال کی پتنگ بنا کر بارش کے وقت اُڑائی تھی اور اس جلیل القدر مسئلہ کا ثبوت بہم پہنچایا تھا کہ آسمانی بجلی اور وہ بجلی جو ہم رگڑسے یا برقی مورچہ وغیرہ کی مدد سے اپنے دارالتجارب (Laboratory) میں حاصل کرتے ہیں دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ آج بھی یوروپ میں جہاں ہر ایک چیز سے فائدہ اخذ کیا جاتا ہے پتنگیں نئے نئے کاموں کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ فرانس کے ایک شہر تولون میں ایک فوجی کپتان پتنگوں کی مدد سے سپاہی کو ہوا میں اُڑانے کی کوشش کررہا ہے تاکہ اس طریقہ سے جنگ کے موقعہ پر دشمن کی افواج اور قلعوں کا معائنہ کیا جاسکے۔ اس فرانسیسی کپتان کا خیال ہے کہ انسانی پتنگیں غباروں یا ہوائی جہازوں سے بدرجہا زیادہ مفید ہیں اس لئے یہ اُن سے نہ صرف زیادہ محفوظ ہیں بلکہ نہایت زور کی آندھی اور طوفان میں بھی کام آسکتی ہیں جبکہ غبارے اور ہوائی جہاز بالکل ناکارہ ہوتے ہیں۔ یہ امر توضیح کا محتاج نہیں ہے کہ جس پتنگ کے ساتھ ایک آدمی آرام سے بیٹھ کر ہوا میں اُڑ سکے اس کا حجم بہت بڑا ہوگا اور وہ مشینوں کی مدد سے اُڑائی جاتی ہوگی۔

ہوا میں تین میل کی بلندی پر گولہ پھینکنے والی توپ

قاعدہ کی بات ہے کہ دنیا میں ترقی بتدریج ہوتی ہے لیکن جس وقت انسانی دماغ قدرت سے اصرار کے ساتھ سوال کرنے اور جواب باصواب حاصل کرنے کا عادی ہوجاتا ہے تو اس کی ترقی کی رفتار دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ خیال فرمایئے تار کے بغیر پیغام رسانی کا مسئلہ حل ہوا تو اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے سوائے جہازوں کے اور کوئی میدان کھلا ہوا نہیں تھا۔ لیکن جب سے ہوائی جہاز تشریف لائے ہیں بغیر تاروں کے برقی پیغام رسانی کا علم ان کی جان بن گیا ہے۔ اس ملاپ کے متعلق یہاں تک غلو کیا جاتا ہے کہ بعض آدمیوں کے نزدیک اگر ہوائی جہازوں کی دریافت سے پہلے بغیر تاروں کے برقی پیغام پہنچانے کا علم ہم کو حاصل نہ ہوتا تو ہوائی جہازوں کے استعمال کی قدر و قیمت آدھی رہجاتی۔ اب مزید غور فرمایئے۔ توپیں دنیا میں عرصہ دراز سے استعمال ہوتی ہیں۔ لیکن آج تک چونکہ کسی کو بلندی میں توپ کے گولے پھینکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اسلئے کسی خاص قسم کی توپ اس کام کے لئے نہیں بنائی گئی تھی۔ اب ہوائی جہازوں کا زمانہ ہے بدطینت اشخاص ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر خلق خدا کے امن میں خلل ڈال سکتے ہیں۔ ان خیالات سے متاثر ہوکر اب مہذب اقوام میں اس امر کی جستجو ہے کہ ہوائی جہاز کا مقابلہ کرنے کے لئے ایسی توپیں بنائی جائیں جو ان کا پورے طور پر مقابلہ کرسکیں چنانچہ اندنوں امریکہ کے ایک فوجی افسر نے ایک ایسی توپ تیار کی ہے جو علاوہ اتنی ہلکی ہونے کے کہ ایک آدمی اُسے چلا سکتا ہے ہوا میں تین میل کی

بلندی تک مار کر سکتی ہے - زندہ قوموں کا تجسس اس پر قانع نہیں ہے بلکہ کوشش کی جا رہی ہے کہ سات میل کی بلندی تک مار کرنے والی ہلکی توپیں بنائی جا سکیں -

زمین کی کشش اور دائمی حرکت

اس ترقی کے زمانہ میں کسی معقول آدمی کی نسبت یہ شبہ کرنا کہ وہ چیزوں کے بوجھ اور زمین کی کشش سے ناواقف ہے اپنے تئیں معرض خطر میں ڈالنا ہے - یہ امر مشاہدات میں سے ہے کہ تمام چیزیں زمین کی طرف گرتی ہیں - چیزوں کے بوجھل ہونیکا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ زمین کی کشش جسے ہم آیندہ تجاذب مادی کے نام سے موسوم کرینگے ہر ایک چیز کو نیچے کی طرف کھینچتی ہے - اگر زمین ہمیں اپنی طرف نہ کھینچتی تو ہوا میں اُڑنا اور گولی کی رفتار کے ساتھ دوڑنا ممکن ہوتا - یہ ایک نہایت ہی حیرت انگیز واقعہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہر ایک قوت کے اثر سے بچنے کی سمجھ دی ہے ابھی تک تجاذب مادی سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا - بجلی کی قوت سے ہم لوہے کے پنجرہ میں بند ہو کر بالکل محفوظ ہو جاتے ہیں - گرمی کے اثر سے درمیان میں خاص خاص اشیاء کے پردے حائل کرنے سے بچ جاتے ہیں - روشنی بہت سی چیزوں میں سے نہیں گذر سکتی لیکن تجاذب مادی سب چیزوں میں اپنا اثر دکھاتا ہے - ہم کسی چیز کا وزن گھٹا بڑھا نہیں سکتے - اُمید ہے کہ سمجھ دار ناظرین اُڑنے والی چیزوں کے مغالطہ میں نہیں پڑینگے - جب سے دنیا قایم ہوئی ہے اور ہمیں گذشتہ کے واقعات کی اطلاع ہے انسانی دماغ کیمیا اور حرکت دائمی کی گتھی کو باوجود انتھک کوشش کے نہیں سلجھا سکا - تانبے سے سونا بنانا ہوس کو آج تک کبھی نصیب نہیں ہوا[۱] اور نہ ہی دائمی حرکت کا عقدہ تجاذب مادی کے مخالف سے حل ہو سکا ہے - دائمی حرکت کا مفہوم آسانی کے ساتھ آپکی سمجھ میں اس طرح آ جائیگا - ریل کے انجن میں کوئلہ ڈالا جاتا ہے بھاپ بنتی ہے اور خاص خاص پرزوں کی مدد سے انجن کام کرتا ہے - حرکت دائمی کے مفتون اس امر محال کی کوشش کرتے ہیں کہ انجن میں کوئلہ صرف ایک دفعہ ڈالا جائے یا کبھی بھی نہ ڈالا جائے اور انجن مدت العمر کام کرتا رہے - اگر یہ مثال واضح نہ ہو تو یوں خیال فرمایئے کہ گرما میں پنکھا قلی تو سو رہا اور پنکھا بغیر کسی قسم کی بیرونی مدد کے اپنے آپ ہلتا رہے - اگر حرکت دائمی کا مسئلہ حل ہو جائے تو آج ہی انتظام عالم درہم برہم ہو جائے - ذرا سے غور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حرکت دائمی اور تجاذب مادی کا بذاتہ زائل کر دینا ایک ہی تصویر کے دو پہلو ہیں -

چیزوں کا بوجھ ضایع کر سکتے ہیں

اگر کوئی ایسی چیز دریافت ہو سکے کہ اسکو زمین کے اور اپنے درمیان حائل کرنے سے ہمارا بوجھ بالکل زائل ہو جائے تو تمام عالم کی سیر کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہو جائے - اُس چیز کی کرسی بنوا لو اور جب جی میں آیا کرسی پر بیٹھ کر ہوا میں اُڑ گئے - اسی موضوع پر ایک انگریز مصنف H G. Well نے ایک کتاب First Man in the Moon لکھی ہے جس کا مطالعہ انگریزی داں احباب کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - اسوقت تک ہم تجاذب مادی کے متعلق عالم خیال کی باتیں کرتے رہے ہیں جن سے سوائے مایوسی کے اور کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا - لیکن بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب کہ ایک محقق مسٹر فروسنے تجربتہً یہ بات ثابت کی ہے کہ چیزوں کا وزن مناسب اسباب کے

---

[۱] انشاء اللہ العزیز دوسرے مضمون میں ریڈیم کے ضمن میں کیمیا گری پر ایک دلچسپ بحث کرنے کا موقع حاصل ہوگا -

عمل سے گھٹایا جاسکتا ہے-فیرو کا تجربہ یہ ہے- انھوں نے ایک کتاب کو ایک صحیح ترازو میں تولا اور اسکا وزن اٹھارہ آونس نکلا- اسکے بعد انھوں نے کتاب کے نزدیک ایک مستطیل شکل کا چھوٹا سا صندوق جسے وہ کنڈنسنگ ڈائنامو (Condensing Dynamo) کہتے ہیں رکھا- ابھی تک ترازو کتاب کا وزن ۱۸ آونس بتا رہی تھی لیکن جب اُس مستطیل صندوق میں برقی رَو گذاری گئی تو ترازو نے کتاب کا وزن ۱۵ آونس بتایا- گویا بجلی کے اثر سے جب وہ اثر ایک خاص طریقہ سے عمل میں لایا گیا کتاب کا بوجھ تین آونس گھٹ گیا جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہیں کہ تجاذب مادی کے چھٹا حصہ کو اس طریقہ سے معطل کر لیا گیا- اس تازہ ترین دریافت کے متعلق رائے زنی کرنا قبل از وقت ہے- جبتک دنیا کے مستند اور مسلم سائنس داں اس دریافت کی صداقت کا اعتراف نہ کریں ہمیں اپنے دلوں میں آیندہ کے لئے موہوم امیدیں نہیں باندھنی چاہئیں- ہاں اگر اس تجربہ میں فی الواقع کوئی نقص نہیں ہے اور فی الحقیقت زمین کی کشش مغلوب ہو گئی ہے تو آیندہ زمانہ میں وہ وہ باتیں ممکن ہونگی جن کا کرنا اس زمانہ میں معجزوں سے زیادہ مشکل ہے-

خاتمہ- علمی اصطلاحات کے رواج کی ضرورت

ہمارا مضمون مناسب حد سے زیادہ طول ہو جائیگا اگر ہم سائنس کی تازہ ترین ترقی کو اس میں ختم کرنے کی کوشش کریں لہذا ہم اس مضمون کو یہاں ختم کرتے ہیں اور انشاء اللہ العزیز عنقریب ایک دوسرا مضمون مزید حیرت انگیز علمی انکشافات جدیدہ کے متعلق لکھیں گے- ایک بات جس کی طرف میں حضرات ناظرین کی توجہ منعطف کیا چاہتا ہوں ہندوستان میں سائنس کی بے قدری ہے فی زماننا اقوام عالم کی تہذیب اور ترقی کا انحصار بتمامہ سائنس کے وسیع میدان میں ترقی کرنے پر ہے- جب تک ہندوستان میں سائنس عام نہ ہوگی اور جابجا سائنس کے علحدہ مدرسے اور دار التجارب قایم نہ ہوں گے ہم اقوام عالم کی دوڑ میں سب سے پیچھے رہیں گے- سائنس کی بے قدری کا اندازہ آپ اس دل شکن نقص سے لگائیں کہ ہماری زبان میں علمی اصطلاحات اس قدر کم ہیں کہ صفر کا حکم رکھتی ہے- میں اس کمی کو اپنے اس مضمون میں نہایت افسوس کے ساتھ محسوس کرتا ہوں اور شرمندہ ہوں کہ بعض الفاظ کو ہندوستانی جامہ نہیں پہنا سکا- ایک بڑی مشکل نئے الفاظ وضع کرنے میں یہ ہوتی ہے کہ پڑھنے والوں کو ان کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے- اس مشکل کا حل صرف یہی ہے کہ ایک مستند لغات علمی مصطلحات کے اردو مترادف الفاظ کی بہت جلدی تیار ہونی چاہیئے-

فیروز الدین مراد

قطعہ تاریخ از مولوی محمد عبد الکریم خاں صاحب صبر دہلوی

سب رسالوں میں کیوں نہو ممتاز کیوں نگاہوں میں کھپ نہ جائے ادیب
سب رسالوں سے ہے بڑی تقطیع پھر لکھائی چھپائی اور عجیب
کاغذ اعلی نفیس تصویریں اور پھر نظم و نثر کی ترتیب
ایک سے ایک لایق و قابل ہیں جو مضمون نگار، دور و قریب
دیکھکر اسکی کوشش علمی دوست خوش اور غمزدہ ہیں رقیب
اس کے مشتاق انتظار اسکا کرتے ہیں مثل انتظار حبیب
خود یہ نکلا ادیب کے مُنہ سے
بیخزاں بہار باغ ادیب

قدیم ہندوستان کے جہاز اور جہاز رانی

ہندوستان کی صنعتی ترقی کے راستے میں یہ ایک بہت بڑی مشکل حائل ہے کہ اس ملک میں جہاز سازی اور جہاز رانی کا فن قریب قریب معدوم ہو چکا ہے- بحالیکہ یہ ایسا ملک ہے جسے دیسی جہاز رانی کی بہت بڑی ضرورت ہے- ہندوستان کی بحری تجارت متواتر بڑھتی چلی جا رہی ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ غیر ملکی جہاز رانی پر ہمارا دارومدار روز افزوں ترقی پر ہے اور اس کے لئے بالاوسط ہمیں ۲۵ کروڑ روپیہ سالانہ ادا کرنا پڑتا ہے-

ہمارے تجارتی تعلقات صرف بر اعظم ایشیا ہی سے نہیں بلکہ دنیا کے ہر حصّہ سے قایم ہیں- ہماری تجارت ایک طرف یورپ اور افریقہ اور دوسری طرف آسٹریلیشیا اور امریکہ سے ہوتی ہے- اس تجارت کی مجموعی مقدار کم و بیش ۳۴۴،۲ کروڑ روپیہ ہے- جس میں سے ۱۶۱،۸ کروڑ کی درآمد اور ۱۸۲،۳ کروڑ کی برآمد ہے- ہماری یہ ساری تجارت صرف غیر ملکی جہاز رانوں کے رحم پر ہے جو ہم سے اپنے جہازات کے استعمال کے لئے حسب منشا کرایہ لے سکتے ہیں- ہماری ساحلی اور بندرگاہی تجارت کے متعلق جو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اندازہ کیا گیا ہے کہ اسکی مجموعی مقدار ۴۶،۳۷ کروڑ روپیہ سے کم نہیں لیکن اس میں بھی آزاد تجارت (Free-Trade) کی پالیسی سے کام لیا جا رہا ہے جسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرح یہ تجارت صرف قومی جہازوں کے لئے موقوف نہیں بلکہ دنیا بھر کے جہاز اس میں حصّہ لے سکتے ہیں- اس طرح اس تجارت کا ۸۵ فیصدی حصّہ ممالک غیر کے جہازوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے اور صرف ۱۵ حصّہ اہل ملک کے لئے بچتا ہے-

مسافروں کی آمد و رفت کا کاروبار بھی بالکل غیر ملکی جہاز رانوں کے ہاتھ میں ہے ہمارے مسلمان زائرین جو مکۂ معظمہ اور دوسرے مقدس مقامات کو جاتے رہتے ہیں- ہمارے تارک الوطن ہندوستانی جنکی تعداد ہر سال کم و بیش ۲۵۰۰۰ کے قریب ہوتی ہے- ہمارے مسافر جو ۱۵ لاکھ کی تعداد میں ہر سال حدود ملک کے اندر ہی مسافت کرتے ہیں- ہندوستانی فوج کے باہر جانے اور آنے والے گورے سپاہی جنکی تعداد بالاوسط ۲۵۰۰۰ سالانہ ہوتی ہے اور ان کا اسباب جس پر ½۵۵ لاکھ روپیہ سالانہ بطور کرایہ کے صرف ہوتا ہے ان سب کی آمد و رفت کا ذریعہ صرف غیر ملکی جہازات ہیں- حتیٰ کہ ولایتی ڈاک لانے اور لے جانے کیلئے بھی کوئی ہندوستانی آگبوٹ کمپنی ایسی نہیں جو محکمۂ ڈاک سے ۷،۸ لاکھ روپیہ کی سالانہ رقم حاصل کر سکے جو ڈاک کے انتظام کے متعلق آجکل ایک غیر ملکی کمپنی کے ہاتھوں میں جاتی ہے- اس بارے میں ہم جس حد تک دوسروں کے محتاج ہیں اسکا اندازہ کسیقدر اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بحری تجارت کے ۱۱۸۰۰۰۰۰ ٹن مال میں سے صرف ۹۵۰۰۰ ٹن یا ۰،۸ فیصدی حصّہ ہمارے دیسی جہازوں کو ملتا ہے اور ملکی بندرگاہوں کے ۲۹،۶۱ ملین (ملین دس لاکھ کا ہوتا ہے) ٹن میں سے صرف ۳،۲۴ ملین ٹن ہمارے جہازوں کے ہاتھ آتے ہیں اور باقی سارا حصّہ غیر ملکی جہاز رانوں کے پاس جاتا ہے-

ہمارے قومی جہازوں کے بیڑے میں جو آجکل موجود ہے صرف ۱۳۰۰ جہاز ۸۰ ٹن سے کم کے بحری تجارت کے لایق اور ۲،۸۰۰ ملکی بندرگاہوں کی تجارت کے ۲۰-۲۰۰ ٹن سے کم کے موجود ہیں - گویا ان سب کی مجموعی تعداد ۷،۴۱۰ ہے جنمیں سب بڑے چھوٹے جہاز ملے ہوئے ہیں - ظاہر ہے کہ یہ تعداد ایک ایسے ملک یا یوں کہنا چاہیئے کہ ایک بر اعظم کے لئے بالکل ناکافی ہے - جسکا ساحل ۴۰۰۰ میل بلکہ اس سے بھی زیادہ فاصلے تک پھیلا ہوا ہے -

ہماری جہاز سازی فی زماننا ایسی محدود حالت میں ہے کہ اس قسم کے کارخانوں میں جنکی تعداد گھٹتے گھٹتے اب ۸۴ تک رہگئی ہے صرف ۱۲۳۴۱ آدمی کام کرتے ہیں جو ہر سال گنتی کے چند جہاز بناتے ہیں - اور اس سرمایہ کی مقدار جو سالانہ جہاز سازی کے کام میں لگایا جاتا ہے کبھی پانچ چھ لاکھ سے نہیں بڑھی - یہ حالت ایک ایسے ملک کی ہے جو کسی زمانے میں "مشرقی سمندروں کی ملکہ" کہلاتا تھا اور جسپر فضل ایزدی سے اب ایک ایسی گورنمنٹ کا سایہ ہے جو "سمندروں کی جدید مالکہ" کہلاتی ہے اور جو حقیقت میں فی زمانا سب سے بڑی بحری طاقت رکھتی ہے -

بلاشبہ ان سب باتوں سے معاملات کی نہایت بری اور خطرناک حالت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ ہماری قومی تجارت اس وقت تک روبہ اصلاح ہو یا قایم نہیں رہ سکتی جب تک قومی جہازات کا ایک معقول بیڑہ موجود نہ ہو - اس موقعہ پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اب سے صرف ایک صدی پہلے ہندوستان میں جہاز سازی کی صنعت نہایت عمدہ حالت میں تھی اس ملک میں ایسے ایسے جہاز تیار ہوا کرتے تھے جو برطانیہ کلاں کے بادبانوں اور چپوؤں سے چلنے والے جہازوں کے ساتھ ساتھ دریائے ٹیمز میں چلتے تھے - چنانچہ ہمارے اس بیان کی تصدیق لارڈ ولزلی بہادر سابق گورنر جنرل ہند کرتے ہیں جنھوں نے ۱۸۰۰ء میں ایک موقعہ پر کہا تھا کہ

کلکتہ کی بندرگاہ میں دیسی جہاز جس تعداد میں موجود ہیں اور بنگال میں فن جہاز سازی جس تکمیل کے درجے تک پہنچ چکا ہے (اور اس میں ابھی مزید اصلاح اور ترقی کی کافی امید ہے) اس سے یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کے پرائیویٹ انگریز تاجروں کو بندرگاہ لندن تک اپنا مال پہنچانے کے لئے جسقدر جہازوں کی ضرورت ہوگی وہ بندرگاہ کلکتہ میں مل سکیں گے -

ایک اور موقعہ پر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ

بندرگاہ کلکتہ میں دس ہزار ٹن بار برداری کے جہاز اس قسم کے موجود ہیں جو ہندوستان کے بنے ہوئے ہیں اور انگلستان کو مال لے جانے کی قابلیت رکھتے ہیں -

بنگال کی نسبت بمبئی کو جہاز سازی کی اور بھی قدرتی سہولتیں حاصل تھیں - کیونکہ بقول لفٹنٹ کرنل اے - ڈاکر صاحب -

بباعث مالابار اور گجرات کے جنگلات کے مابین واقع ہونے کے اسے ہوا کے ہر ایک جھونکے کے ذریعہ کافی مقدار میں لکڑی حاصل ہوتی رہتی ہے -

علاوہ بریں بمبئی کے ساگون کی لکڑی کے بنے ہوئے جہاز قدیم انگلستان کے شاہ بلوط کی لکڑی کے بنے ہوئے بڑے بڑے جہازوں کی نسبت بہت اعلیٰ ہوا کرتے تھے - ڈاکر صاحب نے ۱۸۱۱ء میں لکھا تھا کہ

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر بارہ سال بعد برطانیہ کلاں کے

بیڑے کے ہر ایک جہاز کی مرمت کرنا پڑتی ہے۔ برعکس اس کے یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ ساگون کی لکڑی کے بنے ہوئے جہاز ۵۰ سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے تک کارآمد رہتے ہیں بمبئی کے بنے ہوئے بہت سے جہازوں کو جب وہ چودہ پندرہ سال چل چکے تو بیڑے کے لئے خرید لیا گیا اور اسوقت معلوم ہوا کہ وہ اچھی طرح مضبوط اور کام دینے کے لایق ہیں۔ سر ایڈورڈ ہیوز نامی جہاز کے متعلق میرا خیال ہے کہ جب اسے بیڑے کے لئے خریدا گیا اس سے پہلے وہ بہ اعتباً ایک ہندی جہاز کے آٹھ بار سفر کر چکا تھا۔ برعکس اس کے کوئی یورپ کا بنا ہوا ہندوستان تک جانے والا جہاز ایسا نہیں جو محفوظ طریقے پر ۶ مرتبہ سے زیادہ سفر کر سکے۔

لیکن بمبئی کے ساختہ جہاز دوسرے مقامات کے بنے ہوئے جہازوں کی بہ نسبت نہ صرف زیادہ پائدار ہوتے تھے بلکہ ان میں ارزانی کی صفت بھی پائی جاتی تھی۔ یہی صاحب لکھتے ہیں کہ

بمبئی کے بنے ہوئے جہازوں پر انگلستان کے کارخانوں میں بنے ہوئے جہازوں کی نسبت ۱/۴ حصہ کم لاگت آتی ہے اور اس کے ساتھ ہی جب دیکھا جائے کہ آخرالذکر کو ہر بارہ سال بعد از سر نو مرمت کرنا پڑتا ہے تو اسپر کل خرچ چوگنا ہو جاتا ہے۔

جوں جوں یہ صدی گذرتی گئی ہندوستان میں جہازرانی کا کام زوال پذیر ہوتا گیا حتیٰ کہ اب جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں قریب قریب معدوم ہو چلا ہے۔ ذیل میں جو اعداد درج کئے جاتے ہیں ان سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ بحالت موجودہ ہندی جہازرانی کس حالت میں ہے۔

	تعداد	وزن بار برداری (ٹن)
۱۸۵۶ء		
ہندوستانی جہاز جو بندرگاہوں میں داخل ہوئے اور جن پر سے مال اُتارا گیا۔	۳۴۲۸۶	۱۲۱۹۹۵۸
برٹش انڈین اور برطانیہ کلاں کے جہازات۔	۵۹۴۴۱	۲۴۷۵۴۷۲
۱۹۰۸-۹ء		
ہندوستانی جہاز جو بندرگاہوں میں داخل ہوئے اور جن پر سے مال اُتارا گیا۔	۲۳۰۲	۱۳۳۰۴۳
برٹش انڈین اور برطانیہ کلاں کے جہازات۔	۶۲۱۹	۷۶۸۵۰۰۹
ممالک غیر کے جہازات۔	۱۱۶۵	۱۲۹۷۶۰۴

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ۱۸۵۶ء میں ہندوستانی جہازوں کا وزن بار برداری برطانیہ کلاں اور غیر ملکی جہازوں کی نسبت نصف تھا وہاں ۱۹۰۸-۹ء میں گھٹتے گھٹتے صرف ۱/۵ حصہ رہ گیا۔

اس بات کو زیادہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستانی جہازرانی کا زوال ایک بالکل جدید عمل ہے اور اس پر بھی انھیں اقتصادی قوتوں کا اثر پڑا ہے جن کے باعث ہندوستان سے دستی کرگھوں کی صنعت اُٹھ گئی ہے جسے اخبار ٹائیمز کے ایک ہمدرد نامہ نگار نے بجا طور پر "زمانۂ حال کا سب سے بڑا صنعتی سانحہ" قرار دیا ہے۔ لیکن یہی قول بالکل ٹھیک طور پر ہماری ملکی جہازرانی پر صادق آتا ہے کیونکہ ہندوستان کی جہازسازی کی تاریخ جسکے باعث وہ کسی زمانہ میں ساری مہذب دنیا کا تجارتی مرکز بنا ہوا تھا

کسی لحاظ سے اسکی روئی کی صنعت کی تاریخ سے کم شاندار اور جوش پیدا کرنے والی نہیں۔ ہمارے لئے لازم ہے کہ ہندوستان کی اس زمانے کی تاریخ کا باب بڑے غور و خوض کے ساتھ پڑھیں کیونکہ اس ذریعہ سے ہم میں وہ اُمنگ اور استقلال پیدا ہو سکتا ہے جو ایک زوال پذیر صنعت کو تازہ دم کرنے کے لئے لازم ہے۔ جس کے ذریعہ ہم پھر ایک بار ہندوستان کو اس شاندار رفعت تک پہونچا سکتے ہیں جو دنیا بھر کی قوموں میں اسے کسی زمانے میں حاصل تھی۔

ابتدائے تاریخ اور آغاز تحریر سے لیکر ہندوستان اپنی بحری قوت اور تجارت کے لئے مشہور رہا ہے جسکا ثبوت پورے طور پر ہمیں ہندوستان کے السنۂ قدیم سے مل سکتا ہے۔ بوہلر کہتا ہے کہ

> بعض قدیم ہندوستانی کتابوں میں اس قسم کے فقرات جا بجا پائے جاتے ہیں جن سے ثبوت ملتا ہے کہ بحر ہند میں نہایت قدیم زمانے میں جہاز رانی جاری تھی اور اس کے بعد ایک زمانے میں ہندو تاجر اپنا مال فروخت کرنے کی غرض سے خلیج فارس کے ساحل اور اس کے دریاؤں تک بحری سفر کیا کرتے تھے۔

یہ فقرات براہمنی اور بدھ مذہب کے زمانے کی کتابوں میں موجود ہیں اور ان کا حوالہ بابو رادھا کمود مکرجی پروفیسر بنگال نیشنل کالج کلکتہ نے اپنے ایک مضمون کے دوران میں جو ماہ مارچ و اپریل ۱۹۰۹ء کے رسالہ ڈان میگزین میں درج ہوا تھا دیا ہے لیکن اس موقعہ پر ہمارا مطلب ان حوالوں کو دوہرانا نہیں بلکہ ہم صرف یہ جتانا چاہتے ہیں کہ اس بحری تجارت کے موجود ہونے اور جاری رہنے سے جسکا پتہ ان حوالوں سے ملتا ہے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں قومی جہاز رانی نہ صرف موجود بلکہ ترقی پر تھی۔ کیونکہ بغیر اسکے اس زمانے میں تجارت کے عروج حاصل کرنیکا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بدقسمتی سے سنسکرت اور پالی زبانوں کے لٹریچر میں گو تجارتی سیاحتوں کے متعلق بہت سے حوالے ملتے ہیں تاہم ان میں بہت کم ہندوستان کے جہازات اور جہاز سازی سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں جس کے ذریعہ یہ بین القومی رشتے قایم ہوئے۔ اتفاق سے مسٹر مکرجی کو جنکا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے کلکتہ کے سنسکرت کالج کی لائبریری میں ایک سنسکرت زبان کا مسودہ مل گیا ہے جسکا نام "یکتی کل پاترو" ہے اس میں قدیم ہندوستان کی جہاز سازی کا ذکر کسی قدر اجمال کے ساتھ درج ہے۔ اس کتاب میں جہازوں کے اقسام اور جسامت کے علاوہ ان مصالحوں کا بھی ذکر ہے جن کے ذریعہ سے یہ جہاز بنائے جاتے تھے۔ غرض ہندوستان کی اس قدیم صنعت کے متعلق کافی واقفیت اس کتاب کے اندر یکجا کی گئی ہے۔

سنسکرت زبان کے علم نباتات کی رو سے جسے "برکش آیوروید" کہتے ہیں لکڑی کی چار بڑی بڑی قسمیں ہیں ایک تو برہمن ذات کی لکڑی جو ہلکی اور نرم ہوتی ہے اور جسے آسانی کے ساتھ کسی دوسری لکڑی کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔ دوسری کشتری ذات کی لکڑی جو ہلکی اور سخت ہوتی ہے اور جسے کسی دوسری قسم کی لکڑی سے ملایا نہیں جا سکتا۔ تیسری ویش ذات کی لکڑی جو نرم اور بھاری ہوتی ہے اور چوتھی شودر ذات کی وہ لکڑی ہوتی ہے جو سخت ہونے کے علاوہ بھاری بھی ہو۔ ایک قسم ملی جلی یا دو جاتی لکڑی کی بھی ہوتی ہے اور اس میں دو مختلف قسموں کے مشترکہ خواص پائے جاتے ہیں۔

فن جہاز سازی کے متعلق زمانۂ قدیم میں بھوج نامی ایک مستند اہل الرائے گذرا ہے جس نے ایک موقعے پر کہا ہے

لہ کنشتری ذات کی لکڑی کا بنا ہوا جہاز دولت اور خوشی لاتا ہے۔ اُبھرے پانی میں جہاں جہاز رانی ایک خطرناک کام ہوتا ہے عام طور پر اسی قسم کے جہاز استعمال کئے جاتے تھے۔ برعکس اسکے جن جہازوں میں متفرق اقسام اور مختلف خواص کی لکڑیاں استعمال کی جائیں وہ کسی طرح کار آمد اور آرام دہ نہیں ہوتے۔ اس قسم کے جہاز زیادہ دیرپا بھی نہیں ہوتے۔ ان کی لکڑی پانی میں گل جاتی ہے اور انہیں ذرا سا بھی صدمہ پہنچے تو وہ پھٹکر پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔

یہ بتانے کے بعد کہ جہاز سازی کے لئے بہترین قسم کی لکڑیاں کونسی ہوتی ہیں بھوج جہاز سازوں کے لئے ایک نہایت ضروری ہدایت تنبیہ کی صورت میں درج کرتا ہے جسکا اس جگہ ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس بات کی احتیاط رکھنا ضروری ہے کہ سمندری جہازوں کی پیندے کی لکڑی کو جوڑنے کیلئے لوہا بالکل استعمال نہ کیا جائے کیونکہ اس صورت میں جہازوں پر مقناطیسی چٹانوں کا اثر پڑتا ہے یا اس لوہے کے باعث جہاز خود بخود مقناطیسی چٹانوں کے قریب پہنچ جاتے ہیں، جس میں سراسر تباہی کا خطرہ ہے۔ یہی باعث ہے کہ جہاز کے پیندے میں لوہے کے علاوہ کوئی اور دھات لگانیکی ہدایت صریح الفاظ میں کی گئی ہے۔ درحقیقت یہ ہدایت اس لحاظ سے نہایت ضروری تھی کہ اُس زمانے میں ہندوستانی جہاز بڑے بڑے گہرے سمندروں میں چلا کرتے تھے۔

جہازوں اور کشتیوں کی تیاری میں لکڑی کے استعمال کے متعلق بھوج کی ہدایات کے علاوہ "یکتی کل پاترو" یعنی مسودہ محولہ بالا میں جہازوں کی بلحاظ اُن کی جسامت کے بہت سی قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ ابتدائی تقسیم دو جماعتوں پر ہے:-

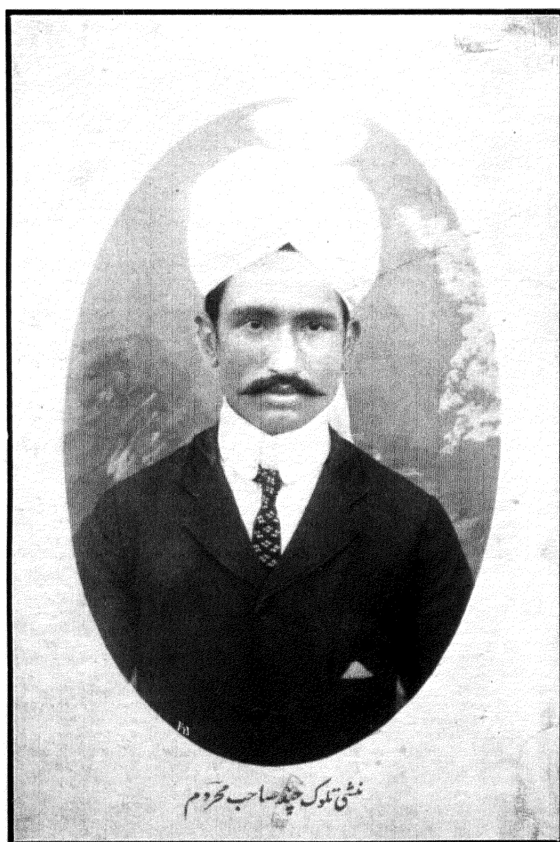
(ا) معمولی یا سامانیہ قسم کے جہاز جو دریاؤں اور ندیوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

(ب) خاص یا وشیش قسم کے جہاز جو صرف بحری مسافتوں کے کام میں آتے ہیں۔

معمولی جہازوں کی آگے چلکر دس قسمیں دی گئی ہیں جو لمبائی۔ چوڑائی اور گہرائی یا اونچائی کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ ذیل میں ان قسموں کے نام اور ہر ایک کی جسامت ہاتھ یا Cubit کے اعتبار سے دی جاتی ہے:-

نام	لمبائی	چوڑائی	اونچائی
کشودر	۲۱	۵ ۱/۴	۵ ۱/۴
مدھیم	۳۱ ۱/۲	۱۵ ۳/۴	۷
بھیم	۲۱	۱۰ ۱/۲	۱۰ ۱/۲
چپل	۴۲	۲۱	۲۱
ٹپل	۷۳ ۱/۲	۳۶ ۳/۴	۳۶ ۳/۴
بھئے	۱۰۵	۵۲ ۱/۲	۵۲ ۱/۲
دیرگہ	۱۲۶	۶۳	۶۳
پتر پوٹہ	۱۴۷	۷۳ ۱/۲	۷۳ ۱/۲
گربھر	۱۷۸ ۱/۲	۸۹ ۱/۴	۸۹ ۱/۴
منتھر	۲۱۰	۱۰۵	۱۰۵

مندرجہ بالا جدول میں معمولی جہازوں کی جو ۱۰ قسمیں مذکور ہیں ان میں سے بھیم بھئے اور گربھر قسم کے جہاز منحوس خیال کئے جاتے ہیں۔ جسکی وجہ شاید یہ ہو کہ بباعث اپنی جسامت کے وہ پانی پر ہموزن نہ رہ سکتے ہوں۔ خاص قسم کے جہاز سب کے سب وہ ہوتے تھے جو بحری سفر کیا کرتے تھے۔ ان کی دو بڑی بڑی قسمیں (۱) دیرگہ اور (۲) اونت ہوتی تھیں جنمیں سے اول الذکر



منشی تلوک چند صاحب محروم

انڈین پریس الہ آباد

بن زیادہ لمبائی والے اور آخر الذکر میں زیادہ اونچائی والے جہاز ہوا کرتے تھے۔ ان میں آگے چلکر دیرگہ کی ۱۰ اونت کی پانچ قسمیں ہوا کرتی تھیں۔ ذیل میں جداگانہ طور پر ان میں سے ہر ایک کا نام اور جسامت بحساب پیمانہ ہاتھ (Cubit) کے دی جاتی ہے۔ مخفی نہ رہے کہ خاص دیرگہ قسم کی لمبائی ۴۲ چوڑائی ۵ ۱/۴ اور اونچائی ۴ ۱/۵ ہاتھ ہوا کرتی تھی:-

نام	لمبائی	چوڑائی	اونچائی
دیگھک	۶۳	۷ ۷/۸	۶ ۳/۱۰
ترنی	۶۳	۷ ۷/۸	۶ ۳/۱۰
مولا	۱۰۵	۱۳ ۱/۸	۱۰ ۱/۲
گنتور	۱۲۶	۱۵ ۳/۴	۱۲ ۳/۵
گمنی	۱۴۷	۱۸ ۳/۸	۱۴ ۷/۱۰
تری	۱۶۸	۲۱	۱۶ ۴/۵
جنگھلا	۱۸۹	۲۳ ۵/۸	۱۸ ۹/۱۰
پلاونی	۲۱۰	۲۶ ۱/۴	۲۱
دھارنی	۲۳۱	۲۸ ۷/۸	۲۳ ۱/۱۰
بیگنی	۲۵۲	۳۱ ۱/۲	۲۵ ۱/۵

ان میں سے مولا۔ گمنی اور پلاونی قسم کے جہاز اور نیز وہ جہاز جو ان تینوں قسموں کے درمیان آتے ہیں منحوس خیال کئے جاتے ہیں۔

اونت جہاز کی پانچ قسمیں حسب ذیل ہیں:-

نام	لمبائی	چوڑائی	اونچائی
اُردہوا	۴۲	۴۲	۴۲
انردہوا	۶۳	۴۲	۴۲
سورن مکھی	۸۴	۴۲	۴۲
گربھنی	۱۰۵	۴۲	۴۲
منتھرا	۱۲۶	۴۲	۴۲

ان پانچ قسموں میں سے انردہوا اور گربھنی ایسے جہاز ہیں جو تباہی لاتے ہیں لیکن اُردہوا قسم کے جہازوں سے بادشاہوں کو بہت منافع ہوتا ہے۔

بھوج کا بیان ہے کہ ۳۵ سے ۴۵۔۴۰ سے ۵۰۔ ۹۰ سے ۱۰۰۔ ۶۰ سے ۷۰ اور ۹۴۸ سے ۹۵۸ ہاتھ کی لمبائی والی کشتیاں بھی تباہی لانے والی ہوتی ہیں۔

"یکتی کل پاترو" میں جہازوں کی اس قسم کی آرایش و زیبایش کا بھی بہت کچھ ذکر ہے جس سے مسافروں کو آرام و آسایش حاصل ہو سکے۔ آرایش کی غرض سے چار قسم کی دھاتوں کی سفارش کی گئی ہے یعنی سونا۔ چاندی۔ تانبہ اور ان تینوں کا مرکب۔ چار مختلف قسم کے جہازوں کیلئے چار قسم کے رنگ تجویز کئے گئے ہیں یعنی چار مستول والے جہازوں کے لئے سفید تین قسموں والوں کے لئے سُرخ۔ دو مستول والوں کے لئے زرد اور ایک مستول والے کے لئے نیلا۔ جہاز کے اگلے حصے پر مختلف حیوانات کی شکلیں بنائی جاتی تھیں مثلاً شیر ببر۔ بھینسے۔ سانپ۔ ہاتھی۔ شیر وغیرہ کا سر یا ایسے پرندوں کی شکلیں جیسے کہ بطخ۔ مرغابی۔ طوطا وغیرہ۔ بعض حالتوں میں مینڈک یا انسان کی شکلیں بھی بنائی جاتی تھیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں نجاری اور سنگ تراشی کا پیشہ تکمیل کے ایک اعلیٰ درجہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے علاوہ بعض حالتوں میں جہاز کے خوبصورت سروں پر موتیوں کے ہار اور سونے کی مالا بھی لٹکا دی جاتی تھیں۔

جہازوں کی کوٹھریوں کے متعلق بھی اس کتاب میں بہت سی دلچسپ تفصیلات موجود ہیں۔ کوٹھریوں کی لمبائی اور ان کے جائے وقوع کے لحاظ سے جہازوں کی تین قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ ان میں سے قسم اول کے جہاز جو "سرومندر"

کہلاتے تھے اُن میں بہت بڑی بڑی لمبی کوٹھریاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بنی ہوئی ہوتی تھیں۔ یہ جہاز شاہی خزانہ گھوڑے اور عورتیں ایک سے دوسرے مقام تک لے جانے کے کام آتے تھے۔ قسم ثانی کے جہاز "مدہ مندر" کہلاتے تھے اور ان کی کوٹھریاں وسطی حصے میں بنی ہوتی تھیں۔ یہ جہاز شاہی سیاحت کے لئے استعمال کئے جاتے تھے اور بارش کے لئے ہر طرح موزوں ہوتے تھے۔ قسم ثالث کے جہازوں کی کوٹھریاں اگلے حصے کی طرف بنی ہوتی تھیں اور یہ "اگر مندر" کہلاتے تھے۔ یہ جہاز برکھارت ختم ہونے پر کھلے موسم میں استعمال کئے جاتے تھے۔ کتاب میں مذکور ہے کہ اس قسم کے جہاز طویل بحری سفر کے لئے زیادہ موزوں ہیں اور بحری جنگ میں بھی ان سے کام لیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے لٹریچر میں جس پہلی بحری لڑائی کا ذکر آتا ہے وہ غالباً اسی قسم کے جہازوں میں کی گئی ہوگی۔ اس موقعہ پر رشی راج توگرہ نے اپنے بیٹے بھوجیو کو اپنے دشمنوں کے خلاف کسی دور دراز جزیرے میں بھیجا تھا۔ لیکن ایک موقع پر اسکا جہاز عین منجدھار میں ٹوٹ گیا اور اُس وقت جب کوئی شے اُسے سہارا دینے والی باقی نہ تھی بھوجیو اور اس کے ہمراہیوں کو دو اسونوں نے آبی قبر سے بچا کر اپنے سو ڈانڈوں والے جہاز (Gallery) میں بٹھایا۔ ایسے ہی جب پانڈوں بدر کی دوستانہ نصیحت کے ذریعہ اس تباہی سے بچ نکلے جو ان کے لئے تیار کی گئی تھی تو وہ ایک اسی قسم کے جہاز میں فرار ہوئے تھے جس میں تمام ضروری آلات اور جنگی ہتھیار موجود تھے اور جو بحری طوفانوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ رامائن میں ایک جگہ پانسو جہازوں کا ذکر آتا ہے جنہیں سیکڑوں کیورت جوانوں کو اس غرض سے رکھا گیا تھا کہ وہ دشمن کا راستہ روکیں۔ وہ بھی اسی وضع کے تھے۔ کالیداس نے اپنی تصنیف "رگھوبنس" میں رگھو کے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ وہ مقدس دریائے گنگا کے جزیروں پر اپنے فتح کے ستون قائم کر کے واپس چلا گیا اس موقع پر اُسکی زبردست طاقت کا مقابلہ بنگالیوں نے اسی قسم کے جہازوں سے کیا تھا۔

سنسکرت لٹریچر کے ان حوالوں سے زمانہ قدیم کے ہندوستان میں جہاز سازی اور جہاز رانی کی جو شہادتیں ملتی ہیں انکی تصدیق کسی حد تک پالی لٹریچر سے بھی ہوتی ہے۔ اس زبان کی کتابوں میں سنسکرت کی طرح بحری سفر اور بحری تجارت کا جابجا ذکر پایا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس غرض کے لئے جو جہاز کام میں لائے جاتے تھے وہ حجم میں کافی بڑے ہوتے تھے اس میں شک نہیں کہ سنسکرت کی طرح پالی زبان میں مختلف قسم کے جہازوں کی ناپ صاف طور پر درج نہیں تاہم اسمیں چونکہ جابجا اس بات کا ذکر پایا جاتا ہے کہ کس قسم کے جہاز کتنے مسافر لے جا سکتے تھے اس لئے ایک اور طریقے پر ہمیں انکی جسامت کا پورے طور پر ثبوت مل سکتا ہے۔ چنانچہ کتاب راج ولی میں مذکور ہے کہ بنگالہ کے راجہ سمھا باہو نے جس جہاز میں کنور بجے اور اس کے ہمراہیوں کو ان مظالم کے باعث جو وہ رعایا پر کیا کرتے تھے جلا وطن کیا وہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں ۷۰۰ آدمی جو سب کے سب کنور کے ہمراہی تھے سوار ہو گئے۔ ان کی بیویوں اور بچوں کو بھی جنکی تعداد ۷۰۰ سے زاید تھی اسی قسم کے جہازوں پر سوار کرایا گیا تھا۔

جس جہاز میں کنور سمھالا جمبو دیپ کے کسی نامعلوم مقام سے لنکا کو گیا تھا اُس میں اُس کے علاوہ وہ پانسو دوسرے تاجر موجود تھے۔ جس جہاز میں بجے کی پانڈی دلہن لنکا پہنچائی گئی تھی وہ بھی بہت بڑا تھا۔ کیونکہ اس میں شہزادی اور اُسکی

۷۰۰ سہیلیوں کے علاوہ ۱۸ سرکاری افسروں۔ ۵۷ نوکروں اور متعدد غلاموں کی نشست کا انتظام تھا۔ بشپ بگنڈیٹ صاحب اپنی کتاب "سوانح عمری گوتم بودھ" میں لکھتے ہیں اور ایک اور کتاب "جنک جٹکا" سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ایک جہاز کے ٹوٹنے پر اس کے ۷۰۰ مسافر اور ملاح جن میں گوتم بدھ بھی ایک ابتدائی اوتار کی صورت میں موجود تھا سب کے سب غرق ہوگئے۔ ہارڈی صاحب کے "رسالہ بدھ مذہب" ("Manual of Buddhism") کے صفحہ ۱۳ پر مذکور ہے کہ سپرک بودھسٹ اوتار کے موقع پر بدھ نے بھروکچ (موجودہ شہر بھڑوچ) سے "سات رتنوں کے سمندر" تک جس جہاز میں تجارتی سفر کیا اس میں اس کے علاوہ ۷۰۰ اور سوداگر موجود تھے۔ ولھاس جٹکا میں جس جہاز کی تباہی کا ذکر آتا ہے اسمیں پانچسو سوداگر سوار تھے۔ سمدونج جٹکا میں ایک جہاز کا ذکر آتا ہے جو اتنا بڑا تھا کہ اس میں کئی ہزار مفرور بڑھئیوں کا سارا گانوں سما گیا۔ یہ لوگ اس وجہ سے فرار ہوئے تھے کہ انھیں کچھ چوبی اسباب تیار کرنے کے لئے بیعانہ دیدیا گیا تھا مگر وہ اسے وقت پر تیار نہ کرسکے تھے۔ جس جہاز میں سپرک کے پنا برادران تجارت کی غرض سے سرخ ریت والے ملک کی طرف گئے تھے وہ اتنا بڑا تھا کہ ۳۰۰ مسافر بیٹھنے کے بعد بھی اتنی جگہ خالی بچ رہی کہ واپسی پر وہ بہت بڑی مقدار ایک خاص قسم کی لکڑی کی اپنے ملک کو لے آئے۔ دو برہمی تاجروں تپوسہ اور بالی کٹ نے خلیج بنگالہ کو ایک ایسے جہاز میں عبور کیا تھا کہ علاوہ دوسرے مال کے اس میں ان کے ذاتی اسباب کے پانچسو چھکڑے موجود تھے۔ سانکہ جٹکا کا خیر خواہ خلایق برہمن جس جہاز کی مدد سے آبی قبر سے بچایا گیا تھا اُسکی لمبائی ۸۰۰ اور چوڑائی ۶۰۰ ہاتھ تھی۔ وہ ۲۰۰ فیدم (Fathoms) گہرا تھا اور اس پر تین مستول لگے ہوئے تھے۔ مہاجنک جٹکا کا شہزادہ جس جہاز میں دوسرے تاجروں کے ساتھ سوار ہو کر چمپا سے جہاں آجکل بھاگل پور آباد ہے سورن بھومی کی طرف جو غالباً برہما یا ہندوستان کے کسی ساحل کا نام تھا روانہ ہوا اُس میں سات قافلے مع لدو جانوروں کے موجود تھے۔

کتابی حوالوں سے جو نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں انکی تائید کسی حد تک اس شہادت سے بھی ہوتی ہے جو پرانی عمارات کی نقاشی یا قدیم سکوں سے ملتی ہے۔ سانچی کے استوپا نمبر اول کے مشرقی دروازے پر ایک کشتی کی تصویر کندہ ہے جو کھردرے تختوں کو سن یا رسیوں سے باندھ کر بنائی گئی ہے۔ اس میں جیسا کہ جرنیل الیف۔ سی۔ میسلی صاحب اپنی کتاب "سانچی اور اس کے کھنڈرات" کے صفحہ ۲۴ پر لکھتے ہیں "ایک دریا یا ندی کا نظارہ دکھایا گیا ہے جس پر ایک ناؤ چل رہی ہے۔ اس ناؤ میں تین زاہدانہ صورت کے سنیاسی سوار ہیں جن میں سے دو کشتی کو کھیتے ہیں اور درمیانی شخص کشتی کے کنارے پر ہاتھ رکھے چار سنیاسیوں کی طرف دیکھ رہا ہے جو نہایت ادب کے ساتھ پانی کے کنارے کھڑے ہیں"۔ سر اے۔ کیننگھم اپنی کتاب "بھیلسا ٹوپ" (Bhilsa Topes) کے صفحہ ۲۰۷ پر لکھتے ہیں کہ کشتی میں شاکیہ منی بدھ اور اُن کے دو خاص مقلد سوار ہیں۔ اور خود بدھ کا مقابلہ بدھ مذہب کی بہت سی تحریروں میں "زندگی اور موت کے وسیلے سمندر میں کشتی اور جہاز" سے کیا گیا ہے۔ لیکن جرنیل میسلی کا خیال ہے کہ اس تصویر میں محض ایک اعلیٰ رتبہ کے سنیاسی یا پجاری کی روانگی کا نظارہ دکھایا گیا ہے جسے اس کے مقلد ادب کے ساتھ الوداع

کئے آئے ہیں اور جو کسی خاص مہم یا مشن پر جا رہا ہے۔ اس بارے میں صاحب موصوف جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اول تو اس تصویر کے کندہ ہونے کی تاریخ سے کئی صدی بعد تک بودھ کی کوئی تصویر کبھی انسانی صورت میں نہیں بنائی گئی اور دوسرے یہ تصویر محض ایک معمولی قسم کی کشتیوں سے بندھی ہوئی ناؤ کی ہے۔ بودھ اعظم کے شایان شان کسی مقدس بجرے کی نہیں۔

ہندوستان بھر میں قدیم سنگ تراشی کے جسقدر نمونے موجود ہیں ان میں ایک نہایت اہم اور دلچسپ نمونہ ایک جہاز کا ہے جو سانچی کے استوپ نمبر اول کے مغربی دروازے پر کندہ پایا جاتا ہے۔ اس میں پانی کی سطح پر ایک بجرہ تیرتا ہوا دکھایا گیا ہے جسکے اگلے حصے میں ایک فرضی جانور کی جسے شیر ببر اور عقاب سے ملتا جلتا خیال کیا جاتا ہے تصویر بنی ہوئی ہے اور پچھلے حصے میں مچھلی کی دم کی۔ اس بجرے میں ایک خالی تخت پر ایک قنات تنی ہوئی ہے اور دو نوکروں میں سے ایک کے ہاتھ میں چتر اور دوسرے کے ہاتھ میں چنور ہے۔ تیسرا شخص ایک بڑے چپو کے ذریعہ سے بجرے کو چلا رہا ہے۔ پانی میں بہت سے آبی پھول۔ شگوفے اور ایک بڑا سا سنکھ ہے اور پانچ آدمی مشکوں کو پھلائے یا تختے کو پکڑے تیر رہے ہیں۔ چھٹا شخص جہاز کے عقبی حصے والے آدمی سے درخواست کر رہا ہے کہ وہ اسے پانی سے نکلنے میں مدد دے اس تصویر میں جو بجرہ دکھایا گیا ہے وہ ایک شاہی بجرہ معلوم ہوتا ہے اور آج کل ہندی شرفا میں جو بعض پرانی وضع کے بجرے استعمال ہوتے ہیں ان کی ساخت اسی قسم کے بجروں سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ نظارے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی راجہ اور اس کے درباری پانی کی کسی مصنوعی جھیل میں سیر و تفریح کر رہے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ممکن ہے کہ اس کا پوشیدہ مطلب کچھ اور ہو۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ بجرے کی شکل جیسی کہ اس تصویر میں دکھائی گئی ہے مکر یا مچھ اوتار یا بدھ مذہب کے جٹکا سے مشابہ ہے اور ایسے ہی اہل ہنود کی مذہبی کتب میں متسی یا مچھلی کو دشنو کا اولین اوتار سمجھا جاتا ہے جس نے بعد میں بودھ کا اوتار دھارن کیا تھا۔ اس موقعہ پر یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاز کے اگلے حصے کی جو عجیب و غریب شکل بنائی گئی ہے وہ سنگتراش کی جدت یا رنگ آمیزی کے باعث نہیں جسکی نسبت خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی نئی وضع کا نمونہ تیار کرنے کی کوشش میں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی شکلیں بالکل روایات کے مطابق اور مقررہ طریقوں کے ڈھنگ پر ہیں۔ اور اس لئے ان جہازوں کے اگلے حصوں کی شکلوں سے ملتی جلتی ہیں جنکا ذکر "یکتی کل پا ترو" نامی کتاب کے اشلوکوں میں جسکا حوالہ ایک سے زیادہ مرتبہ سطور بالا میں دیا گیا ہے پایا جاتا ہے۔

جہاز کی ایک اور تصویر جسکا یہاں ذکر کیا جاتا ہے ہندوستان میں نہیں بلکہ یہاں سے بہت دور یعنی بورو بوڈور واقع جاوا میں دیکھی گئی ہے جو ان ہندوستانی فنون نے اعلیٰ ترقی حاصل کی تھی۔ ایک کندہ کی ہوئی تصویر عظیم الشان جہاز کی ہے جسکے بادبان کھلے ہوئے ہیں جسے دیکھ کر سنہ عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں ہندوستانیوں کے جاوا میں اپنی نو آبادی قائم کرنے کی تاریخ کا نظارہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے "جہاز جو نہایت شاندار وضع کا اور عمدہ رفتار کے قابل بنا ہوا ہے اپنی قسم کا

ایک نادر نمونہ ہے"۔ جیسا کہ ای۔ بی ہیول صاحب اپنی کتاب "ہندوستان کا فن سنگتراشی و نقاشی" کے صفحہ ۱۲۴ پر لکھتے ہیں "یہ الفاظ کی نسبت زیادہ وضاحت کے ساتھ اُن خطرات کو بیان کرتا ہے جو شہزادہ[۱] گجرات اور اس کے ہمراہیوں کو ہندوستان کے مغربی ساحل سے روانہ ہو کر اس طویل اور مشکل سفر میں پیش آئے۔ لیکن یہ خطرات اب گذر چکے ہیں۔ ملاح اب بادبان لپیٹ رہے اور لنگر ڈال رہے ہیں۔ چھٹی یا ساتویں صدی کے جہازوں کا یہ نمونہ دیکھ کر معاً ہمارے دل میں پانچویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصے کا خیال گذرتا ہے جب کہ اسی قسم کا ایک اور جہاز تین ماہ کے مسلسل سفر کے بعد لنکا سے چلکر جاوا کے ساحل پر پہونچا تھا۔ اس جہاز پر ۲۰۰ کے قریب مسافر تھے جن میں مشہور چینی سیاح فاہیان بھی موجود تھا جس کا ذکر اُس معمولی سی تاریخ ہند میں بھی آتا ہے جو اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ بڑے جہاز کے سامنے والے حصے پر ایک اور چھوٹا جہاز اس غرض سے لگا رہتا تھا کہ دوران سفر میں کوئی حادثہ واقع ہو جائے یا جہاز ٹوٹ جائے تو اس سے کام لیا جا سکے"۔

ہندوستان کے بنے ہوئے جہاز کی ایک اور کندہ کی ہوئی تصویر بابو رادھا کمود مکرجی پروفیسر بنگال نیشنل کالج کلکتہ نے پوری کے مندر میں دیکھی تھی جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "پچھلے دنوں اڑیسہ اور جنوبی ہند کا دورہ کرتا ہوا میں پوری پہونچا جہاں جگن ناتھ جی کے مندر میں مجھے پتھر پر بنی ہوئی شاہی بجرے کی ایک نہایت نفیس اور زمانہ کی دست برد سے بچی ہوئی تصویر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ تصویر مندر کے اس حصے میں بنی ہوئی ہے جسے بھوگ مندر کہتے ہیں اور جس کے متعلق یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ ابتداءً اس مندر سے متعلق نہیں بلکہ کسی زمانے میں یہاں سے ۲۰ میل کے فاصلے پر کنارک کے سیاہ پگوڈہ میں لگا ہوا تھا جہاں سے مرہٹے اسے اُٹھا لائے تھے۔ اور ۴۰ لاکھ کے صرفہ سے اسے اس بڑے مندر میں لگایا تھا۔ فی الحقیقت مندر کے اس حصے پر جو شاندار کندہ کی ہوئی تصاویر موجود ہیں وہ بالکل ہی الگ معلوم ہوتی ہیں اور جگن ناتھ جی کے مندر کے دوسرے حصوں میں جو مقابلتاً بھدی سنگتراشی کے نمونے موجود ہیں ان سے انکا کوئی تعلق نہیں برعکس اس کے جو شخص سرسری طور پر بھی اس خاص حصے کی تصاویر کا کنارک کے سیاہ پگوڈہ کے اُس حصے کی نقش کاری سے مقابلہ کرے جو اب تک لب ساحل اپنی شاندار تنہائی کی حالت میں کھڑا ہے وہ فوراً انکی یگانگت محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن ان سنگتراشی کے نمونوں کے علاوہ ایک اور بہت بڑا ثبوت اس بات کا کہ یہ حصہ کنارک ہی کے مندر سے تعلق رکھتا ہے یہ ہے کہ ان دونوں میں یکساں قسم کا مصالحہ لگا ہوا ہے یعنی سنگ اسود جسے مقامی طور پر مگوئی کہتے ہیں دو سیاہ سنگ کا ستون جو ۲۵ فٹ لمبا اور جگن ناتھ جی کے مندر کے مشرقی یعنی شیروں والے دروازے

[۱] تاریخ جاوا میں مذکور ہے کہ سنہ ۶۰۳ء کے قریب گجرات کے ایک فرمانروا کو خبر ملی کہ اسکی سلطنت عنقریب تباہ ہو جائے گی اس پر اس نے اپنے بیٹے کو مع ۵۰۰۰ آدمیوں کے جنہیں کاشتکار۔ کاریگر۔ سپاہی، طبیب اور لکھے پڑھے لوگ شامل تھے ۶ بڑے اور ۱۰۰ چھوٹے جہازوں میں سوار کر کے جاوا بھیجدیا جہاں پہنچ کر انہوں نے اُس تہذیب کی بنیاد رکھی جس کے باعث بوروبوڈور کی کندہ کی ہوئی تصاویر آجتک دیکھی جاتی ہیں۔ ۱۲

گے سامنے کھڑا ہے وہ بھی اسی مسالہ کا بنا ہوا ہے اور ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ اسے کنارک کے مندر سے یہاں پہونچایا گیا تھا۔

تصویر میں ایک نہایت شاندار شاہی بجرہ دکھایا گیا ہے جسے بڑے بڑے مضبوط ملاح پوری طاقت سے چلا رہے ہیں حتیٰ کہ غور کرنے سے گویا پانی کی آواز کانوں میں آنے لگتی ہے۔ پانی کی لہریں نہایت خوشنما طور پر بنائی گئی ہیں اور تمام نظارہ دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ نہایت پھرتی اور تیزی سے کام لیا جا رہا ہے۔ گویا فراری کا عمل بڑی جلدی میں انجام پا رہا ہے۔ یا کسی خطرے سے بچنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جہاز کی کوٹھری کی خوشنمائی اور اس کی طرز ساخت کی سادگی خاص طور پر قابل غور ہے۔ اور چھت سے جو زنجیر اس غرض سے لٹکائی گئی ہے کہ اس میں جو شخص بیٹھے وہ اسے مضبوط پکڑے رکھے اور اس طرح پر گرنے سے بچے وہ واقعی ایک نرالی ایجاد ہے۔

یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اس تصویر میں شاستروں کا کونسا نظارہ دکھایا گیا ہے کیونکہ غالبًا یہ ایک محض دنیاوی تصویر یا سامانِ آرایش نہیں ہے۔ بعض پنڈتوں سے اس بارے میں استفسار کیا گیا تو ان میں سے ایک نے خاصی دل لگتی بات کہی۔ چنانچہ اس نے بیان کیا یہ سری کرشن جی کی اس وقت کی تصویر ہے جب اُنھیں راجہ کنس سے بچانے کے لئے جہاز میں بٹھا کر لئے جا رہے تھے "یکتی کل پاترو" میں جہازوں کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے یہ مدہ مندہ قسم کا جہاز معلوم ہوتا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بھوبنیشور کے عظیم الشان مندر میں جو ہندوستانی صناعی کا بہترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے ایک اور تصویر اس قسم کے بجرے کی موجود ہے۔ ایسے ہی مدورا کے مندر میں سورن پشپ کارنی تالاب کے گرد بنی ہوئی غلام گردشوں کی دیواروں پر استرکاری کی جو تصاویر ہیں ان میں ایک نہایت خوشنما تصویر سمندر کی بنی ہوئی ہے جس پر ایک جہاز پورے بادبان پھیلائے چلا جا رہا ہے۔ اور یہ جہاز جسامت میں بوروبوڈور کی تصاویر سے کسی طرح کم نہیں۔

ہندوستان میں قدیم سکوں سے جہاز رانی وغیرہ کے متعلق جو شہادت مل سکتی ہے اس میں سے قابل ذکر معلومات وہ ہیں جو شرقی ساحل کے خاندان اندھر کے اُن سکوں سے جو دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں رائج تھے حاصل ہوتی ہیں۔ ان سکوں پر ایک دو مستول والے جہاز کی تصویر ہے جو بظاہر بہت بڑی جسامت کا معلوم ہوتا ہے مسٹر ونسنٹ اسمتھ صاحب اس علامت کے معنی اپنی کتاب "ہندوستان کی ابتدائی تاریخ" کے صفحہ ۲۰۲ پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ راجہ یجنا سری کی حکومت جو ۱۸۴ء سے ۲۱۳ء تک حکمراں رہا صرف خشکی تک محدود نہ تھی۔ اسکی تائید سیول صاحب کی اس راے سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے جدید اڈیشن کے امپیریل گزیٹیر کی جلد ۲ کے صفحہ ۳۲۵ میں بالفاظ ذیل ظاہر فرمائی ہے:-

ان کی تجارت کا سلسلہ خشکی اور سمندر کی راہ سے مغربی ایشیا۔ یونان۔ روما۔ مصر چین اور دوسرے شرقی ممالک سے قایم تھا۔

سطور بالا میں ہم نے قدیم ہندوستان کی جہاز سازی اور جہاز رانی کے متعلق جس قدر شہادت براہ راست مل سکتی ہے

اس پر کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ شہادت ہرچند کہ تھوڑی ہے تاہم اس سے جو ثبوت ملتا ہے وہ زبردست ہے۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ ہندوستان کی بحری تجارت کو ثابت کرنے کے لئے ہمارے پاس کافی دلائل موجود ہیں۔ خاتمے پر یہاں صرف اس قدر اور بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں ہندوستان کی جہاز سازی ایک ایسے اعلیٰ پیمانے پر پہنچ چکی تھی کہ نہ صرف سکندر اعظم کو یہاں پہنچ کر کشتیوں کا ایک بیڑا مل گیا جس کے ذریعہ اس نے سندھ کو عبور کیا اور دریائے ہڈسپیس کی خطرناک موجوں پر پل باندھا بلکہ اس کے جرنیل نیارکس کو بھی ایک بیڑا اس قسم کا میسر آگیا جس کے ذریعہ سے اس نے خلیج فارس کا مشہور سفر پورا کیا۔ اس سفر کے موقعہ پر ملک میں جسقدر کشتیاں یا جہاز مل سکتے تھے ان سبکو بیگار میں پکڑ لیا اور ان کے ذریعہ سے ایک عظیم الشان بیڑا تیار کیا گیا تھا۔ جسکے جہازوں کی تعداد بقول ایرین ۸۰۰ اور بقول کرٹیس اور ڈایوڈورس قریباً ۱۰۰۰ تھی۔ لیکن بطلیموس جسکا اندازہ زیادہ صحیح تسلیم کیا گیا ہے اسکا خیال ہے کہ اس موقعہ پر جہازوں کی تعداد کسی طرح پر ۲۰۰۰ سے کم نہ تھی اور انہیں ۸۰۰۰ سپاہی کئی ہزار گھوڑے اور بیشمار مقدار خوراک کی موجود تھی۔ فی الحقیقت ہندوستانی لکڑی کے ذریعہ ہندی دستکاروں کے بنائے ہوئے جہازوں کا یہ عظیم الشان بیڑا تھا۔ اور اگر ہم اس حملے کو قابل یقین سمجھیں جو سمیرامس نے ہندوستان پر کیا تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بیڑے کا مقابلہ کرنے کے لئے ۴۰۰۰ جہاز دریائے سندھ میں جمع ہوئے تھے۔ ایسے ہی جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کیں تو اس سے مقابلہ کرنے کو بھی ایک زبردست بیڑا دریائے سندھ کے عمیق پانی پر جمع ہوا تھا۔ آئین اکبری میں مذکور ہے کہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں سرکار ٹاٹا (واقع سندھ) کے جہاز سازی کے کارخانوں میں چالیس ہزار سے زاید بڑے چھوٹے جہاز ہر وقت تیار موجود رہا کرتے تھے۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ ہندوستان بھر کے کارخانے مل کر بھی ۱۲۵ سے زیادہ بڑی کشتیاں سالانہ تیار نہیں کر سکتے۔

کسی نے سچ کہا ہے "ہم انسان ہیں اور ہمیں اس صورت میں غم کرنا چاہیئے جبکہ ایک ایسی بات کا جو کسی زمانے میں عظیم الشان تھی سایہ تک ہمارے قابو میں نہ رہے۔"

تیرتھ رام

حکیم سینکا

قرطبہ دنیا کے اُن مبارک شہروں میں شمار ہے جو زمانہ دراز تک علمی مرکز ہونے کی وجہ سے آماجگاہ خلایق بنا رہا۔ اس نے اگرچہ مسلمانوں سے پیشتر بھی بہت سے قابل قدر حکیم پیدا کئے۔ لیکن جو شہرت اور عزت اس نے بہ لحاظ علم مسلمانوں کے عہد میں حاصل کی وہ اسوقت تک قایم و برقرار رہیگی جبتک کہ دنیا علم کو اچھا سمجھتی ہے۔

فی الحال حکیم سینیکا کے حالات پیش کئے جاتے جو مسلمانوں سے تقریباً چھ صدی پیشتر پیدا ہوا' اور جس کی زندگی باوجودیکہ طرح طرح کے مصائب اور مختلف قسم کی تکالیف کا شکار رہی' نہایت شاندار گذری ہے۔

لیوکی اَس اینی اَس سینیکا سات سال قبل مسیح بمقام قرطبہ جو ہسپانیہ میں واقع ہے' پیدا ہوا۔ اس کا والد مارکس اینی اَس سینیکا ایک اعلیٰ عہدہ پر مامور رہونے کے علاوہ فصیح و بلیغ مقرر تھا۔ اس کی والدہ ہیلویا نہایت شریف اور ممتاز خاتون سمجھی جاتی تھی اور دوسری خواتین میں نمایاں عزت سے دیکھی جاتی تھی۔ جب بچے کی عمر دو برس کی ہوئی تو اس کے والدین روما چلے گئے۔ نقل مکان کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ چونکہ روما اس زمانہ میں منبع علوم و فنون تھا اور سینیکا کی تعلیم یہیں خاطر خواہ ہونی ممکن تھی' لہذا یہی جگہ قابل رہایش سمجھی گئی۔

رستم کے والد زال کی طرح سینیکا کے بال بھی پیدایشی سفید تھے۔ اس لئے بچہ کا نام سینیکا رکھا گیا جس کے معنی پیر مرد یا بوڑھے آدمی کے ہیں۔

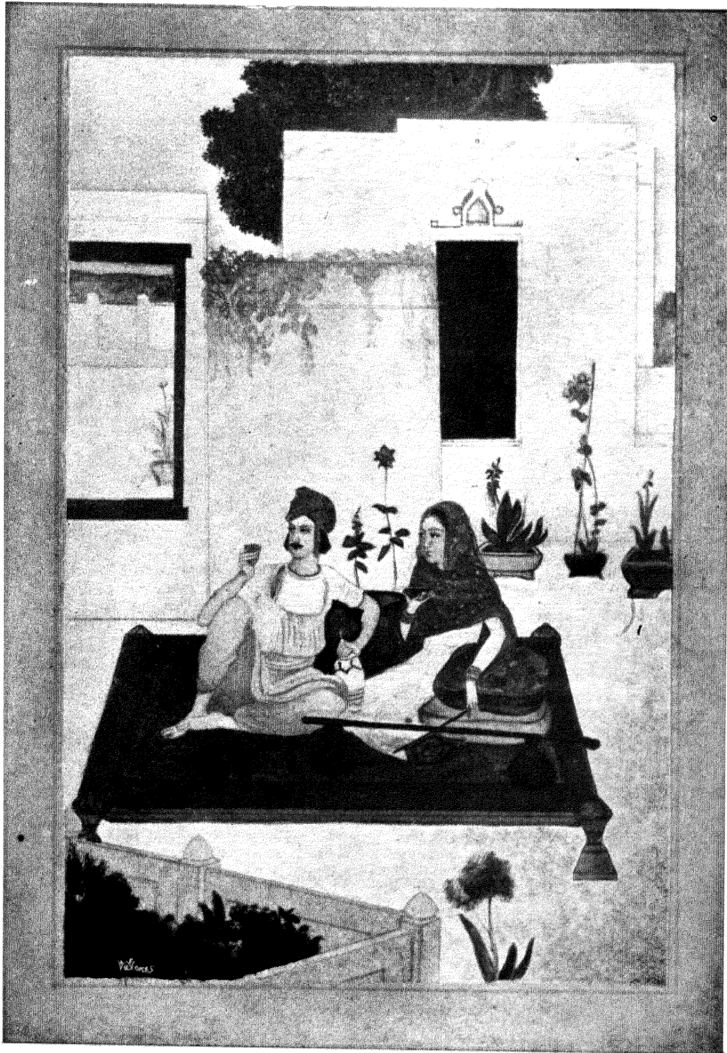
بچپن میں سینیکا نے بیماری سے سخت تکلیف اٹھائی۔ چنانچہ وہ خود لکھتا ہے کہ "میں زندگی بھر ضیق النفس کی بیماری میں مبتلا رہا۔ اور یہ وہ بیماری ہے جسکو میں سب سے اول خیال کرتا ہوں"۔

تقریباً سات برس کی عمر سے سینیکا کی تعلیم شروع ہوئی بازاروں میں کثرت اژدحام کی وجہ سے اسکے لئے ایک غلام خدمتگار مقرر کیا گیا' جس کا یہ فرض تھا کہ وہ اسے مدرسہ پہنچا دیا کرے اور چھٹی کے وقت اسے لے آیا کرے۔ سینیکا نے شروع شروع میں فن بلاغت کے متعلق کچھ کتابیں پڑھیں' لیکن چونکہ اس کا میلان طبع فلسفہ کی طرف زیادہ تھا' اسلئے اس نے اپنی عنان توجہ فلسفہ کی طرف موڑی اور اپنے آپکو ہمیشہ کے لئے اسی کی نذر کر دیا۔

اُس زمانہ کی تعلیم میں ابتدائی حساب اور معمولی لکھنا پڑھنا بھی شامل تھا۔ تاریخ اور علم ادب کی درسیہ کتابیں بھی داخل نصاب تھیں۔ لیکن چونکہ چھاپہ خانہ اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا تھا' اس لئے عام طور پر طلبا اپنے اُستادوں سے کتابیں نقل کر لیا کرتے تھے۔ آج کل کے خلاف تعلیم بالعموم گھر پر دی جاتی تھی' لیکن اسکولی تعلیم و تعلم کا سلسلہ بھی جاری تھا اور اسکو اعلیٰ ترقی پر پہنچانے کی بہت کوشش کیجاتی تھی۔ لوگ مدرسوں کے وجود کو امن اور خوشحالی کا نشان سمجھتے تھے۔ استاد عام طور پر غلام ہوتے تھے اور ایک قابل یونانی استاد ۱۵۰۰ پونڈ میں بآسانی دستیاب ہو سکتا تھا۔ ماسٹر اپنے طلبا کی قوت دماغیہ بڑھانے کے لئے مشہور تاریخی واقعات پر جواب مضمون لکھواتے اور انعام دیتے تھے۔ اس زمانے کے اُستاد شاگردوں پر بہت سختی روا رکھتے تھے اور انھیں (موجودہ نظام تعلیم کے خلاف) کثرت کے ساتھ جسمانی سزائیں دی جاتی تھیں۔

سینیکا کو اس قسم کی تعلیم سے جس کا مختصر سا ذکر اوپر ہو چکا ہے سخت نفرت تھی۔ وہ کہتا تھا کہ "یہ سچی تعلیم نہیں ہے۔ یہ ہرگز ہماری آیندہ زندگی میں مفید نہیں ہو سکتی۔ مجھے پہلے جاہ و تمکنت اور عیش و عشرت سے نفرت دلانیوالی تعلیم دو۔ اسکے بعد پھر تم مجھے جس قسم کی تعلیم دینی چاہو دے سکتے ہو"۔

تمام اُستاد سینیکا کی خداداد ذہانت طبع کے معترف تھے اور اکثر غائبانہ اسکی تعریف بھی کیا کرتے تھے اُسکی قوت



موسم گرما

(از بابو ابنندرو ناتھ ٹیگور)

دید کے قابل ہے نازو بے نیازی کی ادا * سرمگیں آنکھوں میں ہے افسوں طرازی کی ادا

انڈین پریس الہ آباد

حافظہ اتنی تیز تھی کہ وہ دو ہزار الفاظ سننے کے بعد ترتیب وار انھیں سنا سکتا تھا۔

سینکا کی اپنے ایک اُستاد اٹے لس سے بہت اُلفت تھی۔ وہ اسکے مکان پر دوسرے شاگردوں کی نسبت سب سے پہلے پہنچتا اور سب سے پیچھے وہاں سے آتا۔ اپنے ایک اور اُستاد کی نسبت لکھتا ہے کہ "وہ مسئلہ تناسخ کا قایل تھا اور گوشت خواری کو گناہ سمجھتا تھا۔ اس نے گوشت خواری کے خلاف بہت سے لکچر دئے جن کا میرے دل پر اتنا اثر ہوا کہ مین نے گوشت خواری کی عادت ترک کردی اور ویجی ٹیرین بن گیا۔" اسوقت سینکا کی عمر ۲۰ سال کی تھی۔

حکیم سیکس ٹی اس بھی ان اشخاص میں سے ہے جنہوں نے سینکا کی تعلیم میں نمایاں حصہ لیا۔ اس حکیم سے سینکا نے اپنی ہر روزہ حالت جانچنے کی عادت سیکھی۔ وہ لکھتا ہے کہ "جب رات زیادہ آجاتی اور مین آرام کرنے کے لئے پلنگ پر لیٹتا تو اسوقت مین اپنے دل سے پوچھتا تھا کہ آج تونے کونسی بُری عادت کو ترک کیا اور کونسی بُرائی کا مقابلہ کیا اور ایسی کونسی اخلاقی صنف ہے جس میں تونے ترقی کی"۔ سینکا آخر عمر میں لکھتا ہے کہ "یہ عادت مجھ میں ابتک موجود ہے اور مین سونے سے پیشتر ہر روز کے واقعات اپنے دل کی عدالت میں پیش کیا کرتا ہوں اور دن بھر کے حالات پر تنقیدانہ نظر ڈالتا ہوں اور پھر اپنے الفاظ و افعال کی گرفت کرتا ہوں میری بیوی بھی میری اس عادت سے واقف ہے"۔

سینکا بچپن ہی سے سٹوئک حکما کا ہم خیال تھا اور اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ قدیم حکیموں میں سٹوئک حکما کی تعلیم سب سے اچھی اور شریفانہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان فصیح و بلیغ فلاسفروں کے وعظوں نے اُس کے دل پر نمایاں اثر کیا اور وہ اُس پُر آشوب اور نازک وقت میں ان بُری صحبتوں سے بچا رہا جن سے وہ زمانہ بدنام ہے۔ سینکا کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ دوسرے فرقوں کے بزرگوں کی عزت اپنے سلسلہ کے بزرگوں کی طرح کرتا تھا۔ اسی وجہ سے ہم دیو جانس کلبی کی جو ایک دوسرے سلسلہ کا بزرگ تھا کئی جگہ تعریف دیکھتے ہیں۔ اسی طرح ڈمٹری اس کی تعریف میں کہتا ہے کہ "مین جہاں کہیں جاتا ہوں، شریف ترین انسان یعنی ڈمٹری اس کو اپنے ساتھ لیجاتا ہوں۔ اور مین تمام گیروے رنگ کے کپڑے پہننے والے لوگوں کو چھوڑ کر صرف اسی سے بات چیت کرتا ہوں۔ مجھ سے کیونکر ہو سکتا ہے کہ مین ایک بے غرض انسان کی تعریف سے باز رہوں؟ یہ ممکن ہے کہ انسان تمام چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھے، لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کہ تمام چیزیں اسی کے قبضۂ اختیار میں ہوں۔ دولت حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ انسان دولت سے نفرت کرنے لگے۔ اور اگرچہ ہمارا دوست ڈمٹری اس ہر ایک چیز اور خصوصًا دولت سے متنفر ہے لیکن وہ دوسرے لوگوں کو اسکے استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے"۔

سینکا کا زمانہ اہل روم کے نزدیک بدترین زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ اسوقت کی صحبتیں خراب تھیں۔ لوگ عیاشی اور بدمعاشی کی طرف جھکے ہوئے تھے، اور اگرچہ مغلسی کی ہوا چاروں طرف چل رہی تھی، لیکن ان رذیل اوصاف میں ترقی ہی ترقی تھی۔ خود بادشاہ کی حالت نہایت نازک تھی۔ کبھی تو وہ اپنے آپ کو لامذہب کہتا اور کبھی دیوتا۔ لوگوں میں خودداری نام کو نہ تھی کیونکہ وہ پہلے ہی اپنے افعال کے سبب خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو چکے تھے۔ امیر صاحب جائداد تھے لیکن یہ سب روپیہ انہوں نے غریبوں کے گلے پر

چھری پھیر کے حاصل کیا تھا۔ لونڈیوں اور غلاموں پر سخت تشدد ہوتا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انکو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ان کو جانور سمجھکر دشمن سے زیادہ تکلیف دیجاتی تھی۔ غرض یہ ہے کہ وہ زمانہ لاانتہا عیاشی اور ظلم اور مفلسی کا زمانہ تھا اور غالبًا یہی واقعات جناب مسیح کے درود کا باعث ہوئے۔

روما نے بڑی اس بادشاہ کے زمانہ میں کچھ ترقی نہیں کی بلکہ اُلٹا تنزل ہی کیا۔ یہ بادشاہ بہت ہی عیاش تھا۔ اسکے بعد کالیس تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس بادشاہ کی تعریف میں سینیکا کہتا ہے کہ "وہ بنی آدم کی تباہی اور بربادی کے واسطے پیدا ہوا تھا"۔ الغرض اُسوقت کوئی بادشاہ بادشاہت کے فرایض ادا نہیں کرتا تھا بلکہ نفس پروری کے لئے ہر گھڑی کوشاں رہتا تھا۔

جب رفتہ رفتہ سینیکا نے مجسٹریٹ کے درجہ تک ترقی کی تو اُس نے ایک خاتون سے، جس کا نام صفحات تاریخ میں نہیں ملتا، شادی کی۔ اس سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ سینیکا نے اب خاصی دولت جمع کر لی تھی۔ اسوقت تخت کا مالک کلوڈی اس تھا جس کے عہد میں ہمارے فلاسفر نے شاہی دربار میں خاص رسوخ حاصل کر لیا۔ لیکن اس بادشاہ کی خود غرضی اور بیوقوفی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے سینیکا کو اپنی بیوی کے کہنے سننے سے جزیرہ کورسیکا میں جلاوطن کر دیا۔ یہ واقعہ ۴۱ء میں پیش آیا۔

جس الزام میں سینیکا گرفتار کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ بادشاہ کی بھتیجی کے ساتھ کسی خفیہ سازش میں شریک ہے۔ چونکہ اس امر سے سلطنت کو اندیشہ تھا لہذا بھتیجی کو تو فوراً قتل کر دیا گیا لیکن کسی سفارش کی وجہ سے سینیکا کو صرف جلاوطن ہونے کا حکم دیا گیا۔ سینیکا آٹھ سال تک جلاوطن رہا اور اس تنہائی میں وہ اپنے دل کو فلسفیانہ باتوں سے بہلاتا رہا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وقت جزیرہ کورسیکا ایک بہت ہی اجاڑ جگہ تھی، اور وہاں گذارہ بھی بہت مشکل سے ہو سکتا تھا۔ وہاں جلاوطنی اور جلاوطن کے علاوہ اور کچھ موجود نہ تھا۔

سینیکا کو اس مصیبت میں رہتے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ اس نے ایک کتاب موسوم بہ "Consolation to his Mother" (اپنی ماں کے لئے تسلی نامہ) لکھی۔ یہ کتاب اس کی تصنیفات میں سب سے زیادہ دلچسپ اور موثر ہے۔ ہم ناظرین کی دلچسپی طبع کے لئے کہیں کہیں سے اس کا اقتباس کرتے ہیں۔

جلاوطنی تبدیلی مقام کا نام ہے۔ اور اگرچہ مجھے اس ویران جگہ میں بھیجدیا گیا ہے، تاہم میں خوش و خرم ہوں، کیونکہ میرا یقین ہے کہ تمام کاروبار مشیت الٰہی کے مطابق انجام پذیر ہوتے ہیں۔ یہ دنیا جو قدرت کی سب چیزوں میں زیادہ شاندار اور خوبصورت ہے اور ہماری عقل جو اسکے مشاہدے کے لئے پیدا کی گئی ہے ایسی چیزیں ہیں، جو ہمارے ساتھ ساتھ رہتی ہیں، جبتک ہم اپنے آپ کو قایم و برقرار رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں خندہ پیشانی کے ساتھ رضائے خداوندی کی پیروی کرنی چاہیئے۔ کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں انسان رہایش نہ کر سکتا ہو، اور کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں وہ آسمان کو نہ دیکھ سکتا ہو۔ اس لئے ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ جہاں کہیں بھی ہم ہونگے انسان اور خدا کا فاصلہ یکساں ہی رہیگا۔ جب تک میں چاند، سورج اور دیگر ستاروں کے نکلنے اور غروب ہونے پر غور کرتا ہوں، اور جب تک میں زمین اور اسکے دلخوش کن مناظر دیکھتا ہوں، اسوقت تک اس کا کچھ

مضایقہ نہیں کہ میں زمین کے کونسے حصہ میں رہتا ہوں۔

اگرچہ قدرت نے مجھے ایک ایسے جزیرے میں بھیجا ہے جہاں سب سے زیادہ شاندار عمارت جھونپڑی خیال کی جاتی ہے تاہم میں مفلس اور نادار ہونے پر بشاش رہتا ہوں کیونکہ میں ایک شریفانہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔

مفلسی کی نسبت یہ ہے کہ جس کسی کو حرص اور عیاشی کے خیال نے پریشان نہیں کیا ہے، وہ جان سکتا ہے کہ مفلسی کوئی گناہ نہیں ہے۔ میری جسمانی ضروریات بہت کم ہیں یعنی کھانا کپڑا اور بس۔ اور یہ سب مجھے مہیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ مفلسی ایک ایسے شخص کو جو ہر چیز کی زیادتی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ہماری روح ہمیں غریب اور امیر بناتی ہے اور چونکہ جلاوطن ہونے پر بھی ہماری روح ہمارے ساتھ ساتھ رہتی ہے اس لئے تنہائی اور مصیبت کے زمانے میں بھی وہ اپنی برکتیں ہم پر نازل کرتی ہے، اور اس طرح ہمیں ہمیشہ خوش و خرم رکھتی ہے۔

دولتمندی درحقیقت محتاجی کا ایک دوسرا نام ہے۔ یہ ہرگز ہرگز خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ دولتمند لوگ ہمارے ایسے غریبوں سے زیادہ خوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان جس قدر دولتمند ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی ضرورتیں اور حاجتیں بڑھتی رہتی ہیں۔ اس لئے زیادہ دولتمندی دراصل زیادہ محتاجی ہے سے

آنانکہ غنی ترند۔ محتاج ترند۔

.... اس لئے میری پیاری اماں! محض میرے لئے تمہارے رونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ تمہیں میری اس چند روزہ جدائی کا غم نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے پیشتر ہم کئی دفعہ ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں اور اگرچہ یہ ایک طبعی امر ہے کہ تم میری اس جدائی کا افسوس کرو لیکن جس طرح تمہیں تمام دیگر مستورات پر حیا، سادگی اور عفت کا شرف حاصل ہے اسی طرح تم کو دوسری عورتوں کی طرح رونے دھونے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

غور کرو کہ خدا نے تمہارے آرام و تسلّی کے لئے کتنے سامان بہم پہنچائے ہیں۔ میرے دونوں بھائی (نووےٹس اور گیلیو) تمہارے پاس موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میرے بیٹے کی دل خوش کن باتیں تمھیں ہمیشہ مسرور کرتی رہینگی۔ مزید براں میری ممانی جو ایک نہایت شریف النفس خاتون ہیں، یقین ہے کہ تمہارے لئے باعثِ تسلّی ثابت ہونگی۔

لیکن چونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہارے خیالات ان سب سے ہٹ کر میری ہی طرف متوجہ ہونگے، اس لئے نہیں کہ میں سب بچوں میں پیارا ہوں، بلکہ اسلئے کہ انسان قدرتاً اُس جگہ اپنا ہاتھ رکھتا ہے جہاں کہیں درد ہوتا ہے، اس لئے میں بتانا چاہتا ہوں کہ تمھیں میرا خیال کس طرح کرنا چاہیئے۔ تمھیں معلوم ہو کہ میں خوش اور بشاش ہوں۔ میرا دل ہر قسم کے رنج وہ خیالات سے پاک ہے میں اکثر اس دنیا کے دقیق مسائل پر غور کرتا ہوں اور باقی وقت اپنی حالت پر غور و فکر کرتا رہتا ہوں۔ میں شروع میں قطعاتِ زمین اور ان کی جائے وقوع کی نسبت غور و خوض کرتا ہوں۔ پھر اُس کے گرد اگر دسمندر اور اُسکے مدّ و جزر کا خیال کرتا ہوں۔ اسکے بعد میں زمین اور آسمان کے درمیانی حصہ کا خیال کرتا ہوں جس میں بادل گرجتے ہیں، بجلی چمکتی ہے، ہوائی طوفان آتے ہیں، مینہ برستا ہے، اولے پڑتے ہیں اور برف گرتی ہے۔ پھر یکایک میرا خیال ان طبقات زیرین میں سے گذر کر طبقات اعلیٰ میں پہنچ جاتا ہے، اور پھر اُس ذاتِ اقدس کا جسے خدا کہتے ہیں،

نظارہ کرتا ہے، اور بعد میں اُن تمام باتوں سے واقف ہو جاتا ہے جو ازل سے لیکر اسوقت تک پیش آچکی ہیں یا ابد تک پیش آتی رہیں گی۔

متذکرہ بالا اقتباس اس لحاظ سے اور بھی دلچسپ ہو گیا ہے کہ اس میں سینیکا نے اپنا فلسفہ بھی ظاہر کر دیا ہے۔ اسکا محبت آمیز طرز تحریر مصنف کے ہم خیال حکما، کی ایک ایسی صفت ہے جس نے اُنھیں ایسے پر آشوب اور نازک زمانے میں نہایت کامیابی بخشی۔

بادشاہ کلوڈی اس کے دوسری شادی کرنے پر سینیکا اس کی نئی بیوی اگرپنا کے توسل سے پھر واپس بلوایا گیا۔ روما کی گدی پر جلوہ افروز ہونے کے بعد سینیکا نیرو کا اتالیق مقرر کیا گیا جس کی عمر ۱۱ سال کی تھی، اور جو اگرپنا کا بیٹا تھا اور جس کو کلوڈی اس نے اپنا جانشین بنا لیا تھا۔ ایک اور شخص جس کو بروس کہتے تھے شاہزادہ نیرو کی جنگی تعلیم کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہ دونوں اُستاد نیرو کی ہر ایک بات کا خیال رکھتے اور اسکو اُن تمام مروجہ بُرائیوں سے بچاتے تھے جس سے وہ عہد پر ہے۔ لیکن ۵ سال کی تعلیم کے بعد نیرو اپنی طبیعت کے اصلی رنگ پر آگیا اور اپنی ماں سے لڑنے جھگڑنے میں مشغول ہو گیا۔ سینیکا اور بروس نے اس جھگڑے کا فیصلہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن چونکہ ماں بیٹے کے درمیان دشمنی غایت درجہ کو پہنچ گئی تھی اسلئے صلح ناممکن ثابت ہوئی، اور بالآخر نیرو اپنی والدہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس واقعہ کے بعد سینیکا نے بادشاہ کی طرف سے مجلس انتظامیہ کو اس واقعہ کی اصلیت دکھائی جس پر خوش ہو کر نیرو نے سینیکا پر لامحدود دولت قربان کر دی۔ اشارۃً اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ غیر معمولی اعزاز آخر میں خود سینیکا کی موت کا باعث ہوا۔

سینیکا نے یہ دیکھ کر کہ ہر شخص مجھ سے جلتا ہے نیرو سے اجازت طلب کی کہ مجھے عدالت کے کاروبار سے علیحدہ ہو جانے کی اجازت دی جائے اور ساتھ ہی اپنی تمام دولت کو شاہی خزانے کے سپرد کرنے کا وعدہ کیا۔ نیرو نے اس کی عزت برقرار رکھنے اور اسے حاسدوں سے بچانے کا وعدہ کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وعدہ میں کچھ اصلیت نہ تھی۔ الغرض سینیکا پر سازش کا بے بنیاد الزام[۵۱] دھر کر سپاہیوں کی ایک جماعت اس کے مکان میں اسوقت داخل ہو گئی جبکہ وہ رات کا کھانا اپنی بیوی[۵۲] اور دوستوں کے ساتھ کھا رہا تھا۔ سپاہیوں نے اُسے حکم دیا کہ وہ خود ہی اپنا خاتمہ کر دے۔ سینیکا نے اس حکم کو نہایت استقلال کے ساتھ سنا اور اپنی قطعی رائے ظاہر کرنے کے لئے کچھ وقت مانگا لیکن یہ درخواست نامنظور کی گئی۔ اسکے بعد سینیکا اپنی بیوی سے بغلگیر ہوا اور ہر طرح سے اسے تسلی و تشفی دیتا رہا۔ لیکن اُس وفادار بی بی نے سوائے اسکے کہ خود بھی اپنے خاوند کے ساتھ جان دے دے اور کسی قسم کی تسلی نہ چاہی۔ خود سینیکا نے جس موت کو پسند کیا وہ ایسی تھی کہ اُس کی تمام رگوں کا منہ کھول دیا جائے تاکہ خون کے زائل ہو جانے سے خود ہی اس کا دم نکل جائے۔ اس کی زندگی کی آخری گھڑیاں آنسو بہانے

---

۵۱ بات دراصل یہ ہے کہ چونکہ سینیکا نیرو کی بدچلنی اور بُرائیوں سے اچھی طرح واقف تھا اسلئے نیرو نے اس خیال سے کہ کوئی اور آفت برپا نہ ہو اس پر سازش کا الزام دھر کر مروا ڈالا۔

۵۲ یہاں کچھ پتہ چلتا ہے کہ سینیکا کی بیوی کا نام پولینا تھا۔

والوں کی تسلّی و تشفی میں بسر ہوئیں - افسوس ہے کہ جو سنہری باتیں سینیکا نے اس موقعہ پر اپنے دوستوں کو لکھوائیں وہ آج صفحاتِ تاریخ میں نہیں ملتیں -

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سینیکا میں بچپن ہی سے خودانکاری کے اصول کی قبولیت کا مادہ موجود تھا' اور یہ تو بالکل اظہر من الشمس ہے کہ بڑھاپے میں بھی وہ اپنی بہت سی خفیہ عادات پر کاربند رہا - اگرچہ اس نے اپنے والد کے زیادہ مصر ہونے پر خوراک میں کچھ زیادتی کر دی تھی لیکن اس امر کے ثبوت میں بہت سے دلائل پیش ہو سکتے ہیں کہ اس نے بڑھاپے میں ان تمام ریاضتوں اور عادات کو جو اس نے وقتاً فوقتاً اعلیٰ استادوں سے حاصل کی تھیں اختیار کر لیا تھا - اس نے غریبی اور دولتمندی کے زمانے میں ایک ہی وضع رکھی اور وہ بالکل سادہ تھی - اس کے اوضاع واطوار' اس کی عادات' غرضیکہ اس کی ہر ایک بات سادہ تھی وہ سیر و تفریح کو پسند کرتا تھا اور ورزش کی خاطر کبھی کبھی دوڑا بھی کرتا تھا -

اگر بنا کے قتل کو جائز ٹھیرانا اور پھر نیرو کو ہر قسم کے الزامات سے بچانا سینیکا کی اخلاقی کمزوری اور بزدلی پر دال ہے - یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ اس قتل کے بھیدی صرف نیرو اور سینیکا تھے اسواسطے موخر الذکر کا قتل کیا جانا ایک لازمی بات تھی - لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اسکی موت کا قلق بہت ہوا - اور اس افسوس کی وجہ سینیکا کی ذاتی خوبیاں ہی نہ تھیں بلکہ یہ واقعہ تھا کہ نیرو نے دو شخص بطور جانشین کے مقرر کر دئے تھے' اور اگرچہ نیرو یہ خیال کرتا تھا کہ اب اسے سینیکا کی کچھ ضرورت نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کے دل میں اسکی وفات کے بعد اسکی عزت موجود تھی - بہرحال جو کچھ ہوا' وہ اُس آغاز کا انجام تھا جس کی بنیاد نیرو نے اپنے ہاتھ سے آٹھ سال پیشتر ڈالی تھی -

یہ مضمون نامکمل رہیگا اگر اُسے سینیکا کے بیش بہا اقوال کے ساتھ نہ ختم کیا جائے - لہذا ذیل میں چند اقوال درج کئے جاتے ہیں - اُمید ہے کہ اُن کے صوفیانہ اور اخلاقی جذبات دلچسپ نظر سے دیکھے جائیں گے -

(۱) خدا تمہارے قریب ہے - تمہارے ساتھ ہے - نہیں بلکہ خود تم میں موجود ہے - ہمارے دل میں ایک مقدس روح رہتی ہے جو ہماری بُرائیوں اور نیکیوں کی محافظ ہونے کے علاوہ ان کی دیکھ بھال کرتی رہتی ہے -

(۲) انسان سے کسی چیز کے چھپانے کا کیا فائدہ' جب کہ ہر ایک چیز خدا تعالیٰ کے سامنے ظاہر اور عیاں ہے - خدا ہمارے دلوں میں موجود ہے اور وہی ہمارے خیالات کا مرکز ہے -

(۳) اگر ہم کسی چیز پر تنقیدانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں تو سب سے پیشتر ہمیں اس کا خیال کر لینا چاہیئے کہ دنیا میں کوئی شے بُرائی سے پاک نہیں -

(۴) اگر تم اپنے لئے رہنا پسند کرتے ہو تو تمھیں چاہیئے کہ تم دوسروں کے لئے زندگی بسر کرنے کی کوشش کرو -

(۵) ایسا شخص جو نیکی کی زندگی بسر کرتا ہے اور مصیبتوں اور بُرائیوں کا مقابلہ کر کے ان پر فتح حاصل کرتا ہے ایک ایسا وجود ہے جس پر دیوتا بھی خوشی کی نظر ڈالتے ہیں -

(۶) دنیا کے کسی کونے میں رہنے کے باوجود بھی انسان کا خدا تک پہنچنا ممکن ہے - اسلئے اُٹھ اور اپنے آپ کو خدا کے قابل بنا - تو چاندی اور سونے سے اس مقصد کو ہرگز حاصل نہیں کر سکتا - یاد رکھ کہ خدا کی مشابہت ان چیزوں سے پیدا نہیں ہو سکتی

(۷) دولت تمام انسانی برائیوں اور تکالیف کا سرچشمہ ہے -

(۸) انسان ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے اور مدد دینے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

(۹) جب تک ہم زندہ ہیں ہمیں لازم ہے کہ مہربانی کو ترقی دیں۔ ہمیں کسی شخص کے لئے باعث خوف و خطر نہیں ہونا چاہئے۔

(۱۰) احسان کرنے والے کو چاہیئے کہ اپنی زبان بند رکھے احسان کرنے کے بعد اپنے فعل کا ذکر کرنا اور اسپر تکبر کرنا ایک عبث فعل ہے۔

خدا کی برکات جو گنہگار اور نیک بندوں پر یکساں پڑتی ہیں اسکو اس طرح بیان کرتا ہے۔

(۱۱) اگرچہ ہم میں سے بہت سے اشخاص روشنی کے ناقابل ہیں لیکن پھر بھی دن نکلتا ہے۔

(۱۲) اپنے اوپر ضمیر کا دروازہ بند کرنے سے کیا فائدہ جبکہ ہم ہر وقت خدا کے حضور میں رہتے ہیں۔

سینیکا ایک ایسے شخص سے جو نیکی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے:۔

(۱۳) میری بھی یہی خواہش ہے۔ لیکن اسکے حصول کی مجھے امید نہیں۔ مین پہلے ہی بُرائیوں سے گھرا ہوا ہوں۔ اب میری خواہش یہ ہے کہ مین اعلیٰ درجہ کے نیک آدمی کی برابری کرنے کی کوشش نہ کروں بلکہ بُرے آدمی سے اچھا بننے میں کوشاں رہوں۔

الغرض سینیکا اُن اشخاص میں سے ہے جنکی غرض و غایت یہ رہی ہے کہ ہم دن بدن زیادہ نیک بننے کی کوشش کریں۔ وہ عمر بھر خدا تعالیٰ کی جستجو میں رہا اور آخر کار اُسی تلاش میں اُسکا خاتمہ ہو گیا۔

ضیاء الدین احمد برنی

وضعداری کی کہانیاں

اللہ کی شان ہے، دہلی کیا مٹی اسکی ہر آن بان خاک میں ملگئی، سب رنگ رلیاں اور وضعداریاں خواب خیال و فسانہ ہو گئیں۔ ایک زمانہ تھا جسے بہت زیادہ عرصہ نہیں گذرا، کوئی پچاس پچپن برس پہلے کی بات ہے، اس شہر میں ہزاروں وضعدار صورتیں دکھائی دیتی تھیں، ہر وضع ایک دوسرے سے نرالی اور بڑھ چڑھکر ہوتی تھی، یا آج یہ وقت آیا ہے کہ ہم ان کی کہانیاں لکھنے بیٹھے ہیں۔ انگریزی سرکار کے قدم مدت سے ہندوستان اور دہلی میں موجود تھے مگر لال قلعے کی سلامتی میں دلی کا ہر گھرانا اپنی [illegible]ں کی شکل پہ قایم و برقرار تھا۔ ماں کی گود سے آغوش لحد تک ہر شخص کا لباس، رفتار گفتار ایک رنگ اور ایک طرح کی رہتی تھی۔ یہ نہیں کہ صبح کچھ، دوپہر کو اور، اور شام کو وہ بھی القط۔ خلقت نئی روشنی اور نئی ہوا کے اثر سے کچھ عجب راستہ چل رہی ہے کہ کسی بات کا ٹھکانا نہیں۔ پیر میں جوتی انگریزی ہے تو سر پر ٹوپی کامدار، گلے میں انگرکھا دیسی ہے، تو ٹانگوں پر پتلون سوار۔ کوئی شے موزوں اور مناسب ہو تو اسکا ذکر کیا جائے؛ دوستوں میں مروت باقی نہیں۔ یاری و وفاشعاری کا نام صرف ناولوں اور ناٹکوں کے لئے مخصوص ہو گیا، ہر شخص پیٹ بھرنے کی دُھن میں بیدار ہوتا ہے اور معاش ہی کی فکر

میں غلطاں پیچاں رات کو پلنگ پر جاتا ہے۔ میل جول، ملاقاتیں سب مطلب نکالنے اور غرض پوری کرنے تک محدود ہیں۔ نوشت و خواند، کھیل کود، شادی غمی کل پیسے کی طلبگاری سے مملو۔ کہتے ہیں ملک زندگی کے میدان میں قدم بڑھا رہا ہے۔ مگر ہمارا تو یہ خیال ہے کہ زندگی کے ولولے، ساز و سامان لب دم ہیں جنکا تھوڑے دنوں بعد نشان تک نہ رہیگا۔

آج جو درد اگلی وضعداریوں کا چند دلوں میں پایا جاتا ہے کل یہ بھی نہ ہوگا اور نہ وہ بچے کھچے مرثیہ خواں ملیں گے جو اُس سمے کی یادگاریں ہیں۔ لہذا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ ان قبر میں پیر لٹکائے ہوئے بڈھوں سے جو کچھ ہاتھ لگ سکے قلمبند کر لیا جائے تاکہ آیندہ نسلیں اسے دلچسپی مگر عبرت کی نگاہ سے ملاحظہ کریں اور ممکن ہو تو اپنی گذری ہوئی حالت سے کوئی فائدہ اُٹھائیں۔ اس دفعہ چند قصے لکھے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ صفحات **ادیب** میں مدت تک جاری رہیگا۔ بشرطیکہ خدا نے چاہا اور ان ناظرین کا جو اندھی تقلید کے سبب فیشن کے صحیح معنے نہیں سمجھتے جی نہ اکتایا۔

قایل عطار کے کوچے میں ایک صاحب رہتے تھے اصلی نام تو یاد نہیں عرف میر سنگی تھا خدا جنت نصیب کرے ابھی حال میں دنیا سے سدھارے ہیں۔ غدر سے پہلے بڑے رنگ روپ کے بانکے جوان تھے۔ ان کی بابت دیکھنے والے کہتے ہیں کہ کبھی دوسرے کی دی ہوئی جھاڑو آپ کی سمجھ میں نہ آئی۔ روز تاروں کی چھاؤں میں اُٹھتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر خود گھر بھر کی صفائی کرتے اور پھر دروازے سے لیکر گلی کے نکڑ تک زمین کو چندن بنا دیتے یہ دستور تھا جس میں تاحین حیات فرق نہ آیا۔ ایکدن کا ذکر ہے جناب ڈیوٹی ختم کر کے اندر گئے اور اتفاقیہ کچھ دیر بعد پھر باہر آئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گلی میں گھوڑے کے سموں کے نشان ہیں۔ بہت بگڑے اور پوچھنے لگے کہ کس بیرحم نے یہ سفاکی کی۔ لوگوں نے جواب دیا کہ صاحب دو دن سے فلاں شخص بیمار ہے اور حکیم محمود خاں علی الصباح اسے دیکھنے آتے ہیں۔ بولے "آتے ہیں تو آئیں مگر گھوڑا سڑک پر ہی رہیگا" خیر رفت و گذشت۔ دوسرے دن معمول پورا کیا اور مونڈھا بچھا کر گلی کے سرے پر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب موصوف بھی اول درجے کے وضعداروں میں تھے۔ مرتے مرگئے جاڑے گرمی ایک تن زیب کے انگرکھے کے سوا جسم پر اور کپڑا نہ آنے دیا۔ آخری عمر میں زیادہ سردی لگتی تو ململ کی نیم آستین پہن لیتے اور بس۔ اسیطرح جسکے ہاں جانے کا جو وقت مقرر کر دیتے تھے اسے نہ بدلتے تھے۔ آندھی، مینہ کسی سے نہ رکتے اور پابندی کو قایم رکھتے۔ چنانچہ میر سنگی کی گلی میں بھی جو روش چلگئی تھی اسی کے موافق تشریف لائے۔ میر صاحب انکا انتظار کر ہی رہے تھے۔ دور سے چلائے بندہ پرور! گھوڑے سے اُتر جائیے۔ میں اپنی محنت رائگاں نہیں ہونے دونگا۔ دیکھئے تو یہ گلی اس لایق ہے کہ آپ اسے اپنے گھوڑے کی ٹاپوں سے روندیں۔" حکیم صاحب ان باتوں کے قدرداں تھے۔ فوراً مسکراتے ہوئے نیچے آگئے۔ اور پھر کبھی اس گلی میں سے گھوڑے پر سوار ہو کر نہ گذرے۔

ان ہی میر سنگی کے بارے میں مشہور ہے کہ ایکدفعہ انکے پاس کہیں سے آٹھ سو روپیہ آگئے۔ چوروں کو بھی اسکی اطلاع پہنچی چنانچہ ایک شخص گھس آیا۔ یہ رقم کو سرہانے رکھے ہوئے سو رہے تھے۔ چور نے اسپر ہاتھ ڈالا۔ انکی آنکھ کھلگئی۔ جھٹ

گردن پکڑلی اور بولے "میاں! تمھیں خبردار نے یہ تو خبر دیدی کہ روپئے رکھے ہیں لیکن یہ نہ بتایا کہ سپاہی زادے کے قبضے میں ہیں۔ اچھا خیر! اب تم ہمارے مہمان ہو (برابر کی چارپائی کی طرف اشارہ کرکے) اس پر لیٹ کر آرام کرو۔ صبح چلے جانا" چور نے کہا "حضور! مین تو اشتہاری آدمی ہوں دن مین کسی کی نظر پڑ گئی تو کہیں کا نہ رہونگا" جواب دیا "کچھ فکر نہ کرو۔ جب تک ہمارے دم میں دم ہے کوئی تم سے آنکھ نہیں ملا سکتا" غریب مجبور ہو کر پڑ گیا۔ صبح ہوئی تو آپ نے اسکے سامنے ناشتہ رکھا۔ اور ڈولی میں بٹھا کر شہر سے باہر پہنچوادیا۔ اور ایک ٹوکری مٹھائی کی ساتھ کردی کہ گھر ہاتھ خالی نہ جائے۔

ایک صاحب تھے کہ لوگوں کے سلاموں کا جواب نہ دیتے تھے کسی نے دریافت کیا "حضرت یہ کیا حرکت ہے۔ کیا آپ مسلمان نہیں ہیں" کہنے لگے "بھئی! مسلمان تو ہوں اور سلام کا جواب بھی کوئی ایسا نہیں جس کو مین نے ندیا ہو۔ لیکن اشتہار نہیں کرتا۔ چپکے سے وعلیکم السلام کہدیتا ہوں۔ کیونکہ زور سے جواب اسی کو دینا چاہیئے جسکی سلامتی کے لئے انسان کچھ کام بھی آسکے دوچار ہی ایسے آدمی ہیں جن سے باواز علیک سلیک ہوتی ہے سو ان کے دکھ درد میں اپنے دکھ درد کی طرح شریک ہونا پڑتا ہے۔ ہر شخص کے ساتھ یہ معاملہ کیونکر نبھ سکتا ہے۔

خاندوراں خاں عہد مغلیہ کے امیر کبیر۔ ان کے پاس ایک سپاہی نوکری کی غرض سے آیا۔ خانصاحب بڑے چلبلے مزاج کے شخص تھے۔ جب منشی ملازموں کے رجسٹر میں اسکا نام درج کرنے لگا تو بولے "ان کی بیوی کا نام بھی پوچھ لینا" سپاہی نے نہایت سنجیدہ شکل بنا کر عرض کیا "خداوند نعمت! بیوی کا نام تو اسوقت ذہن سے اتر گیا۔ سالے کا نام کہئے تو بتلادوں" فرمایا "ہاں" اس نے ہاتھ باندھکر کہا "خاندوراںخاں" چپ رہگئے اور منشی کو حکم دیا "انکی اتنی تنخواہ مقرر کردو" سپاہی نے جواب دیا "حضور! بس مین سالے کی نوکری نہیں کرتا۔ السلام علیکم" یہ کہکر وہ تو چلا گیا مگر خاندوراںخاں کو تگ و دو ہوئی کہ یہ کون تھا اور کہاں رہتا ہے۔ آخر پتہ لگا کر اسکے مکان پر پہنچے۔ سپاہی موجود نہ تھا۔ اسکی بیوی سے کہا "مین تیرا بھائی ہوں۔ یہ روپئے رکھ اور اپنے خاوند سے کہدیجو کہ یہ میرا بھائی خاندوراںخاں دے گیا ہے" وہ بہت حیران ہوئی مگر ان کے کہنے سننے سے روپیہ رکھ لئے۔ اسوقت سے معمول کرلیا کہ چاند ہوا اور مقررہ رقم اسکے ہاں بھجوادی۔ اس طرح ایک زمانہ بیت گیا اور خاندوراںخاں کو کسی فوج کا سردار بنکر جنگ میں جانا پڑا۔ وہاں انھیں ناکامیوں پہ ناکامیاں ہوئیں۔ سپاہی کی بیوی نے کہا کہ ہم اپنے محسن کے کس دن کام آئیں گے۔ جاؤ اور کچھ کرکے دکھاؤ۔ سپاہی بھی بالکل تیار تھا بیوی کا کہنا اور اسکا روانہ ہونا۔ گیا اور ایسا بڑھ بڑھکر لڑا کہ جان جاتی رہی مگر خاندوراںخاں سرخرو اور فتحیاب دلی آئے۔ اسکے بعد سے انہوں نے بہن کے وظیفے کو دوچند کردیا اور اسکی زندگی تک اسکو تکلیف نہ ہونے دی۔

ایسی ہی خاندوراںخاں کی بیوی تھیں۔ کسی نے آکر خاندوراںخاں سے کہا کہ "مین آپکا ہم زلف ہوں۔" خاندوراںخاں اُٹھکر زنانخانہ میں آئے اور بیوی سے پوچھا کہ اس اس نام کا کوئی تمہارا بہنوئی ہے انہوں نے سوچکر جواب دیا کہ ہاں کبھی فلاں عورت بچپنے میں میرے ساتھ کھیلی تھی جسے مین نے بہن

کہہ لیا تھا یہ اسکا میاں ہوگا۔ قصہ مختصر خاندورانخاں نے اسے اپنا مصاحب بنا لیا۔ اور بات آئی گئی ہوئی اتفاقاً کچھ عرصے بعد پھر گھر میں اس شخص کا ذکر چھڑا۔ بیگم صاحب نے منہ بولی بہن کی خیر سلا دریافت کرائی اُسوقت اس نے کہا کہ میں نے تو صرف یہہ خیال کر کے اپنے تئیں ہم زلف کہا تھا کہ میرے گھر میں عسرت ہے اور خاندورانخاں کے ہاں نصرت۔ ورنہ میں نہ کسی کا خاوند اور نہ کوئی میری بیوی۔

دہلی کے ایک اور مشہور و معروف شخص کا ذکر ہے کہ کسی نوجوان پر فریفتہ تھے۔ محبوب کے لئے مکان گھوڑے جوڑے کا اعلیٰ انتظام کر رکھا تھا۔ راتدن میں صرف ایکدفعہ کھڑے کھڑے اسکے مکان پر جاتے اور اسکے رخسار پر اُنگلی رکھکر مزاج پرسی کرتے اور پھر چلے آتے۔ یہی وضع مدت العمر جاری رہی۔ عاشق و معشوق دونوں بڈھے ہوگئے مگر یہہ آنا جانا کبھی نہ چھوٹا آجکل کا سا تعلق نہ تھا کہ سویرے محبت ہوتی ہے اور شام کو دشمنی۔ الفت کے اظہار میں زمین آسمان کے قلابے ملجاتے ہیں اور جب ان بن ہوتی ہے تو پھر تو کون اور میں کون گویا کبھی کی شناسائی ہی نہیں غرض ہر چیز غیر مستقل ہر بات ادھوری اور چھچھوری۔ ناقص اور بے نیتجہ۔ اگلے وقتوں میں وضعداریاں بعض اوقات تکلیف دہ ہوجاتی تھیں مگر وضعدار لوگ لکیر کے فقیر بنے رہتے تھے اور اس سے دست بردار نہوتے تھے۔

سرسید (علیہ الرحمۃ) کے بڑے بھائی سید محمد مرحوم کا کسی صاحب سے دوستانہ تھا۔ سرسید انھیں اپنا بزرگ سمجھتے۔ ان کے گھر پر آتے جاتے تھے۔ جب سید محمد صاحب کا انتقال ہوگیا تب بھی یہ سلسلہ قایم رہا۔ لیکن دوست صاحب کسی بات پر سرسید سے ناراض ہوگئے اور ان کے ہاں آنا ترک کر دیا۔ سرسید بھی رُک گئے۔ اسکی اطلاع آپکی والدہ ماجدہ کو ہوئی انھوں نے نہایت افسوس کیا اور فرمایا کہ وہ اپنی وضع کو چھوڑتے ہیں تو تم ان کی تقلید نہ کرو۔ جاؤ اور ضرور جاؤ۔ سرسید نے ارشاد کی تعمیل کی۔

محمد الواحدی

فرایض مستورات

'The hand that rockes the cradle, rules the world."

دست بہ گہوارہ حکمرانِ عالم است

اس مصرعہ کو پڑھکر شاید ناظرین متعجب ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسکو واقعات کے خلاف بتائیں کیونکہ سلطنت کے کاروبار اور ملکی انتظامات مرد ہی انجام دیتے ہیں۔ مستورات صرف خانگی کاموں کو سنبھالتی ہیں۔ شاذونادر ہی کوئی ایسی عورت ہوگی جو ایسے کاموں میں مردوں کا ساتھ دیتی ہو۔ لہذا یہ فقرہ غلط ٹھہرا۔

میرے خیال میں مستورات اپنے ملک کی بنیاد کو پختہ

کرنے والی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسی عورت ہوگی جو اس شریف کام میں شریک نہیں ہوتی یا شریک نہیں ہو سکتی۔

مستورات کے فرائض کئی ہیں:۔

۱۔ والدین اور کُل خاندان کے متعلق۔

۲۔ خدا اور مذہب کے متعلق۔

۳۔ شوہر اور اپنی اولاد کے متعلق۔

۴۔ ملک اور اپنی قوم کے متعلق۔

شاید کوئی اعتراض کرے کہ والدین سے متعلقہ فرائض کا درجہ کیوں پہلا رکھا گیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ بچہ ہمیشہ اپنے والدین پر کامل ایمان اور بھروسہ رکھتا ہے۔ وہ شروع سے اپنے والدین ہی کو پیار کرتا ہے، جبکہ وہ خدا اور مذہب کو بالکل جانتا بھی نہیں۔ جب والدین کی محبت اور فرمانبرداری اُس کے دل میں جگہ پکڑ جاتی ہے، تو رفتہ رفتہ اُس کے یہی تعلقات خدا سے قایم ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ اپنے والدین کے حکموں پر نہ چلے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا کے حکموں پر چلیگا جسکو اُس نے (بلکہ کسی نے بھی) کبھی دیکھا ہی نہیں۔ صدہا یتیم بچے ابتدا ہی سے بُرائی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ خُدا کا خوف اُن کے دل میں مطلق نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض دفعہ وہ اپنی بیکسی کی حالت کو دیکھکر خدا کو ملامت کرتے ہیں۔ لیکن اگر اُن کے والدین زندہ ہوتے اور شروع ہی سے اُن کو نیک تعلیم دیتے تو والدین کی محبت سے نمونہ حاصل کرکے خُدا سے بھی محبت رکھ سکتے اور اس طرح خدا کا خوف اُن کے دل میں قایم ہوتا۔

۱۔ لڑکی کا فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کی تعظیم و تکریم کرے، اور بدل و جان اُن سے محبت رکھے۔ والدین کی عزت کرنا اور اُن کے حکموں پر چلنا، ہندوستان کی کیا بلکہ تمام دنیا کی پُرانی اور عام تعلیم ہے۔ یہی وہ وقت ہے جبکہ سیرت بنتی ہے اور اسی پر ہماری آیندہ زندگی کے خوشی اور غم کا انحصار ہے۔ عمر کا یہ حصہ بہت نازک ہوتا ہے۔ اگر اس میں لڑکیاں کامیاب نہوں تو ہماری آیندہ زندگی میں ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر لڑکیاں اپنا یہ پہلا فرض عمدگی کے ساتھ ادا کرینگی، تو دوسرے فرض کو آسانی کے ساتھ پُورا کرسکیں گی۔ والدین کے فرایض کے ساتھ اُستادوں اور اپنے دیگر بزرگوں کے متعلق جو فرایض ہیں، وہ بھی شامل ہیں۔

۲۔ دوسرا فرض خدا اور مذہب کے متعلق ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان میں یونیورسٹی کی تعلیم کو تو بہت ضروری خیال کیا جاتا ہے، اور اسپر زور بھی دیا جاتا ہے، مگر مذہبی تعلیم کا یہاں بہت کم خیال کیا جاتا ہے۔ جب مستورات ہی کو عام طور پر، مذہبی رسومات میں شامل نہیں کیا جاتا تو بھلا لڑکیوں کا کیا ذکر؟ یہ بالکل نادرست ہے۔ اگر وہ اپنے مذہبی فرایض کی طرف سے لاپروا اور سُست ہو جائینگی، تو یقین جانئے کہ اُن کے ہر ایک کام میں یہی سُست رفتاری پائی جائیگی۔ علم سے انسان میں صرف شرافت ہی نہیں آجاتی، بلکہ اُس کے دل میں خدا کا خوف (جو دانائی اور شرافت کا مادہ ہے) بھی پیدا ہوتا ہے۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم و تربیت ایسی ہو کہ یہ خوف قایم رہے۔ اعتراض ہو سکتا ہے کہ عورت ذات کو عقلمند بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کا جواب میں اپنے گذشتہ مضمون میں دے چکی ہوں۔ مگر اتنا پھر بھی کہونگی کہ اگر عورتوں کو دانائی اور شرافت کی ضرورت نہیں، تو مردوں کو اسکی کیا ضرورت ہے!

جس طرح مرد کے لئے عقلمند اور نیک ہونا ضروری ہے، اسی طرح (بلکہ اس سے زیادہ) عورتوں کو بھی اسکی ضرورت ہے۔

نیک نہادی، شرافت، دانائی، عقلمندی وہ زیورات ہیں، جنکے بغیر کوئی عورت خوبصورت نہیں گنی جاسکتی۔ اور یہہ زیورات صرف اخلاقی، مذہبی اور روحانی تعلیم کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتے ہیں

۳۔ عورت کا فرض اپنے شوہر اور اپنی اولاد کے متعلق۔ درستی کے ساتھ اس کا بیان شادی شدہ مستورات یا اُن کے شوہر ہی کرسکتے ہیں۔ اس کے متعلق میرا کچھ لکھنا زیادہ مفید نہ ہوگا۔ تاہم اتنا کہنے کی جرارت کرتی ہوں کہ نیک بخت عورت اپنے شوہر کے تابع رہتی، اسکی عزت کرتی، اُس سے محبت رکھتی، اور اسکی خدمت کرتی ہے۔ نیز اپنی اولاد سے صرف محبت ہی نہیں رکھتی، بلکہ اُسے نیک تعلیم بھی دیتی ہے۔ جس عورت میں یہ خوبیاں موجود ہوتی ہیں، ملک اور قوم پر اسکا بڑا اثر ہوتا ہے اور اُس اثر سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔

۴۔ ملک و قوم کی نسبت مستورات کے کیا فرائض ہیں؟

اس جگہ پر پیشانی کا انگریزی فقرہ دہرانا کچھ ناموزوں نہیں ہوگا:۔

The hand that rocks the cradle, rules the world

اگر اس فقرہ پر غور سے نظر ڈالیں تو واضح ہوگا کہ اس ذرا سے جملے میں کس قدر معنی بھرے ہوئے ہیں۔ کیا یہ نادرست ہے کہ ماں کا وہی ہاتھ جو ایک چھوٹے گہوارہ کو سنبھالتا ہے، تمام ملک کا بوجھ بھی سنبھال سکتا ہے؟ میں کہتی ہوں کہ سنبھال سکنا کیا معنی، سنبھالتا ہی ہے۔ ماؤں کی نیک تعلیم و تربیت اور اُن کے اثر سے غریب لڑکے بھی صاحب جاہ و جلال، بڑے رتبہ والے اور اپنے ملک کے لیڈنگ ممبر یا رہنما ہوجاتے ہیں۔ میدان جنگ میں سپاہی کس دلیری کے ساتھ غنیم کی فوج کا مقابلہ کرتا ہے کیوں وہ اپنی جان کو موت کے حوالے کردیتا ہے۔ وہ کونسا جوش ہے جو اُسے لڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اپنے ملک کی عورتوں کی عزت و حرمت اور اُن کی محبت کا خیال اُس کے دل میں ایک دلیرانہ جوش پیدا کردیتا ہے۔ کیا ہی سچ کہا ہے کہ

"The power behind the gun is woman."

ہندوستان میں ماں باپ لڑکیوں کو محض زیور ایسا سمجھتے ہیں۔ انہیں لڑکوں کی طرح عمدہ موقع نہیں دیتے کہ وہ کچھ سیکھ سکیں۔ اور اس پر یہہ غضب کہ اُن کو ناکارہ بتایا جاتا اور بہت سی بُرائیاں اُن کی ذات سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ذرا لڑکیوں کو بھی کچھ سیکھنے کا موقع دیں تو معلوم ہو کہ کس میں زیادہ خوبیاں ہیں۔ اگرچہ پولیٹیکل نظر سے اُن کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے، لیکن جو طاقت وہ اپنی روزانہ زندگی میں صرف کرتی ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔

عورت کی طاقت نہایت ہی عجیب اور زوردار ہے۔ وہ سمندر کی طرح عمیق اور اٹل ہے، مگر دریا کی طرح بہنے اور تبدیل ہونے والی ہے۔ اُس میں ہوا کی مانند ہلکاپن اور لچلچاہٹ پائی جاتی ہے، مگر وہ طوفان کی طرح تیز و غالب آنیوالی ہے۔ مرد ہزار کوشش کرے کہ اسکی حکومت سے آزاد ہوجائے مگر ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ قوم کی سیرت بادشاہوں یا مقننوں سے نہیں بنتی بلکہ عورتوں سے بنتی ہے۔ ہر ایک زمانہ میں عورت کی بزرگی اور حکومت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ سپاہی میدان جنگ میں اپنی پیاری بیوی، اپنی بیٹی، اپنی بہن، یا اپنی ماں کی عزت و محبت کا خیال کرکے دلیری حاصل کرتا ہے۔ بڑے بڑے بادشاہوں نے صرف کسی عورت کو حاصل کرنے کے لئے کیسے بڑے بڑے کام کئے ہیں گویا کسی عورت کی حضوری کو معلوم کرکے اور بھی زیادہ سُریلی آواز سے الاپتا ہے۔ عورت کی تصویر کھینچنے میں مصور اپنا تمام زور قلم صرف کرڈالتا ہے۔ جہاز ران محض عورت کے لئے دُور

دراز کا سفر اختیار کرتا اور مصیبتیں جھیلتا ہے۔آزاد خیال بھی اپنی زندگی، اپنے زمانہ، یا اپنی قسمت کی پوشیدہ باتوں سے عاجز آکر اُسی کی صحبت میں راحت پاتا ہے۔درویش بھی اس کے سامنے آتے ہی اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ان مثالوں سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ عورت کی طاقت سے کس قدر کام ہوتے ہیں۔

عورت کی خوشی کا خیال آدمیوں کو سرسبز اور کامیاب بناتا ہے، لیکن جب اسکی ناراضگی کا خیال آجاتا ہے تو وہ مرجھا جاتے ہیں۔جبتک عورت کی مدد شامل حال نہو، مرد تمام برکتوں سے محروم رہتا ہے۔اگر عورت سچی اور وفادار ہے تو مرد کی زندگی "خوشی کی زندگی" ہے اور سخت مصیبت کے وقت بھی وہ راحت پاسکتا ہے۔نامعلوم طور پر مرد پر اسکی حکومت قایم رہتی ہے۔اگر مرد پر اسکی حکومت نہو تو اسکی تمام خوشیاں جاتی رہتی ہیں۔وہ ناامیدی کے سمندر میں غوطے کھانے لگتا ہے۔

پس جبکہ عورت کا اثر اس قدر بڑا ہے تو کیا اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ زیورِ علم سے آراستہ ہوں؟ نہایت ہی افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان میں عورت کو بالکل ناچیز و نالایق سمجھا جاتا ہے۔کیا آپ نے دنیا کی کسی تاریخ میں پڑھا ہے کہ قادرِ مطلق نے عورت اور مرد کو علیحدہ علیحدہ کام دیئے کہ تم کھانا پکاؤ، چکی پیسو، اور تم پڑھو لکھو اور علم سیکھو۔اگر عورت خانگی کام انجام دیتی ہے تو یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ وہ اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔میرا خیال ہے کہ اسکا یہ فعل اُس کے نیک بخت اور محبتی ہونے کی دلیل ہے کہ وہ اپنی طاقت کو اسطرح دوسروں کی خدمت میں صرف کرتی ہے۔مردوں کو مناسب نہیں کہ اسکی کمزوری اور حلیمی اور محبت سے فائدہ اُٹھا کر اپنی فوقیت اور برتری ثابت کریں۔

آر۔ظہور الدین

عالیجناب یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد بالقابہم مدارالمہام ریاست نظام

مہاراجہ بہادر ریاست حیدرآباد دکن کے وزیر اعظم ہیں۔۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔اس حساب سے انکی عمر اسوقت ۴۸ سال کی ہے۔ریاست حیدرآباد علمی سرپرستی کے لئے ہمیشہ مشہور رہی ہے۔آپ کی ذات بابرکات میں بھی یہ وصف پایا جاتا ہے۔آپکا لٹریری مذاق نہایت ستھرا ہے۔اُردو و فارسی کے علاوہ انگریزی اور عربی میں بھی اعلیٰ درجہ کی دستگاہ رکھتے ہیں۔اردو زبان میں آپ کی کئی نادر تصنیفات شایع ہوچکی ہیں، اور آپکا کلام حُسن تخیل کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے۔فارسی نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔فن ناول نویسی میں بھی کافی مہارت ہے، چنانچہ "فسانۂ رشید" کے نام سے ایک ناول شایع ہوچکا ہے جسکی زبان نہایت پاکیزہ ہے۔مہاراجہ بہادر کی علم دوستی کا اس سے بہترین ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ باوجودیکہ ایسے جلیل القدر عہدہ کی خدمات آپ کے سپرد ہیں تاہم آپکا علمی شغل برابر جاری ہے۔

معاونین ادیب یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ مہاراجہ بہادر کا کلام ادیب کو بھی اشاعت کی غرض سے عنایت فرمایا گیا ہے۔بالفعل صفحۂ مقابل پر ایک نظم درج کی جاتی ہے۔ناظرین ملاحظہ فرمائیں اور آپکے اعلیٰ صوفیانہ خیالات سے مسرت اندوز ہوں۔



عالیجناب یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد بالقابہم
مدارالمہام ریاست نظام

انڈین پریس الہ آباد

تضمین

از افکار گہربار عالیجناب مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد باقابہم
مدار المہام ریاست نظام

پرتو ذاتِ احد جلوہ سرِ عجبی — روکشِ مہرِ حقیقت تو چہ عالی نسبی
چہ کنم وصفِ تو اے ہاشمی و مطلبی — مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

از وجودِ تو شدہ جامۂ احرامِ عدم — چشمہائے تو نمودہ اثرِ لاؤنعم
از خرامِ تو بود رونقِ گلزارِ ارم — من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی

دردِ عشقِ تو بدل باد مرا اے دلبر — باد سودائے از آں زلفِ معنبر در سر
باد تصویرِ تو در دیدہ مرا شام و سحر — چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی

گرچہ گویند براقت ز سرِ خاک گذشت — کس نداند مگر از دانش و ادراک گذشت
وہ چہ در چشم زدن صاحبِ لولاک گذشت — شبِ معراج عروجِ تو ز افلاک گذشت
بمقامے کہ رسیدی نرسد ہیچ نبی

جلوۂ حق چو شدی اے شہ والا درجات — گشت پیوستہ بیک آئینہ ذات و صفات
حبذا برزخِ کبرای سکون و حرکات — ما ہمہ تشنہ لبانیم تو ئی آبِ حیات
رحم فرما کہ ز حد میگذرد تشنہ لبی

ساقیِ کوثر و تسنیم عطا کن یک جام — تا بمانم ز مئے عشقِ تو سرمست مدام
حسرتِ لذتِ آزار شود نیک انجام — نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

کیمیا ہست حیاتِ تو بنی آدم را — زندگی ہست ثباتِ تو بنی آدم را
حق کجا داد صفاتِ تو بنی آدم را — نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی

شد نہ اوصافِ تو تحریر ازیں رو خجلم — بے گلِ مدحِ تو چوں غنچہ فسردہ است دلم
اللہ اللہ کجائی و کجا آب و گلم — نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگِ کوئے تو شد بے ادبی

چشمِ بد دور ز رویت شدہ عالم پر نور — ہست مشتاقِ جمالِ تو چہ انسان و چہ حور
بر فلک عیسیٰ و موسیٰ بہ تمنا سرِ طور — ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

یا نبی مونسِ جان و دلِ عشاق تو ئی — خاکِ راہِ تو شوم ہست تمنائے دلی
شاد ہر وقت کند ذکرِ تو ہمچوں قدسی — سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

موسم گرما

(ماخوذ از "رتو سنگھار" مصنفہ مہاکوی کالی داس)

آگئی گرمی کی رت پھر اے نگارِ نازنیں! — شعلہ جوالہ ہے پھر موجِ آغوشِ زمیں
دھوپ میں تیزی شعاعوں میں شرارت بڑھ چلی — پھر ہوا کے تند جھونکوں میں حرارت بڑھ چلی
چاندنی راتوں کی ہے پھر دید کے قابل بہار — پنکھیاں پھولوں کی جھلتی ہے نسیمِ خوشگوار
ٹھنڈی ٹھنڈی سطح پر دریا کے ہے قمر کی روشنی — شب کے دامن میں ہے کافورِ سحر کی روشنی
تھے بہ رنگِ دیدۂ عشاق جو چشمے پر آب — اڑ رہی ہے خاک ان میں صورتِ موجِ سراب
ہو چلی ہے سرد دل میں آتشِ ہیجانِ شوق
وصل کی اب وہ امنگیں ہیں نہ وہ سامانِ شوق

یہ وہی موسم ہے جس میں ہے عجب لطفِ بہار — گرمیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی ہے خوشگوار
صندل آلودہ ہے اس رت میں حسینوں کی جبیں — دوش پر بکھرے ہوئے گیسو میں ہار صندلیں

آسماں پر مہ جبینوں کا دماغِ حُسن ہے ‏ ‏ جو پسینے کا ہے قطرہ شب چراغِ حُسن ہے
گھولتے ہیں قند لعلِ شکریں سے نازنیں ‏ ‏ میٹھی باتوں میں ٹپکتا ہے زباں سے انگبیں
دید کے قابل ہے ناز و بے نیازی کی ادا ‏ ‏ سُرمگیں آنکھوں میں ہے افسوں طرازی کی ادا
بین کے نغموں کی ہے آواز کتنی دل نواز ‏ ‏ درد کا ہے کچھ اثر، کچھ لذتِ سوز و گداز
ہلکے ہلکے ہیں دوپٹے صندلی زیبِ بدن ‏ ‏ عنبر افشاں، عطرِ صندل سے ہے زلفِ پُر شکن
قابلِ نظارہ ہے رنگیں اداؤں کی بہار ‏ ‏ بدھیاں ہیں دوش پر گردنیں ہیں پھولوں کے ہار
اک طلسمِ دلربا ہے عالمِ نیرنگِ حُسن ‏ ‏ پھُوٹ نکلا ہے عجب دلکش ادا سے رنگِ حُسن
دل کو ملتی ہے دمِ رفتار تلوؤں کی حنا ‏ ‏ اُس پہ پازیبوں کی، سونے میں سہاگا ہے صدا
شوخیِ تقریر میں ہے اک ادائے دلفریب ‏ ‏ جسطرح منسوں کے نغموں کی صدائے دلفریب
ہر ادائے دلربا میں نازِ معشوقانہ ہے ‏ ‏ سادگی میں بھی عجب اندازِ معشوقانہ ہے
یوں پسینے کے ہیں قطرے عارضِ گل رنگ پر ‏ ‏ جسطرح پھولوں پہ شبنم کا سماں وقتِ سحر
صندلِ تر سے ہیں پھولوں کی معطر پنکھیاں ‏ ‏ جنکی جنبش سے ہے موجِ بوئے گل با دِ وزاں
آہ! یہ عالم فریبی یہ ادائے دلفریب ‏ ‏ بین کے نغمونکی اُف اُف! یہ صدائے دلفریب
جانفزا ہے کتنا عالم ہر صدائے ساز کا ‏ ‏ ہر ترانہ نے اثر پیدا کیا اعجاز کا
کچھ عجب لطفِ ترنم بین کی تانوں میں ہے ‏ ‏ شوق کا اک حشر برپا دل کے ارمانوں میں ہے
مہ جبینوں کا ہے دلکش طرز ہر شیخ و شاب ‏ ‏ اُس پہ اک چلتا ہوا جادو ہے آغازِ شباب

گورے گورے چاند سے چہروں کا عالم دیکھکر
زرد پڑ جاتا ہے خجلت سے قمر وقتِ سحر

آہ! وہ تفتیدگانِ آتشِ سوزِ فراق ‏ ‏ کر چکے ہیں کام جن کا شعلہ ہائے اشتیاق
وہ وطن کے خانماں برباد جو غربت میں ہیں ‏ ‏ جلنے والے روز و شب جو آتشِ فرقت میں ہیں
دُھوپ کی وہ بھی تمازت سے ہیں گھبرائے ہوئے
ہیں زبانیں خشک اور چہرے ہیں سنولائے ہوئے

اب کہاں بادِ صبا میں وہ ادائے دل نواز ‏ ‏ خاک اُڑاتی پھرتی ہے ہر سو سمومِ جانگداز
وہ روانی دامنِ صحرا کے نالوں میں کہاں ق ‏ ‏ شوخیاں دلکش وہ اگلی سی غزالوں میں کہاں
خشک لب میں پیاس سے ہونٹوں پہ ہے جانِ حزیں ۲ ‏ ‏ اور بیاباں میں کہیں اک بُوند پانی کی نہیں
سطحِ گردوں کو سمجھ کر چشمۂ آبِ رواں ۳ ‏ ‏ تک رہے ہیں دیدۂ حسرت سے ہو کر نیمجاں
دُھوپ سے ایسے ہیں گھبرائے ہوئے مارِ سیاہ ‏ ‏ بازوئے طاؤس کے سایہ میں لیتے ہیں پناہ
دشت میں شیروں پہ ہیبت ایسی ہے چھائی ہوئی ق ‏ ‏ پھرتی ہے قالب میں جانِ زار گھبرائی ہوئی
پیاس کی شدت سے ہیں غاروں میں سرگرمِ خروش ۲ ‏ ‏ ہو چلا ہے آتشِ غیظ و غضب کا سرد جوش
سامنے ہو کر گذر جاتے ہیں پیلانِ دماں ۳ ‏ ‏ کیسا حملہ، ضعف سے اب جست کی طاقت کہاں

دُھوپ کی شدت سے یوں آتش بجاں طاؤس ہیں
بازوئے زریں نہیں ہیں، شعلۂ فانوس ہیں

دلفریبی کا وہ عالم سبزہ زاروں میں کہاں ‏ ‏ وہ روانی دشت و در کے آبشاروں میں کہاں
اب کہاں وہ سبزۂ نوخیز کی دلکش لہک ‏ ‏ اب کہاں وہ دامنِ صحرا میں پھولونکی مہک
دوڑتے پھرتے ہیں بیتابانہ شعلے آگ کے ‏ ‏ ہیں حریفِ شوخیِ پروانہ شعلے آگ کے
یوں لیے شعلوں کو ہے آغوش میں اک اک شجر ‏ ‏ جس طرح بجلی گرے ابرِ سیہ سے ٹوٹ کر
بڑھکے پہنچے شعلے تیزی سے نیستاں کے قریب ‏ ‏ مشتعل ہیں اب کسی وادی کے داماں کے قریب

ٹھُنڈ کچھ سُوکھے ہوئے آتے ہیں صحرا میں نظر
چونچ کھولے جس پہ دم لیتی ہیں چڑیاں بیٹھکر

یوں تو صحرا کے مناظر ہیں غضب کے ہولناک ‏ ‏ اُڑ رہی ہے چار سُو سے دشت کے دامن میں خاک
کتنے نظارے ہیں اس موسم کے پھر بھی خوشگوار ‏ ‏ کتنی دلکش ہے کنول کے سُرخ پھولوں کی بہار
کتنا منظر ہے سکوتِ شام کا تسکیں فزا ‏ ‏ چاند کی کرنوں کی کتنی پیاری پیاری ہے ادا
کس قدر لذت فزا ذوقِ سماع ساز ہے ‏ ‏ کتنا دلکش مہوشوں کے حُسن کا انداز ہے

موسمِ گرما کی ہے کیا روح پرور چاندنی
مرہمِ کافور ہے زخمِ جگر پر چاندنی

شاکر

کلام اکبر

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے — خدا ہی خوب واقف ہے کہ کس پر کیا گذرتی ہے
نئے عنصر نہیں آتے چمن میں گل کھلانے کو — یہی ذرے ابھرتے ہیں یہی مٹی سنورتی ہے
وہ دو ذرے بلا اذنِ خدا مل ہی نہیں سکتے — کہ جنکے میل سے سائنس کی قوت ابھرتی ہے
جو ہیں اہلِ بصیرت اکثر آنکھیں بند رکھتے ہیں — نظر اچھے دلوں کو بھی کبھی بدنام کرتی ہے
زبانیں مختلف بھی ہوں اگر دو حق پرستو نکی — بہم بنہ جاتی ہے نیت کی خوبی کام کرتی ہے

فضول بحث میں وقت اپنا کھو نہیں سکتا — زیادہ اب شبِ غفلت میں سو نہیں سکتا
گذر گیا دلِ دنیا پسند دنیا سے — اس انجمن کا میں اب رکن ہو نہیں سکتا

طامع کو گدا پایا قانع کو غنی دیکھا — اوروں کی نہیں کہتے ہم نے تو یہی دیکھا
عقدے بھی کھلے تجھسے منظر بھی نظر آئے — آنکھیں بھی کبھی کھولیں دل کو بھی کبھی دیکھا

پروانہ و دل

دلِ شیدا سے پروانے نے جل کر — سرِ محفل کہا آنکھیں بدل کر
چلے تو ہو میاں گھر سے نکل کر — قدم الفت میں رکھیئے گا سنبھل کر
ہزاروں تم سے مجنوں ہو چکے ہیں — نثارِ زلفِ شبگوں ہو چکے ہیں
رموزِ عاشقی کی ہے خبر بھی — نہ کھولے راز اسکے عمر بھر بھی
نہ ظاہر ہو کبھی دردِ جگر بھی — نہ لب پر آسکے آہوں کا اثر بھی
زباں پر شکوۂ بیداد کیوں ہو — کلیجہ تھام کر فریاد کیوں ہو
کہا کس نے ہے دیوانے بنو تم — کسی کی زلف کے شانے بنو تم
اگر عاشق ہو پروانے بنو تم — ہماری طرح مردانے بنو تم
محبت میں تڑپ کر جان کھونا — جمالِ یار کے ہمرنگ ہونا
دلِ شیدا بھی پروانے کی سن کر — پکارا عاشقی کا دم ہے گھر
شرابِ بیخودی سے مست ہوں مین — جہاں میں نیست ہو کر ہست ہوں مین
پتنگا ہوں ذرا سا پست ہوں مین — مگر الفت میں جا بک دست ہوں مین
ہوا آغاز میں انجام میرا — رہے گا عاشقوں میں نام میرا
کسی کا نور ہے آنکھوں میں میری — سحر کا نور ہے آنکھوں میں میری
چراغِ طور ہے آنکھوں میں میری — سراپا حور ہے آنکھوں میں میری
اڑا پھرتا ہوں شوقِ عاشقی میں — فنا فی اللہ ہوں ذوقِ عاشقی میں
نہ بلبل کی طرح نالاں چمن میں — نہ مجنوں کی طرح پھرتا ہوں بن میں
لگی رہتی ہے میری لو لگن میں — نظارے دیکھتا ہوں انجمن میں
قریبِ شمع چکر مارتا ہوں — درِ جاناں پہ ٹکر مارتا ہوں
پریشاں حال ہوں آفت رسیدہ — جگر افگار دل سوز و تپیدہ
ازل سے حسن و خوبی کا ندیدہ — مذاقِ عشق کا لذت چشیدہ
حیا پرور سراپا شرم ہوں مین — تلاشِ یار میں سرگرم ہوں مین
نہیں افشا کسی پر راز میرا — بھرا کرتے ہیں دم جانباز میرا
رفیق و ہمدم و دمساز میرا — اڑا دے گا پر پرواز میرا
دکھا دونگا جلا کرتے ہیں کیونکر — محبت میں جلا کرتے ہیں کیونکر
دلِ شیدا مجھے آتی ہنسی ہے — تمہاری عاشقی بھی دل لگی ہے
غضب کی بیقراری بیکلی ہے — قضا ہر دم سرِ بالیں کھڑی ہے
لبوں پر جان ہے آنکھوں میں دم ہے — مگر مرنے کی تمکو بھی قسم ہے
جو مرتے ہو تو زلفِ یار پر تم — فدا ہو ابروئے خمدار پر تم
کسی کے چاند سے رخسار پر تم — کسی کے نازِ پُر رفتار پر تم
فنا ہونا نہیں آتا ہے بالکل — مچاتے پھر رہے ہو درد سے غل
بڑھا کر نالۂ آتش فشاں کو — اٹھا رکھا ہے سر پر آسماں کو
عیاں کرتے ہو کیوں دردِ نہاں کو — ذرا اعتا مو ذرا رو کو زباں کو
بہت آساں ہے داماں چاک کرنا — مگر مشکل ہے خود کو خاک کرنا
دلِ شیدا بھی پروانے کی سن کر — پکارا عاشقی کا دم ہے گھر

نہ ہو آپے سے باہر بندہ پرور   چڑھے جاتے ہو کیوں شمع کے سر پر
ادب آموز تم بالکل نہیں ہو   ہمہ تن سوز تم بالکل نہیں ہو
نبھے گی آپ سے کیونکر ہماری   تمھیں ہے وصل ہمکو انتظاری
ہمیں ہے سینہ کاوی دلفگاری   تمھیں ہر دم ہے شوقِ جاں نثاری
کہاں کی آشنائی کر رہے ہو   مقدر آزمائی کر رہے ہو
رُخِ روشن کو دیکھا بھی نہیں ہے   اُٹھا آنکھوں سے پردا بھی نہیں ہے
چراغوں کا تماشا بھی نہیں ہے   ضیائے حُسن آرا بھی نہیں ہے
لگے بیتابیوں سے تلملانے   شبِ عشرت میں بے پر کی اُڑانے
مزا جب تھا نظر بھر بھر کے جاتے   رُخِ پُرنور تک ڈر ڈر کے جاتے
محبت کے قدم دھر دھر کے جاتے   تڑپ کر لوٹ کر مر مر کے جلتے
ستم سہتے چپک رہ رہ کے اُٹھتی   کلیجہ میں کھٹک رہ رہ کے اُٹھتی
ہمیں دیکھو سراپا درد ہیں ہم   تپِ سوزِ نہاں سے زرد ہیں ہم
پراگندہ مثالِ گرد ہیں ہم   مصیبت جھیلنے میں مرد ہیں ہم
شہیدِ تیغِ ابروئے صنم ہیں   اسیرِ دامِ گیسوئے صنم ہیں
ہمیں ہے وصل سے بہتر جدائی   نرالی ہے ہماری آشنائی
کھٹک جاتی ہے طرزِ دلرُبائی   کسی کی بے وفائی کج ادائی
نگاہِ ناز کے تیروں کے صدقے   خمِ ابرو کی شمشیروں کے صدقے
جمالِ حسن سے بے ہوش رہنا   خیالِ یار میں روپوش رہنا
کبھی ہے شکلِ شمع خاموش رہنا   کبھی دیوانگی کا جوش رہنا
فنا ہونا حقیقت میں بقا ہے   مگر اپنی بقا میں بھی فنا ہے
مجھے کہتے ہیں سب انسان کا دل   جمالِ حُسنِ لیلےٰ کا ہوں محمل
مرے دم سے جما کرتی ہے محفل   نہ کر دعویٰ تو مجھ سے مقابل
سمائی شمع ہے تیری نظر میں   تجلّی اور ہے میری نظر میں
بڑھی دل اور پروانے کی تکرار   یہ دیوانے سے دیوانے کی تکرار
جنابِ عشق کے آنے کی تکرار   ہوئی دربار میں جانے کی تکرار
برستا نور تھا محفل میں چھن چھن   ادھر جاناں اُدھر تھی شمع روشن
خلیق اپنا بیاں دونوں نے سر سے   سُنایا کچھ ادھر سے کچھ اُدھر سے
یکایک عشق کے جذبِ اثر سے   دُوئی کا اُٹھ گیا پردہ نظر سے
جمالِ شمع میں جاناں سمایا   دلِ شیدا کو پروانہ بنایا

خلیق دہلوی

ماہِ تاباں

چرخ پر کس کا چراغِ انجمن روشن ہوا   نور سے جسکے مرا بیت الحزن روشن ہوا
چاندنی گلگشت کو اُتری چمن روشن ہوا   آشیانِ عندلیبِ نغمہ زن روشن ہوا

مرحبا اے ماہِ تاباں! حبذا اے چاندنی
دیر باش اے ماہِ تاباں! خوش بیا اے چاندنی

او مہِ تاباں! ترا کب سے تماشائی ہوں میں   تیرے جلووں سے جنوں بڑھتا ہے سودائی ہوں میں
سر بسر وارفتۂ شانِ دل آرائی ہوں میں   حُسنِ دلکش کی قسم! تیرا تمنائی ہوں میں

شاہدِ اوجِ فلک! ہاں مُسکرائے جا یونہی
اور مجھکو پیکرِ حیرت بنائے جا یونہی

تھا کبھی تو ایک جادو کا کھلونا ہائے ہائے   وہ نظر آنا ترا - حاصل نہ ہونا ہائے ہائے
رات کو پہروں مچلنا اور نہ سونا ہائے ہائے   نیند کی وادی میں آخر تجھکو کھونا ہائے ہائے

وہ ہجومِ ذوقِ پنہانی دلِ بیتاب میں
تیرے پیچھے اُڑکے جانا - آسماں پر - خواب میں

تجھکو خالق نے بنا کر آہ! پُتلا نور کا   نور کی خلعت عطا کی اور سراپا نور کا
دیدیا تاروں کا جھومر یعنے گہنا نور کا   اور نورانی گلے کا زیب ہالا نور کا

حسن والا کونسا تجھ سے کرے گا ہمسری
ماہِ تاباں! اور ہے کچھ تیری شانِ دلبری

روح پرور کس قدر ہے اُف! یہ تیری چاندنی   پاک سازِ چشم و دل ہے صاف سُتھری چاندنی



نواب مرزا سعید الدین احمد خاں صاحب طالب دہلوی جاگیردار لوہارو

انڈین پریس الہ آباد

بہ گئے چاندی کے دریا جبکہ نکھری چاندنی پیاری پیاری۔ اُجلی اُجلی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی

موہنی مورت نے پایا کیا مزاجِ نرم ہے
اے حسینانِ تکبر خو! مقامِ شرم ہے

دیکھتا ہے کس نظر سے آہ ہیئت داں تجھے ہے بنا دیتا وہ ظالم کرۂ ویراں تجھے
کیوں بتائے اک تعلق۔ گول کوہستاں تجھے اسکے کہنے سے مگر کیا اے مہِ تاباں تجھے

اسکی باتوں سے تری رونق بھلا کیونکر ہو ماند
یہ مثل ہے "خاک ڈالے سے کہیں چھپتا ہے چاند"

تجھکو یہ الزام بھی ملتا ہے اے روشن عذار روشنی مانگی ہوئی ہے۔ حسن تیرا مستعار
اُنکے طعنوں سے نہ کر تو اپنے دل کو داغدار ہاں اسی قانون پر ہے ساری دنیا کا مدار

وہ بھی لیتا ہے کسی سے۔ جس سے تو لیتا ہے نور
اور ہے وہ نور والا سب کو جو دیتا ہے نور

چاند سورج جسکے لاکھوں ہیں۔ ستارے بیحساب کتنے ساکن ہیں ہیں۔ کتنے ہیں سرگرم شتاب
ہے ضیا جنکی انوکھی۔ حسن جن کا لاجواب تیری صورت کے بھی ہیں اُنمیں کئی اے ماہتاب

نور کا مخزن ہے اک سبکو دئے جاتا ہے نور
وہ سراپا نور ہے دنیا میں پھیلاتا ہے نور

آہ! پھر اس خاکدانِ تیرہ میں ظلمت ہے کیوں؟ سایۂ عصیاں سے کالی رات کی صورت ہے کیوں؟
بحرِ ہستی میں بپا طوفانِ پُر آفت ہے کیوں؟ کیوں جہازِ عمر چکراتا ہے؟ یہ ہیبت ہے کیوں؟

کیوں یہ حسرتناک چیخیں ہیں؟ یہ کیسا شور ہے؟
بڑھتا جاتا کیوں مصیبت کی گھٹا کا زور ہے؟

تو کدھر ہے آہ! اے حسنِ ازل کے ماہتاب کب تلک اوڑھے رہیگا منہ پہ دامانِ سحاب
خانۂ دل ہو نہ جائے اس اندھیرے میں خراب ڈالدے کوئی شعاعِ شفقت آلودہ شتاب

تیرے جلوے کاش! ہو جائیں قریبِ چشمِ دل
خوابِ غفلت ہو نہ پھر ہرگز نصیبِ چشمِ دل!

تلوک چند محروم

تازہ غزلیں

نواب مرزا سعید الدین احمد خاں صاحب بہادر طالب

یہ دل کسی نہ کسی وجہ داغ دار رہا ہزار شکر کہ یہ باغ پُر بہار رہا
صبا کی ضد سے جو اُڑتا تمام اغبار رہا بڑے عروج پہ یاروں میں خاکسار رہا
نہ لالہ زار رہا اور نہ سبزہ زار رہا کہ سیلِ اشک سدا صرفِ جوئے بار رہا
پلائی اتنی سبوں کو چھکا دیا ساقی رہا تو تشنہ مے مجھسا بادہ خوار رہا
وفا شعار فروتن جہاں سے مستغنی مدام شیوۂ مردانِ روزگار رہا
شکارگاہ میں آیا ہے گلچلا ہے کون کہ زخم سے نہیں خالی کوئی شکار رہا
تمام عمر کا ہے دردِ سر سے الفت یہ وہ نہیں کہ گھڑی دو گھڑی خمار رہا
جفائیں آپ کی مانا کہ بیحساب رہیں مگر ہماری وفاؤں کا کیا شمار رہا
خودی میں خود نہ رہے جب سے ہم خدا شاہد نہ کوئی غیر رہا پھر نہ کوئی یار رہا
ہمارے گریہ نے ٹھنڈا کیا کسی کا دل ذرا نہ سنگ میں باقی کوئی شرار رہا
نگاہ بھر کے جو تم دیکھتے رہے دل کو وہ مے فروش بنے اور یہ میگسار رہا
درود لاکھوں کروڑوں سلام ہوں اُسپر جو عفوِ اُمتِ عاصی کا خواستگار رہا
چلا ہے راستہ کترا کے دیکھ تو زاہد وہ میکدہ سے کوئی تجھکو ہے پکار رہا

نہ پھنستا دامِ محبت میں کب تلک طالب
وہ سادہ لوح بہت دن تو ہوشیار رہا

مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ

اُسی کا عکس ہے یہ بھی بہار آئی جو گلشن میں گریباں سے لگی تھی آگ وہ صحرا کے دامن میں
ہمیشہ خشک ہی دیکھا جنھیں صحرا میں گلشن میں وہی کانٹے اُبھکر رنگ لائے میرے دامن میں
ہمیں اس باغِ عالم میں بھلا درکار ہی کیا ہے بہت ہیں چار تنکے گھر کو صحرا میں کہ گلشن میں
ہمارے آشیانے سے بہارِ باغِ عالم ہے وہ دو تنکے ہیں یہ جنسے لگی ہے آگ گلشن میں
نہ کی سیرِ چمن ہم نے نہ کوئی پھول ہی توڑا چلے ویسے ہی گلشن سے کہ جیسے آئے گلشن میں

خزاں ہی ہمنے دیکھی باغباں جب سے کھلیں آنکھیں   کرینگے یاد کیا ہم بھی کبھی آئے تھے گلشن میں

مرے عیبوں کو کہتا ہے بڑا احسان کرتا ہے   ہزاروں خوبیوں کی ایک خوبی ہے یہ دشمن میں

مصیبت میں نہ کام آئے ہمیں دونوں برابر ہیں   سمجھ میں کچھ نہ آیا فرق کیا ہے دوست دشمن میں

عجب رنگِ زمانہ ہے عجب ہیوٹ کی باتیں ہیں   بظاہر فرق اب کچھ بھی نہیں ہے دوست دشمن میں

ہزاروں ہی لٹائے اور پھر بفائدہ تونے   نہ تھے گلچیں ہمارے نام کے دو پھول گلشن میں

ارے زاہد خدا سے ڈر مذمت اور اس منہ سے   صفت وہ کون ہے تجھ میں نہیں ہے جو برہمن میں

زہے قسمت عمل کی نیکیاں کام آگئیں اپنے   ملی ہے راحتِ آغوشِ مادر ہمکو مدفن میں

جو کوئی غور سے دیکھے تو کثرت عین وحدت ہے   نظر آتا ہے خوشہ میں وہی جو کچھ ہے خرمن میں

خزاں ہی باغباں اک ہو کا عالم ہے نہیں جب سے   ہمارے آشیاں کے چار تنکے تیرے گلشن میں

کرہت ہے نہ جادو ہے نظر کے ساتھ پھرتا ہوں   مگر نازک سا اک رشتہ محبت کا ہے گردن میں

اُٹھو حامد تمھیں کچھ ہوش بھی ہے کیا یہ عالم ہے   گریباں دھجیاں کرتے ہو تم صحرا کے دامن میں

تعلق باغ سے جبتک کہ تھا حامد پریشاں تھے
اکیلے چین سے بیٹھے ہیں اب صحرا کے دامن میں

منشی محمد عبد الحمید صاحب حمید میرٹھی

تمہارے قدِ بالا سے یہ کیوں جلتے ہیں گلشن میں   جہنم میں پڑے شمشاد جائے سرو گلخن میں

بہت ہیں داغِ دل گلچیں کہوں کیا جا کے گلشن میں   کہ میں اپنے ہی پھولوں کو بھرونگا اپنے دامن میں

جب انکا قدِ موزوں یاد آیا مجھکو گلشن میں   تو رو یا سرو سے میں ڈالکر ہاتھ انکو گردن میں

بہار آئی یس مردن مرے پھولوں کے گلشن میں   کہ آیا ہے ہنسکر پھول وہ گُل بزمِ شیون میں

تمہاری تیغ مقتل میں جوانمردوں سے لڑتی ہے   ابھی سے آگئیں بے باکیاں دو دنکی دلہن میں

صفائی کے ترے قائل ہیں اے دستِ جنوں ہم بھی   کفن کو بھی نہ چھوڑا تار باقی جیبِ دامن میں

نظر بازی ہی جب ٹھہری تو پھر نیچی نظر کیوں ہو   کھڑی کی ہے یہ تمنے کس لئے دیوار روزن میں

یہ میرے مارنے کو کس لئے سرمہ لگاتے ہو   بھرا ہے کوٹکر پہلے ہی جادو چشمِ پرفن میں

کلی چپ سرو ششدر دیدۂ نرگس ہے حیرت میں   یہ مستِ ناز کون اے باغباں آیا ہے گلشن میں

مرے سینہ میں پنہاں داغہائے دل سے گلشن ہے   صدائے نالۂ بلبل ہے مخفی میرے شیون میں

یہ اک انداز تھا انکا جفائیں اور ہیں باقی   نہ دیکھا ہائے کچھ بھی جا چھپے ہم کنجِ مدفن میں

تجلی جمالِ روئے جاناں نے جلایا ہے   بنانا چاہیئے مرقد ہمارا دشتِ ایمن میں

وہی سر ہے حقیقت میں رہی جو تیرے زانو پر   وہی ہیں ہاتھ اے ظالم پڑیں جو تیری گردن میں

جلن ہوتی ہے میرے داغہائے دل میں رونے سے   وہ غنچے اور ہیں کھلتے ہیں جو شبنم سے گلشن میں

کلیجہ تھام لیتا ہوں جو ٹھنڈی آہ بھرتا ہوں   چراغِ گور یا شمعِ سحر ہوں بزمِ دشمن میں

بٹھائیگا انہیں کون اب بھلا شفقت سے پہلو میں   مرے ہمراہ کردو زندہ ارماں دفن مدفن میں

ہوئے بے آبرو ہم جیسے جا کر دوست کی خاطر   نہ لیجائے خدا دشمن کو بھی یوں بزمِ دشمن میں

ہمارا ابتدا سے عشق بازی کھیل ہے یونہی   کہ اپنی جان پر کھیلا کئے برسوں لڑکپن میں

سرِ حشر آپکا لاکھوں میں پکڑا جائیگا دامن   ہماری بات ابھی سے باندھ لیجے اپنے دامن میں

نہیں گر آپکا جلوہ مری آنکھوں کے ڈھیلے ہوں   ہمیشہ چاہیئے نورِ نظر کچھ چشمِ روزن میں

خدا معلوم اُس کافر نے پھر ناکس سے سیکھا ہے   فلک ہمکو نظر آتا ہے اسکی چشمِ پرفن میں

جو اشک آتا ہے ڈر کر انیں چھپا لیتا ہوں میں اسکو   بھرے ہیں تول کر کانٹوں سے میں پھول دامن میں

مسی مالیدہ لب کا اور تری آنکھوں کا کیا کہنا   نہ یہ شوخی ہے نرگس میں نہ یہ رنگت ہے سوسن میں

یہ کہتی ہے کہ میں نکلوں وہ کہتا ہے کہ میں نکلوں   ہوا دستِ جنوں سے کیا جھگڑا جیب و دامن میں

ہنسا ہے بیکسی پر میری آکر غنچۂ لب کوئی
حمید آتی ہے بو پھولوں کی مجھکو اپنے مدفن میں

دیگر

نئی اک میرے دل کیواسطے الجھن ہے الجھن میں   تری چوٹی میں ہے موباف یا ناگن ہے ناگن میں

سرِ شوریدہ میں سودا ہے یا صحرا میں صحرا ہے   مرے سینہ میں داغِ دل ہیں یا گلشن ہے گلشن میں

وہ ظالم سامنے میرے عدو سے عید ملتا ہے   چھری پھرتی ہے یاں گردن پہ واں گردن ہے گردن میں

بتوں کے دل میں گھر کر جائے اے دل نالہ ایسا ہو   جو پتھر میں نہ اُترے وہ کوئی شیون ہے شیون میں

جھڑی باندھی ہے میری چشمِ تر نے مینہ برسنے پر   تماشا دیکھیے اک دوسرا ساون ہے ساون میں

وہ نازک ناتواں یہ رشتہ ہے مضبوط دونوں کا   تصور ہے مژہ کا دل میں یا سوزن ہے سوزن میں

تمہارے گیسو و رخ رکھتے ہیں وہ صلح کل مذہب   کہ شیخ و کافر بدکیش کا دامن ہے دامن میں

سجاد و تختۂ گلشن پہ تم گل کر مسی لب پر   زیادہ جسمیں ہو شوخی وہی سوسن ہے سوسن میں

ادھر میں سو رہا ہوں - مُعطّر ان ساتھ ہی　　لگا دیکھو کریں دوہری کہ یاں مفن ہی مدفن میں
پسِ پردہ ہیں وہ اور پھر حیا دیکھوں تو کیا دیکھوں　　یہ انکی نیچی نظرگاں اور بھی چلمن ہے چلمن میں

حمیدِ سوختہ دل جب تمہارا دوست ہی سچا
پھر اس سے ایٔ دن کس واسطے ان بن سی ان بن میں

مرزا واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی

نہیں معلوم کیسا سحر تھا اُس بت کی چتون میں　　چلی جاتی ہیں اب تک چشمکیں شیخ و برہمن میں
چھپیں گے کیا اسیرانِ بلا صحرا کے دامن میں　　محبت دام کی پھر کھینچکر لائیگی گلشن میں
کنارِ آبجو بیٹھے ہیں مستِ نکہتِ ساغر　　نظر سوئے فلک اور ہاتھ ہی مینا کی گردن میں
حجاب اُٹھا زمیں سے آسماں تک چاندنی چھٹکی　　گہن میں چاند تھا جبتک چھپے بیٹھے تھے چلمن میں
کنکھیوں سے جو ہمکو بزم میں تم دیکھ لیتے ہو　　کھٹک جاتے ہیں کانٹے کیطرح ہم چشم دشمن میں
یہ سب کشتِ ہوس مٹی ہی سرسبزی سے کیا حاصل　　گری برقِ فنا جسدم لگی بس آگ خرمن میں
ملادے خاک میں اے چرخ اس اُجڑے ہوئے گھر کو　　کہ اپنی روح تک بے چین ہے اب خانۂ تن میں
جو ہر دم جھانکتے تھے روزنِ دیوارِ زنداں سے　　اُنھیں پھر چین آیا کس طرح تاریک مدفن میں
تھکے ماندے سفر کے سو رہے ہیں پاؤں پھیلائے　　یہ سب مر مر کے پہنچے ہیں بڑی مشکل سے مدفن میں
کسے معلوم داغِ آتشیں سے دل پہ کیا گزری　　سدھاے ٹھنڈے ٹھنڈے سونپ کر سب ہمکو مدفن میں
بہت دستِ جنوں نے گدگدایا جب تو کیا کرتے　　اُتاریں بیڑیاں اور پہنے دو دو طوق گردن میں
گلا گھٹنے لگا اب تنگ آیا ہوں گریباں سے　　جنوں نے واہ کیا پھانسی لگائی میری گردن میں
بتا دے سیرِ صحرا کی کوئی تدبیر وحشی کو　　گریباں میں تو ہاتھ اُلجھا پھنسا ہی پاؤں دامن میں
فرشتوں کے بھی تیور جلتے ہیں یاں شعلۂ دل سے　　حرارت آفتابِ حشر کی ہے داغِ روشن میں
کجا موسیٰ کجا مقصود سبحان الذی اسریٰ　　رگڑ رگڑا ایڑیاں بس رہ گئے وادیٔ ایمن میں

حجابِ ناز بیجا یاس جسدن بیچ میں آیا
اُسی دن سے لڑائی ٹھن گئی شیخ و برہمن میں

ایڈیٹوریل

جہاز ٹائی ٹینٹک کی تباہی اور ڈیڑھ ہزار سے زائد بندگانِ خدا کی غرقابی نے تمام عالم کو رنج و غم میں مبتلا کر دیا ہے - دنیا کا کوئی ایسا حصہ نہیں جہاں اس دلخراش واقعہ پر غم کے آنسو نہ بہائے گئے ہوں - یہ جہاز نہایت قیمتی مضبوط اور زبردست تھا - امریکہ والوں کا دعویٰ تھا کہ کارک کا ڈوبنا ممکن ہے مگر ٹائی ٹینٹک ہرگز نہیں ڈوب سکیگا - مگر جہاز کے پہلے ہی سفر نے اس بڑے بول کا سر نیچا کر دیا - جہاز کے ساتھ ۱۵۹۵ جانیں تلف ہوئیں صرف ۷۴۵ جانیں بچائی جا سکی ہیں - خدا کے جبروت اور انسانی کمزوریوں کا بیان اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتا ہے -

اس جہاز پر کروڑوں روپیہ کا مال و اسباب اور جواہرات بار تھے مسافروں میں صدہا نہایت مشہور آدمی تھے - منجملہ اُن کے ایک مسٹر ڈبلو - ٹی اسٹیڈ (ایڈیٹر ریویو آف ریویوز) بھی تھے جو امریکہ جا رہے تھے - آہ! دنیا ایک اعلیٰ شخصیت سے خالی ہو گئی - جو دل دنیا کے مظالم سُنکر بیچین ہو جاتا تھا اسکی حرکت بند ہو گئی جو دماغ دنیا سے مظالم دور کرنے میں ہر وقت کام کر رہا تھا بیکار ہو گیا اور جو شخص مظلوم قوموں اور گمنام ذاتوں کے حقوق کے لئے دن رات سینہ سپر رہتا تھا وہ موت سے ہمکنار ہو گیا - مسٹر اسٹیڈ تہذیب و تمدن کی اشاعت کی تحریک کے زبردست حامی تھے - ساری دنیا اُن کے زورِ قلم کا لوہا مان چکی تھی اور بڑے بڑے بادشاہ اُن کی دوستی کا دم بھرتے تھے -

جہاز کے غرق ہونے کے جو حالات ابتک ظاہر ہوئے ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ مسٹر اسٹیڈ مرتے دم تک ثابت قدم رہے اور بڑی مردانگی و حوصلہ مندی کے ساتھ انہوں نے جان دی - آیندہ نمبر میں ہم مسٹر اسٹیڈ کی زندگی کے اہم واقعات و حالات ادیب میں درج کریں گے -

---

اخبار وکیل کے نامور پروپرائیٹر شیخ غلام محمد صاحب کی وفات کا زخم ابھی تازہ تھا کہ ایک اور جگر کو لگا یعنی منشی غلام قادر صاحب فصیح سیالکوٹی نے گذشتہ

ماہ کے اخیر میں بعارضہ کاربنکل انتقال کیا۔ آپ کی عمر ۴۸ سال کی تھی۔ آپ پُرانے اخبار نویس اور بڑے مشاق مترجم تھے۔ کچھ عرصہ امپیریل پیپر کے ایڈیٹر رہنے کے بعد انہوں نے سیالکوٹ سے پنجاب گزٹ نامی ایک اخبار نکالا تھا جو کئی سال تک جاری رہا۔ عرصہ تک ایک ماہوار رسالہ ناولسٹ بھی نکالتے رہے۔ اب آخر میں تاریخ الاسلام کے نام سے ایک سلسلۂ کتب شروع کیا تھا۔ پندرہ سال تک سیالکوٹ کی میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی رہے اور اس کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ خداوند آپکے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

تصریح تصاویر

اس ماہ کی رنگین تصویر اپنشد کے ایک مشہور واقعہ سے تعلق رکھتی ہے اس واقعہ کا تفصیلی حال جاننے کے لئے چھاندوگ اپنشد کا چوتھا باب ملاحظہ فرمانا چاہیئے۔ یہاں صرف تصویر کو روشناس کرنے کے لئے چند مختصر الفاظ لکھے جاتے ہیں: جب ستکام نامی طالب علم اپنی والدہ سے اجازت لیکر تحصیل علم کے لئے ہاردرومت رشی کی خدمت میں حاضر ہوا تو بزرگ رشی نے اُسے شاگردی کے قابل سمجھکر قبول کیا۔ اس تصویر میں وہ منظر دکھایا گیا ہے جبکہ رشی نے ستکام کو اپنی شاگردی میں قبول فرماکر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔ قدیم ہندوستان میں پیری و مریدی کا جو طریقہ تھا اُسپر اس تصویر سے خاصی روشنی پڑتی ہے۔ (مصوّر کا نام بابو نندلال بوس ہے)

نواب مرزا سعید الدین احمد خاں صاحب طالب۔ آپ نواب ضیاء الدین احمد خانصاحب نیّر درخشاں مرحوم رئیس لوہارو کے فرزند ہیں ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپکا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہ تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ خود بھی ایک مرثیہ کی ٹیپ میں فرماتے ہیں ؎

المختصر کہ خادمِ شاہِ نجف ہیں ہم
مشکل کشا ہیں جن کے سلف وہ خلف ہیں ہم

رسم قدیم کے مطابق آپ کی تعلیم و تربیت اپنے مکان ہی پر ہوئی۔ بارہ چودہ سال کی عمر تھی کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ ابتداً جو کچھ کہا اپنے برادر بزرگوار نواب شہاب الدین احمد خانصاحب ثاقب کو دکھایا اور چونکہ اکثر خود مرزا غالب کی خدمت میں حاضر رہتے تھے لہذا جو کچھ کہتے تھے بعد صلاح اُنکی نظر فیض اثر سے بھی گذر جاتا تھا۔ ۱۲۸۵ھ میں حضرت غالب نے انتقال فرمایا اور ایک سال بعد یعنی ۱۲۸۶ھ میں حضرت ثاقب بھی روانۂ عدم ہوئے تو آپ نے اپنا کلام حضرات سالک و مجروح کو دکھانا شروع کیا۔ اخیر میں مولانا حالی سے بھی مشورہ لیا۔ حضرت ثاقب کی وفات کے بعد آپ بغرض تعلیم سرکاری اسکول میں داخل ہوئے مگر ۱۸۷۱ء میں جبکہ نواب سید احمد شاہ بہادر رئیس سردھنہ کی دختر نیک اختر سے آپکی شادی ہوئی تو مدرسہ چھوڑ دیا اور خاص شہر دہلی میں آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوگئے۔ مارچ ۱۸۷۹ء میں آپ اسسٹنٹ اکسٹرا کمشنر ہوکر ضلع فیروزپور تشریف لیگئے ۱۸۸۰ء میں آپ نے ڈیپارٹمنٹل اکزمینیشن میں کامیابی حاصل کی اور اپنے عہدہ پر مستقل کردئے گئے۔ آپ ہوشیارپور میں تھے کہ ۲۷ جون ۱۸۸۵ء کو آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ اس سے آپکا دل ٹوٹ گیا اور ملازمت ترک کرکے خانہ نشین ہوگئے ۱۸۷۷ء کے دربار قیصری میں سند خوشنودی مزاج گورنمنٹ سے ملی تھی ۱۹۰۳ء کے دربار میں بھی درباری تمغہ مرحمت ہوا۔ کتب بینی کا آپ کو بہت شوق ہے اور زبان اردو کے سچے بہی خواہ ہیں۔

پنڈت بشن نراین صاحب در بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ کے بالتصویر حالات ادیب میں ایک مرتبہ نکل چکے ہیں لہذا اعادہ کی ضرورت نہیں۔ گذشتہ کانگریس کے آپ پریسیڈنٹ منتخب ہوئے تھے۔ اس سے بڑا کوئی اور اعزاز نہیں ہے جو اہل ملک متفقہ طور پر کسی کو دے سکتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ادیب کا آپ کو ہمیشہ خیال رہتا ہے اور اپنے کلام سے اسکو مزیّن فرماتے رہتے ہیں۔

منشی تلوک چند صاحب محروم کی تصویر یقیناً خاص دلچسپی کے ساتھ دیکھی جائیگی۔ آپ کی نتیجہ خیز نظموں سے ناظرین ادیب اچھی طرح آشنا ہیں۔ اُردو کا کوئی ایسا رسالہ نہیں ہے جسمیں آپکا کلام شایع نہوا ہو۔ آپ کی نظمیں خاص قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور اپنے رنگ میں لاجواب ہوتی ہیں۔ محروم کی بابت بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے مگر ہم نہیں چاہتے کہ دوست فروشی کا الزام ہم پر عاید کیا جائے۔ لہذا یہی بس ہے۔

موسم گرما کی اشاعت نہایت باموقعہ ہے۔ اس تصویر میں کالیداس کی موسمی نظم "گریشم" کا ایک سین دکھایا گیا ہے۔ اسکے ساتھ اُس نظم کو ملاحظہ فرمانا چاہیئے جو اسی عنوان سے حصۂ نظم میں درج ہے